اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور ۔ کراچی ۔ پاکستان

اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ (صحیح مسلم)

بیشک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد ششم

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۰ پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد ششم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
پروف ریڈنگ و تصحیح	مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
اشاعت اول	جون 2012ء
اشاعت دوم	دسمبر 2012ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ9
قیمت	-/450 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ فون:۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350 فیکس:۔ 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-32212011-32630411 فیکس:۔ 021-32210212

e:mail:- info@zia-ul-quran.com

visit our website:- www.zia-ul-quran.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العٰلمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رحمۃ للعٰلمین، سیدنا و مولانا محمدٍ وّعلیٰ الہ الطیبین الطاھرین وعلیٰ صحابتہ الصدیقین الکاملین، وعلیٰ اولیاءِ امتہ وعلماءِ ملتہ من الفقہاء المجتہدین والمحدثین والمفسرین اجمعین.

حرفِ چند

الحمد للہ علیٰ احسانہٖ تفہیم المسائل کی جلد ششم پیشِ خدمت ہے۔ اس میں اہم مسائل ہیں اور اکثر مسائل مفصّل و مدلّل ہیں۔ یہ مسائل روزنامہ ایکسپریس کے جمعۃ المبارک کے دین ودانش ایڈیشن میں چھپتے رہے ہیں، وہ اپنی پالیسی کے تحت دلائل کو حذف کردیتے ہیں اور بعض اوقات عبارت بے ربط بھی ہوجاتی ہے۔ لیکن اس میں ہم بے بس ہیں، کیونکہ اخبارات کی اپنی پالیسی ہوتی ہے۔

ان مسائل کے حوالہ جات وترتیب کے سلسلے میں میرے نائب خصوصی مفتی عبدالرزاق نقشبندی کی بڑی کاوش ہے۔ میں نے اس کتاب کو امکانی حد تک لفظی اور معنوی اغلاط سے محفوظ رکھنے کے لئے دارالعلوم نعیمیہ کے ذی علم اور فقہی بصیرت رکھنے والے اساتذۂ کرام علامہ احمد علی سعیدی زید مجدہٗ اور مفتی محمد وسیم اختر المدنی زید مجدہٗ سے بھی اس پر نظرِ ثانی کروائی۔ ان حضرات نے کافی انہماک سے اس کا مطالعہ کیا اور حذف واضافہ اور لفظی ومعنوی اصلاح کے بارے میں مفید مشورے دیئے اور ان سے میں نے استفادہ کیا۔ جہاں نظرِ ثانی یا ردوبدل کی ضرورت محسوس ہوئی، میں نے اس میں کوئی تردد نہیں کیا۔ میں ان تینوں حضرات کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں اور ان کے علم اور فیضان میں اضافے کے لئے دعاگو ہوں۔

سب سے زیادہ حضرت علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی زید مجدہٗ کا ممنون ومتشکر ہوں کہ انہوں نے نہایت عمیق نظر سے اس مسودہ کو پڑھا، ایک ایک حوالہ کو اصل مآخذ سے دوبارہ چیک (Tally) کیا، اعراب جہاں نہیں تھے لگائے اور جہاں ضرورت

محسوس کی وہاں اصلاح کی ۔ اُن کے گرانقدر مشوروں سے بعض مسائل کی مزید وضاحت کی ۔ الغرض اُن کے بے لوث علمی تعاون کا میں قدر دان ہوں اور چونکہ مسائل پر اُن کی گہری نظر ہے، اس لئے کوئی تسامح اُن کی نظر سے بچ نہیں سکتا۔

افتاء میں ہر سوال مستقل ہوتا ہے اور اس کے جواب میں ضروری دلائل دیئے جاتے ہیں۔ لیکن جب اُن فتاویٰ کو کتابی شکل دی جاتی ہے تو ایک جیسے سوالات کے جوابات میں بعض اوقات حوالوں کا تکرار محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ قارئین کی سہولت کے لئے میں نے بعض فقہی حوالہ جات کے تکرار کو حذف کر دیا ہے اور جہاں جہاں وہ حوالہ جات پہلے سے اس کتاب میں درج ہیں، اس کا حوالہ دے دیا ہے تاکہ اہلِ علم کے ذہن میں دلیل تازہ ہو جائے۔

میری ایک نفسیاتی کمزوری ہے کہ میں خود اپنی تحریر سے بھی مطمئن نہیں ہو پاتا، اور معیار کی بہتری، عبارت کو سلیس اور عام فہم بنانے کے لئے ہر نظرِ ثانی کے موقع پر کچھ نہ کچھ ردو بدل کرتا رہتا ہوں۔ اس کی وجہ سے تصحیح اور کمپوزنگ کی محنت زیادہ ہو جاتی ہے، اس کے لئے میں مولانا یاسر رحمان کا شکر گزار ہوں۔

میری ہمیشہ یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ اللہ عزّ وجلّ، رسول مکرم ﷺ، کسی صحابی، تابعی، امام، عالم و فقیہ اور مصنِّف و مصنَّف کا نام یا کوئی بھی مرکب کلمہ اس طرح نہ آئے کہ اس کا نصفِ اول سطر کے آخر میں ہو اور نصفِ ثانی اگلی سطر کے شروع میں آئے، مگر ہماری محنت سے قائم کی ہوئی یہ ترتیب بعض اوقات بگڑ جاتی ہے۔

اہلِ علم اور قارئین سے التجا ہے کہ کوئی بھی لفظی اور معنوی فروگزاشت ان کے علم میں آئے تو ضرور مطلع فرمائیں، میں نہایت شکر گزار ہوں گا۔ اللہ تعالیٰ میری لغزشوں سے درگزر فرمائے، اس کاوش کو اپنی بارگاہِ اقدس میں ماجور فرمائے اور اسے قبولِ عام عطا فرمائے۔

آپ نے اس کتاب کے مطالعہ کے دوران مشاہدہ کیا ہوگا کہ ہم عصرِ حاضر کے

عظیم مفسر، محدّث، فقیہ اور عالمِ جلیل علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم کی تحقیقات سے کافی استفادہ کرتے ہیں۔ گزشتہ دنوں وہ کافی علیل رہے اور کچھ عرصے کے لئے ''نعمۃ الباری'' کا کام بھی موقوف ہوگیا تھا، لیکن الحمدللہ اب ان کی طبیعت کسی حد تک بحال ہوگئی ہے اور ''نعمۃ الباری'' کی نویں جلد کی تکمیل کے بعد دسویں جلد پر کام جاری ہے۔ آج کل انہیں گھٹنے کے درد (Arthritis) کی شدید تکلیف ہے، تمام قارئین سے درخواست ہے کہ اُن کی صحت یابی کے لئے ہمیشہ دعا کرتے رہیں۔ ہماری مخلصانہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں تمام جسمانی، روحانی اور عقلی وفکری قوئ کی سلامتی کے ساتھ اعلیٰ تحقیقی معیار پر ''نعمۃ الباری'' کی تکمیل کی سعادت نصیب فرمائے۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ ''تبیان القرآن''، ''شرح صحیح مسلم''، ''نعمۃ الباری'' اور علامہ صاحب کی دیگر تصانیفِ جلیلہ صدیوں مطلعِ علم پر ضوفگن رہیں گی اور ہر عہد کے شائقینِ علم ان سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

طلبگارِ دعا:

العبد المفتقر الی اللّٰہ

منیب الرحمٰن

فہرست

عقائد کے مسائل

نبی اور رسول میں فرق

سوال: 01

نبی اور رسول میں کیا فرق ہے؟ اور ان میں سے کس کا رتبہ زیادہ بلند ہے؟ اور جو چار خلیفہ تھے وہ کس میں شامل ہوں گے؟ (افتخار احمد، ایف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

رسول اس (کامل) بشر کو کہتے ہیں، جسے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی طرف (اپنے) احکام کی تبلیغ کے لئے مبعوث فرمایا ہو اور اس میں کتاب کی بھی شرط لگائی گئی ہے (یعنی وہ ''صاحبِ کتاب'' ہو)۔اس کے برعکس نبوت عام ہے (یعنی ہر رسول نبی ہوتا ہے، مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا)۔ نبوت و رسالت کبھی ہم معنی (Synonymous) استعمال ہوتے ہیں۔ علامہ سعد الدین تفتازانی نے شرح العقائد النسفیہ اور شرح المقاصد میں ہم معنی ہی مراد لیا ہے، جسے عربی میں ''مُترادِف'' کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ معنی کے اعتبار سے مُتَبَایِن (Words with different meanings) ہیں۔ ایک تعریف یہ ہے کہ رسول وہ ہے جو ''صاحبِ کتاب'' ہو اور حاملِ شریعت ہو۔ مگر اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ روایات کی رو سے رسولوں کی تعداد 313 (یا 315) ہے اور الہامی کتابوں کی تعداد 110 ہے اور انبیاءِ کرام کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی گئی ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام ''صاحبِ کتاب'' نہیں ہیں، مگر قرآن نے انہیں ''رسول نبی'' کہا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِسْمٰعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا○

ترجمہ: ''اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کیجئے، بے شک وہ وعدے کے سچے (اور پکے) تھے اور رسول نبی تھے، (مریم: 54)''۔

اس بنا پر رسول کی تعریف میں وسعت پیدا کی گئی اور اس میں یہ اضافہ کیا گیا کہ: ''اُسے بھی رسول کہتے ہیں، جو سابق رسول کی شریعت ہی کا داعی اور مبلغ ہو لیکن اسے کسی نئی قوم کی

طرف بھیجا گیا ہو، جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکۂ مکرمہ اور اُس خطے کے لوگوں کی طرف دین کی دعوت دینے کے لئے بھیجا گیا یا جیسے حضرت یوشع علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت ہی کے مبلّغ تھے۔ ایک تعریف کی رو سے رسول وہ ہے جس کی طرف (پیغام رسانی کے لئے) فرشتہ آتا ہو اور نبی پر اور طریقوں سے بھی وحی آتی رہتی ہے، جیسے الہام (Revelation) ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں کوئی بات ڈال دی جائے یا نیند میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی وحی کی جائے۔ ایک لحاظ سے نبی کے مقابلے میں رسول عام ہے، کیونکہ رسول انسانوں میں سے بھی گزرے ہیں اور فرشتوں میں بھی ہیں، جبکہ نبی صرف انسانوں میں ہوتے ہیں۔

(خلاصۂ بحث از شرح العقائد النسفیہ مع عقد الفرائد، ص:57، مکتبۃ البشریٰ، پاکستان)

قرآن مجید میں فرشتے پر رسول کا اطلاق کیا گیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: قَالَ إِنَّمَآ أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۝

ترجمہ: ''(جبرئیل علیہ السلام نے) کہا: (اے مریم!) میں تو صرف تمہارے رب کا رسول (بھیجا ہوا) ہوں تاکہ میں تمہیں ایک پاکیزہ بیٹا دوں، (مریم:19)۔ اس آیت میں فرشتے کو رسول کہا گیا ہے اور صاحبِ کتاب ہونا یہ رسولِ بشر کا خاصہ ہے، فرشتے پر رسول کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے فرستادہ یا پیغام رساں کے معنی میں ہے۔ اسی طرح قرآنِ مجید میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا؟، تو اس نے جواب دیا:

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي ۝

ترجمہ: ''اس نے کہا: میں نے وہ چیز دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی، تو میں نے اللہ کے رسول (جبرئیل علیہ السلام) کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی بھر (مٹی) لی، پھر میں نے اس کو (بچھڑے کے مجسمے میں) ڈال دیا اور اسی طرح میرے دل کو (یہی بات) بھلی لگی، (طٰہٰ:96)''۔ یہاں بھی فرشتے پر رسول کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں عام پیغام رساں پر بھی رسول کا اطلاق ہوا ہے، لیکن یہ لغوی معنیٰ میں ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌO

ترجمہ: ''تو جب اُن (یوسف علیہ السلام) کے پاس (بادشاہ کا) قاصد آیا، تو اُنہوں نے فرمایا: اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ اُن عورتوں کا کیا حال ہے، جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، بے شک میرا رب ان کی سازش کو خوب جاننے والا ہے، (یوسف: 50)''۔

الہامی کتابوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

حضرت شیث پر 50 صحیفے، حضرت خنوخ پر 30 صحیفے، حضرت ابراہیم پر 10 صحیفے، حضرت موسیٰ پر تورات سے پہلے 10 صحیفے نازل کئے گئے اور 4 کتابیں تورات، زبور، انجیل اور قرآن ہیں، (حلیۃ الاولیاء، جلد: 1، ص: 167، بیروت)۔ایک روایت کی رو سے چار بڑی کتابیں ہیں (تورات، زبور، انجیل اور قرآن) اور حضرت آدم پر 10 صحیفے، حضرت شیث پر 50 صحیفے، حضرت ادریس پر 30 صحیفے اور حضرت ابراہیم پر 10 صحیفے۔

(خلاصہ بحث از شرح العقائد النسفیہ مع عقد الفرائد، ص: 57، مکتبۃ البشریٰ پاکستان)

یہ سب اخبارِ آحاد ہیں اور ظنی ہیں۔اسی لئے علماءِ کرام جب بھی الہامی کتب اور تعدادِ انبیاء کی بات کرتے ہیں تو ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم وبیش کے الفاظ بولتے ہیں، قطعیت کے ساتھ تعداد کا تعین نہیں کرتے، انبیاءِ کرام کی قطعی تعداد اور ان کے اسماءِ مبارکہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں۔علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

عقیدہ: نبی اس بشر کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لئے وحی بھیجی ہو، اور رسول بشر ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ملائکہ میں بھی رسول ہیں (جیسے جبریل وغیرہ)۔

عقیدہ: انبیاء سب بشر تھے اور مرد، نہ کوئی جن نبی ہوا اور نہ عورت۔

عقیدہ: انبیاء علیہم السلام شرک و کفر اور ہر ایسے عیب سے جو خلق کے لئے باعثِ نفرت ہو،

جیسے کِذب وخیانت وجہل وغیرُھا صفاتِ ذمیمہ سے نیز ایسے افعال سے جو وجاہت (Prominence/Dignity)اور مُروت(Sense of honor, Generosity) کے خلاف ہیں، قبلِ نبوت اور بعدِ نبوت بِالاجماع(By Consensus) معصوم ہیں اور کبائر سے بھی مطلقاً معصوم ہیں اور حق یہ ہے کہ تعمُّداً(Intentionally) صغائر سے بھی قبل نبوت اور بعد نبوت معصوم ہیں،(بہارِشریعت،جلد:1،ص:11-9)۔

علامہ کمال الدین بن ھمام نے نبی کی بعض خصوصیات بیان کی ہیں، جودرج ذیل ہیں:

مذکر ہونا، عقل اور خِلقت(By Birth)کے اعتبار سے کامل ہونا، ذہانت (Intellect)اوراصابتِ رائے(Righteousness) کےاعتبار سے کامل ہونا،اُن کے آباء کااوصافِ رذیلہ(Depraved Qualities)سے پاک اور پاکیزہ کردار کا حامل ہونا، نرم دل اور شفیق ہونا، ایسے جسمانی نَقص (Defect) اور عیب(Deficiency)سے پاک ہونا جولوگوں کے نزدیک نفرت کا سبب ہو،جیسے برص، جذام وغیرہ،اُن کا کوئی فعل انسانی وقار کے منافی نہیں ہوتا،ایسے پیشے کا حامل نہ ہو جولوگوں کے نزدیک بےتوقیراورنفرت یاعار کا سبب ہو۔اس پرعلماءِ اُمّت کا اجماع ہے کہ نبی نبوت سے پہلے اورنبوت کے بعد کبائر سے مُطلَقاً معصوم ہوتا ہےاور عمداً(Intentionally) صغائر سے بھی معصوم ہوتا ہے،البتہ بعض اوقات نسیان یااجتہادی خطا نبی سے ممکن ہے۔

(خلاصہ ازتبیان القرآن،ج:1،ص:618)

قرآن مجید میں درج ذیل 26 انبیاءِ کرام کے نام صراحت اور قطعیت کے ساتھ آئے ہیں:

حضرت آدم،حضرت نوح،حضرت ابراہیم،حضرت اسماعیل،حضرت اسحاق،حضرت یعقوب، حضرت یوسُف،حضرت موسیٰ،حضرت ہارون،حضرت شعیب،حضرت لوط،حضرت ہود، حضرت داؤد،حضرت سلیمان،حضرت عزیر،حضرت ایوب،حضرت زکریا،حضرت الیاس، حضرت الیَسَع،حضرت یحیٰی،حضرت عیسیٰ،حضرت یونُس،حضرت ادریس،حضرت ذُوالکِفل،

حضرت صالح اور ختم المرسلین حضرت سیّدنا محمد رسول اللہ علیہم الصلاۃ والسلام۔
ان میں سے کسی ایک نبی کی بھی نبوت کا انکار کفر ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کا نام صراحت کے ساتھ قرآن میں مذکور نہیں ہے، ان کی نبوت میں بھی اختلاف ہے، تاہم جمہور علماءِ امت کی رائے ہے کہ وہ نبی تھے۔ان کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں ہے:فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا٥
ترجمہ:''تو اُن دونوں (حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع علیہما السلام) نے ہمارے بندوں میں سے ایک (مُقرّب) بندے (حضرت خضر) کو پایا، جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت دی اور اسے اپنا علمِ لَدُنّی سکھایا (یعنی اللہ تعالیٰ کے تکوینی امور کے پیچھے اُن کے اَسرار و رموز اور پوشیدہ حکمتوں کا علم عطا کیا)، (الکھف:65)''۔اسی طرح قرآن میں حضرت لقمان کا ذکر یوں ہے:وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَةَ، ترجمہ:''اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی، (لقمان:12)''۔ان کے بارے میں جمہور علماءِ امت کی رائے یہ ہے کہ یہ نبی نہیں تھے بلکہ مردِ دانا اور حکیم (Wise Man, Sage) تھے۔
مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہو گیا کہ رسول کا مقام نبی سے اَرفع ہوتا ہے اور پھر رسولوں میں سے اُولوالعزم رسولوں کا مقام بلند ہوتا ہے۔لیکن یہ فرقِ مراتب اُن کے مابین درجات کے تفاوت کی وجہ سے ہے، ورنہ تمام رُسُلِ عِظام اور انبیاءِ کرام علیٰ نبیّنا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی اپنی جگہ بلند درجات کے حامل ہیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
(۱) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ،
ترجمہ:''یہ (سب) رسول ہیں، ہم نے اِن میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے، (البقرہ:253)''۔
(۲) لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ،
ترجمہ: ہم (ایمان لانے میں) اُس (اللہ) کے رسولوں میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی فرق نہیں کرتے، (البقرہ:285)''۔

تمام انبیاءِ کرام کا نام بہ نام ذکر قرآن وحدیث میں نہیں ہے، اس لئے قرآن وحدیث میں مذکور انبیاءِ کرام کے علاوہ دیگر انبیاءِ کرام پر اجمالاً (Generally) ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ،

ترجمہ: اور بے شک ہم نے آپ سے پہلے (بھی) رسول بھیجے، ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان فرمادیا اور اُن میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان نہیں فرمایا، (المؤمن:78)"۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد جو صحابۂ کرام یکے بعد دیگرے آپ کے خلیفہ بنے، وہ اپنے فضائل اور رفعتِ شان کے باوجود امتی ہیں، آپ ﷺ کی شریعت کے پیروکار اور مبلغ رہے۔ غیر نبی مرتبے میں نبی کے برابر نہیں ہوسکتا۔ حدیثِ پاک میں ہے:

كَانَتْ بَنُوْ إِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَسَيَكُوْنُ خُلَفَاءُ۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل کے امورِ سیاست انبیاء انجام دیتے تھے، جب ایک نبی کا وصال ہوجاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ لے لیتا، مگر اب میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، بس خلفاء ہوں گے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:3455)"۔

امام مہدی کی تشریف آوری

سوال:02

امام مہدی اس دنیا میں کس حیثیت سے تشریف لائیں گے؟۔

جواب:

حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ اس دنیا میں رسول اللہ ﷺ کے امتی کی حیثیت سے تشریف لائیں گے اور امامت بھی وہی فرمائیں گے۔

حدیث پاک میں ہے:اَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كَيْفَ أَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيْكُمْ ، وَاِمَامُكُمْ مِنْكُمْ۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (اے میری امت کے لوگو!) اس وقت تمہاری کیا شان ہوگی ، جب عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام تمہارے درمیان نازل ہوں گے اور تمہارا امام تم ہی میں سے ہوگا''۔

(صحیح بخاری:3449)

اس حدیث میں اُمّتِ محمدیہ کے جس امام کی طرف اشارہ ہے، وہ حضرتِ امام مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی رسالت ونبوت مستقل اور بالذات ہے

سوال:03

کیا حضرت محمد ﷺ کی رسالت حضرت علی کے بغیر ثابت نہیں ہوتی ؟۔

جواب:

حضرت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت ونبوت مستقل اور بالذات ہے، اس کا ثبوت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمیت کسی اور شخصیت یا ذات پر موقوف نہیں ہے۔آپ ﷺ کو نبوت ورسالت، منصب خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین الغرض سارے کمالات براہِ راست اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے۔حضرت علی سمیت تمام خلفاءِ راشدین، عشرۂ مُبَشَّرَہ، اہل بیتِ کرام اور تمام اصحابِ رسول رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی فضیلتیں آپ ﷺ کے طفیل، آپ کی نسبت سے، آپ پر ایمان لانے سے اور آپ کی برکات کے طفیل ہیں۔

بشر اور ملائکہ میں افضل کون

سوال:04

بشر اور ملائکہ میں کس کا رتبہ زیادہ ہے؟۔

جواب:

رُسُلِ بشر، رُسُلِ ملائکہ سے افضل ہیں اور رُسُلِ ملائکہ عام انسانوں سے افضل ہیں اور عام انسان عام ملائکہ سے افضل ہیں۔ رُسُلِ ملائکہ کے عام انسانوں سے افضل ہونے پر جُمہور علماءِ اُمّت کا اجماع ہے اور یہ ضروریاتِ دین سے ہے، یعنی اسلام میں عام انسانوں پر رسول کی فضیلت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے، یہ دین کے قطعی امور سے ہے۔ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ عام انسان عام ملائکہ سے افضل ہیں، ان سے وہ انسان مراد ہیں، جو علماء وصُلَحَاء ہیں، ایمانِ کامل رکھتے ہیں، کسی عَلانیہ فسق وفجور اور بدعت وضلالت میں مبتلا نہیں ہیں۔ البتہ جو انسان قبولِ حق سے انکار کر دیں، خالق تبارک وتعالیٰ اور اس کے احکام اور ضروریاتِ دین کے منکر ہو جائیں، کفر وشرک، فسق وفُجور اور بدعت وضلالت میں مبتلا ہوں، تو ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ،

ترجمہ: ''وہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں، (الاعراف:179)''۔ اور فرمایا: ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ٥

ترجمہ: ''پھر ہم نے اسے پستی کے آخری درجے میں گرا دیا، (التین:5)''۔

اس کے دلائل کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، علماء نے قرآن مجید کی متعدد آیات سے استدلال کیا ہے۔ چند یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں اور سجدے کا یہ حکم تعظیم وتکریم کے لئے تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ابلیس کے اعتراض کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

أَرَأَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ،

ترجمہ: ''مجھے بتائیے کیا یہ وہی ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت عطا کی، (بنی اسرائیل:62)''۔

(۲) ابلیسِ لعین آدم علیہ السلام کی فضیلت کے حکمِ ربانی کو چیلنج کرتے ہوئے کہتا ہے:

أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ،

ترجمہ: ''میں (اپنے جوہرِ تخلیق کے اعتبار سے) اُس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اُسے مٹی سے پیدا کیا، (الاعراف:12)''

(۳) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا، ترجمہ: ''اور اُس (اللہ) نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے، (البقرہ:31)''۔ یہاں علم کو آدم علیہ السلام کی فضیلت کا سبب قرار دیا۔ اس پر قرآن مجید کی بہت سی آیات شاہد ہیں۔

(۴) وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ، ترجمہ: ''اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو بزرگی عطا فرمائی، (بنی اسرائیل:70)''۔

معتزلہ، فلاسفہ اور بعض اَشاعرہ ملائکہ کی انسانوں پر فضیلت کے قائل ہیں، ان کے اپنے دلائل ہیں اور علماء نے ان دلائل کا جواب دیا ہے۔ اس کی تفصیل شرح العقائد النسفیہ مع عقد الفرائد، مطبوعہ: مکتبۃ البشریٰ، صفحات: 402 تا 407 پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

تخلیقِ کائنات میں نورِ مصطفیٰ ﷺ کی جلوہ گری

سوال: 05

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کرنے سے پہلے حضرت محمد ﷺ کا نور بنایا تو کیا انبیاء کے نور اس وقت موجود تھے؟۔

جواب:

مصنف عبدالرزاق کی ایک روایت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ کائنات سے پہلے نورِ محمد ﷺ کو پیدا فرمایا، دیگر انبیاءِ کرام ورسلِ عِظام کی اَرواحِ مبارکہ کی تخلیق اس کے بعد ہوئی۔ تاہم عالَمِ اجسام کی تخلیق سے پہلے درجہ بدرجہ تمام انسانوں کی ارواح تخلیق کی گئیں۔ قرآن مجید میں عالَمِ اَرواح میں ارواحِ انبیاء علیھم السلام کے سید المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی نصرت کا پختہ وعدہ لینے کا ذکر ہے، جس پر انبیاءِ کرام کو بھی شاہد بنایا گیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں بھی اس پر شاہد ہوں اور اسے میثاق سے تعبیر فرمایا، (آلِ عمران: 81)۔ اور اسی طرح تمام انسانوں کی ارواح سے بھی اللہ نے

اپنی رُبوبیت کے اقرار کا عہد لیا اور اس کی تفصیل سورۂ الاعراف:172 میں بیان فرمائی گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو اپنی مذہبی تنظیم میں کام کی دعوت دینا

سوال: 06

کیا فرماتے ہیں کہ علماءِ کرام اس بارے میں کہ ایک مذہبی تنظیم کے اجلاس کے دوران تنظیم کے ذمہ دار نے کارکنان کو تنظیمی کام کی ترغیب دلاتے ہوئے ایک خواب بیان کیا، جس کے الفاظ کچھ یوں ہیں کہ: ''حضور ﷺ ہمارے تنظیمی کام سے خوش ہیں اور پھر تنظیم کے ذمہ دار نے حضور ﷺ کو تنظیم میں کام کرنے کی پیشکش کی''۔کیا اس قسم کے خوابوں کو بیان کر کے کسی بھی تنظیم کا کارکنان کو ترغیب دلانا کیسا ہے؟۔کیا مذکورہ خواب میں حضور ﷺ کو تنظیم میں کام کرنے کی پیشکش کرنا بے ادبی تو نہیں؟۔

(محمد فاروق، لائنز ایریا، کراچی)

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے، تو اس میں مذکور مذہبی تنظیم کے ذمہ دار کے حوالے سے دو باتیں ہیں، ایک تو اس بات کا دعویٰ کہ خواب میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی ہے، خواب میں زیارتِ رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے:

وَمَنْ رَآنِی فِی الْمَنامِ فَقَدْ رَآنِیْ، فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ فِیْ صُورَتِیْ، وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔

ترجمہ:'' جس نے خواب میں مجھے دیکھا، اُس نے مجھے ہی دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کرسکتا، اور جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے، (صحیح بخاری، کتاب العلم، رقم الحدیث:110، 6197)''۔

اس حدیث مبارک کی رُو سے یہ امر ثابت ہے کہ سعادت مند مومن کو خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوسکتی ہے، یہ بھی ہمارا عقیدہ ہے کہ شیطان رسول اللہ ﷺ کی

صورت مبارکہ اختیار نہیں کرسکتا۔ اور مذکورہ حدیث میں جو دوسری اہم بات بیان فرمائی گئی، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنے والا حقیقتاً آپ ہی کو دیکھتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص محض اپنی بڑائی اور شان ظاہر کرنے کی خاطر جھوٹا خواب بیان کرے یعنی اس نے حضور ﷺ کی زیارت نہ کی ہو اور لوگوں سے بیان کرتا پھرے، تو حدیث کے مطابق وہ نارِ جہنم کا مستحق ہے۔ حضور ﷺ کے بارے میں اس طرح پتا چلتا ہے کہ خواب میں کوئی تعارف کرائے یا اس کے دل میں بات آئے کہ یہ نبی کریم ﷺ ہیں۔ اسی طرح اگر ظاہر حال کے اعتبار سے وہ شخص فاسق و فاجر یا مبتدع ہے، تو اس کے قول کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، یا وہ ایسی مذہبی تنظیم سے تعلق رکھتا ہے، جو اپنے یا اپنے رہنما کے بارے میں ایسے مذہبی تفرّدات کی مدّعی ہے، جو صراحۃً خلافِ واقع ہیں یا ان کے عقائد میں کوئی فساد ہے، تو ان کے دعووں پر اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ البتہ عمومی طور پر شرعاً ہمیں کسی کے بارے میں ''سوءِ ظن'' کی ممانعت ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ دعویٰ باطل اور کذب ہے اور ہمارے پاس تصدیق کا بھی کوئی ذریعہ نہیں ہے، لہٰذا ایسے دعووں کے بارے میں ہمارے نزدیک سکوت بہتر ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا کسی دینی تنظیم کو پسند فرمانا، یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے، بلکہ ہر امرِ خیر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کو پسند ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ،

ترجمہ: ''بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، (البقرہ:195)''۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ،

ترجمہ: ''بیشک اللہ بہت توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور نہایت پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، (البقرہ:222)''۔

وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ،

ترجمہ: ''اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ (آل عمران:146)''۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ،

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے، (آل عمران: 159)''۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ،

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، (الممتحنہ: 8)۔ وغیرھا من الایات۔ تو جن صفات کے حامل لوگ اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، یقیناً رسول اللہ ﷺ بھی اُن سے محبت فرماتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ کسی خاص مذہبی تنظیم کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا، اگر بظاہر اس تنظیم میں کوئی امر خلافِ شرع نہیں ہے اور وہ ایسے کاموں میں مشغول ہے، جو شرعاً فرض، واجب، سنت، مستحب اور اَولیٰ ہیں اور اُس کے لوگ مُحرّمات ومکروہات سے اجتناب کرتے ہیں، تو دنیا میں احکامِ شریعت کا اطلاق ظاہر حال پر ہوتا ہے، باطن اور نیتوں کا فیصلہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ہوگا، ہمیں حسنِ ظن سے ہی کام لینا چاہئے اور قطعی شواہد وقرائن کے بغیر سُوءِ ظن (بدگمانی) سے اجتناب کرنا چاہئے۔ دوسری بات جو سوال میں مذکور ہے، وہ یہ ہے کہ کسی مذہبی تنظیم کے ذمہ دار نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی تنظیم میں کام کرنے کی پیش کش کی، ہمارے نزدیک یہ خواہش یا پیشکش کہ رسول اللہ ﷺ ان کی تنظیم میں کام کریں، ایسی ہے جس سے بظاہر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کے امیر کی سربراہی میں کام کریں، یہ خلافِ ادب ہے۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے خوابوں کو عوام میں بیان کرنا درست نہیں ہے، نہ ہی یہ دینی مصلحت وحکمت کا تقاضا ہے اور مقاصدِ شرعیہ میں ایک ''سدِّ ذرائع'' بھی ہے، یعنی ایک ایسا امر جو شریعت کی رو سے فی نفسہٖ مستحسن ہو، لیکن وہ کسی اور فساد کا باعث بن رہا ہو یا بن سکتا ہو، تو دین کی حکمت ومصلحت کے تحت اُس مستحسن امر کو بھی چھوڑ دینا بہتر ہے، حدیث پاک میں ہے:

لَوْلَا حَدَاثَةُ قَوْمِكِ بِالْكُفْرِ، لَنَقَضْتُ الْبَيْتَ ثُمَّ لَبَنَيْتُهُ عَلٰى أُسَاسِ إِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، فَإِنَّ قُرَيْشًا اِسْتَقْصَرَتْ بِنَاءَهُ، وَجَعَلْتُ لَهُ خَلْفًا۔

ترجمہ: ’’حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تمہاری قوم ابھی تازہ تازہ کفر ترک کر کے اسلام میں داخل نہ ہوئی ہوتی، تو میں بیت اللہ کی عمارت کو منہدم (شہید) کر دیتا اور پھر اُسے ابراہیم علیہ السلام کی اصل بنیاد پر تعمیر کرتا، کیونکہ (اعلانِ نبوت سے پہلے جب بیت اللہ کی عمارت قدرتی اسباب سے شہید ہو گئی تھی، تو) قریش نے بیت اللہ کی عمارت کو (بناءِ ابراہیمی کے مقابلے میں) چھوٹا کر دیا تھا، اور میں اس کے پیچھے کی جانب بھی ایک دروازہ بناتا، (صحیح بخاری، کتاب الحج، رقم الحدیث: 1585)‘‘۔

اس حدیث کا مستفاد یہ ہے کہ اعلانِ نبوت سے پہلے جب حادثاتِ زمانہ سے بیت اللہ کی عمارت شہید ہو گئی، تو قریشِ مکہ نے اس کی تعمیرِ نو کی۔ اس تعمیرِ نو کے لئے انہوں نے طے کیا تھا کہ حلال پیسہ خرچ کیا جائے گا، تو مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے انہوں نے عمارت کی حدود میں کمی کی۔ چنانچہ انہوں نے رکنِ عراقی اور رکنِ شامی کی جانب سے عمارت کی حد کو چھوٹا کر دیا اور اصل بناءِ ابراہیمی کی نشاندہی کے لئے چھوٹی سی دیوار بنادی، جسے ’’حطیم‘‘ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیچھے کی جانب کا دروازہ بند کر دیا تاکہ ان کی منظوری کے بغیر عام لوگ بیت اللہ میں داخل نہ ہو سکیں اور یہ اعزاز ان کے لئے ایک امتیاز کی علامت ہو۔ اب فتحِ مکہ کے بعد اسلام حجاز میں مکمل طور پر غالب آچکا تھا، یہاں تک حدودِ حرم میں مشرکین کا داخلہ منع تھا، وسائل کی کمی نہیں تھی اور رسول اللہ ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ بیت اللہ بناءِ ابراہیمی پر تعمیر ہو اور اس کی پچھلی جانب بھی دروازہ رکھا جائے اور یہ خواہش پسندیدہ بھی تھی۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے بناءِ ابراہیم علیہ السلام پر تعمیر کعبہ کے پسندیدہ ہونے، وسائل کی دستیابی اور اپنی خواہش کے باوجود اسے ترک فرما دیا تاکہ لوگوں کا ایمان متزلزل نہ ہو، کیونکہ بیت اللہ کی تقدیس کے پیشِ نظر اُس کی عمارت کو منہدم (شہید) کرنے کے عمل کو عام مسلمان کا ذہن بآسانی قبول نہ کرتا۔ اور عام قریش فتح مکہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے، وہ نو مسلم تھے اور ان کے عقائد کو متزلزل کرنا حکمتِ دین کے منافی تھا۔ اس سے ذاتِ رسالت مآب ﷺ کا یہ مزاجِ مبارک واضح ہوتا ہے کہ بعض اوقات دینی

اعتبار سے دین کی بڑی حکمت کے پیشِ نظر کسی پسندیدہ بات کو بھی ترک کیا جا سکتا ہے اور اتباعِ رسالت میں ایسا کرنا چاہئے۔

مُتصوّفین اور اُن کے ارادتمندوں کے خلافِ شرع عقائد کا رَد

سوال: 07

کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس شخص کے بارے میں جو روحانی رہنما و پیر ہے، اُس کے عقائد مشتبہ تھے، مقامی علماء کرام نے اس کے پروگرام کی سی۔ڈی دیکھی جس میں سرعام اُسے سجدہ ہورہا ہے اور اس کی طرف اشارہ کرکے مریدین یارسول اللہ کا نعرہ لگارہے ہیں اور وہ نعتیں جو رسول اللہ ﷺ کی شان میں ہیں، اس شخص کی طرف اشارہ کرکے پڑھ رہے ہیں۔اس پر علماء کا ایک وفد اُسے ملنے کے لئے گیا۔اِس پر اُس نے مندرجہ ذیل کلمات کہے، جس کے علماء اور بیس پچیس آدمی گواہ ہیں:

1۔علماء نے پوچھا کہ لوگ آپ کو سجدہ کررہے ہیں حالانکہ غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے، تو اس نے کہا: یہ تمہاری نظروں میں مجھے سجدہ کررہے ہیں، درحقیقت میرے اندر اِن کو اللہ نظر آتا ہے، اُس کو سجدہ کررہے ہیں، اس پر ایک مرید کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ اللہ ہمارے سرکار پاک کے اندر ہے اسلئے ہم ان کو سجدہ کرتے ہیں۔

2۔علماء نے پوچھا: آپ کے مریدین آپ کی طرف اشارہ کرکے یارسول اللہ! کہہ رہے ہیں، اس نے کہا: یہ اُن کا عقیدہ ہے۔

3۔حضرت آدم اور حضرت یوسف کو سجدہ ہوا ہے اور میں آدم زادہ ہوں، مجھے بھی سجدہ ہوسکتا ہے، کعبہ صرف ایک پوائنٹ ہے۔اللہ ہر جگہ موجود ہے حتیٰ کہ بیت الخلا میں بھی سجدہ ہوسکتا ہے۔

4۔آپ کو پتا ہے میں کہاں سے آیا ہوں، امریکہ سے آیا ہوں، اس کو ولایت کہتے ہیں مغرب، میں کہاں بیٹھا ہوں؟ اس کو کہتے ہیں مشرق، قرآن میں لکھا ہے: رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ، اب کوئی اور بات بھی ہے؟ اور میرا یہ آنا جانا چلتا رہے گا۔

5۔تم علماء قادیانیوں کو کافر کہتے ہو حالانکہ وہ کافر نہیں بلکہ روئے زمین پر کوئی بھی کافر نہیں، ہم تو کافر کو بھی کافر نہیں کہتے۔

6۔اس کے مریدین اس کے نام محمد اسحاق کے ساتھ محمد پر ''ص'' کا نشان لگاتے ہیں۔ اپنے پیر کے لئے حضور اور سرکار پاک کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور صرف جھکتے نہیں بلکہ مکمل سجدہ کرتے ہیں۔

نوٹ: اس گفتگو میں وہ یہ بھی کہتا رہا: رب ایک ہے، سجدہ رب کو ہی ہوتا ہے، حضور رسولوں کے رسول ہیں، I am nothing اور ساتھ ہی فوراً اوپر والے کلمات بھی کہتا رہا، یعنی اقرار بھی کرتا ہے اور انکار بھی۔اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس شخص اور اس کے مریدین کے بارے میں کیا حکم ہے؟۔کیا یہ شخص مذکورہ عقائد کی بنا پر مسلمان ہے یا دائرۂ اسلام سے خارج ہے؟۔ان باتوں میں توہینِ رسالت کا جرم ہے یا نہیں؟، خدائی دعویٰ کا کیا حکم ہے؟، اسلام میں اس کی سزا کیا ہے؟، نیز یہ شخص اب پولیس کی تحویل میں ہے کیا اگر اب توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہے یا نہیں؟، اگر قبول ہے تو طریقہ کیا ہے، اس کی حمایت کرنے والوں کا کیا حکم ہے؟۔

المستفتیان

مولانا عبدالرحمٰن عثمانی ،مولانا عبید الرحمٰن انور ،مولانا صابر ایوب ،مولانا شاہد کلیم ، مولانا عبدالرحمٰن نظام وایکشن کمیٹی ،تلہ گنگ، ضلع چکوال، پنجاب

جواب :

ولی اللہ، اللہ تعالیٰ کے مُحِبّ، محبوب اور مُقرّب کو کہا جاتا ہے۔ولایت کی دو شرطیں ہیں: (۱) صاحب ایمان ہونا، (۲) صاحب تقویٰ ہونا۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ،

ترجمہ: ''اللہ کے ولی وہ ہیں جو ایمان لائے اور (ساری زندگی) تقوے پر کاربند رہے، (سورۂ یونس:63)''۔

علامہ علاؤالدین خازن رحمۃ اللہ علیہ ولایت کی شرائط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَقَالَ الْمُتَكَلِّمُوْنَ: وَلِيُّ اللّٰهِ مَنْ كَانَ آتِيًا بِالْاِعْتِقَادِ الصَّحِيْحِ الْمَبْنِيِّ عَلَى الدَّلِيْلِ وَيَكُوْنُ آتِياً بِالْاَعْمَالِ الصَّالِحَةِ عَلٰى وَفْقِ مَاوَرَدَتْ بِهِ الشَّرِيْعَةُ وَاِلَيْهِ الْاِشَارَةُ بِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۔

ترجمہ: ''ماہرینِ علم الکلام (علم العقائد) نے کہا ہے کہ اللہ کا ولی وہ ہے جو شرعی دلیلوں پر مبنی صحیح عقیدے پر قائم ہو اور شریعت کے مطابق اعمالِ صالحہ پر عمل پیرا ہو اور اللہ جل شانہٗ نے اپنے ارشاد ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ، ترجمہ: ''اللہ کے ولی وہ ہیں جو ایمان لائے اور (ساری زندگی) تقوے پر کاربند رہے، (سورۂ یونس :63)''، میں اسی جانب اشارہ فرمایا ہے، (تفسیر خازن، جلد 2، ص:322، دارالکتب العربیہ، پشاور)''۔

کوئی بدعقیدہ اور بدعمل شخص اللہ کا ولی نہیں ہوسکتا۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اِعْلَمْ اَنَّ مِيْزَانَ الشَّرْعِ الْمَوْضُوْعَةِ فِي الْاَرْضِ هِيَ بِاَيْدِي الْعُلَمَآءِ مِنَ الشَّرِيْعَةِ فَمَا خَرَجَ وَلِيٌّ عَنْ مِيْزَانِ الشَّرْعِ الْمَذْكُوْرِ مَعَ وُجُوْدِ عَقْلِ التَّكْلِيْفِ وَجَبَ الْاِنْكَارُ عَلَيْهِ۔

ترجمہ: ''یقین کیجئے شریعت کا ترازو جو زمین پر قائم کیا گیا ہے، وہی ہے جو علماءِ شریعت کے ہاتھوں میں ہے، پس جو ولی عقل وخرد اور ہوش وحواس کے سالم رہتے ہوئے میزان شریعت سے باہر نکلے، اس کا رد اور انکار واجب ہے''۔

(فتاویٰ نوریہ، جلد 5، ص:108 بحوالہ مقال العرفاء)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: لَابُدَّ مِنْ تَصْحِيْحِ ظَاهِرِ الشَّرِيْعَةِ اَوَّلًا وَآخِراً،

ترجمہ: ''اور یوں ہی اول وآخر ظاہر شریعت پر عمل پیرا رہنا ضروری ہے''۔

(فتاویٰ نوریہ، جلد 5، ص:108 بحوالہ اِحیاء العلوم)

حضرت سیدنا محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں:

كُلُّ حَقِيْقَةٍ رَدَّتْهَا الشَّرِيْعَةُ فَهِيَ زَنْدَقَةٌ

ترجمہ: ''ہر وہ حقیقت جس کو شریعت رد کرے، وہ بے دینی ہے (یعنی ایسا شخص زندیق

ہے)۔(فتاویٰ نوریہ، جلد 5، ص:108 بحوالہ فتوح الغیب)"۔

ان اکابر اولیاء وصوفیاء کرام کی تصریحات سے معلوم ہوا کہ خلافِ شرع عمل مردود ہے اور ولی کے لئے شریعت پر عمل پیرا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

اس تمہید کے بعد اصل مسئلے کی جانب آتے ہیں، اگر سائلین (مستفتیان) کا بیان درست ہے، تو سوالات کے ترتیب وار جوابات حسبِ ذیل ہیں، یہ امر واضح رہے کہ مفتی کا منصب قضا نہیں ہے، کیونکہ قضا میں دعوے کی صحت کو پرکھا جاتا ہے اور اس کے بعد حکم لگایا جاتا ہے اور وہ شخص کسی سزا کا حق دار ہے تو اسے سزا دی جاتی ہے، جبکہ مفتی کا منصب یہ ہے کہ سوال میں بیان کردہ موقف کو درست فرض کرتے ہوئے اس کا حکم بیان کردے، بیان کی قائل کی طرف نسبت صحیح ہے یا غلط، اس کا فیصلہ قاضی اور عدالت کا کام ہے اور اس کے ثبوت کی ذمّے داری سائلین پر عائد ہوتی ہے۔

1۔استفتاء میں سوال نمبر 1 کے ذیل میں جو پیر کا قول نقل کیا گیا ہے وہ سراسر کفر ہے کیونکہ وہ اس بات پر راضی ہے کہ ان کے مریدین ان کو سجدہ کریں اور چونکہ پیر کا کہنا یہ ہے کہ میرے اندر ان کو اللہ نظر آتا ہے، وہ اُس کو سجدہ کر رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ کو سجدہ چونکہ بندگی کی نیت سے کیا جاتا ہے، لہٰذا پیر کو "عَلٰی وَجْهِ الْعُبُوْدِیَّة" سجدہ کیا جارہا ہے جو کہ کفر وشرک ہے اور اس پر ایک واضح قرینہ مرید کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے سرکار پاک کے اندر ہے، اس لئے ان کو سجدہ کرتے ہیں۔اگر یہ سجدہ علی وجہ التعظیم ہو تب بھی حرام ہے اور صریح فسق ہے اور کوئی فاسق پیر نہیں ہوسکتا۔

2۔استفتاء میں سوال نمبر 2 کے ذیل میں پیر کا جو عقیدہ بیان کیا گیا ہے، وہ بھی صراحۃً کفر ہے۔پیر کے مریدین جو اپنے شیخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یارسول اللہ ﷺ! کہتے ہیں، وہ اپنے پیر کو (معاذ اللہ!) اللہ کا رسول سمجھتے ہیں، اس پر واضح دلیل خود پیر کا یہ قول ہے کہ یہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ مجھے اللہ کا رسول (معاذ اللہ!) اعتقاد کرتے ہیں، اگر یہ مریدین کا عقیدہ ہے تو باطل ہے اور پیر صاحب کا اس پر راضی ہونا اپنی رسالت کے مُدّعی ہونے کی

دلیل ہے جو کہ صریح کفر ہے۔

3۔حضرت آدم علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کی شریعت میں غیر خدا کو سجدۂ تعظیمی جائز تھا اور ایک روایت کی رُو سے ان کی حیثیت جہت سجدہ کی تھی ،جیسے بیت اللہ ہے ،لیکن شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں غیرِ خدا کے لئے سجدۂ تعظیمی ناجائز اور حرام ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے علم اور قدرت کے لحاظ سے ہر جگہ موجود ہے،یہ عقیدہ درست ہے،لیکن یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ موجود ہے،یہ کفر ہے،کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کا ''مُتَمَکِّنٌ فی المکان ''(یعنی کسی جگہ کا مکین ہونا) ہونا لازم آئے گا،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:از خدا ہیچ مکان خالی نیست یکفر ترجمہ:''اگر کوئی کہے کہ خدا سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے،وہ کافر ہو جائے گا،(فتاویٰ عالمگیری،جلد 2،ص:259)''۔

سجدہ جزءِ نماز ہے،نماز کے لئے طہارت شرط ہے،بیت الخلا نجس جگہ ہے،پیر کا یہ کہنا کہ بیت الخلا میں بھی سجدہ ہوسکتا ہے ،استخفافِ عبادت (یعنی عبادت کو ہلکا اور معمولی سمجھنا) ہے،جو کہ کفر ہے۔حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ :اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ نَھٰی اَنْ یُّصَلِّیَ فِی سَبْعَۃِ مَوَاطِنَ : فِی الْمَزْبَلَۃِ، وَالْمَجْزَرَۃِ ،وَالْمَقْبَرَۃِ ،وَقَارِعَۃِ الطَّرِیْقِ ،وَفِی الْحَمَّامِ ،وَفِیْ مَعَاطِنِ الْاِبِلِ ،وَفَوْقَ ظَھْرِ بَیْتِ اللّٰہِ ۔

ترجمہ:''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات مقامات پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا،(وہ یہ ہیں) گوبر یا کوڑے کا ڈھیر،ذبح خانہ (مذبح)،قبرستان، شارعِ عام،حمّام،اونٹوں کا باڑہ اور بیت اللہ کی چھت''۔

(سُنن ترمذی،رقم الحدیث:346)

ان سات مقامات میں سے بیت اللہ کی چھت پر نماز کی ممانعت تعظیم کے سبب ہے اور باقی مقامات پر نماز پڑھنا نجاست یا عام گزرگاہ ہونے کی وجہ سے خلافِ ادب ہے۔

4۔یہ دَجل (مکروفریب) ہے ،ہمارے ہاں یورپ کو ولایت کہا جاتا رہا ہے ،شاید یہ

مطلب ہو کہ اُس زمانے میں برصغیر اُن کے اقتدار و سلطنت کے ماتحت تھا، لیکن اس سے توریہ کرکے ''مقام ولایت'' سے تشبیہ دینا یہ زندقہ (بے دینی) ہے۔ تَورِیَہ، تعریض اور ایہام کے معنی ہیں کہ کسی لفظ کے دو معنی ہوں، ایک قریب اور مُتبادر الی الفہم (یعنی جو ظاہری معنی ہو اور کسی غور وفکر کے بغیر مخاطب کی سمجھ میں آجائے) اور دوسرا دور کا معنی ہو، بولنے والا مخاطَب کو قریب کے معنی یعنی عام فہم معنی کا تأثر دے اور خود دور کا معنی مراد لے۔

5۔سوال نمبر 5 کے ذیل میں جو پیر صاحب کا قادیانیوں کو مسلمان سمجھنا اور پوری روئے زمین سے کفر کے وجود کا انکار کرنا ہے، یہ بھی کفر صریح ہے۔ قادیانیوں کے کفر پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ پیر صاحب کا ان کو مسلمان سمجھنا پیر صاحب کے کفر کی دلیل ہے، نیز یہود و نصاریٰ، سکھ، ہندو وغیرہم سب کافر ہیں اور اس وقت روئے زمین پر یہ مذاہب موجود ہیں، پیر کا یہ کہنا کہ روئے زمین میں کوئی کافر نہیں ہے، کفر اور اسلام دونوں کو ایک سمجھنے کے مترادف ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(1)اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ،

ترجمہ: ''بے شک اہلِ کتاب میں سے جو کفار ہیں اور مشرکین ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں رہیں گے، (سورۃ البینہ:6)''۔

اہلِ کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کو کافر فرمایا ہے:

(2)لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ

ترجمہ: ''بے شک وہ لوگ کافر ہو گئے، جنہوں نے کہا کہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ تین میں سے تیسرا ہے، (المائدہ:73)''۔

(3)وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ وَ ہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ○

ترجمہ: ''اور جس نے اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو پسند کیا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا، (آلِ عمران:85)''۔

(4)اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ، ترجمہ: ''بے شک اللہ کے نزدیک (مقبول) دین،

اسلام ہی ہے۔(آلِ عمران:19)''۔

(5) لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ ۔ بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ O

ترجمہ:''بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم (علیہم السلام) کی زبان سے اس وجہ سے لعنت کی گئی کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ (دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی مقررہ) حد سے تجاوز کرتے تھے۔(المائدہ:78)''۔

(6) وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَأُولٰٓئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ O

ترجمہ:''اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پلٹ گیا (یعنی مرتد ہو گیا) اور وہ حالتِ کفر میں ہی مر گیا، تو اُن لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے، اور وہ جہنمی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔(البقرہ:217)''۔

ان آیاتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص دینِ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کی پیروی کرے گا، وہ کافر و مرتد ہے اور کافر کو کافر سمجھنا ہی اسلام ہے۔

مذکورہ پیر اور ان کے ان کفریات پر مطلع تمام مریدین شریعت اسلامیہ کی رُو سے کافر ہیں۔ مسلمانوں کا ان کے ساتھ تعلق رکھنا حرام ہے، اگر وہ اپنے کفریہ عقائد سے علانیہ توبہ کر لیں تو ان کی توبہ قبول کی جائے گی تجدیدِ ایمان کے بعد (اگر شادی شدہ ہیں تو تجدیدِ نکاح بھی ضروری ہے) ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا میل جول رکھنا جائز ہے۔آج کل ایک بات فیشن کے طور پر کہی جاتی ہے کہ مولویوں نے کوئی اسلام کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ کسی کو کافر کہے، مگر قرآن میں اللہ تعالیٰ نے، اس کے رسول مکرم ﷺ نے اپنے ارشاداتِ مبارکہ میں کافر کو کافر کہا اور خلیفۃ الرسول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منکرینِ زکوٰۃ اور منکرینِ ختمِ نبوت کو مرتد قرار دے کر ان کے خلاف جہاد کیا۔ یہاں پاکستان کی پارلیمنٹ نے 4 ستمبر 1974ء کو ساتویں آئینی ترمیم کے ذریعے قادیانیوں کو

مرتد قرار دیا۔اب قادیانیوں کو مسلمان کہنا پاکستان کے دستور سے بھی غداری ہے۔
خلاصۂ کلام یہ کہ کفر کا مطلقاً اور کفار کے وجود کا انکار اور کافر کو کافر نہ کہنا یہ بھی کفر ہے۔لیکن جب اسلامی حکومت کفر کے بارے میں غیر جانبدار ہو جائے اور دینی غیرت وحمیت سے عاری ہو جائے،تو پھر علماء حق کی یہ شرعی ذمہ داری ہے کہ حق کے حق ہونے اور باطل کے باطل ہونے کو واضح کریں اور حق کو ثابت کرنے کے لئے میدانِ عمل میں آئیں۔

مُتصوّفین کا ناجائز شِعار

سوال:08

پیر و مرشد کی آمد اور دورانِ تقریر و نعت پیر و مرشد کے گرد گھیرا ڈال کر جھومنا، تالیاں بجانا اور تالیوں کی گونج میں اللہ ہو کا نعرہ بلند کرنا کیسا ہے اور ایسی محافل میں شرکت کا کیا حکم ہے؟،(عبدالحمید قریشی،سعید آباد،بلدیہ ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

(عبادت کی نیت سے) تالیاں بجانا شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے،اور قرآن مجید میں بیت اللہ کے پاس تالیاں بجانے کو فعلِ کفار قرار دیا ہے،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَالْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً ط فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَo

ترجمہ:''اور بیت اللہ کے پاس اُن کی نماز اس کے سوا کیا تھی کہ یہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے،سو اب عذاب کو چکھو کیونکہ تم کفر کرتے تھے،(الانفال:35)''۔

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی لکھتے ہیں:

قرآن مجید نے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کی جو مذمت کی ہے،اِس میں اُن جاہل صوفیاء کا رد ہے،جو رقص کرتے ہیں،تالیاں پیٹتے اور بے ہوش ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں،(الجامع الاحکام القرآن،جز7،ص:359،دارالفکر،بیروت)''۔

شریعت مُطَہّرہ میں تالیاں بجانے کو مکروہ عمل فرمایا ہے،علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(وَكُرِهَ كُلُّ لَهْوٍ) أَيْ كُلُّ لَعِبٍ وَّعَبَثٍ،فَالثَّلَاثَةُ بِمَعْنًى وَاحِدٍ كَمَا فِيْ "شَرْحِ التَّأْوِيْلَاتِ"، وَالإِطْلَاقُ شَامِلٌ لِنَفْسِ الْفِعْلِ، وَاسْتِمَاعِهِ كَالرَّقْصِ وَالسُّخْرِيَةِ وَالتَّصْفِيْقِ وَضَرْبِ الْأَوْتَارِ مِنَ الطُّنْبُوْرِ وَالْبَرْبَطِ وَالرُّبَابِ وَالْقَانُوْنِ وَالْمِزْمَارِ وَالصَّنْجِ وَالْبُوْقِ، فَإِنَّهَا كُلَّهَا مَكْرُوْهَةٌ لِأَنَّهَا زِيُّ الْكُفَّارِ،

ترجمہ:''(ہر بیہودہ کھیل مکروہ ہے) یعنی ہر لہو ولعب اور عَبَث (بے مقصد کام) تینوں معنی ایک ہیں، جیسا کہ ''شرح التاویلات'' میں ہے۔لہو کو مطلق (یعنی کسی قید کے بغیر) ذکر کرنا نفسِ فعل اور اس کی توجہ سے سماعت کو شامل ہے، جیسے رقص کرنا، مذاق کرنا اور تالیاں بجانا، ڈھول بجانا، ستار بجانا، سارنگی بجانا، چنگ بجانا، قانون (ایک تار والا باجا) بجانا، مزامیر کا استعمال، جھانجھ (مجیرا) بجانا اور بگل بجانا، یہ سب مکروہ ہیں کیونکہ یہ عاداتِ کفار ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد9،ص:481،بیروت)

رقص کے متعلق امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''علامہ برکلی طریقہ محمدیہ میں فرماتے ہیں: يدخل فيهما مايفعله بعضُ الصوفيةِ بل هُو اَشدُّمن كل ما عداه منهما لِأَنَّهُم يَفعلونَهٗ عَلٰى اعتقادِ العبادةِ قَالَ الامامُ أبوالوفاءِ بن عقيل رَحِمَهُ اللّٰه تعالىٰ: قَد نَصَّ الْقُرآنُ عَلَى النَّهيِ عَنِ الرَّقْصِ فَقَالَ:﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا﴾وَذَمَّ الْمُختالَ بِقولهٖ : ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ وَالرَّقصُ اَشَدُّ مِنَ الْمَرَحِ وَالْبَطَرِ وَقَالَ أبو بكر الطرطوشي رَحِمَهُ اللّٰهُ تعالىٰ: فَاَوَّلُ مَنْ اَحْدَثَهٗ أصحابُ السَّامِرِيِّ لَمَّا اتَّخَذَلَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهٗ خُوَارٌ،وقَاموا يَرقُصونَ عَليهِ وَيَتَواجَدُونَ وَقَالَ الامامُ البزازى فى فَتاواهُ: قَال القُرطُبى:ان هٰذا۔۔۔ الرَّقصُ حَرَامٌ بِالْاِجماعِ وَسَيِّدُ الطَّآئفةِأحْمَدُ السَّنوى صَرَّحَ بِحُرمَتِهٖ وَرَأيتُ فَتوىٰ شَيخِ الْإِسلامِ جلال الملةوالدين الكيلانى اَنَّ مُستَحِلَّ هٰذاالرقصِ كَافِرٌ وَلِلزَّمخشرى فِى كَشَّافِهٖ كلماتٌ فيهم تقوم بها عليهم الطَّامات ولِلْأمام

المحبوبي اَشدُّ مِن ذٰلكَ اِنتهيٰ قلتُ: من لهٗ انصاف اِذارایٰ رَقصَ صُوفِيةِ زمانِنا فِي المساجدِ والدَّعواتِ مُختلِطاً بهم المردو أهلُ الهواءِ وَالقُرىٰ من جُهَّالِ العَوَامِ وَالمُبتَدِعةِ الطعَام لايعرِفون الطهارةَ والقرآن والحلال والحرام بل لَايعرِفونَ الايمانَ وَالِاسْلامَ لَهُم زَعيقٌ وَزئيرٌ مثل هائي وهوئي وهئي وهيا يقولُ لامحالةَ هٰؤلاءِ اِتَّخذُوا دينَهم لَهوا وَلَعباً۔مُلَخَّصًا۔

ترجمہ: ”جو کچھ بعض صوفیاء کرتے ہیں وہ اس میں داخل ہے بلکہ زیادہ سخت جرم ہے، کیونکہ یہ کام وہ عبادت کے عقیدے سے کرتے ہیں، چنانچہ امام ابوالوفا ابن عقیل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ناچنے سے منع کرنے پر قرآن مجید کی تصریح موجود ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”زمین پر اترا کر نہ چلو“۔اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے اترانے والوں کی مذمت فرمائی، بے شک اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا اور ناچنا، اِترانا، فخر کرنا ایک جیسے اعمال ہیں بلکہ ناچنا، اِترانے اور فخر کرنے سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔ابوبکر طرطوسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: سب سے پہلے جس نے اس بدعت کو ایجاد کیا، وہ اصحابِ سامری ہیں، جب انہوں نے بچھڑے کا ایک ڈھانچہ تیار کیا، جو گائے جیسی آواز نکالتا تھا یا جس سے گائے کی آواز کی طرح آواز نکلتی تھی، تو وہ کھڑے ہو کر اُس کے سامنے ناچنے لگے اور وَجد کرنے لگے یعنی جھومنے لگے۔ امام بزازی نے اپنے فتاویٰ بزازیہ میں فرمایا: ناچ بالاجماع حرام ہے۔سید الطائفہ احمد سنوی نے اس کی حرمت کی صراحت فرمائی ہے، میں نے شیخ الاسلام جلال الدین گیلانی کا فتویٰ دیکھا جس میں کہا گیا کہ ناچ کو حلال کرنے والا یعنی جائز قرار دینے والا کافر ہے۔علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر ”کشاف“ میں ان کے متعلق ایسے کلمات لکھے ہیں کہ جن سے ان (جاہل صوفیوں) پر بڑے مصائب قائم ہو سکتے ہیں اور امام محبوبی کے کلمات ان سے بھی زیادہ سخت ہیں، میں کہتا ہوں کہ جس کی طبیعت میں انصاف ہو، وہ ذرا ہمارے زمانے کے صوفیا کا مساجد میں ناچنا،

کودنا، شور مچانا دیکھے کہ بے ریش لونڈے خواہشات نفسانی کے متوالے، جاہل دیہاتی اور بیوقوف بدعتی ان میں ملے جلے ہوتے ہیں، جو طہارت سے ناآشنا، قرآن مجید کے ادب سے ناواقف اور حلال وحرام کی پہچان سے بے بہرہ ہوتے ہیں جو سوائے چیخنے چلانے کے اور کچھ نہیں جانتے، ایمان اور اسلام کی معرفت سے لاعلم ہوتے ہیں، فرمایا: ان لوگوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 24، ص:90-89، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

جہاں تک ایسی محافل میں شرکت کا معاملہ ہے تو فقہاء نے اسے بہت آسان انداز میں بیان فرما دیا ہے، علامہ ابن عابدین شامی "الجوہرہ" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

مَـا يَفْعَلُهُ مُتَصَوِّفَةُ زَمَانِنَا حَرَامٌ لايَجُوْزُ الْقَصْدُ وَالْجُلُوْسُ اِلَيْهِ، وَمِن قَبْلِهِمْ لَمْ يُفْعَلْ كَذَالِكَ،

ترجمہ: "ہمارے زمانے کے نمائشی (بناوٹی) صوفی جو کچھ کرتے ہیں، وہ حرام ہے، لہٰذا اس کا ارادہ کرنا اور ایسی مجلس میں بیٹھنا جائز نہیں اور ان سے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا گیا"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، ص:425، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

ہم نے اکابر امت کے حوالہ جات کے ساتھ مسئلہ بیان کر دیا ہے۔ ہمارے نزدیک دین کی تقدیس وحرمت، خشوع وخضوع، خشیتِ الٰہی اور آداب اسلامی کا تقاضا یہی ہے کہ ذکرِ الٰہی باوقار انداز میں کیا جائے۔ جو لوگ اس طرح کرتے ہیں، ان کے گرد وپیش کیسے لوگ ہوتے ہیں، پورے ماحول سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ تاہم اگر ان کے پاس کچھ دلائل ہیں تو بھی زیادہ سے زیادہ اباحت وجواز کی حد تک ہو سکتے ہیں، مسلمانوں کو اختلاف میں ڈالنے کے بجائے ایسے اعمال سے انہیں اجتناب کرنا چاہیے۔ آج کل میڈیا کے ذریعے نوجوانوں کے مخلوط رقص اور ڈسکو کو رائج کیا جا رہا ہے، اہلِ دین کا شعار اُن سے مختلف اور پاکیزہ ہونا چاہیے، جس سے لوگوں کے اندر خشیتِ الٰہی پیدا ہو، قلبی وذہنی سکون وقرار

نصیب ہو۔ جو حضرات اس موضوع پر مزید دلائل وحوالہ جات کا مطالعہ کرنا چاہیں ، وہ فتاویٰ رضویہ جلد 24، ص:90-89، جلد 4، ص:528، رضا فاؤنڈیشن ، لاہور ملاحظہ فرمائیں۔

تارکِ صلوٰۃ اور دینی شعائر کے ترک کا مطالبہ کرنے والی بیوی کا حکم

سوال:09

اگر بیوی شوہر سے ڈاڑھی منڈوانے کا مطالبہ کرے، تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟ میری بیوی نماز کی تلقین پر نماز پڑھنے لگی لیکن کبھی دو وقت کبھی تین وقت۔ ایک دن میں نے عشاء کی نماز کے متعلق تلقین کی کہ عشاء کی نماز لمبی ہے، پہلی فرصت میں پڑھ لیا کرو۔ اس پر بیوی نے جواب دیا کہ نماز پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایسی بیوی کے لئے کیا حکم ہے؟۔

ارمان نوشاد، محمد آباد 36/G لانڈھی، کراچی

جواب:

ڈاڑھی منڈوانا یا حد شرع سے کم کرنا حرام ہے اور کسی کی باتوں میں آکر یہ کام کرنا دین پر دنیا کو ترجیح دینے کے مترادف ہے۔ اسی طرح بیوی کے کہنے پر یا شادی کے لئے ڈاڑھی منڈوانا بھی حرام ہے۔ ڈاڑھی شعارِ اسلام ہے اور شعارِ اسلام سے اِستہزاء اسلام سے اِستہزاء (مذاق) ہے، آپ کی بیوی کا آپ سے ڈاڑھی منڈوانے کا مطالبہ اگر ڈاڑھی کی تحقیر کی نیت سے ہے، تو کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیکی کے کاموں میں تعاون اور برائی کے کاموں میں عدمِ تعاون کا حکم دیا ہے: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ،

ترجمہ: ''اور تم نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ:2)''۔ قرآن مجید کی سورۂ ''القلم'' میں ایک دشمن رسول کے مذموم اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا: مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ۔ ترجمہ: ''وہ نیکی کے کاموں سے بہت زیادہ روکنے

والا ہے،(سورۂ قلم:12)''۔

ایسی بیوی کو اللہ تعالیٰ کا خوف کرنا چاہئے اور اس عمل پر توبہ کرنی لازم ہے۔

تمام فرائض میں نماز نہایت اہم اور اعظم عبادت اور اسلام کا بنیادی رکن ہے۔قرآن مجید واحادیث میں اس کی اہمیت وفرضیت کی تاکید جابجا موجود ہے اور اِس کے ترک کرنے والوں کے لئے وعیدیں بھی آئی ہیں۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۝

ترجمہ:''پھران کے بعد ایسے ناخلف آئے جنھوں نے نمازیں ضائع کیں اور خواہشات کی پیروی کی تو عنقریب وہ جہنم کی ''وادیِ غَی''میں جاگریں گے،(سورۂ مریم:59)''۔

جو فرضیتِ نماز کا انکار کرے یا اِس کو حقیر جانے،اُس کے کفر میں کوئی شک نہیں۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(هِيَ فَرْضُ عَيْنٍ عَلٰى كُلِّ مُكَلَّفٍ) بِالْإِجْمَاعِ ---------- (وَيُكَفَّرُ جَاحِدُهَا) لِثُبُوتِهَا بِدَلِيلٍ قَطْعِيٍّ (وَتَارِكُهَا عَمْدًا مَجَانَةً) أَيْ تَكَاسُلًا فَاسِقٌ (يُحْبَسُ حَتّٰى يُصَلِّيَ) لِأَنَّهُ يُحْبَسُ لِحَقِّ الْعَبْدِ فَحَقُّ الْحَقِّ أَحَقُّ ،وَقِيلَ يُضْرَبُ حَتّٰى يَسِيلَ مِنْهُ الدَّمُ ۔وَعِنْدَ الشَّافِعِيِّ : يُقْتَلُ بِصَلَاةٍ وَّاحِدَةٍ حَدًّا ،وقِيلَ كُفْرًا

ترجمہ:''ہر مُکلّف (یعنی عاقل بالغ) پر بالاجماع نماز فرضِ عین ہے''---مزید لکھتے ہیں: ''جو شخص نماز کی فرضیت کا انکار کرے،وہ کافر ہے،نماز دلیلِ قطعی (یعنی قرآن سُنّت متوارثہ اور اِجماعِ تعامل سے ثابت ہے)،جو قصداً(جان بوجھ کر) نماز چھوڑے اگرچہ ایک وقت کی ہو،سُستی اور کاہلی کے سبب چھوڑنے والا فاسق ہے اور جو نماز نہ پڑھتا ہو اُسے قید کیا جائے گا یہاں تک کہ (توبہ کرے اور) نماز پڑھنے لگے،کیونکہ بندے کو بندوں کے حق کے بدلے میں قید کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا حق تو سب سے مُقدّم اور اعلیٰ ہے اور بعض (امام محبوبی) نے کہا کہ تارک الصلوٰۃ کو اس حد تک مارا جائے کہ اُس کا خون بہنے لگے

اور امام شافعی (نیز امام مالک اور امام احمد) کے نزدیک ایک نماز چھوڑنے کے سبب اس کو قتل کیا جائے گا، اور بعض نے کہا کہ اپنے کفر کے سبب حدِ شرع کے تحت قتل کیا جائے گا، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص: 7-6، بیروت)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

بَلْ يُسْتَحَبُّ لَوْ مُؤْذِيَةً أَوْ تَارِكَةً صَلَاةٍ ۔"غاية"۔ وَمَفَادُهُ أَنْ لَا إِثْمَ بِمُعَاشَرَةِ مَنْ لَا تُصَلِّيْ، وَيَجِبُ لَوْفَاتَ الْإِمْسَاكُ بِالْمَعْرُوْفِ،

ترجمہ: ''اگر عورت ایذا دینے والی ہے یا نماز کو ترک کرنے کی عادی ہے، تو (اُسے طلاق دینا) مستحب ہے، ''غایہ''۔ اور (اذیت پسند اور بے نمازی عورت کو طلاق دینے کو مستحب قرار دینے کا) مفاد یہ ہے کہ ایسی عورت کو ساتھ رکھنا گناہ نہیں ہے (اگر گناہ ہوتا تو طلاق واجب ہوتی، مستحب نہیں)، اگر دستور کے مطابق رکھنا مشکل یا ناقابلِ عمل ہو جائے تو پھر طلاق دینا واجب ہے''۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

اَلظَّاهِرُ أَنَّ تَرْكَ الْفَرَائِضِ غَيْرِ الصَّلَاةِ كَالصَّلَاةِ، وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ: لَأَنْ أَلْقَى اللّٰهَ تَعَالٰى وَصَدَاقُهَا بِذِمَّتِيْ خَيْرٌ مِنْ أَنْ أُعَاشِرَ اِمْرَأَةً لَا تُصَلِّيْ،

ترجمہ: ''نماز کے علاوہ دیگر فرائض کا ترک بھی نماز کی طرح ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: اللہ تعالیٰ سے میرا اس حال میں ملاقات کرنا کہ میری بیوی کا مہر میرے ذمے ہو، اس سے بہتر ہے کہ میں بے نمازی عورت سے معاشرت جاری رکھوں، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 316-315، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

علماء تو یہاں تک تصریح فرماتے ہیں کہ عورت اگر مارے سے بھی نماز نہ پڑھے، طلاق دے دے اگرچہ مہر دینے پر قادر نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے اس حال پر ملنا کہ اس کا مطالبۂ مہر اس کی گردن پر ہو اس سے بہتر ہے کہ ایک بے نمازی عورت سے صحبت کرے، فِی "الْغُنْيَة"

اَلزَّوْجُ لَهٗ اَنْ یَّضْرِبَ زَوْجَتَهٗ عَلٰی تَرْكِ الصَّلٰوةِ وَاِنْ لَّمْ تَنْتَهِ عَنْ تَرْكِهَا بِالضَّرْبِ يُطَلِّقُهَا وَلَوْ لَمْ يَكُنْ قَادِرًا عَلٰى مَهْرِهَا وَلِاَنْ يَّلْقَى اللّٰهَ تَعَالٰى وَمَهْرُهَا فِىْ ذِمَّتِهٖ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّطَأَ اِمْرَأَةً لَّاتُصَلِّىْ ۔

ترجمہ: ’’ غنیہ میں ہے: شوہر کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو نماز چھوڑنے پر مارے اور اگر مارنے کے باوجود وہ نماز چھوڑنے سے باز نہیں آتی تو طلاق دے دے، اگر چہ اس کو مہر کی ادائیگی پر قدرت نہ ہو کیونکہ اُس کا اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملنا کہ اس کی بیوی کا مہر اُس کے ذمہ پر ہو، اس سے بہتر ہے کہ ایسی عورت سے صحبت کرے جو نماز نہیں پڑھتی‘‘۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 17، ص:303، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

آپ کی بیوی کا یہ کہنا کہ نماز پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، یہ کلمۂ کفر ہے۔ اس پر لازم ہے کہ توبہ کرے، تجدیدِ ایمان کرے اور آپ دونوں دو گواہوں کے سامنے نئے مہر کے ساتھ ایجاب وقبول کر کے تجدیدِ نکاح کریں۔

امام احمد رضا قادری قدّس سرّہ العزیز ایسے ہی ایک مسئلے کی بابت شرعی حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ’’(عورت) حسبِ روایت مفتیٰ بہا اپنے مسلمان شوہر کے نکاح سے نہ نکلے گی، نہ اسے اختیار ہوگا کہ دوسرے سے نکاح کرے، ہاں! ان کے شوہروں کو جائز نہ ہوگا کہ انہیں ہاتھ لگائیں جب تک وہ تائب ہو کر پھر اسلام نہ لائیں‘‘۔

(فتاوٰی رضویہ قدیم، جلد:06، ص:45، مطبوعہ: مکتبۂ رضویہ، آرام باغ، کراچی)

سورج یا چاند گرہن کا حاملہ عورت پر کوئی طبعی اثر مرتب نہیں ہوتا

سوال:10

عوام میں یہ مشہور ہے کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت حاملہ عورت بیٹھے نہیں بلکہ چلتی پھرتی رہے، اسی طرح حاملہ جانور کو بھی سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت نہیں بیٹھنے دینا چاہیے، شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے؟۔

(مولانا محمد احمد ساجد، ریلوے روڈ بصیر پور ضلع اوکاڑہ)

جواب:

یہ خیال شرعاً بالکل باطل اور غلط ہے کہ سورج یا چاند گرہن کے موقع پر خواتین بالخصوص حاملہ خواتین پر کوئی اثرات مرتب ہوتے ہیں یا انہیں اُس وقت چلتے پھرتے رہنا چاہیے، اِن توہمات کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے، ہاں! خواتین کو بھی چاہیے کہ نماز، ذکر، توبہ واستغفار اور تسبیح وتحمید میں مشغول رہیں۔ اسی طرح حاملہ جانور کو بھی سورج گرہن یا چاند گرہن کے وقت کھڑا رکھنے یا چلاتے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

کیا مولودِ کعبہ ہونا حضرت علی کی امتیازی فضیلت ہے

سوال: 11

کیا حضرت علی کی جائے ولادت کعبۃ اللہ شریف ہے؟، اور کیا یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے امتیازی فضیلت کا سبب ہے؟، (حافظ بابر رحمان، نکیال، آزاد کشمیر)۔

جواب:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت اعلانِ نبوت سے قبل زمانۂ جاہلیت میں ہوئی۔ حکیم بن حزام کے متعلق بھی روایت مذکور ہے کہ وہ بھی کعبہ میں پیدا ہوئے۔ حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کے اسلام میں بے شمار فضائل ہیں، تمام اہلِ ایمان کو اُن سے انتہائی عقیدت اور محبت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت مبارکہ کعبہ میں ہوئی ہے، ایسی روایات موجود ہیں اور یہ عہدِ جاہلیت یعنی زمانۂ قبل از اسلام کا واقعہ ہے۔ اس میں آپ کا تفرّد نہیں ہے بلکہ روایات سے ثابت ہے کہ حکیم بن حزام کی ولادت بھی کعبہ میں ہوئی۔

امام حاکم نیشاپوری بیان کرتے ہیں: أَبُو بَكرٍ محمد بْنِ أَحْمَدَ بْنِ بَالُوَيْهِ حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ إِسْحَاقَ الْحَرْبِيُّ حَدَّثَنَا مُصْعَبُ بْنُ عَبْدِاللهِ فَذَكَرَ نَسَبَ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ وَزَادَ فِيهِ وَأُمُّهُ فَاخِتَةُ بِنْتُ زُهَيْرِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِالْعُزّٰى وَكَانَتْ وَلَدَتْ حَكِيمًا فِي الْكَعْبَةِ وَهِيَ حَامِلٌ فَضَرَبَهَا الْمَخَاضُ وَهِيَ فِي جَوْفِ الْكَعْبَةِ فَوَلَدَتْ فِيهَا، فَحَمَلَتْ فِي نَطْعٍ

وَغَسَلَ مَاكَانَ تَحْتَهَا مِنَ الثِّيَابِ عِنْدَ حَوْضِ زَمْزَمَ وَلَمْ يُوْلَدْ قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ فِي الْكَعْبَةِ اَحَدٌ ☆ قَالَ الْحَاكِمُ وَهِمَ مُصْعَبٌ فِي الْحَرْفِ الْاٰخِيْرِ فَقَدْ تَوَاتَرَتِ الْاَخْبَارُ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ اَسَدٍ وَلَدَتْ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيَّ بْنَ اَبِي طَالِبٍ كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهُ فِي جَوْفِ الْكَعْبَةِ ۔

ترجمہ: ''مصعب بن عبداللہ نے بیان کیا: انہوں نے حکیم بن حزام کا نسب بیان کیا اور اس میں یہ زیادہ فرمایا کہ ان کی والدہ فاختہ زہیر بن اسد بن عبدالعزیٰ کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے حکیم کو کعبہ میں جنم دیا۔ وہ حاملہ تھیں، اُنہیں دردِ زہ ہوا، وہ وسطِ کعبہ میں تھیں، انہوں نے وہیں اسے جنم دیا۔ اس نے اُنہیں چمڑے میں لپیٹ کر اٹھایا اور اپنے کپڑے زمزم کے کنویں پر دھوئے۔ اُن سے پہلے اور ان کے بعد کوئی کعبہ میں پیدا نہیں ہوا۔ حاکم نے کہا: مصعب کو آخری جملے میں وہم ہو گیا، حالانکہ یہ روایات تواتر کے ساتھ منقول ہیں کہ فاطمہ بنت اسد نے امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو وسطِ کعبہ میں جنم دیا''۔

(المستدرک للحاکم، جلد 3، ص: 483)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

واز مناقب وے رضی اللّٰہ عنہ کہ در حینِ ولادتِ او ظاہر شد، یکے آں است کہ در جوفِ کعبہ معظمہ تولد یافت، قَالَ الْحَاكِمُ فِي تَرْجَمَةِ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ: وَقَوْلُ مُصْعَبٍ فِيْهِ لَمْ يُوْلَدْ قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ فِي الْكَعْبَةِ اَحَدٌ، مَانَصُّهُ حَاكِمٌ وَهِمَ مُصْعَبٌ فِي الْحَرْفِ الْاٰخِيْرِ، فَقَدْ تَوَاتَرَتِ الْاَخْبَارُ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ اَسَدٍ وَلَدَتْ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيًّا فِي جَوْفِ الْكَعْبَةِ۔

ترجمہ: ''اور اُن (حضرت علی) کے مناقب سے ایک یہ بات ہے جو اُن کی ولادت کے وقت ظاہر ہوئی کہ اُن کی ولادت کعبہ معظمہ میں ہوئی۔ حاکم نے حکیم بن حزام کے حالات کے بارے میں کہا کہ: مصعب کا یہ کہنا کہ ''حکیم بن حزام سے نہ کوئی پہلے کعبہ میں پیدا ہوا اور

نہ اس کے بعد''، یہ مُصعب کا وہم ہے، کیونکہ تواتر روایات سے ثابت ہے کہ فاطمہ بنت اسد نے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو وسطِ کعبہ میں جنم دیا''۔

(اِزالۃ الخفاء عن خلافہ الخلفاء، جلد 2، ص: 251)

رسول اللہ ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ اگر یہ بات وجہِ فضیلت ہوتی اور خانۂ کعبہ میں ولادت حُرمتِ کعبہ کے منافی نہ ہوتی تو اعلانِ نبوت کے بعد عہدِ رسالت مآب ﷺ میں مسلمان خواتین یہ اعزاز حاصل کرنے کے لئے اپنے بچوں کی ولادت کے وقت خانہ کعبہ میں جاتیں۔ مگر خانہ کعبہ کی تقدیس کی وجہ سے شرعی حکم یہ ہے کہ حیض ونفاس اور جنابت کی حالت میں خانۂ کعبہ کا طواف منع ہے۔ اگر کوئی حیض یا نفاس والی عورت یا مرد جنابت کی حالت میں طوافِ زیارت کرے تو اِس جنایت کے نتیجے میں اُس پر بدنہ یعنی اونٹ یا گائے کی قربانی واجب ہے۔

ہمارے علماء میں سے مفتی اقتدار احمد خان نعیمی نے اپنے دلائل سے اس واقعہ کا انکار کیا ہے۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے، نہ ہی یہ بحث ضروریاتِ دین میں سے ہے اور عہدِ جاہلیت کا ہر عمل شرعی حجت بھی نہیں ہے۔ اور ہمارے نزدیک اس واقعے سے قطعِ نظر بھی اسلام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظمت مُسلّم ہے، اُن سے عقیدت ہمارے ایمان کا حصہ ہے، اُن کا چوتھا خلیفۂ راشد ہونا برحق ہے۔ اور ان کے بعض امتیازی فضائل ہیں: وہ نسلِ نبوت کے امین ہیں، رسول اللہ ﷺ کے ابنِ عم، آپ ﷺ کے داماد، آپ ﷺ کے پروردہ اور آپ ﷺ کے محبوب ترین اہلِ بیت اور انتہائی جلیل القدر صحابی ہیں۔ آپ کے خصائص میں سے یہ ہے کہ آپ اَورع واتقی، اَشجع اور اَعلم صحابہ میں سے ہیں۔

علماء کی اہانت

سوال: 12

زید نے عصرِ حاضر کے علماء کے بارے میں کہا کہ'' ان مولویوں پر کوئی اعتبار

نہیں''۔ زید کا یہ قول جملہ علمائے کرام کے بارے میں از روئے شرع کیسا ہے اور زید کا جملہ علماءِ کرام پر عدمِ اعتماد کس نوع کی غلطی شمار ہو گی؟۔ (عبدالرزاق عباسی، کراچی)۔

جواب:

علماء کا اِکرام شریعت کی رُو سے لازم ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ محض دین کا عالم ہونے کی بنا پر اُن کا اکرام کیا جائے اور یہ بالواسطہ دین کا اکرام ہے اور اگر کوئی عالمِ ربانی ہے، عالمِ حق ہے، علم کے تقاضوں اور شریعت کے احکام پر عمل کرتا ہے، تو اس کا اِکرام اس کی ذات اور کردار کے حوالے سے بھی لازم ہے، اور جو شخص ایسے علماء کی توہین کرتا ہے، اس کے فِسق و فُجور اور گمراہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

عالمِ دین کی اہانت کو فقہائے کرام نے کفر قرار دیا ہے اور اس پر بڑی شدت فرمائی ہے، شاید یہ زجراً کیا ہے تاکہ لوگ عالمِ ربّانی کی اہانت (INSULT) بے دھڑک نہ کرتے پھریں، کیونکہ اس سے بالواسطہ علمِ دین کی توہین ہو گی اور علمِ دین کی توہین بالواسطہ دین کی توہین ہے۔ لیکن ہماری رائے میں یہ ''کلامی'' اور ''اعتقادی'' کفر نہیں ہے، جو اس درجہ قطعی ہو کہ ''مَنْ شَكَّ فِيْ كُفْرِهٖ فَقَدْ كَفَرَ'' (یعنی جو ایسے شخص کے کفر میں شک کرے، وہ بھی کافر ہے) کے درجے میں ہو۔

علماء کی اہانت (Insult) کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اہانت صرف اس لئے کی جا رہی ہے کہ وہ شخص دین کا عالم ہے، دراصل یہ بالواسطہ دین کی اہانت ہے۔ یہ طریقۂ کار وہ لوگ اختیار کرتے ہیں، جو مسلم معاشرے میں براہِ راست دین کی اہانت کی جسارت نہیں کر سکتے، انہیں مسلمانوں کے رَدِّعمل کا خوف ہوتا ہے تو دین کے بارے میں اپنے باطنی بُغض و عناد اور نفرت کی تسکین عالمِ دین کی اہانت کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہ دین میں ایک سنگین جرم ہے علامہ نظام الدین رحمہ اللہ ''خلاصہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں: مَنْ اَبْغَضَ عَالِماً مِنْ غَيْرِ سَبَبٍ ظَاهِرٍ خِيْفَ عَلَيْهِ الْكُفْرَ

ترجمہ: ''جس نے کسی ظاہری سبب کے بغیر کسی عالم سے بغض رکھا، اُس کے کفر کا اندیشہ ہے،''البحر الرائق'' کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

وَيُخَافُ عَلَيْهِ الْكُفْرَ اِذَاشَتَمَ عَالِمًا أَوْ فَقِيْهًا مِنْ غَيْرِ سَبَبٍ،

ترجمہ: ''جب کوئی شخص کسی عالم یا فقیہ کو بلا وجہ گالی دے، تو اس کے کفر کا اندیشہ ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2 ص: 270)

یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص نماز یا داڑھی کو براہِ راست اپنی تضحیک اور تحقیر کا نشانہ بنانے کی جسارت نہیں کرسکتا، تو وہ یوں کہے گا کہ فلاں شخص نماز پڑھ کر یا ڈاڑھی رکھ کر ایسے کام کر رہا ہے، حالانکہ اُس کے کسی غلط فعل کے ساتھ نماز یا ڈاڑھی کی مذمت کا کوئی جواز نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی کسی عالم سے ذاتی نفرت وعناد اور بغض کی بنا پر یا اُس کے شخصی کردار میں کسی عیب پر مطلع ہونے کی بنا پر اُس کی اہانت کرتا ہے یا اس عالم کی بے اعتدالی بالکل عَلانیہ ہو کہ وہ اپنے علم کے تقاضوں پر عمل نہیں کرتا ہو یا اس کے قول وفعل میں تضاد ہے تو ایسے عالم کی اہانت کرنے والا اس تکفیر کا مصداق نہیں ہے۔ کیونکہ ہر دور میں ''علماءِ حق'' بھی رہے ہیں اور ''علماءِ سُوء'' بھی، ایسی باتوں کو ہمیں ''علماءِ سُوء'' پر محمول کرنا چاہئے۔ اس سے وہ علماء مراد ہیں جو زمانہ ساز، ابن الوقت ہوں، محض دنیاوی منفعت کے لئے دین کے صریح حکم کو چھوڑ دیں یا دین کی مصلحت وحکمت کے خلاف کام کریں۔ دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کے لئے اہلِ دنیا یا اہلِ اقتدار کی بے اعتدالیوں کو سندِ جواز دینے کی خاطر طرح طرح کی تاویلیں کرکے باطل کی حمایت کریں، جسے قرآن مجید نے ''مُداہنت'' (Flattery) سے تعبیر فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ،

ترجمہ: ''وہ (مشرک) چاہتے ہیں کہ (دین کے معاملے میں) آپ ان کی بے جا رعایت کریں تاکہ وہ بھی (اس کے بدلے میں) آپ کے ساتھ رعایت کریں، (القلم: 9)''۔

آج کل علماء کے بارے میں اہانت آمیز تبصرے ایسے ہی لوگوں کی مثالوں کو سامنے رکھ کر

کیے جاتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک ناپسندیدہ رجحان ہے اور اس سے بچنا چاہئے، یہ طرزِ عمل دینی سعادت سے محرومی کا باعث بن سکتا ہے، دوسروں کے کردار پر انگلی وہ اُٹھائے جس کا اپنا دامن صاف ہو، اس پر بدکرداری، بے عملی اور بے اعتدالی کا کوئی دھبّہ نہ ہو۔ قرآنِ مجید کی ''سورۂ الحُجرات'' میں دوسروں کا مذاق اُڑانے، دوسروں کو بُرے ناموں سے پکارنے، دوسروں کے بارے میں بدگمانی کرنے اور غیبت سے منع فرمایا ہے۔ ''سورة الهُمَزه'' میں دوسروں کی عیب جوئی اور طعن و تشنیع کرنے پر وعید فرمائی گئی ہے، لہٰذا یہ عادات اسلام میں انتہائی معیوب اور قبیح ہیں اور ہر مسلمان کو اِن سے اجتناب کرنا چاہئے۔ دوسروں کے عیب تلاش کرنے کے بجائے اپنے عیوب پر نظر رکھنا انسان کے لئے زیادہ مفید ہے اور اِس سے اپنی اِصلاح ہوتی ہے، بقولِ شاعر ؎

نہ تھی حال کی جب اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی حال پر جب اپنے نظر، تو نظروں میں کوئی برا نہ رہا

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

لَایَسْتَخِفُّ بِحَقِّهِمْ اِلَّا مُنَافِقٌ رَوَاهُ الطَّبرانی فِي الكبيرِ عَنْ أَبی اُمَامَة رَضِيَ اللّٰهُ تعالىٰ عَنْهُ،

ترجمہ: ''علماء (کے حق) کو ہلکا نہ جانے گا مگر منافق (طبرانی نے کبیر میں ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسے روایت کیا)''۔

دوسری حدیث میں ہے: فرماتے ہیں ﷺ: لَایَسْتَخِفُّ بِحَقِّهِمْ اِلَّا مُنَافِقٌ بَیِّنُ النِّفَاقِ۔ رَوَاهُ اَبُو الشَّیخِ فِی التَّوبِیخِ عَنْ جَابِرِ بنِ عبدِاللّٰهِ الْاَنصارِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعالیٰ عَنهُما۔

ترجمہ: ''اُن کے حق کو ہلکا نہ سمجھے گا مگر کھلا منافق (اسے ابوالشیخ نے التوبیخ میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا)۔

اور فرماتے ہیں ﷺ:

لَیسَ مِنْ اُمَّتِی مَنْ لَّمْ یعرِفْ لِعَالِمِنَا حَقَّهٗ،رَوَاهُ أحمدُ وَالحاکِمُ وَالطَّبرانی فی الکبیرِ عَنْ عُبادَۃَ بنِ الصَّامتِ رَضِی اللّٰهُ تَعالیٰ عَنْهُ۔

ترجمہ:''جو ہمارے عالم کا حق نہ پہچانے وہ میری امت سے نہیں۔(اسے احمد، حاکم اور طبرانی نے معجم کبیر میں عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا)۔پھر اگر عالم کو صرف اس لئے برا کہتا ہے کہ وہ عالم ہے، جب تو صریح کافر ہے اور اگر بوجہ علم اس کی تعظیم فرض جانتا ہے مگر اپنی دنیاوی خصومت (اختلاف) کے باعث برا کہتا ہے، گالی دیتا ہے، تحقیر کرتا ہے تو سخت فاسق وفاجر ہے۔اور اگر بے سبب رنج رکھتا ہے تو مریضُ القلب خبیثُ الباطن ہے اور اُس کے کفر کا اندیشہ ہے۔خلاصہ میں ہے:مَنْ اَبْغَضَ عَالِماً مِنْ غَیرِ سَبَبٍ ظَاهِرٍ خِیفَ عَلَیهِ الْکُفرَ

ترجمہ:''جو کسی عالم سے کسی ظاہری سبب کے بغیر عداوت رکھتا ہے، اس کے کفر کا اندیشہ ہے۔منح الروض الازہر میں ہے اَلظَّاهِرُ اَنَّهٗ یُکَفَّرُ(ظاہر یہ ہے کہ وہ کافر ہو جائے گا)۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 21، ص:129، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:عوام پر علمائے دین کا ادب باپ سے زیادہ فرض ہے۔رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:ثَلٰثَةٌ لَا یَسْتَخِفُّ بِحَقِّهِمْ اِلَّا الْمُنَافِقُ بَیِّنُ النِّفَاقِ ذُوالشَّیبَةِ فِی الْاِسْلَامِ وَالْاِمَامُ الْمُقْسِطُ ومُعَلِّمُ الْخَیرِ۔رَوَاهُ أبو الشیخ فِی التوبیخ عَنْ جابرٍ والطَّبرانی فِی الکبیرِ بِسَنَدٍ حَسَنٍ عَنْ أبی اُمامۃَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعالیٰ عنهما۔

ترجمہ:''تین شخص ہیں جن کے حق کو ہلکا نہ جانے گا مگر منافق جس کا نفاق واضح ہو، ان اشخاص میں ایک بوڑھا مسلمان، دوسرا عادل حکمران، تیسرا وہ شخص جو لوگوں کو نیکی کے کاموں کی تعلیم دے۔(اس کو ابوالشیخ نے التوبیخ میں حضرت جابر سے اور طبرانی نے معجم کبیر میں سندِ حسن کے ساتھ ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا)۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 25، ص:216، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز سے سوال کیا گیا: ''بعض جدید تعلیم یافتہ لوگ کہتے ہیں: مولوی لوگ کیا جانتے ہیں، کیا اس لفظ سے علم کی حقارت نہیں ہوئی؟''، آپ نے جواب میں لکھا: یہ لفظ کہ ''مولوی لوگ کیا جانتے ہیں''، اس سے ضرور علماء کی تحقیر نکلتی ہے اور علمائے دین کی تحقیر کفر ہے''۔

ایک اور مقام پر سوال کیا گیا کہ: ''اگر کوئی شخص غضبناک ہوکر علماء کی توہین اور حقارت کرے اور کہے کہ عالم لوگوں نے دیس خراب کردیا ہے''، آپ نے جواب میں لکھا: علمائے دین کی توہین کفر ہے، مجمع الانہر میں ہے:

مَنْ قَالَ لِعَالِمٍ "عُوَيْلِمٌ" عَلٰى وَجْهِ الْإِسْتِخْفَافِ فَقَدْ كَفَرَ،

ترجمہ: ''جس نے بے ادبی کرتے ہوئے عالم کو عُوَیلِم کہا، اُس نے کفر کیا''۔ اُس شخص پر تجدیدِ اسلام لازم ہے اور اس کے بعد اپنی عورت سے نکاحِ جدید کرے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 14، ص:ص:244-605، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

''عُوَیلِم'' عربی زبان میں تصغیر (Minimization) کا صیغہ ہے، تصغیر کی وضع اس مقصد کے لئے ہے کہ اس کلمے کے اصل ماخذ یا مصدر کے جو معنی ہیں، اس صیغے کے ذریعے انہیں کم تر یا کمترین درجے میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ ''عُوَیلِم'' کے معنی ہیں: چھوٹا سا یا معمولی سا یا بے توقیر سا عالم، جیسے پنجابی زبان میں لفظ مولوی کی تصغیر کرکے ''مُلوَنٹا'' کہتے ہیں، یا اُردو میں کھاٹ کی جگہ ''کھٹیا'' کہہ دیتے ہیں۔

طہارت کے مسائل

غسلِ مسنون کا طریقہ

سوال:13

شرعاً غسل کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟، (جہانگیر عالم، کراچی)۔

جواب :

طہارت کی دو قسمیں ہیں: (۱) طہارتِ صغریٰ (۲) طہارتِ کبریٰ، جن چیزوں سے صرف وضو لازم آتا ہے، اُنہیں حَدَثِ اصغر کہتے ہیں اور جن سے غسل واجب ہو جائے اُنہیں حَدَثِ اکبر کہتے ہیں۔ جو غسل حَدَثِ اکبر کے ازالے کے لئے ہوتا ہے، اُسے ''طہارتِ کُبریٰ'' کہا جاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاِنۡ کُنۡتُمۡ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوۡا،

ترجمہ: ''اور اگر تم جنبی ہو تو اچھی طرح پاکیزگی حاصل کرلو، (المائدہ:6)''۔

ایک غسل حَدَثِ اصغر کے ازالے اور جسمانی طہارت کے لئے ہوتا ہے، جو حضور نبی کریم ﷺ کی سنت کی نیت سے کیا جاتا ہے باعثِ اجر ہے۔ جب غسل جنابت یا حَدَثِ اکبر کے ازالے کے لئے کیا جائے تو مَضمَضہ (کلی) اور اِسۡتِنۡشَاق (ناک میں پانی ڈالنا) فرض ہے۔ اور اگر غسل محض جسمانی پاکیزگی کے لئے کیا جائے یا حَدَثِ اصغر کے لئے کیا جائے تو مَضمَضہ اور اِسۡتِنۡشَاق سنت ہے۔

غسل کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ غسل اس طرح کیا جائے، جس میں سارے فرائض، سُنَن اور مُستَحبات کی رعایت ہو اور ممنوعات سے اجتناب کیا جائے۔ حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ کے غسل فرمانے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے:

عَنۡ عَائِشَةَ زَوۡجِ النَّبِيِّ ﷺ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ: كَانَ إِذَا اغۡتَسَلَ مِنَ الۡجَنَابَةِ، بَدَأَ فَغَسَلَ يَدَيۡهِ، ثُمَّ تَوَضَّأَ كَمَا يَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ، ثُمَّ يُدۡخِلُ أَصَابِعَهُ فِي الۡمَاءِ، فَيُخَلِّلُ بِهَا

أُصُولَ شَعْرِهِ،ثُمَّ يَصُبُّ عَلٰى رَأْسِهٖ ثَلَاثَ غُرَفٍ بِيَدَيْهِ ،ثُمَّ يُفِيْضُ الْمَاءَ عَلٰى جِلْدِهٖ كُلِّهٖ ۔

ترجمہ:''اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب جنابت کا غسل فرماتے تو پہلے اپنے ہاتھوں کو دھوتے ، پھر اس طرح وضو فرماتے ، جس طرح نماز کا وضو کرتے تھے ، پھر اپنی انگلیاں پانی میں داخل کر کے بالوں کی جڑوں میں خلال کرتے پھر اپنے ہاتھوں سے تین چلّو پانی لے کر سر پر بہاتے ، پھر اپنے تمام جسم پر پانی بہاتے ،(صحیح بخاری، رقم الحدیث:248)''۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی لکھتے ہیں:فَرْضُ الْغُسْلِ : اَلْمَضْمَضَةُ، وَالْاِسْتِنْشَاقُ ،وَغَسْلُ سَائِرِ الْبَدَنِ،

ترجمہ:''غسل کے فرائض میں مَضمَضہ (اس طرح کلی کرنا کہ پانی منہ کے سارے اندرونی حصے تک پہنچ جائے)،استنشاق (ناک کے نرم گوشے تک پانی پہنچانا اور سانس کے ذریعے اندر تک پانی چڑھانا)اور تمام بدن پر (تین مرتبہ) پانی بہانا ہے''۔۔۔۔۔۔آگے چل کر غسل کا مسنون طریقہ لکھتے ہیں:وَسُنَّتُهٗ أَنْ يَبْدَأَ الْمُغْتَسِلُ ،فَيَغْسِلُ يَدَيْهِ وَفَرْجَهٗ، وَيَزِيْلُ النَّجَاسَةَ اِنْ كَانَتْ عَلٰى بَدَنِهٖ ،ثُمَّ يَتَوَضَّأُ وَضُوْءَهٗ لِلصَّلَاةِ اِلَّا رِجْلَيْهِ ،ثُمَّ يُفِيْضُ الْمَاءَ عَلٰى رَأْسِهٖ وَسَائِرِ جَسَدِهٖ ثَلَاثاً ،ثُمَّ يَتَنَحّٰى عَنْ ذٰلِكَ الْمَكَانِ، فَيَغْسِلُ رِجْلَيْهِ،هٰكَذَا حَكَتْ مَيْمُوْنَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اِغْتِسَالَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، وَاِنَّمَا يُؤَخِّرُ غَسْلَ رِجْلَيْهِ لِأَنَّهُمَا فِيْ مُسْتَنْقَعِ الْمَاءِ الْمُسْتَعْمَلِ فَلَا يُفِيْدُ الْغَسْلُ حَتّٰى لَوْ كَانَ عَلٰى لَوْحٍ لَا يُؤَخِّرُ وَاِنَّمَا يَبْدَأُ بِاِزَالَةِ النَّجَاسَةِ الْحَقِيْقِيَّةِ كَيْلَا تَزْدَادَ بِاِصَابَةِ الْمَاءِ ۔

ترجمہ:''غسل کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے غسل کرنے والا اپنے دونوں ہاتھ اور

شرمگاہ کو دھوئے اور اگر بدن پر (کوئی ظاہری) نجاست ہو تو نجاست زائل کرے، پھر وضو کرے جیسا نماز کے لئے وضو کرتے ہیں اور دونوں پاؤں نہ دھوئے، پھر اپنے سر پر پانی بہائے اور پھر تمام بدن پر تین بار پانی بہائے، پھر اُس جگہ سے ہٹ کر دونوں پاؤں دھولے۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے غسل فرمانے کا طریقہ اِسی طرح بیان فرمایا اور دونوں پاؤں تاخیر سے (آخر میں) دھونے کا حکم اس لئے ہے کہ دونوں پاؤں غسل میں استعمال شدہ پانی جمع ہونے کی جگہ پر ہیں، اس لئے اُن کا دھونا مفید نہ ہوگا، ہاں! اگر کسی تختہ (یا اونچی جگہ) پر ہو تو پھر وضو کے وقت پاؤں بھی دھو لئے جائیں، پاؤں کے دھونے کو موٴخر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نجاستِ حقیقیہ زائل کرنے کے ساتھ ابتدا کرے تاکہ پانی پہنچ کر بڑھ نہ جائے (یعنی پانی کے ذریعے اس نجاست کا اثر باقی بدن تک تک نہ پہنچے)، (ہدایہ، جلد 1، ص:45-44)"۔

الغرض غسل کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ پہلے سنت کے مطابق باقاعدہ وضو کریں اور پھر پورے بدن پر پانی ڈالیں۔ غسلِ جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں اندر تک پانی ڈالنا فرض ہے، غسلِ طہارت اور غسلِ مسنون میں یہ دونوں امور فرض نہیں بلکہ سنت ہیں۔

ستر کھولنے سے وضو نہیں ٹوٹتا

سوال:14

غسل کے ساتھ جو وضو کیا جاتا ہے، کیا وہ وضو نماز کی ادائیگی اور تلاوتِ قرآن کے لئے کافی ہے یا دوبارہ وضو کرنا ہوگا؟۔ اسی طرح وضو کی حالت میں اگر کپڑے تبدیل کرتے ہیں تو کیا وضو قائم رہتا ہے؟، (محمد ابدال، نارتھ کراچی)۔

جواب :

غسلِ مسنون ہو یا فرض، تلاوتِ قرآنِ کریم اور نماز وغیرہ کی ادائیگی کے لئے دوبارہ وضو کرنا ضروری نہیں ہے اگر چہ برہنہ ہی غسل کیا ہو، یہی وضو کافی ہے۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ برہنہ ہونے کے سبب وضو ٹوٹ جاتا ہے، یہ خیال درست نہیں ہے۔ جب تک جسم سے کسی نجاست کا اخراج نہ ہو، وضو قائم رہتا ہے۔ شرعاً غسل کا نام طہارتِ کبریٰ ہے اور وضو کو طہارتِ صغریٰ کہا جاتا ہے۔ جب طہارتِ صغریٰ سے نماز ادا ہوسکتی ہے تو طہارتِ کبریٰ سے بدرجۂ اولیٰ ادا کی جاسکتی ہے۔ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

''عوام میں جو مشہور ہے کہ گھٹنا یا ستر کھلنے یا اپنا، پرایا ستر دیکھنے سے وضو جاتا رہتا ہے، محض بے اصل بات ہے۔ ہاں! وضو کے آداب سے ہے کہ ناف سے زانو کے نیچے تک سب ستر چھپا ہو بلکہ استنجا کے بعد فوراً ہی چھپالینا چاہئے کہ بغیر ضرورت ستر کھلا رہنا منع ہے اور دوسروں کے سامنے ستر کھولنا حرام ہے، (بہارشریعت، حصہ دوم، ص:95)''۔

حالتِ اعتکاف میں غسلِ مسنون کا حکم

سوال:15

رمضان المبارک کے آخری عشرے کے اعتکاف کے دوران جمعۃ المبارک یا غسلِ مسنون کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟۔

(محمد امیر ممتازی، فیڈرل بی ایریا، گوہرآباد، کراچی)

جواب:

تفہیم المسائل کی جلد سوم میں ہم نے اس مسئلے پر یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ''معتکف کے لئے غسلِ جنابت کے علاوہ غسلِ مسنون یا غسلِ تبرید (یعنی ٹھنڈک

حاصل کرنے کے لئے غسل کرنے کی خاطر) مسجد سے نکلنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ شرعی ضرورت نہیں ہے''۔لیکن اب مطالعے کے دوران نئے فقہی حوالے اور فقہاءِ کرام کی آراء سامنے آئیں، جن میں انہوں نے معتکف کو غسل واجب کے علاوہ نفلی غسل کی بھی رخصت دی ہے، اس لئے ہم نے بھی رائے تبدیل کر لی ہے اور اسے پہلی رائے سے رجوع سمجھا جائے۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَحَرُمَ عَلَيْهِ)أَيْ عَلَى الْمُعْتَكِفِ اِعْتِكَافاً وَاجِباً، أَمَّاالنَّفلُ فَلَهُ الْخُرُوْجُ لِأَ نَّهُ مُنْهٍ لَّهُ لَا مُبْطِلٌ كَمَا مَرَّ (اَلْخُرُوْجُ اِلَّا لِحَاجَةِ الْإِنْسَانِ)طَبِيْعِيَّةً كَبُوْلٍ وَّغَائِطٍ وَّغُسْلٍ لَوِاحْتَلَمَ لَا يُمْكِنُهُ الْإِغْتِسَالُ فِي الْمَسْجِدِ، كَذَافِي "النَّهْرِ" (أَوْ)شَرْعِيَّةً كَعِيْدٍ وَاَذَانٍ لَوْ مُؤَذِّناً وَبَابُ الْمَنَارَةِ خَارِجُ الْمَسْجِدِ،

ترجمہ:''اور واجب اعتکاف کرنے والے کے لئے شرعی یا طبعی حاجت کے بغیر مسجد سے نکلنا حرام ہے، لیکن نفلی اعتکاف والے کے لئے نکلنا جائز ہے، کیوں کہ مسجد سے نکلنا نفلی اعتکاف کو مکمل کر دیتا ہے باطل نہیں کرتا۔ طبعی حاجت میں پیشاب، پاخانہ اور غسلِ واجب شامل ہے، جبکہ اس کے لئے (مسجد کو نجاست سے آلودہ کئے بغیر) مسجد میں غسل کرنا ممکن نہ ہو، ''النھر'' میں اسی طرح ہے۔ حاجتِ شرعی سے مراد جیسے مؤذن کا اذان دینے کے لئے نکلنا، اگرچہ منارہ کا دروازہ مسجد سے باہر ہو، وغیرہ، (ردالمحتار، جلد:3، ص:88-387)''۔ پس ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے غسل کی خاطر معتکف کو مسجد سے نکلنا جائز نہیں ہے۔ اس مسئلے پر ہم نے مزید تحقیق اور غور و فکر کا سلسلہ جاری رکھا اور اب ہماری رائے میں غسلِ مسنون کی خاطر معتکف کے لئے مسجد سے نکلنا جائز ہے۔ شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی

صاحب مدّظلہم نے بھی شرح صحیح مسلم میں معتکف کے لئے غسلِ مسنون کی خاطر مسجد سے نکلنے کے عدمِ جواز کا لکھا تھا، لیکن بعد میں انہوں نے نعمۃ الباری میں نئے دلائل آنے کے بعد اپنی رائے تبدیل فرمالی۔ جواز کے دلائل یہ ہیں:

(۱) ''شیخ عبدالحق مُحدث دہلوی متوفی 1052ھ لکھتے ہیں: رہا غسلِ جمعہ تو اس کے متعلق مجھے اصول میں صریح روایت نہیں ملی، سوائے اس کے کہ شرح اوراد میں یہ لکھا ہے کہ غسل کے لئے باہر آئے خواہ غسل فرض ہو یا نفل، (اشعۃ اللمعات، جلد 2، ص: 128، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

شیخ عبدالحق ''لمعات التنقیح''میں لکھتے ہیں: ''رہا جمعہ کا غسل تو اس کے متعلق یہ تصریح نہیں ملی کہ وہ حاجت میں سے ہے یا نہیں، سوائے اس کے کہ شرح اوراد میں لکھا ہے کہ وہ غسل کے لئے نکلے خواہ غسل واجب ہو یا نفل، (مخطوطہ لمعات)''۔

(۲) علامہ عالم بن العلاء الانصاری الاندرائینی الدہلوی الہندی التوفی 789ھ لکھتے ہیں: وَيَخْرُجُ لِلْوُضُوْءِ وَالِاغْتِسَالِ فَرْضًا كَانَ أَوْ نَفْلًا، ترجمہ: ''معتکف وضو اور غسل کے لئے نکلے خواہ فرض ہو یا نفل، (الفتاویٰ التاتارخانیہ، جلد 2، ص: 413)''۔

نفلی غسل سے مراد جمعہ کا غسل ہے، جو کہ حقیقت میں غسلِ مسنون ہے، اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معتکف کا جمعہ کے غسل کے لئے نکلنا بھی جائز ہے، کیونکہ سنت اپنی اصل کے اعتبار سے نفلی عبادت ہے۔

(۳) الشیخ علی بن احمد الفوری لکھتے ہیں: فِيْ فَتَاوَى الْحُجَّةِ وَيَجُوْزُ لِلْمُعْتَكِفِ أَنْ يَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ فِيْ سَبْعَةِ أَشْيَاءَ: الْبَوْلِ وَالْغَائِطِ وَالْوُضُوْءِ وَالِاغْتِسَالِ فَرْضًا كَانَ أَوْ نَفْلًا وَالْجُمُعَةِ وَيَخْرُجُ أَيْضًا لِحَاجَةِ السُّلْطَانِ وَيَخْرُجُ أَيْضًا لِأَمْرٍ لَا بُدَّ مِنْهُ ثُمَّ يَرْجِعُ بَعْدَ مَا فَرَغَ مِنْ ذٰلِكَ الْأَمْرِ سَرِيْعًا فِي الْخُوَارِزْمِيِّ وَالسِّغْنَاقِيِّ مِنَ

الذَّخِيرَةِ وَهٰذَا كُلُّهٗ فِي الْإِعْتِكَافِ الْوَاجِبِ۔

ترجمہ: ’’فتاویٰ الحجۃ میں مذکور ہے کہ سات امور انجام دینے کے لئے معتکف کا مسجد سے نکلنا جائز ہے: (۱) پیشاب (۲) پاخانہ (۳) وضو (۴) غسل خواہ فرض ہو یا نفل (۵) جمعہ کی ادائیگی (٦) حاکم کے کام سے (۷) وہ کام جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، پھر فارغ ہونے کے بعد جلد واپس آجائے ،خوارزمی اور سغناقی میں ’’ذخیرہ‘‘ سے نقل ہے اور یہ تمام باتیں اعتکافِ واجب میں ہیں، (خزانۃ الروایات (مخطوطہ) جلد 1، ص: 431)‘‘۔

مخطوطہ میں خزانۃ الروایات کے مصنف کا نام علی بن احمد الفوری لکھا ہے اور نزہۃ الخواطر اور کشف الظنون میں لکھا ہے کہ اس کے مصنف کا نام جگن ہندی گجراتی متوفی 920ھ ہے۔

(۴) علامہ یوسف بن عمر الصوفی الکماروی لکھتے ہیں: وَيَجُوزُ لِلْمُعْتَكِفِ أَنْ يَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ فِي سَبْعَةِ أَشْيَاءَ: الْبَوْلِ وَالْغَائِطِ وَالْوُضُوْءِ وَالْإِغْتِسَالِ فَرْضًا كَانَ أَوْ نَفْلًا وَالْجُمُعَةِ ۔ الخ

ترجمہ: ’’معتکف کے لئے سات چیزوں کی وجہ سے مسجد سے نکلنا جائز ہے: (۱) پیشاب (۲) پاخانہ (۳) وضو (۴) غسل خواہ فرض ہو یا نفل (۵) جمعہ پڑھنے کے لئے‘‘۔

(جامع المضمرات والمشکلات شرح مختصر القدوری، (مخطوطہ) ص: 170)

(نعمۃ الباری شرح صحیح البخاری، جلد 4، ص: 554)

(۵) علامہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ’’البیاض الہاشمی‘‘ میں ’’خزانۃ الروایات‘‘ کا حوالہ نقل کر کے جواز کا قول کیا ہے۔ وہ ’’حیاۃ الصائمین‘‘ میں ’’الفتاوی الحمدیہ للمفتی محمد الھالائی السندی، جلد: 2، ص: 80‘‘ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وہم از حاجتِ شرعیہ وضو و اغتسال است پس جائز است معتکف را خروج از مسجد برائے آں،

اگر چہ فرض باشد یا نفل، کذا فی " المضمرات و الفتاوی الحجۃ و التتارخانیۃ و کنز العباد

و متانۃ الروایات "۔

ترجمہ: "حاجتِ شرعیہ میں وضو اور غسل بھی شامل ہے۔ پس معتکف کا ان حاجات کے لئے

مسجد سے نکلنا جائز ہے، خواہ غسل فرض ہو یا نفل"۔

(۶) مظہر الانوار میں ہے: یَجُوْزُ لِلْمُعْتَکِفِ الْخُرُوْجِ لِلْبَوْلِ وَالْغَائِطِ وَالْوُضُوْءِ

وَالْاِغْتِسَالِ فَرْضًا کَانَ اَوْ نَفْلاً۔

ترجمہ: "معتکف کے لئے پیشاب، پاخانہ، وضو اور غسل کے لئے نکلنا جائز ہے، خواہ فرض ہو

یا نفل"۔ لہٰذا یہ اجازت صرف جمعۃ المبارک کے مسنون غسل کے لئے ہے، کیونکہ ہر سنت

عمل اپنی اصل کے اعتبار سے نفل ہے۔ البتہ جو معتکف، اعتکاف واجب یا سنتِ مؤکدہ کر

رہا ہے، اگر محض ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے غسل کرنے کی خاطر مسجد سے باہر جائے گا، تو

اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

نماز کے مسائل

مسبوق مقتدی تشہّد میں شامل ہو تو کیا کرے

سوال:16

اگر مقتدی درمیان تشہد نماز میں شامل ہوتا ہے اور اس کے تشہد شروع یا مکمل کرنے سے پہلے امام کھڑا ہو جاتا ہے تو مقتدی کے لئے کیا حکم ہے؟، اسی طرح آخری قعدہ میں ایسا ہو جائے تو کیا حکم ہے؟۔

(مولانا محمد احمد ساجد، ریلوے روڈ بصیر پور ضلع اوکاڑہ)

جواب :

وہ مقتدی جو ابتدا سے امام کے ساتھ نماز میں شامل ہے، اُس کے لئے قعدۂ اُولیٰ پر بیٹھنا اور تشہّد کا پورا پڑھنا واجب ہے اور قعدۂ اخیرہ کے لئے تشہّد کی مقدار بیٹھنا فرض اور پورے تشہّد کا پڑھنا واجب ہے، تو اگر امام تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے اور مقتدی نے اپنا تشہّد پورا نہ پڑھا ہو، تو وہ تشہّد پورا کر کے کھڑا ہو، لیکن اگر اُسے اندیشہ ہو کہ امام جلدی فاتحہ مکمل کر کے رکوع میں چلا جائے گا، تو تشہّد نامکمل چھوڑ کر امام کے ساتھ قیام میں شامل ہو جائے۔ وہ مقتدی جو نماز کے درمیان میں پہلے یا آخری تشہّد میں امام کے ساتھ آکر شامل ہو، تو قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ چونکہ اُس کی اپنی ترتیب کے اعتبار سے نہ اُس کا پہلا قعدہ ہے اور نہ آخری، لہٰذا وہ تشہّد نا تمام چھوڑ کر بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے اِن دو صورتوں میں مسبوق مقتدی کے لئے تشہّد پورا پڑھنے کو اپنا مختار قرار دیا ہے اور نامکمل چھوڑنے کو بھی جائز رکھا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وَشَمِلَ بِاِطْلَاقِهٖ مَالَوِ اقْتَدٰى بِهٖ فِيْ اِثْنَاءِ التَّشَهُّدِ الْأَوَّلِ أَوِ الْأَخِيْرِ ،فَحِيْنَ قَعَدَ قَامَ إِمَامُهٗ أَوْسَلَّمَ ،وَمُقْتَضَاهُ اَنَّهٗ يُتِمُّ التَّشَهُّدَ ثُمَّ يَقُوْمُ وَلَمْ أَرَهٗ صَرِيْحاً ،ثُمَّ رَأَيْتُهٗ فِي "الذَّخِيْرَةِ" نَاقِلاً عَنْ أَبِي اللَّيْثِ:اَلْمُخْتَارُعِنْدِيْ اَنَّهٗ يُتِمُّ التَّشَهُّدَ وَاِنْ لَمْ يَفْعَلْ أَجْزَاهٗ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ ،

ترجمہ: ''تشہّد کے مکمل پڑھنے کو مطلقاً واجب قرار دینا اِس صورت کو بھی شامل ہے کہ اگر

مقتدی پہلے یا آخری قعدہ کے دوران امام کے ساتھ جماعت میں شامل ہوا اور وہ جونہی بیٹھا، امام (تیسری رکعت کے لئے) کھڑا ہو گیا یا اُس نے سلام پھیر دیا، تو ''اَلتَّحِیَّات'' مکمل پڑھنے کو مطلقاً واجب قرار دینے کا تقاضا یہ ہے کہ یہ مقتدی بھی ''اَلتَّحِیَّات'' پوری پڑھے، پھر کھڑا ہو، لیکن میں نے یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ کہیں دیکھا نہیں ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ''الذخیرہ'' میں ابواللیث سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ اِس صورت میں بھی ''اَلتَّحِیَّات'' پوری پڑھے اور اگر پوری نہ پڑھے، تو بھی جائز ہے، اللہ تعالیٰ کا بے پایاں شکر ہے کہ اُس نے اِس مسئلے میں میری صحیح رہنمائی فرمائی ۔۔۔۔

آگے چل کر علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(وَلَوْ لَمْ يُتِمَّ جَازَ) اَیْ صَحَّ مَعَ كَرَاهَةِ التَّحْرِيْمِ كَمَا اَفَادَهُ "الْحَلَبِيُّ" وَنَازَعَهُ "الطِّيْبِيُّ وَالرَّحْمَتِيُّ" وَهُوَ مَفَادُ مَا فِيْ "شَرْحِ الْمُنْيَةِ" حَيْثُ قَالَ: وَالْحَاصِلُ اَنَّ مُتَابَعَةَ الْإِمَامِ فِي الْفَرَائِضِ وَالْوَاجِبَاتِ مِنْ غَيْرِ تَاخِيْرٍ وَاجِبَةٌ، فَاِنْ عَارَضَهَا وَاجِبٌ لَا يَنْبَغِيْ اَنْ يَفُوْتَهُ، بَلْ يَأْتِيْ بِهِ ثُمَّ يُتَابِعُهُ، لِأَنَّ الْاِتْيَانَ بِهِ لَا يَفُوْتُ الْمُتَابَعَةَ بِالْكُلِّيَّةِ، وَاِنَّمَا يُؤَخِّرُهَا، وَالْمُتَابَعَةُ مَعَ قَطْعِهِ تَفُوْتُهُ بِالْكُلِّيَّةِ، فَكَانَ تَاخِيْرُ اَحَدِ الْوَاجِبَيْنِ مَعَ الْاِتْيَانِ بِهِمَا اَوْلٰى مِنْ تَرْكِ أَحَدِهِمَا بِالْكُلِّيَّةِ، بِخِلَافِ مَا اِذَا عَارَضَهَا سُنَّةٌ، لِاَنَّ تَرْكَ السُّنَّةِ اَوْلٰى مِنْ تَاخِيْرِ الْوَاجِبِ،

ترجمہ: ''اور اگر (مقتدی) تشہد کو پورا نہیں کرے گا تو اُس کا یہ عمل جائز ہے مگر مکروہِ تحریمی ہے، جیسا کہ ''الحلبی'' سے مستفاد ہے۔ اور ''الطیبی اور الرحمتی'' نے اس سے اختلاف کیا ہے اور ''شرح المنیہ'' کا مفاد بھی یہی ہے کہ انہوں نے کہا: '' حاصل یہ ہے کہ فرائض اور واجبات میں واجب کی تاخیر کے بغیر امام کی پیروی واجب ہے، اگر کوئی واجب اس سے مُعارض ہو تو اسے فوت نہ کرے بلکہ اسے مکمل کر کے امام کی پیروی کرے، کیونکہ مقتدی کا تشہد کو پورا کرنا امام کی متابعت کو بالکلیہ فوت نہیں کرتا بلکہ اسے مؤخر کرتا ہے اور تشہد کو نا تمام چھوڑ کر امام کی پیروی کرنے سے تشہد کا واجب فوت ہو جاتا ہے۔ پس دو واجب امور کو ادا کر کے کسی ایک

میں تاخیر کرنا دوسرے کو مکمل طور پر ترک کرنے سے بہتر ہے۔اس کے برعکس اگر کوئی سنت امام کی پیروی سے معارض ہو جائے (تو سنت کو چھوڑ دیں گے اور امام کی پیروی کریں گے)، کیونکہ واجب کی تاخیر سے سنت کا ترک کرنا بہتر ہے۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تشہد کو نا تمام چھوڑ کر مقتدی نے امام کی پیروی کر لی تو کراہتِ تحریمی کے ساتھ جائز ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ التحیات واجب ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص: 177-176، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

یہ اس تشہد کے بارے میں ہے جو یقیناً واجب ہے اور یہ تین یا چار رکعت والی نماز کا ''قعدۂ اولیٰ'' ہے، جس کے بعد امام تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور یہ قعدہ مُدرِک مقتدی اور امام دونوں پر واجب ہے۔ابھی تک ایسا کوئی جزیہ ہمارے علم میں نہیں آیا، جس میں یہ صراحت ہو کہ اگر مقتدی آخری تشہد میں امام کے ساتھ ملا تو امام کی متابعت میں وہ تشہد مقتدی پر بھی واجب ہو جاتا ہے تاکہ التحیات نامکمل رہنے کی صورت میں اس پر بلاتردد مکروہِ تحریمی کا اطلاق کیا جا سکے۔تاہم امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز کی مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کی متابعت میں مسبوق مقتدی کے لئے بھی قعدۂ اخیرہ واجب ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''دوسرے یہ کہ اس کا فعل فعلِ امام کے بعد بدیر واقع ہوا اگرچہ بعد فراغ امام، فرض یوں بھی ادا ہو جائے گا، پھر یہ فصل بضرورت ہوا تو کچھ حرج نہیں، ضرورت کی یہ صورت کہ مثلاً مقتدی قعدۂ اولیٰ میں آکر ملا، اس کے شریک ہوتے ہی امام کھڑا ہو گیا اب اسے چاہئے کہ التحیات پوری پڑھ کر کھڑا ہو اور کوشش کرے کہ جلد جا ملے۔فرض کیجئے کہ اتنی دیر میں امام رکوع میں آگیا، تو اس کا قیام، قیامِ امام کے بعد ختم ہوگا، مگر حرج نہیں کہ یہ تاخیر بضرورتِ شرعیہ تھی، اور اگر بلاضرورت فصل کیا تو قلیل فصل میں، جس کے سبب امام سے جاملنا فوت نہ ہو ترکِ سنت ہے اور کثیر میں جسطرح سوال میں ہے کہ فعلِ امام ختم ہونے کے بعد اس نے فعل کیا، ترکِ واجب ہے، جس کا حکم اس نماز کو پورا کر کے اعادہ کرنا ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 7، ص: 275)''۔

نماز میں قراءت (قرآن کی لفظاً ادائیگی) فرض ہے

سوال: 17

میری عمر اس وقت 60 سال ہے، سات سال کی عمر سے مستقل نمازیں پڑھتا ہوں۔ بچپن سے ہی میری عادت یہ ہے کہ نماز میں نماز کی قراءت اذکار وغیرہ اور قرآنِ مجید دل ہی دل میں پڑھتا ہوں۔ اتفاق سے ایک عالمِ دین کی کتاب میں میں نے پڑھا کہ: ''نماز میں تلاوتِ قرآن، تکبیرات اور درود شریف اتنی آواز سے پڑھنا چاہیے کہ خود کو آواز آئے، ہونٹ اور زبان حرکت کرے، دل ہی دل میں نماز پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی''۔ میں نے مسجد کے امام صاحب سے پوچھا تو انہوں نے اُس کی تائید کی اور کہا آپ کی نماز نہیں ہوئی، 60 سال کی نماز قضاءِ عمری کے طور پر ادا کریں۔ میں یہ سن کر پریشان ہوں کہ 60 سال کی نمازیں دوبارہ کیسے پڑھوں گا؟۔ شریعت کی روشنی میں میرے اس مسئلے کو حل فرمائیں، (صدیق حسن، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

دل میں قراءت کرنے سے نماز نہیں ہوگی بلکہ قراءت زبان سے اتنی آواز سے ہونی چاہیے کہ خود سُن سکے، علامہ برہان الدین ابوبکر فرغانی لکھتے ہیں:

ثُمَّ الْمُخَافَتَةُ أَنْ يُّسْمِعَ نَفْسَهٗ وَالْجَهْرُ أَنْ يُّسْمِعَ غَيْرَهٗ وَهٰذَا عِنْدَالْفَقِيْهِ أَبِيْ جَعْفَرِ نِ الْهِنْدُوَانِيِّ لِأَنَّ مُجَرَّدَ حَرَكَةِ اللِّسَانِ لَايُسَمّٰى قِرَاءَةً بِدُوْنِ الصَّوْتِ وَقَالَ الْكَرْخِيُّ أَدْنَى الْجَهْرِ أَنْ يُّسْمِعَ نَفْسَهٗ وَأَدْنَى الْمُخَافَتَةِ تَصْحِيْحُ الْحُرُوْفِ لِأَنَّ الْقِرَاءَةَ فِعْلُ اللِّسَانِ دُوْنَ الصِّمَاخِ

ترجمہ: ''پھر اخفاء (یعنی نماز میں آہستہ قرآن پڑھنا) یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنائے (یعنی پڑھنے والے کو خود سنائی دے) اور جہر یہ ہے کہ دوسرے کو سنائے اور یہ ''فقیہ ابوجعفر ہندوانی'' کے نزدیک ہے، کیونکہ آواز کے بغیر محض زبان کی حرکت کا نام قراءت نہیں ہے۔ اور امام کرخی فرماتے ہیں: جہر کی ادنیٰ صورت یہ ہے کہ خود سن سکے اور آہستہ (اِخفاء) یہ کہ حروف صحیح

ادا کرے، کیونکہ قراءت تو زبان کا فعل ہے نہ کہ کان کا، (ہدایہ اولین، ص:98)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں:

وَحَدُّ الْقِرَاءَۃِ تَصْحِیْحُ الْحُرُوْفِ بِلِسَانِہٖ بِحَیْثُ یُسْمِعُ نَفْسَہٗ عَلَی الصَّحِیْحِ

ترجمہ: ''صحیح قول کے مطابق قراءت کی حد یہ ہے کہ حروف کو اپنی زبان سے اس طرح صحیح طور پر ادا کرے کہ خود کو سنائی دے، (البحر الرائق، جلد 1، ص:510)''۔

الغرض وہ قراءت جو نماز میں فرض ہے، جب تک اس کو زبان سے لفظاً ادا نہ کیا جائے، فرض ادا نہیں ہوگا، اور نماز میں محض دل میں قرآن پڑھنے کا اعتبار نہیں، ایسا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے، یعنی اس سے فرضِ قراءت ادا نہیں ہوگا اور ترکِ فرض سے نماز ادا نہیں ہوتی۔ اب تک آپ لاعلمی میں جو محض دل میں پڑھتے رہے، یہ محض تخیُّل و تصور ہے، قراءت نہیں ہے، اور ضروریاتِ دین کے بارے میں دارالاسلام میں لاعلمی شرعاً قابلِ قبول عذر نہیں ہے، لہٰذا آپ ماضی کی اس غفلت پر اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل سے توبہ کریں اور فرض نمازیں اور وتر کی قضا پڑھتے رہیں اور نمازوں کی کثرت کی وجہ سے تخفیف کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، مثلاً سورۂ فاتحہ کے بعد کم از کم مقدارِ واجب قراءت، رکوع و سجود میں کم از کم ایک تسبیح، وتر میں دعاءِ قنوت کی جگہ ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِی'' وغیرہ اور آخری قعدہ ''التحیات'' کے بعد ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ'' پر اکتفا کر سکتے ہیں، لیکن یہ بہت زیادہ قضا نمازوں کے لئے ہے، معمول کی نمازوں کے لئے ہرگز نہیں ہے۔ معمول کی نماز سنت کے مطابق فرائض، واجبات، سُنَن، مستحبات اور آداب کی رعایت کے ساتھ ادا کریں اور مکروہات سے اجتناب کریں۔

رکوع اور سجدے میں تسبیحات کے ساتھ دعائیں پڑھنا

سوال:18

فرض یا سنت نماز کی ادائیگی کے دوران اگر کوئی شخص حالتِ سجدہ میں کسی قسم کی دعا کرتا ہو مثلاً ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ'' وغیرہ، تو کیا نماز صحیح ادا ہو جائے گی یا فاسد ہو جائے گی؟۔ نماز کے دوران کس قسم کا کلام نماز کو فاسد کر دیتا ہے؟، (سید شفاعت علی، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

حدیثِ پاک میں ہے: عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا اَنَّهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُكْثِرُ اَنْ يَّقُوْلَ فِيْ رُكُوْعِهٖ وَسُجُوْدِهٖ "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ" يَتَاَوَّلُ الْقُرْآنَ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی ﷺ اپنے رکوع اور سجود میں کثرت سے یہ کلمات پڑھا کرتے تھے:

"سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ"، وہ قرآن سے اس کی تاویل فرماتے تھے، (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 817)''۔

یعنی قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ

ترجمہ: ''پس اپنے رب کی حمد و تسبیح بیان کرو اور اُس سے مغفرت طلب کرو، (النصر:۳)''۔

یعنی آیۂ مبارکہ میں تین امور کا تذکرہ ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کی تسبیح (۲) حمدِ باری تعالیٰ (۳) استغفار۔ پس رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات اپنے رکوع وسجود کی تسبیح میں ان تین باتوں کو اس آیۂ کریمہ کی متابعت میں جمع فرمادیا کرتے تھے۔

صحیح مسلم رقم الحدیث: 971 تا 978 میں رسول اللہ ﷺ سے رکوع وسجود کی مزید دعائیں بھی مذکور ہیں:

(1) اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ كُلَّهٗ، دِقَّهٗ وَجِلَّهٗ، وَاَوَّلَهٗ وَآخِرَهٗ، وَعَلَانِيَتَهٗ وَسِرَّهٗ

ترجمہ: ''(تعلیمِ اُمت کے لئے آپ دعا فرماتے) اے اللہ! میرے تمام چھوٹے اور بڑے، اگلے اور پچھلے، ظاہر اور پوشیدہ ذُنوب کو بخش دے''۔

(2) سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ، اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ترجمہ: ''تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے، تو ہی ہر تعریف کے لائق ہے، میں تجھ سے اپنی بخشش کا طلب گار ہوں اور میں اپنے گناہوں کی معافی کے لئے تیری ہی طرف رجوع کرتا ہوں''۔

(3) سُبْحَانَكَ رَبِّيْ وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ

ترجمہ: ”اے میرے ربّ! تو ہر عیب سے پاک ہے، تو ہی ہر تعریف کے لائق ہے، اے اللہ! میری بخشش فرما“۔

(4) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ ، أَسْتَغْفِرُاللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ

ترجمہ: ”اللہ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے اور وہی ہر تعریف کے لائق ہے، میں اللہ سے بخشش مانگتا ہوں اور میں ہر گناہ سے معافی کے لئے اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں“۔

(5) سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ لَااِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ

ترجمہ: ”(اے اللہ!) تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے اور ہر تعریف تجھ ہی کو زیبا ہے، تیرے سوا کوئی عبادت کا حق دار نہیں“۔

(6) اَللّٰهُمَّ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ، وَأَعُوْذُبِكَ مِنْكَ،لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ ،اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ،

ترجمہ: ”اے اللہ ! میں تیری ناراضگی سے بچ کر تیری رضا کی پناہ میں آتا ہوں، اور تیری سزا سے بچ کر تیری معافی کی پناہ میں آتا ہوں، اور تیری گرفت سے بچنے کے لئے تیری آغوشِ رحمت کی پناہ میں آتا ہوں، میں تیری تعریف کا احاطہ نہیں کرسکتا، تیری کمالِ ثناء ہی ہے جو تو نے خود اپنی ذات کی فرمائی“۔

(7) سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ

ترجمہ: ”(اے اللہ! تو) ہر عیب سے بہت پاک ہے، تیری ذات ہر نقص اور عیب سے بے انتہا پاکیزہ ہے، تو تمام فرشتوں اور جبریلِ امین کا بھی رب ہے“۔

امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق اور داؤد ظاہری رحمہم اللہ کے نزدیک فرض و نفل ہر نماز کے رکوع و سجود میں جتنی دعائیں چاہیں، پڑھ سکتے ہیں۔ حضرت ابراہیم نخعی، حضرت حسن بصری، امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے

نزدیک سنت یہ ہے کہ رکوع میں تین بار ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ '' پڑھیں اور سجدے میں تین بار ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی '' پڑھیں، یہ کم از کم مسنون مقدار ہے، امام طحاوی نے کہا: ائمہ کے نزدیک رکوع میں ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ '' اور سجدے میں ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' پر اور کلمات کا اضافہ نہ کرے، ہاں! جس قدر چاہے اِن کلمات کو بار بار پڑھ سکتا ہے۔ لیکن امام کو چاہئے کہ مقتدیوں کی رعایت کے لئے تین بار پڑھنے پر اکتفا کرے تا کہ اُنہیں بار محسوس نہ ہو اور اُن کی حضوریِ قلب (Presence Of Mind) میں کمی نہ آئے، کیونکہ جماعت میں باہمت افراد کے ساتھ ساتھ بیمار، ضعیف اور عمر رسیدہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ تحدید فرائض کے لئے ہے اور نوافل میں ان مسنون تسبیحات کے ساتھ مذکورہ بالا مسنون دعائیں بھی حسبِ توفیق پڑھ سکتے ہیں، بلکہ جتنا زیادہ پڑھیں گے اُتنے ہی زیادہ اجر کے حق دار ہوں گے''۔

(خلاصہ بحث: عمدۃ القاری، جلد 6، ص: 101-100، دارالکتب العلمیہ، بیروت وحاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد 1 ص: 362)

نوٹ: واجب اور سنّتِ مؤکدہ فرض کے تابع ہوتے ہیں۔

نماز کے اندر دعا کے بارے میں علامہ حسن بن عمار بن علی شرنبلالی ضابطہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اِنَّ صَلَاتَنَا هٰذِهٖ لَایَصْلُحُ فِیْهَا شَیْئٌ مِّنْ كَلَامِ النَّاسِ، فَقَدَّمَ هٰذَا الْمَانِعَ عَلٰی اِبَاحَةِ الدُّعَاءِ بِمَا اُعْجِبَهٗ فِی الصَّلَاةِ، فَلَا يَدْعُوْفِيْهَا اِلَّا (بِمَا یُشْبِهُ اَلْفَاظَ الْقُرْآنِ) ﴿رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا (آل عمران: 08)﴾ (وَ) بِمَا يُشْبِهُ اَلْفَاظَ (السُّنَّةِ) وَمِنْهَا مَارُوِیَ عَنْ اَبِیْ بَكْرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ: عَلِّمْنِیْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ دُعَاءً اَدْعُوْا بِهٖ فِیْ صَلَاتِیْ فَقَالَ: قُلْ، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا كَثِيْراً، وَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ، اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ وَكَانَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ يَدْعُوْ بِكَلِمَاتٍ مِّنْهَا: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهٖ

مَاعَلِمْتُ مِنْهُ وَمَالَمْ أَعْلَمْ ،وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهِ مَاعَلِمْتُ مِنْهُ وَمَالَمْ أَعْلَمْ وَ (لَا) يَجُوْزُ أَنْ يَّدْعُوَفِيْ صَلَاتِهِ بِمَا يُشْبِهُ (كَلَامَ النَّاسِ) لِأَنَّهٗ يُبْطِلُهَا اِنْ وُّجِدَ قَبْلَ الْقُعُوْدِ وَقَدْرِ التَّشَهُّدِ ،وَيَفُوْتُ الْوَاجِبَ لِوُجُوْدِهٖ بَعْدَهٗ قَبْلَ السَّلَامِ بِخُرُوْجِهٖ بِهٖ دُوْنَ السَّلَامِ، وَهُوَ مِثْلُ قَوْلِهٖ: اَللّٰهُمَّ زَوِّجْنِيْ فُلَانَةً ،أَعْطِنِيْ كَذَا مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْمَنَاصِبِ،لِأَنَّهٗ لَايَسْتَحِيْلُ حُصُوْلُهٗ مِنَ الْعِبَادِ وَمَا يَسْتَحِيْلُ مِثْلَ الْعَفْوِ وَالْعَافِيَةِ۔

ترجمہ:’’(نمازی) نماز میں صرف ان کلمات کے ساتھ دعا مانگے گا، جوقرآن وسنّت کے کلمات کے مشابہ ہوں ☆ قرآن کے کلمات کی مثال جیسے:رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا اِلٰی آخِرِہٖ (آل عمران:08) ☆ اور حدیث میں دعا کی مثال (یہ ہے): حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ ! مجھے ایسی دعا بتایئے جو میں اپنی نماز میں اللہ سے مانگوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ترجمہ’’(یوں دعا مانگو) اے اللہ! میں نے اپنے آپ پر بہت ظلم کیا اور تیرے سوا کوئی گناہوں کا معاف کرنے والا نہیں ہے۔ پس اپنے فضل سے میرے گناہوں کو معاف فرما اور مجھ پر رحم فرما، کیونکہ تو بہت بخشنے والا ،نہایت مہربان ہے‘‘۔☆ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کلمات کے ساتھ (نماز میں) دعا مانگا کرتے تھے: ترجمہ’’اے اللہ ! میں تجھ سے ہرقسم کی خیر کا سوال کرتا ہوں، خواہ وہ مجھے معلوم ہے یا معلوم نہیں، اور میں ہرقسم کے شَر سے تیری پناہ میں آتا ہوں، خواہ وہ مجھے معلوم ہے یا معلوم نہیں ☆ اور لوگوں کے کلام کے مشابہ کلمات کے ساتھ نماز میں دعا مانگنی جائز نہیں ہے، کیونکہ اگر تشہّد کی مقدار بیٹھنے سے پہلے ہو تو اِس سے نماز باطل ہوجاتی ہے اور اگر سلام سے پہلے مقدارِ تشہّد بیٹھنے کے بعد ہو، تو لفظِ سلام کے ساتھ نماز سے باہر آنا، جو واجب ہے، فوت ہوجاتا ہے۔اُس کی مثال یوں ہے: ترجمہ:’’ اے اللہ ! فلانی عورت سے میرا نکاح کرادے،، مجھے اتنا اتنا سونا ، چاندی اور عہدے عطا فرما، کیونکہ ان امور کا حصول بندوں سے ممکن ہے، البتہ اس طرح کے امور کا حصول بندوں سے ممکن نہیں، جیسے اے اللہ ! مجھے

معافی اور عافیت عطا فرما، (حاشیۃ الطحطاوی، جلد 1، ص:372-371)''۔

نماز میں ایسی دعا کرنا، جس کا سوال بندے سے نہیں کیا جا سکتا، جائز ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

اِنْ دَعَابِمَا یَسْتَحِیْلُ سُؤَالُہٗ مِنَ الْعِبَادِ مِثْلَ الْعَافِیَۃِ وَالْمَغْفِرَۃِ وَالرِّزْقِ بِأَنْ قَالَ: اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی الْحَجَّ أَوِ اغْفِرْلِیْ لَاتَفْسُدُ وَلَوْ دَعَابِمَالَا یَسْتَحِیْلُ سُؤَالُہٗ مِنَ الْعِبَادِ مِثْلُ قَوْلِہٖ:" اَللّٰھُمَّ أَطْعِمْنِیْ أَوِ اقْضِ دَیْنِیْ أَوْزَوِّجْنِیْ"، فَاِنَّہٗ یُفْسِدُ، وَلَوْ قَالَ:" اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ فُلَانَۃَ "فَالصَّحِیْحُ اَنَّہٗ یُفْسِدُ لِأَنَّ ھٰذَا اللَّفْظَ أَیْضًا مُسْتَعْمَلٌ فِیْمَا بَیْنَ النَّاسِ،وَلَوْقَالَ:" اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ "لَاتَفْسُدُ لِاَنَّہٗ مَوْجُوْدٌ فِی الْقُرْاٰنِ، وَلَوْقَالَ: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِأَخِیْ ذَکَرَ الشَّیْخُ أَبُوالْفَضْلِ الْبُخَارِیُّ اَنَّہٗ یُفْسِدُ وَالصَّحِیْحُ اَنَّہٗ لَایُفْسِدُ لِاَنَّہٗ مَوْجُوْدٌ فِی الْقُرْاٰنِ کَذَافِیْ مُحِیْطِ السَّرْخَسِیِّ ،وَاِنْ قَالَ: اِغْفِرْلِیْ وَلِأُمِّیْ أَوْ لِعَمِّیْ أَوْ لِخَالِیْ أَوْلِزَیْدٍ فَسَدَتْ صَلَاتُہٗ کَذَافِی السِّرَاجِ الْوَھَّاجِ۔

ترجمہ: ''اگر (دورانِ نماز) ایسے امور کے بارے میں دعا کی جس کا بندوں سے سوال کرنا محال ہے، مثلاً عافیت، مغفرت اور رزق طلب کرنا، تو نماز فاسد نہیں ہوگی، جیسے (یہ کہنا کہ:) ''اے اللہ! مجھے حج نصیب فرما یا اے اللہ! میری مغفرت فرما'' ☆ اگر (دورانِ نماز) ایسے امور کے بارے میں دعا کی، جن کا بندوں سے سوال کرنا محال نہیں ہے، تو نماز فاسد ہو جائے گی، جیسے (یہ کہنا کہ:) ''اے اللہ! مجھے کھانا کھلا دے یا میرا قرض ادا کردے یا میرا نکاح کرادے'' ☆ اور اگر یہ کہا کہ: ''اے اللہ! فلاں عورت سے میرا نکاح کرادے''، تو صحیح قول کے مطابق نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ ایسے کلمات عام طور پر لوگوں کے درمیان استعمال ہوتے ہیں ☆ اور اگر (دورانِ نماز) یہ کہا کہ: ''اے اللہ! میری اور میرے ماں باپ کی مغفرت فرما''، تو نماز فاسد نہیں ہوگی، کیونکہ ایسے کلمات قرآن مجید میں موجود ہیں ☆ اور اگر (دورانِ نماز) یہ کہا کہ: ''اے اللہ! میرے بھائی کو بخش دے''، تو شیخ ابوالفضل بخاری نے ذکر کیا کہ نماز فاسد ہو جائے گی اور صحیح قول یہ ہے کہ

نماز فاسد نہیں ہوگی، کیونکہ اس طرح کے کلمات قرآن مجید میں موجود ہیں، جیسا کہ ''محیط السرخسی'' میں ہے☆اور اگر کہا کہ: ''اے اللہ! میری اور میری والدہ یا میرے چچا یا میرے ماموں یا زید کی مغفرت فرما''، تو نماز فاسد ہو جائے گی، جیسا کہ ''السراج الوہاج'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:100، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ فرض نماز کے دوران ایسی دعا کرنا، جس کا سوال بندوں سے محال ہے، مُفسِدِ نماز نہیں ہے اور جس چیز کا سوال بندوں سے کیا جا سکتا ہو، وہ مُفسِدِ نماز ہے، جیسا کہ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ نے اُن مقامات کی نشاندہی فرمائی۔

نماز کے اندر دنیاوی کلام، خواہ جان بوجھ کر کیا ہو یا غلطی سے، اپنی خوشی سے کیا ہو یا کسی نے مجبور کیا ہو، قلیل ہو یا کثیر، کم از کم اتنی آواز سے ہو کہ وہ خود سن سکے، نماز کو فاسد کر دیتا ہے۔

چند مقامات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جن میں سے بعض صورتیں مفسدِ نماز ہیں اور بعض صورتیں مفسدِ نماز نہیں ہیں:

(الف) دورانِ نماز سلام کرنا یا سلام کا جواب دینا۔

(ب) کسی کے جواب میں کوئی کلام کیا، مثلاً چھینک کے جواب میں ''یَرحَمُکَ اللّٰہُ'' کہا، یا کسی دوسرے نے ''یَرحَمُکَ اللّٰہُ'' کہا اور نمازی نے جواب میں ''آمین'' کہا۔

(ج) خوشی کی خبر سن کر ''اَلحَمدُ لِلّٰہِ'' کہا، لیکن اگر جواب کی نیت سے نہیں بلکہ یہ بتانے کے لئے کہا کہ میں نماز میں ہوں، تو نماز فاسد نہیں ہوئی۔

(د) بری خبر سن کر ''اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ'' پڑھا یا الفاظِ قرآن کسی کے جواب میں پڑھے، نماز فاسد ہوگئی۔

(ھ) اللہ تعالیٰ کا نام سن کر ''جَلَّ جَلالُہٗ'' کہا یا نبی ﷺ کا اسمِ مبارک سن کر درود پڑھا یا امام کی قراءت سن کر ''صَدَقَ اللّٰہُ وَصَدَقَ رَسُولُہٗ'' کہا تو نماز فاسد نہیں ہوگی، بشرطیکہ جواب کی نیت سے نہ ہو۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَلَو قَالَ: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ اَوقَالَ: اَللّٰہُ اَکبَرُ لَاتَفسُدُ صَلَاتُہٗ بِالاِجمَاعِ اِن

لَّمْ يُرِدْ بِهِ الْجَوَابَ، أَمَّا إِذَا أَرَادَ الْجَوَابَ قَالَ بَعْضُهُمْ تُفْسِدُ صَلاَتَهُ عِنْدَ الْكُلِّ وَهُوَ الظَّاهِرُ ولو صلى على النبى ﷺ فى الصلاة ان لم يكن جوابًا لغيره لَاتَفْسُدُ صَلَاتَهُ وَإِنْ سَمِعَ اِسْمَ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ جَوَابًا لَهُ تَفْسُدُ صَلَاتَهُ وَلَوْ قَرَأَ رَجُلٌ مَاكَانَ مُحَمَّدٌ أَبَاأَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَصَلَّى عَلَيْهِ رَجُلٌ فِي الصَّلَاةِ لَاتَفْسُدُ صَلَاتَهُ وَكَذَالَوْ قَرَأَ ذِكْرَالشَّيْطَانِ فَقَالَ وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ لَعَنَهُ اللّٰهُ لَاتَفْسُدُ صَلَاتَهُ۔

ترجمہ:" اگر (دورانِ نماز) کسی کے جواب کا ارادہ کئے بغیر درود شریف پڑھا یا اللہ اکبر کہا، تو اس پر اجماع ہے کہ نماز فاسد نہیں ہوگی ☆ اگر نماز کے اندر کسی شخص سے نبی ﷺ کا نام سنا اور اُس کے جواب میں درود پڑھا تو نماز فاسد ہو جائے گی ☆ اور اگر کسی شخص نے یہ آیت پڑھی:"مَاكَانَ مُحَمَّدٌ أَبَاأَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ" اور نماز کے اندر سن کر کسی نمازی نے درود پڑھا، تو نماز فاسد نہیں ہوگی ☆ اسی طرح اگر کسی شخص نے شیطان کے بارے قرآن کی کوئی آیت پڑھی، اور نماز کے اندر نمازی نے"لَعَنَهُ اللّٰه" (اللہ اُس پر لعنت فرمائے) پڑھا، تو نماز فاسد نہیں ہوگی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:99، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

نوٹ: ہم نے مسنون اور دیگر دعاؤں کا ترجمہ بھی لکھ دیا ہے لیکن نماز میں یہ دعائیں صرف عربی میں پڑھی جاسکتی ہیں۔

نمازی کے آگے سے گزرنے کا حکم

سوال:19

ہماری مسجد میں لوگ نمازیوں کے آگے سے بلا تکلف گزر جاتے ہیں، نمازی کے آگے سے گزرنے کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں؟، بیان فرمائیں۔

محمد آصف اقبال قادری، گلبہار 2 کراچی

جواب:

حالتِ نماز میں نمازی کے آگے سے گزرنے والے کے بارے میں حدیث پاک میں سخت وعید آئی ہے۔ بسر بن سعید بیان کرتے ہیں کہ زید بن خالد جہنی نے اُنہیں حضرت

ابوجُہیم انصاری کے پاس یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے نمازی کے آگے سے گزرنے والے شخص کے بارے میں کیا سنا ہے؟،

قَالَ أَبُو جُهَيْمٍ :قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: لَوْيَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّي مَاذَاعَلَيْهِ، لَكَانَ أَنْ يَقِفَ أَرْبَعِيْنَ خَيْراً لَّهُ مِنْ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ ـقَالَ أَبُو النَّضرِ:لَاأَدْرِي قَالَ: أَرْبَعِيْنَ يَوْماً ،أَوْشَهْراً ،أَوْسَنَةً؟ـ

ترجمہ:''حضرت ابوجُہیم نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والا یہ جان لے کہ اس پر کیا گناہ ہے؟، تو (وہ سوچتا کہ) نمازی کے آگے سے گزرنے کی بہ نسبت اُس کے لئے چالیس تک کھڑے رہ کر (انتظار کرنا) بہتر ہوتا۔ ابوالنضر کہتے ہیں: میں نہیں جانتا (یعنی مجھے یاد نہیں رہا)، بُسر نے چالیس دن کہا تھا، چالیس ماہ یا چالیس سال، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:1019)''۔

لیکن اگر ہم چالیس دن بھی نہیں بلکہ چالیس گھنٹے یا اُس سے بھی کم چالیس منٹ مراد لیں، تو بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نمازی کے آگے سے گزرنا شریعت کی نظر میں کتنا ناپسندیدہ فعل ہے۔

نمازی کے آگے کسی ایسی چیز کا ہونا جو نمازی کے لئے آڑ بن جائے اور نمازی کے سامنے یا آگے سے گزرنے والا گنہگار نہ ہو، اُسے فقہی اصطلاح میں ''سُترہ'' کہتے ہیں۔ سُترہ کی مقدار لمبائی میں ایک ہاتھ سے تین ہاتھ کے برابر ہو اور موٹائی کم از کم ایک انگلی کے برابر ہو۔ چھوٹی مسجد میں نمازی کے آگے دیوارِ محراب تک بغیر سُترہ کے کسی کو نہیں گزرنا چاہئے، بڑی مسجد میں نمازی کے مقامِ سجدہ سے دو یا تین صفوں کا فاصلہ چھوڑ کر گزر سکتے ہیں۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَلَوْ مَرَّمَارٌّ فِي مَوْضِعِ سُجُوْدِهٖ لَاتَفْسُدُ وَإِنْ أَثِمَ، وَتَكَلَّمُوْا فِي الْمَوْضِعِ الَّذِيْ يُكْرَهُ الْمُرُوْرُ فِيْهِ، وَالْأَصَحُّ أَنَّهٗ مَوْضِعُ صَلَاتِهٖ مِنْ قَدَمِهٖ إِلَى مَوْضِعِ سُجُوْدِهٖ، كَذَا فِي "التَّبْيِيْنِ"،قَالَ مَشَايِخُنَا إِذَا صَلّٰى رَامِيًا بَصَرَهٗ إِلَى مَوْضِعِ سُجُوْدِهٖ فَلَمْ يَقَعْ بَصَرُهٗ عَلَيْهِ لَمْ يُكْرَهْ وَهُوَ الصَّحِيْحُ، كَذَا فِي الْخُلَاصَةِ،وَهُوَ الْأَصَحُّ، كَذَا فِي

"الْبَدَائِعِ"،وَهُوَ الْأَشْبَهُ إِلَى الصَّوَابِ ،كَذَافِي "النِّهَايَةِ"،هٰذَاحُكْمُ الصَّحْرَاءِ فَإِنْ كَانَ فِي الْمَسْجِدِ إِنْ كَانَ بَيْنَهُمَا حَائِلٌ كَإِنْسَانٍ أَوْ أُسْطُوَانَةٍ لَايُكْرَهُ، وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ بَيْنَهُمَا حَائِلٌ وَالْمَسْجِدُ صَغِيرٌ كُرِهَ فِيْ أَيِّ مَكَانٍ كَانَ وَالْمَسْجِدُالْكَبِيرُ كَالصَّحْرَاءِ ،كَذَا فِي "الْكَافِي" ۔

ترجمہ: ''اگر کوئی شخص نمازی کی سجدہ گاہ کے آگے سے گزرا تو نماز فاسد نہیں ہوگی ،اگر چہ وہ (یعنی گزرنے والا) گنہگار ہوگا۔نمازی کے آگے جس جگہ سے گزرنا مکروہ ہے،اُس کی حد کے بارے میں فقہاء کرام نے کلام کیا ہے(یعنی اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں)، زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ جگہ نمازی کے قدم سے لے کر اس کی سجدہ گاہ تک ہے،جیسا کہ ''تبیین الحقائق'' میں ہے۔ہمارے مشائخ نے کہا ہے کہ جب کسی نمازی کی نظر سجدہ گاہ پر ہو اور (سامنے سے گزرنے والے پر) اس کی نظر نہ پڑے،تو اتنے فاصلے سے،نمازی کے آگے سے گزرنا مکروہ نہیں ہے،اور یہی صحیح ہے،جیسا کہ ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے،''بدائع الصنائع'' میں ہے کہ یہ زیادہ صحیح قول ہے،''نہایہ'' میں اسی قول کو صواب (درستی) کے زیادہ مشابہ فرمایا ہے-یہ صحرا(یعنی کھلے میدان میں نمازی کے آگے سے گزرنے) کا حکم ہے،لیکن اگر نمازی مسجد میں ہے اور نمازی اور گزرنے والے کے درمیان کوئی انسان یا ستون کی طرح کی کوئی چیز حائل ہے،تو گزرنا مکروہ نہیں ہے انسان کے حائل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اُس سے اگلی صف میں کوئی دوسرا نمازی اُس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھا ہو،اور اگر نمازی اور گزرنے والے کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو اور مسجد چھوٹی ہے تو اُس کے سامنے جہاں سے بھی وہ گزرے گا، (گزرنا) مکروہ ہوگا اور مسجد کبیر کا حکم صحراء کی طرح ہے،''کافی'' میں اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری،جلد 1،ص:104،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

یعنی جب نمازی کی نظر سجدہ گاہ پر ہو اور گزرنے والے پر اُس کی نظر نہ پڑتی ہو،تو بڑی مسجد میں اتنے فاصلے سے نمازی کے آگے سے گزرنا مکروہ نہیں ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:(وَمُرُوْرُ مَارٍّ فِي الصَّحْرَاءِ أَوْ فِيْ مَسْجِدٍ كَبِيرٍ

بِمَوْضِعِ سُجُوْدِہٖ) فِی الْاَصَحِّ (اَوْ) مُرُوْرُہٗ (بَیْنَ یَدَیْہِ) اِلٰی حَائِطِ الْقِبْلَۃِ (فِیْ) بَیْتٍ وَّ(مَسْجِدٍ) صَغِیْرٍ ،فَاِنَّہٗ کَبُقْعَۃٍ وَّاحِدَۃٍ،

ترجمہ: ''صحراء اور بڑی مسجد میں نمازی کے آگے اس کی سجدہ گاہ سے (سُترہ کے بغیر) گزرنا مکروہ ہے، یہی قول زیادہ صحیح ہے، مسجد صغیر اور گھر میں نمازی اور دیوار قبلہ کے درمیان گزرنا مطلقاً مکروہ ہے۔ گھر اور چھوٹی مسجد ایک قطعۂ زمین کی مثل ہیں۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ھُوَ مَااخْتَارَہٗ شَمْسُ الْاَئِمَّۃِ"وَقَاضِیْ خَا نُ" وَصَاحِبُ "الْھِدَایَۃِ" وَاسْتَحْسَنَہٗ فِیْ "الْمُحِیْطِ" وَصَحَّحَہٗ الزَّیْلَعِیُّ،

ترجمہ: ''اسی قول کو شمس الائمہ، علامہ قاضی خان اور صاحبِ ہدایہ نے مختار اور صاحب ''محیط'' نے مستحسن اور ''زیلعی'' نے صحیح قرار دیا ہے'' ـــــــــ آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں:

یہ حکم اس پر محمول ہے کہ نمازی کے آگے کوئی سُترہ نہ ہو اور اگر سُترہ ہے تو چھوٹی مسجد یا مکان میں بھی نمازی کے آگے سے گزرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ مسجدِ صغیر کی تعریف میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: مَسْجِدٌ صَغِیْرٌ ھُوَ اَقَلُّ مِنْ سِتِّیْنَ ذِرَاعًا وَّقِیْلَ مِنْ اَرْبَعِیْنَ وَھُوَ الْمُخْتَارُ۔

ترجمہ: ''مسجدِ صغیر جو ساٹھ ذراع (تیس مروّجہ گز) سے کم ہو اور ایک قول یہ ہے کہ جو چالیس ذراع (بیس مروّجہ گز) سے کم ہو''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 342-343، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ غلام رسول سعیدی ان حوالوں کی بابت لکھتے ہیں:

''اس کا مفاد یہ ہے کہ جس مسجد کا طول اور عرض بیس یا تیس گز سے کم ہو، وہ مسجدِ صغیر ہے، اس میں اگر نمازی بغیر سُترہ کے نماز پڑھ رہا ہو تو نمازی اور دیوارِ قبلہ کے درمیان گزرنا مطلقاً مکروہ ہے۔ اور اگر مسجد کا طول اور عرض بیس یا تیس گز سے زیادہ ہو تو نمازی کی سجدہ گاہ سے دو یا تین صف کے فاصلہ سے بغیر سترہ کے بھی گزرنا بلا کراہت جائز ہے، کیونکہ اگر نمازی خشوع سے نماز پڑھ رہا ہو (یعنی یہ کہ اُس کی نظر سجدہ گاہ پر ہو) تو اُس کو اِتنے فاصلے سے

گزرنے والا نظر نہیں آئے گا۔آج کل شہر کی مساجد عموماً تیس گز سے بڑی ہوتی ہیں اس لئے ان میں نمازی کے آگے سے دوصفوں کے بعد گزرنا جائز ہے''۔

(شرح صحیح مسلم،جلد 1،ص:1326-1325)

مساجد میں عام طور پر جماعت ختم ہونے کے بعد جلد بازی میں نکلنے والے نمازی اِس مسئلے میں احتیاط نہیں کرتے ،اِسی طرح سے باہر سے آنے والے نمازی بھی عام طور پر احتیاط سے کام نہیں لیتے ،حالانکہ اِس مسئلے میں زیادہ مشقت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ توجہ اور احتیاط کی ضرورت ہے۔نمازیوں کو اِس حوالے سے حدیثِ پاک میں بیان کی گئی وعید پر توجہ دینا چاہئے۔

قضائے عمری ادا کرنے کا طریقہ

سوال:20

نماز قضائے عمری ادا کرنے کا شریعت میں کیا طریقہ ہے؟۔

سائل:جہانگیر عالم،کراچی

جواب :

قضا نمازوں کی ادائیگی فرض ہے،غزوۂ احزاب میں کفارِ مکہ کے شدید حملے کی وجہ سے چند نمازیں رہ گئیں تو رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے ساتھ قضا نمازوں کو باجماعت ادا فرمایا۔عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں:

اِنّ الْمُشْرِکِیْنَ شَغَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَنْ أَربعِ صَلواتٍ یومَ الخندَقِ، حَتّٰی ذَھَبَ مِنَ الَّیلِ مَاشَاءَ اللّٰہُ: فَأَمَرَ بِلالاً فَأَذَّنَ ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّی الظُّھرَ،ثُمَّ أَقَامَ فَصَلّی الْعَصرَ،ثُمَّ أَقَامَ فَصَلّی الْمَغرِبَ،ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّی الْعِشَاءَ ۔

ترجمہ:''غزوۂ خندق کے دن رسول اللہ ﷺ کی چار نمازیں مشرکین (کے محاصرے) کی وجہ سے جاتی رہیں،یہاں تک کہ رات کا کچھ حصہ گزر گیا،پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا،اُنہوں نے اذان دی اور پھر اقامت کہی تو،رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی،پھر اقامت کہی تو عصر کی نماز پڑھائی،پھر اقامت کہی تو مغرب کی نماز

پڑھائی، پھر اقامت کہی تو عشاء کی نماز پڑھائی"۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 179، مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث: 3555 واللفظ من سنن الترمذی)

ڈاکٹر وھبہ زوحیلی لکھتے ہیں: وَمَنْ شَغَلَتْ ذِمَّتَهُ بِأَيِّ تَكْلِيفٍ لَا تَبْرَأُ إِلَّا بِتَفْرِيغِهَا أَدَاءً أَوْ قَضَاءً، لِقَوْلِهِ ﷺ: "فَدَيْنُ اللّٰهِ أَحَقُّ أَنْ يُقْضٰى"، فَمَنْ وَجَبَتْ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ، وَفَاتَتْهُ بِفَوَاتِ الْوَقْتِ الْمُخَصَّصِ لَهَا، لَزِمَهُ قَضَاؤُهَا فَهُوَ اٰثِمٌ بِتَرْكِهَا عَمْدًا، وَالْقَضَاءُ عَلَيْهِ وَاجِبٌ، لِقَوْلِهِ ﷺ: فَإِذَا رَقَدَ أَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ أَوْ غَفَلَ عَنْهَا، فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُوْلُ: "وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ"، (طٰه: ۲۰/۱۴) وَلِلْبُخَارِيِّ: "مَنْ نَسِيَ صَلٰوةً فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذَالِكَ" وَمَجْمُوْعُ الْحَدِيْثِ الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ بَيْنَ الْبُخَارِيِّ وَمُسْلِمٍ: "مَنْ نَامَ عَنْ صَلٰوةٍ أَوْ نَسِيَهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا" فَمَنْ فَاتَتْهُ الصَّلٰوةُ لِنَوْمٍ أَوْ نِسْيَانٍ قَضَاهَا، وَبِالْأَوْلٰى مَنْ فَاتَتْهُ عَمَدًا بِتَقْصِيْرٍ يَجِبُ عَلَيْهِ قَضَاؤُهَا۔

ترجمہ: "کسی بھی مشکل کے سبب فرض نماز بروقت ادا نہ کر سکے تو جب تک ادا یا قضا کی صورت میں اداءِ فرض نہ کرے، آخرت کی جوابدہی سے بری الذمہ نہیں ہوگا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: فَدَيْنُ اللّٰهِ أَحَقُّ أَنْ يُقْضٰى، (ترجمہ: "اللہ کا قرض (یعنی فریضہ) ادائیگی کا زیادہ حق دار ہے، صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1953)، تو جس پر نماز فرض ہے اگر اُس نے اُسے مقررہ وقت پر ادا نہ کیا ہو تو اس کی قضا لازم ہے اور دانستہ ترک کرنے پر گنہگار اور فاسق و فاجر ہوگا اور اس پر قضا بہر حال واجب ہوگی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: فَإِذَا رَقَدَ أَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ أَوْ غَفَلَ عَنْهَا، فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُوْلُ: "وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ، طٰه: 14" ترجمہ: پس جب تم میں سے کسی کی نماز سوتے میں یا غفلت سے رہ جائے، تو جب بھی یاد آئے ادا کرلے، کیونکہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے: "میری یاد کے لئے نماز پڑھو"۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1454)

اور صحیح بخاری میں ہے: مَنْ نَسِیَ صَلوٰۃً فَلْیُصَلِّھَا اِذَا ذَکَرَھَا، لَا کَفَّارَۃَ لَھَا اِلَّا ذَالِکَ (ترجمہ: جس کی نماز بھولے سے رہ جائے، تو جیسے ہی اسے یاد آئے، پڑھ لے، اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 597)''، اور صحیحین میں حدیث ہے: مَنْ نَامَ عَنْ صَلوٰۃٍ أوْ نَسِیَھَا فَلْیُصَلِّھَا اِذَا ذَکَرَھَا، (ترجمہ: جس کی نماز نیند کے سبب یا بھولے سے رہ جائے تو جوں ہی یاد آئے، پڑھ لے)''۔ تو جب نیند یا نسیان کے سبب قضا لازم ہے تو اگر کوئی شخص دانستہ کوتاہی کر کے نماز مقررہ وقت پر نہ پڑھے تو اس کی قضا بطریق اولیٰ لازم ہوگی''۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد 2، ص: 1148)

قضا نمازیں مکروہ اوقات (طلوعِ آفتاب، زوال (نصف النہار) اور غروبِ آفتاب) کے علاوہ جب بھی فرصت ملے، ادا کرتے رہنا چاہئے اور ہر وقت کی نماز کے ساتھ یعنی وقتی نماز سے پہلے یا بعد میں اس وقت کی نماز کی کم از کم ایک قضا پڑھ لیں اور نیت اس طرح کریں مثلاً فجر یا ظہر یا عصر یا مغرب یا عشاء اور وتر کی پہلی یا آخری نماز جو میرے ذمے باقی ہے، اُسے بطور قضا ادا کرتا ہوں۔ نیت زبانی کرنا ضروری نہیں ہے، دل میں ارادہ کافی ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قضا نماز کے بارے میں واضح تاکیدات نہیں ہیں، تو اُس کا سبب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابۂ کرام کے بارے میں ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ بلا عذر دانستہ نماز قضا کر دیتے ہوں، جن دو صورتوں (یعنی نیند یا غفلت) کا بشری تقاضے کے تحت وقوع کا امکان تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے اُن کا حکم مذکورہ بالا احادیث میں واضح طور پر بیان فرما دیا۔ اور ایک صورت (یعنی حالتِ جنگ میں دشمن کا خوف) جو خود آپ کو صحابۂ کرام سمیت غزوۂ خندق میں پیش آئی، تو اُس میں آپ نے باجماعت قضا نماز پڑھی، لہٰذا خود آپ کے عمل سے قضا نماز پڑھنا ثابت ہے۔

''قضاءِ عمری'' عوام کی اصطلاح ہے یہ کوئی شرعی یا فقہی اصطلاح نہیں ہے۔ تاہم اس کے جو معنی ظاہری طور پر سمجھ میں آتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ کسی کی عمر بھر کی نمازیں خدانخواستہ قضا ہوگئی

ہوں۔ شریعت میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ کسی خاص دن یا خاص موقع پر کوئی خاص نماز پڑھ لی جائے تو اس سے عمر بھر کی قضا نمازوں کی تلافی ہو جائے گی، یہ محض جاہلانہ سوچ ہے۔ انسان کے عاقل و بالغ ہونے کے بعد جب سے اس پر نماز فرض ہوئی ہے، وہ جو بھی نمازیں وقت پر ادا نہیں کر سکا، وہ سب اس کے ذمے باقی ہیں اور ان سب کی قضا لازم ہے۔ قضا پڑھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے اپنی اس غفلت اور کوتاہی پر توبہ کرتے رہنا چاہئے، کیونکہ ایک بھی فرض نماز کسی عذر کے بغیر جان بوجھ کر چھوڑ دینا گناہِ کبیرہ ہے۔ پانچوں فرض نمازوں کی قضا فرض اور وتر کی قضا واجب ہے، سنتوں کی قضا واجب نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَالْقَضَاءُ فَرْضٌ فِي الْفَرْضِ وَوَاجِبٌ فِي الْوَاجِبِ وَسُنَّةٌ فِي السُّنَةِ ،

ترجمہ: ''فرض (نماز) کی قضاء فرض ہے اور واجب کی قضاء واجب ہے اور سنت کی قضاء سنت ہے (یعنی واجب نہیں ہے)، (عالمگیری، جلد: 1، ص: 121)۔

البتہ اگر کسی دن کسی کی فجر کی نماز قضا ہوگئی ہو تو اسی دن اشراق کے وقت (یعنی سورج نکلنے کے بیس منٹ بعد) قضا پڑھنے کی صورت میں اس دن کی فجر کی سنتوں کی قضا بھی کر لینی چاہئے، کیونکہ فجر کی سنتوں کی تاکید سب سے زیادہ آئی ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَالسُّنَنُ اٰكَدُهَا سُنَّةُ الْفَجْرِ اِتِّفَاقًا، ترجمہ: ''فجر کی سنتوں کی تاکید سب سے زیادہ ہے، اس پر ائمہ کا اتفاق ہے۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: لِمَا فِي الصَّحِيْحَيْنِ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا: لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ عَلٰى شَيْءٍ مِّنَ النَّوَافِلِ أَشَدَّ مِنْهُ تَعَاهُداً عَلٰى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ وَفِي "مُسْلِمٍ"، "رَكْعَتَا الْفَجْرِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا"، وَفِي "أَبِيْ دَاوٗدَ" لَاتَدَعُوْا رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ وَلَوْ طَرَدَتْكُمُ الْخَيْلُ"۔

ترجمہ: کیونکہ صحیحین میں ہے: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''نبی ﷺ نوافل میں کسی قسم کے نوافل کی اتنی سختی سے پابندی نہیں فرماتے تھے، جتنی کہ فجر کی دو سنتوں کی فرماتے تھے (بخاری: 1169، مسلم: 724)۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ''فجر کی دو سنتیں دنیا و مافیھا سے بہتر ہیں''، اور سنن ابوداؤد، جلد: 1، ص: 187 میں ہے: ''خواہ تمہیں (دشمن کے)

گھوڑے روندیں فجر کی دوسنتوں کو نہ چھوڑو۔(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:2،ص:394)''۔

قضاء نمازیں زیادہ ہوں تو تسبیحات میں تخفیف

سوال: 21

اگر کسی شخص کے ذمے قضاء نمازیں بہت زیادہ ہوں تو اُن نمازوں کی جلد ادائیگی کے لئے نماز میں کوئی تخفیف کی جاسکتی ہے؟۔

جواب:

فرض کی پچھلی دو(تیسری اور چوتھی) رکعات میں قراءت فرض یا واجب نہیں ہے، لہٰذا اگر نمازی کچھ بھی نہ پڑھے اور ایک تسبیح (سبحان اللہ) کی مقدار سکوت اختیار کر کے کھڑا رہے یا محض ایک بار ''سبحان اللہ'' پڑھے یا ایک دو آیات (مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ)تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔ اگر قضا نمازوں کی تعداد بہت زیادہ ہو تو قراءت اور تسبیحات میں تخفیف کر سکتے ہیں، یعنی رکوع وسجود میں ایک تسبیح پر اکتفا کرلیں، لیکن اسے عام معمول ہرگز نہ بنایا جائے، معمول کی نمازیں سنت کے مطابق پڑھی جائیں اور ان میں فرائض، واجبات، سُنن اور مستحبات وآداب کی رعایت کی جائے۔ اسی طرح وتر میں دعاءِ قنوت کی جگہ ''اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ'' پڑھ لے اور ''قعدۂ اخیرہ'' میں مکمل درود ودعا کی جگہ ''اَللّٰهُمَّ صل علیٰ محمدٍ'' پڑھ لے۔

امام احمد رضا قادری قدّس سرّہ العزیز لکھتے ہیں:

''قضا ہر روز کی نماز کی فقط بیس رکعتوں کی ہوتی ہے، دو فرض فجر کے، چار ظہر، چار عصر، تین مغرب، چار عشا کے، تین وتر۔ اور قضا میں یُوں نیت کرنی ضرور ہے کہ نیت کی میں نے پہلی فجر جو مجھ سے قضا ہوئی یا پہلی ظہر جو مجھ سے قضا ہوئی، اسی طرح ہمیشہ ہر نماز میں کیا کرے، اور جس پر قضا نمازیں بہت کثرت سے ہیں وہ آسانی کے لئے اگر یوں بھی ادا کرے تو جائز ہے کہ ہر رکوع اور ہر سجدہ میں تین تین بار سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ ، سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰی کی جگہ صرف ایک بار کہے، مگر یہ ہمیشہ ہر طرح کی نماز میں یاد رکھنا چاہئے کہ جب آدمی

رکوع میں پورا پہنچ جائے اس وقت سبحان کا سین شروع کرے اور جب عظیم کا میم ختم کرے اُس وقت رکوع سے سر اٹھائے اسی طرح جب سجدوں میں پورا پہنچ جائے، اُس وقت تسبیح شروع کرے اور جب پوری تسبیح ختم کر لے اُس وقت سجدہ سے سر اٹھائے۔ بہت سے لوگ جو رکوع سجدہ میں آتے جاتے یہ تسبیح پڑھتے ہیں بہت غلطی کرتے ہیں۔ ایک تخفیف کثرت قضا والوں کی یہ ہوسکتی ہے، دوسری تخفیف یہ کہ فرضوں کی تیسری اور چوتھی رکعت میں الحمد شریف کی جگہ فقط سبحان اللہ، سبحان اللہ، سبحان اللہ تین بار کہہ کر رکوع میں چلے جائیں مگر وہی خیال یہاں بھی ضرور ہے کہ سیدھے کھڑے ہو کر سبحان اللہ شروع کریں اور سبحان اللہ پورے کھڑے کہہ کر رکوع کے لئے سر جھکائیں۔ یہ تخفیف فقط فرضوں کی تیسری چوتھی رکعت میں ہے وتروں کی تینوں رکعتوں میں الحمد اور سورت دونوں ضرور پڑھی جائیں۔ تیسری تخفیف پچھلی التحیات کے بعد دونوں درودوں اور دعا کی جگہ صرف اَللّٰھُمَّ صلِ علی محمد و اٰلہ کہہ کر سلام پھیر دیں۔ چوتھی تخفیف وتروں کی تیسری رکعت میں دعائے قنوت کی جگہ اللہ اکبر کہہ کر فقط ایک یا تین بار رَبِّ اغْفِرْلِی کہے"۔

(فتاوی رضویہ، جلد:08، ص:185، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نماز کی رکعات میں تخفیف کس صورت میں جائز ہے

سوال:22

عشاء کی نماز میں اکثر لوگ چار فرض، دوسنت اور تین وتر پڑھتے ہیں، یہ کس صورت میں جائز ہے؟۔

جواب:

نمازِ عشاء کی ابتدائی چار رکعات سنّتِ غیر مؤکدہ اور چار رکعت فرض کے بعد دوسنت اور دو نفل، تین وتر اور پھر دو نفل، کل 17 رکعات پڑھی جاتی ہیں۔ بعض سنّتیں مؤکدہ ہیں جن کی ادائیگی کی تاکید آئی ہے، بغیر کسی عذر کے چھوڑنے پر گنہگار اور ترک کی عادت پر مستحق عذاب ہے۔

سنتِ غیر مؤکدہ (جنہیں "سنن الزوائد" بھی کہتے ہیں) پر شریعت میں اس قدر تاکید نہیں آئی۔ آپ نے جو صورت بیان کی ہے وہ درست ہے، یعنی اس پر کسی کو ملامت نہیں کرنی چاہئے، تاہم سُنَنِ غیر مؤکدہ اور نوافل پڑھنے پر جو اجر اور برکات ہیں ان سے محروم رہے گا۔

نمازِ جمعہ میں فرض کے بعد بقیہ رکعات کی ادائیگی بھی ضروری ہے

سوال:23

نمازِ جمعہ میں اکثر لوگ دو فرض باجماعت ادا کر کے چلے جاتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟۔

جواب:

نمازِ جمعہ میں فرض کی ادائیگی کے ساتھ سُنَنِ مؤکدہ بھی ادا کرنی چاہئیں، سوائے اس کے کہ کبھی کوئی ہنگامی صورتِ حال درپیش ہو، مثلاً بس، ٹرین یا فلائٹ کی روانگی کا وقت ہے یا کسی مریض کو ہنگامی طور پر ہسپتال پہنچانا ہے، وغیرہ۔ نمازِ جمعہ میں دو رکعت فرض کے علاوہ آٹھ رکعات (چار رکعات فرض سے قبل اور چار رکعات فرض کے بعد) سنت مؤکدہ ہیں۔ اور جمعہ کے بعد کی چار رکعات کے بعد دو رکعات سنت غیر مؤکدہ ہیں اور اس کے بعد دو رکعت نفل پڑھنا مستحب ہے۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَرْكَعُ قَبْلَ الْجُمُعَةِ اَرْبَعًا لَا يَفْصِلُ فِيْ شَيْءٍ مِنْهُنَّ،

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنھما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جمعہ سے پہلے ایک سلام کے ساتھ چار رکعت پڑھتے تھے، (ابن ماجہ:1129، مجمع الزوائد:195/2)"۔

عَنْ اَبِيْ اَيُّوْبَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّيْ قَبْلَ الظُّهْرِ اَرْبَعًا اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ۔ لَا يَفْصِلُ بَيْنَهُنَّ بِتَسْلِيْمٍ، وَقَالَ اِنَّ اَبْوَابَ السَّمَآءِ تُفْتَحُ اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ۔

ترجمہ: "حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: سورج ڈھلنے کے بعد رسول اللہ ﷺ چار رکعات ادا فرماتے اور اُن (چار رکعات) کے درمیان سلام نہ ہوتا (یعنی ایک سلام سے چار رکعات ادا فرماتے) اور آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک جب سورج ڈھلتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، (سنن ابن ماجہ:1157)"۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ السَّائِبِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّيْ أَرْبَعًا بَعْدَ أَنْ تَزُوْلَ الشَّمْسُ قَبْلَ الظُّهْرِ وَقَالَ: اِنَّهَا سَاعَةٌ تُفْتَحُ فِيْهَا أَبْوَابُ السَّمَآءِ وَأُحِبُّ أَنْ يَصْعَدَ لِيْ فِيْهَا عَمَلٌ صَالِحٌ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن سائب بیان فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ زوال کے بعد چار رکعات پڑھتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ (ایک مبارک) گھڑی ہے، اس میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، تو میں چاہتا ہوں کہ اس میں میرا نیک عمل عالَمِ بالا میں جائے، (سنن ترمذی:478)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت ہیں اور جمعہ کے بعد چھ رکعت سنت ہیں بایں طور کہ چار رکعت کے بعد سلام پھیر کر دو رکعت سنت پڑھی جائیں حسب ذیل احادیث سے جمعہ کی سنتوں پر استدلال کیا جاتا ہے:

عَنْ قَتَادَةَ أَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ كَانَ يُصَلِّيْ قَبْلَ الْجُمُعَةِ أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ وَبَعْدَهَا أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ قَالَ أَبُوْ إِسْحَاقَ وَكَانَ عَلِيٌّ يُصَلِّيْ بَعْدَ الْجُمُعَةِ سِتَّ رَكَعَاتٍ۔

ترجمہ: ''قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھتے تھے ابو اسحاق کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جمعہ کے بعد چھ رکعت پڑھتے تھے''۔

(امام عبدالرزاق بن ہمام، متوفی 211ھ المصنف، جلد:3، ص:247)

عَنْ أَبِيْ عَبْدِالرَّحْمَانِ السُّلَمِيِّ قَالَ: كَانَ عَبْدُاللّٰهِ يَأْمُرُنَا أَنْ نُصَلِّيَ قَبْلَ الْجُمُعَةِ أَرْبَعًا وَّبَعْدَهَا أَرْبَعًا حَتّٰى جَاءَنَا عَلِيٌّ فَأَمَرَنَا أَنْ نُّصَلِّيَ بَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ أَرْبَعًا۔

ترجمہ: ''ابو عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمیں جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد چار سنتیں پڑھنے کا حکم دیتے حتّٰی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور ہمیں حکم دیا کہ جمعہ کے بعد پہلے دو اور پھر چار سنتیں پڑھیں، (امام عبدالرزاق بن ہمام، متوفی 211ھ المصنف

جلد:3،ص:247،مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت الطبعۃ الاولیٰ 1390ھ)''۔

وَفِیْ حَدِیْثِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا، اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَتَطَوَّعُ قَبْلَ الْجُمُعَۃِ اَرْبَعَ رَکَعَاتٍ وَاخْتَلَفُوْا بَعْدَھَا، قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ: اَرْبَعًا وَّبِہٖ اَخَذَ اَبُوْ حَنِیْفَۃَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَھُمَا اللّٰہُ تَعَالٰی لِحَدِیْثِ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: مَنْ کَانَ مُصَلِّیًا بَعْدَ الْجُمُعَۃِ فَلْیُصَلِّ اَرْبَعَ رَکَعَاتٍ، وَقَالَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یُصَلِّیْ بَعْدَھَا سِتًّا، اَرْبَعًا ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، وَبِہٖ اَخَذَ اَبُوْ یُوْسُفَ رَحِمَہُ اللّٰہُ، وَقَالَ عُمَرُ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ اَرْبَعًا، فَمِنَ النَّاسِ مَنْ رَّجَّحَ قَوْلَ عُمَرَ بِالْقِیَاسِ عَلَی التَّطَوُّعِ بَعْدَ الظُّھْرِ، وَاَبُوْ یُوْسُفَ رَحِمَہُ اللّٰہُ اَخَذَ بِقَوْلِ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، فَقَالَ یَبْدَءُ بِالْاَرْبَعِ لِکَیْلَا یَکُوْنَ مُتَطَوِّعًا بَعْدَ الْفَرْضِ مِثْلَھَا۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے تھے اور جمعہ کے بعد کی سنتوں میں اختلاف ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ چار رکعت کہتے تھے، امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا اسی پر عمل ہے، کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے بعد نماز پڑھے، وہ چار رکعت پڑھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جمعہ کے بعد چھ رکعات نماز پڑھتے تھے، پہلے چار رکعات اس کے بعد دو رکعات، امام ابو یوسف کا اسی پر عمل ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے دو اور پھر چار رکعات نماز پڑھتے تھے۔ بعض علماء نے ظہر کے بعد کی سنتوں پر قیاس کرتے ہوئے حضرت عمر کے قول کو ترجیح دی اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دی اور کہا کہ جمعہ کے بعد پہلے چار رکعت پڑھے تا کہ ایک فرض کے بعد اس کی مثل نفل پڑھنا لازم نہ آئے۔ (علامہ شمس الدین بن محمد بن احمد متوفی:483، المبسوط جلد:1، ص:157، مطبوعہ: دار المعرفت بیروت)''۔

ہر چند کہ علامہ سرخسی نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت علی نے جمعہ کے بعد پہلے چار اور پھر دو رکعات پڑھیں، لیکن ہم نے جب کتب حدیث کا تتبع کیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی جو روایات سامنے آئیں ان میں پہلے دو رکعات اور پھر چار رکعات کا ذکر ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں اس طرح کی متعدد روایات ہیں، ہم نے ایک کا ذکر کر دیا ہے دیگر کتب حدیث سے مزید احادیث ملاحظہ فرمائیں:

عَنْ عَطَاءٍ قَالَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا صَلَّى الْجُمُعَةَ صَلَّى بَعْدَهَا سِتَّ رَكَعَاتٍ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ أَرْبَعًا۔

ترجمہ: عطاء کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جمعہ کے بعد چھ رکعات پڑھتے تھے پہلے دو رکعات پھر چار رکعات، (حافظ ابو بکر بن ابی شیبہ متوفی :235ھ، المصنف، جلد:2 ص:132، مطبوعہ: ادارۃ القرآن، کراچی)۔

عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنَّهُ أَمَرَ أَنْ يُصَلِّيَ بَعْدَ الْجُمُعَةِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ أَرْبَعًا۔

ترجمہ: ''حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ جمعہ کے بعد پہلے دو رکعتیں پڑھی جائیں پھر چار، (امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، متوفی:279ھ، جامع ترمذی، ص:101، مطبوعہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)۔

رُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ كَانَ يُصَلِّي بَعْدَ الْجُمُعَةِ رَكْعَتَيْنِ فِي بَيْتِهِ وَابْنُ عُمَرَ بَعْدَ النَّبِيِّ ﷺ صَلَّى فِي الْمَسْجِدِ بَعْدَ الْجُمُعَةِ رَكْعَتَيْنِ وَصَلَّى بَعْدَ الرَّكْعَتَيْنِ أَرْبَعًا۔

ترجمہ: ''نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپ جمعہ کے بعد اپنے گھر میں دو رکعات پڑھتے تھے اور نبی ﷺ کے بعد حضرت ابن عمر جمعہ کے بعد مسجد میں پہلے دو رکعات پڑھتے پھر چار، (امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، متوفی:279ھ، جامع ترمذی، ص:101)''۔

عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ عَنْ عَطَاءٍ قَالَ أَبُو إِسْحٰقَ حَدَّثَنِي غَيْرَ مَرَّةٍ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ قَامَ فَصَلَّى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ۔

ترجمہ: ''عطاء نے روایت کیا کہ ابو اسحاق نے ایک سے زائد بار مجھ سے بیان کیا کہ میں نے حضرت ابن عمر کے ساتھ جمعہ کے دن نماز پڑھی، پس جب انہوں نے سلام پھیرا تو کھڑے ہوئے اور دو رکعات پڑھیں، پھر کھڑے ہوئے اور چار رکعات پڑھیں''۔

(امام ابو جعفر طحاوی، متوفی 321ھ شرح معانی الآثار، جلد:1، ص:199)

عَنْ أَبِيْ عَبْدِالرَّحْمانِ السَّلَمِيِّ قَالَ قَدِمَ عَلَيْنَا عَبْدُاللّٰهِ فَكَانَ يُصَلِّيْ بَعْدَالْجُمُعَةِ أَرْبَعًا فَقَدِمَ بَعْدَهُ عَلِيٌّ فَكَانَ اِذَا صَلَّى الْجُمُعَةَ صَلّٰى بَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ وَاَرْبَعًا۔

ترجمہ: ''عبدالرحمٰن سلمی بیان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس حضرت عبداللہ بن مسعود آئے، وہ جمعہ کے بعد چار سنتیں پڑھتے تھے، ان کے بعد حضرت علی تشریف لائے، تو وہ جب جمعہ پڑھ لیتے تو اس کے بعد پہلے دو رکعات اور پھر چار رکعات (سنتیں) پڑھتے، (امام ابوجعفر طحاوی متوفی 321ھ شرح معانی الآثار، جلد: 1، ص: 199، مطبوعہ: مطبع مجتبائی لاہور)''۔

امام طحاوی نے حضرت ابن عمر اور حضرت علی کی جو روایات ذکر کی ہیں، وہ یہی ہیں کہ جمعہ کے بعد پہلے دو اور پھر چار رکعات پڑھے۔ پھر ذکر کیا ہے کہ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ جمعہ کے بعد پہلے چار رکعات پڑھے اور پھر دو، کیونکہ اگر جمعہ کے بعد پہلے دو رکعات پڑھیں تو یہ سنت فرض کے مشابہ ہو جائیں گے، کیونکہ دو رکعات جمعہ فرض ہے، اس کے بعد دو رکعت سنت پڑھی گئیں تو سنت اور فرض مشابہ ہو جائیں گے۔ اس مشابہت کو دور کرنے کیلئے جمعے کے بعد پہلے چار رکعات پڑھے اور پھر دو رکعات۔ لیکن علامہ شمس الدین سرخسی نے اس دلیل کو رد کر دیا ہے فرماتے ہیں: وَهٰذَا لَيْسَ بِقَوِيٍّ فَاِنَّ الْجُمُعَةَ بِمَنْزِلَةِ أَرْبَعِ رَكَعَاتٍ لِأَنَّ الْخُطْبَةَ شَطْرُ الصَّلٰوةِ۔

ترجمہ: ''امام ابو یوسف کی یہ دلیل قوی نہیں ہے، کیونکہ نماز جمعہ چار رکعات کے حکم میں ہے، اس لئے کہ خطبہ نصف نماز ہے، (المبسوط، جلد: 1، ص: 157، مطبوعہ: دار المعرفۃ بیروت)''۔

بہر حال ہمارے فقہاء نے امام ابو یوسف کے قول کو ترجیح دی ہے۔ علامہ ابن نجیم نے ذخیرہ، تجنیس، بدائع اور منیۃ المصلی کے حوالے سے لکھا ہے کہ جمعہ کے بعد پہلے چار رکعات اور پھر دو رکعات نماز پڑھے، (البحر الرائق، جلد: 2، ص: 49، مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ)''۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ علامہ شمس الدین نے حضرت علی سے جو پہلے چار اور پھر دو رکعات نماز کو روایت کیا ہے، اس میں ان سے تسامح ہوا ہے، کیونکہ تمام اُمہات کتب حدیث میں حضرت علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جمعہ کے بعد پہلے دو رکعات اور پھر چار رکعات کی

روایت ہے۔اور دوسری بات یہ ہے کہ جب بقول علامہ سرخسی امام ابو یوسف کی دلیل قوی نہیں ہے،تو آثارِ صحابہ کے مطابق جمعہ کے بعد پہلے دو رکعات اور پھر چار رکعات نماز پڑھنی چاہئے۔
علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ مالکیہ، حنابلہ اور بعض اصحاب شافعی جمعہ سے پہلے سنت پڑھنے کے قائل نہیں ہیں، کیونکہ وہ جمعہ کو عید پر قیاس کرتے ہیں اور جس طرح عید سے پہلے نماز نہیں ہے، جمعہ سے پہلے بھی نہیں ہے، (زاد المعاد، جلد: 1، ص: 119، 118)۔ہم نے اس بحث کے شروع میں جمعہ کی نماز سے پہلے چار رکعات کے ثبوت میں مصنف عبدالرزاق سے دو حدیثیں ذکر کی ہیں، یہ حدیثیں ان حضرات پر حجت ہیں اور ان کے قیاس کے مقابلہ میں حدیث پر عمل کرنا زیادہ قرینِ قیاس ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد: 02،ص: 444 تا 447)۔
آپ نے جن لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ جمعہ کے بعد مسجد میں سنتیں نہیں پڑھتے، اگر یہ لوگ بقیہ رکعتیں اپنے گھروں میں جا کر پڑھتے ہوں تو بہتر ہے۔لیکن اگر سرے سے پڑھتے ہی نہ ہوں اور فقط دو رکعت فرض پر اکتفا کرتے ہوں،تو اُن کا یہ عمل شرعا درست نہیں ہے۔اور سنتِ مؤکدہ کے ترک کو معمول بنانے پر گنہگار ہوں گے۔سنتِ مؤکدہ کی ادائیگی کی شریعت مطہرہ میں سخت تاکید آئی ہے، بلا عذر سنت مؤکدہ کا چھوڑنا گناہ ہے۔تاہم سنتوں اور نوافل کا گھر پر پڑھنا بہتر ہے، ممکن ہے کہ کچھ لوگ گھر پر پڑھتے ہوں۔
علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وَالسُّنَّةُ نَوْعَانِ : سُنَّةُ الْهُدىٰ وَتَرْكُهَا يُوجِبُ اِسَاءَةً وَكَرَاهِيَةً۔
ترجمہ:''سنت کی دو قسمیں ہیں، ایک ''سُنَّتُ الھُدیٰ'' ہے اور اس کا ترک کرنا گناہ اور کراہیت کا سبب بنتا ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 1،ص: 196، بیروت)''۔
مزید لکھتے ہیں: قولہ: (وَسُنَّ مُؤَكَّدًا)أَیْ اِسْتِنَانًا مُؤَكَّدًا بِمَعْنٰی اَنَّهٗ طَلَبَ طَلَبًا مُؤَكَّدًا زِيَادَةً عَلٰى بَقِيَّةِ النَّوَافِلِ،وَلِهٰذَا كَانَتِ السُّنَّةُ الْمُؤَكَّدَةُ قَرِيْبَةً مِنَ الْوَاجِبِ فِیْ لُحُوْقِ الْاِثْمِ كَمَا فِی "الْبَحْرِ" وَيَسْتَوْجِبُ تَارِكُهَا التَّضْلِيْلَ وَاللَّوْمَ كَمَا فِی "التَّحْرِيْرِ" :أَیْ عَلٰى سَبِيْلِ الْاِصْرَارِ بِلَا عُذْرٍ كَمَا فِیْ شَرْحِهٖ۔
ترجمہ:''علامہ حصکفی کا یہ قول: (تاکید کے ساتھ سنت قرار دیا گیا ہے) یعنی اس کا سنت ہونا

تاکید کے ساتھ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ باقی نوافل کے مقابلے میں شارع علیہ السلام نے زیادہ تاکید کے ساتھ اس کے کرنے کا مطالبہ کیا ہے، لہٰذا سنت مؤکدہ اس معنی میں واجب کے قریب ہے کہ اس کا ترک کرنا گناہ کا سبب ہے، جیسا کہ ''البحر'' میں ہے۔ سنت کا تارک گمراہ قرار دیئے جانے اور ملامت کا سزاوار ہے، جیسا کہ ''التحریر'' میں ہے: یعنی جو سنت کو بلا عذر چھوڑے اور اس کے ترک پر اصرار کرے، جیسا کہ اس کی شرح میں ہے''۔

(ردالمختار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 392، بیروت)

نمازِ شکرانہ کا طریقہ

سوال: 24

نماز شکرانہ کے نفل ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے اور نیت کس طرح ہوگی؟۔

(حامد اکرم، حاجی پورہ، مسلم کالونی سیالکوٹ)

جواب:

اس مسئلے کے مکمل فہم کے لئے پہلے یہ احادیثِ مبارکہ ملاحظہ کریں۔

عَنْ أَبِی ذَرٍّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: "یُصْبِحُ عَلیٰ کُلِّ سُلَامیٰ مِنْ أَحَدِکُمْ صَدَقَةٌ، فَکُلُّ تَسْبِیحَةٍ صَدَقَةٌ، وَکُلُّ تَحْمِیدَةٍ صَدَقَةٌ، وَکُلُّ تَهْلِیلَةٍ صَدَقَةٌ، وَکُلُّ تَکْبِیرَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْیٌ عَنِ الْمُنْکَرِ صَدَقَةٌ، وَیُجْزِیُٔ مِنْ ذٰلِكَ رَکْعَتَانِ یَرْکَعُهُمَا مِنَ الضُّحیٰ،

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب کوئی صبح اٹھتا ہے تو اس کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہوتا ہے، اس کا ہر بار ''سبحان اللّٰہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار ''الحمد للّٰہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار ''اللّٰہ اکبر'' کہنا صدقہ ہے، کسی شخص کو نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے، کسی کو برائی سے روک دینا صدقہ ہے اور چاشت کی دو رکعت نماز پڑھ لینا ان سب کے لئے کفایت کرتا ہے''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1670)

"سُلامی" انگلیوں کی ہڈیوں اور ہتھیلی کو کہتے ہیں، یہاں اس سے مراد پورے بدن کی ہڈیاں اور مفاصل (جوڑ,Joints) مراد ہیں۔ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ أَنَّ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِیِّ ﷺ قَالُوْا لِلنَّبِیِّ ﷺ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ، ذَهَبَ اَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالْأُجُوْرِ: یُصَلُّوْنَ کَمَا نُصَلِّیْ، وَیَصُوْمُوْنَ کَمَا نَصُوْمُ، وَیَتَصَدَّقُوْنَ بِفُضُوْلِ أَمْوَالِهِمْ۔ قَالَ: أَوَ لَیْسَ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ مَا تَصَّدَّقُوْنَ؟ إِنَّ بِکُلِّ تَسْبِیْحَةٍ صَدَقَةٌ، وَکُلِّ تَکْبِیْرَةٍ صَدَقَةٌ ، وَکُلِّ تَحْمِیْدَةٍ صَدَقَةٌ، وَکُلِّ تَهْلِیْلَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْیٌ عَنِ الْمُنْکَرِ صَدَقَةٌ، وَفِیْ بُضْعِ أَحَدِکُمْ صَدَقَةٌ، قَالُوْا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ، أَیَأْتِیْ أَحَدُنَا شَهْوَتَهٗ وَیَکُوْنُ لَهٗ فِیْهَا أَجْرٌ؟ قَالَ: "أَرَأَیْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِیْ حَرَامٍ أَکَانَ عَلَیْهِ فِیْهَا وِزْرٌ؟ فَکَذٰلِكَ إِذَا وَضَعَهَا فِی الْحَلَالِ کَانَ لَهٗ أَجْرٌ"۔

ترجمہ:''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے بعض صحابہ نے آپ سے کہا: یارسول اللہ ﷺ! مالدار لوگ تو (ڈھیروں) ثواب کما گئے، وہ ہماری طرح (فرض اور نفل) نمازیں پڑھتے ہیں، ہماری طرح روزے رکھتے ہیں اور اپنے زائد مال سے (اللہ کی راہ میں) صدقہ دیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بھی صدقات کے اسباب نہیں بنائے؟ ہر بار ''سبحان اللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار ''اللہ اکبر'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار ''الحمدللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار ''لا الہ الا اللہ'' کہنا صدقہ ہے۔اور نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے اور برائی سے روکنا صدقہ ہے، (جائز طریقے سے) ازدواجی عمل صدقہ ہے۔صحابۂ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنی نفسانی خواہش پوری کرتا ہے، کیا اس میں بھی اس کے لئے اجر ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ذرا سوچو! اگر کوئی شخص حرام طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرے، تو کیا اس پر گناہ نہیں ہوگا؟، پس اسی طرح اگر وہ جائز طریقے سے اپنی خواہش پوری کرتا ہے تو اسے اجر ملے گا''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث:2218)

عَنْ عَائِشَةَ تَقُوْلُ: إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ:" إِنَّهٗ خُلِقَ کُلُّ إِنْسَانٍ مِنْ بَنِیْ آدَمَ عَلٰی

سِتِّيْنَ وَثَلَاثِمِائَةِ مَفْصِلٍ: فَمَنْ كَبَّرَاللّٰه، وَحَمِدَاللّٰه، وَهَلَّلَ اللّٰه، وَسَبَّحَ اللّٰه، وَاسْتَغْفَرَاللّٰه، وَعَزَلَ حَجراً عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ، أَوْ شَوْكَةً أَوْ عَظْمًا عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ وَأَمَرَ بِمَعْرُوْفٍ، أَوْ نَهٰى عَنْ مُنْكَرٍ، عَدَدَ تِلْكَ السِّتِّيْنَ وَالثَّلَاثِمِائَةِ السُّلَامٰى فَاِنَّهٗ يَمْشِى يَوْمَئِذٍ وَقَدْ زَحْزَحَ نَفْسَهٗ عَنِ النَّارِ"۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر انسان 360 جوڑوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، پس جس شخص نے ''اَللّٰہُ اَکْبَر'' کہا، ''اَلْحَمْدُلِلّٰہ'' کہا، ''لَااِلٰہَ اِلَّااللّٰہ'' کہا، ''سُبْحَانَ اللّٰہ'' کہا، ''اَسْتَغْفِرُاللّٰہ'' کہا، لوگوں کے راستے سے کوئی پتھر یا کانٹا یا ہڈی ہٹائی اور نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا (اس نے یہ کام مجموعی طور پر) 360 جوڑوں کی تعداد کے برابر کیے، تو اُس دن وہ اس حال میں چل رہا ہوگا کہ اس نے اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے آزاد کر لیا ہے، (صحیح مسلم: رقم الحدیث: 2219)''۔

صحیح مسلم کی حدیث نمبر: 2222 اور 2224 میں مندرجہ ذیل امور کو بھی صدقے سے تعبیر فرمایا گیا ہے:

(الف) ایسا عملِ خیر جو اپنے لئے بھی نفع مند ہو اور دوسروں کو بھی اس کا فائدہ پہنچانا، (ب) مصیبت زدہ کی مدد کرنا، (ج) دو افراد کے درمیان انصاف کرنا، (د) سوار ہونے یا بار برداری میں کسی کی مدد کرنا۔

قَالَ الْقَاضِىْ: يَحْتَمِلُ تَسْمِيَتُهَا صَدَقَةً أَنَّ لَهَا أَجراً كَمَا لِلصَّدَقَةِ أَجْرٌ وَاِنَّ هٰذِهِ الطَّاعَاتِ تُمَاثِلُ الصَّدَقَاتِ فِى الْاُجُوْرِ وَسَمَّاهَاصَدَقَةً عَلٰى طَرِيْقِ الْمُبَالَغَةِ وَتَجْنِيْسِ الْكَلَامِ وَقِيْلَ مَعْنَاهُ أَنَّهَا صَدَقَةٌ عَلٰى نَفْسِهٖ۔

ترجمہ: ''قاضی عیاض نے کہا: ان (تسبیحات اور دیگر امور) کو ''صدقہ'' سے تعبیر کرنے کا ایک سبب یہ ہے کہ جس طرح صدقے کے لئے اجر ہے، اسی طرح اِن امور کے لئے بھی اجر ہے اور یہ کہ اطاعتِ الٰہی پر مبنی ان امور کا نام مبالغے اور معنوی مناسبت کی بناء پر صدقہ رکھ دیا اور ایک معنی یہ ہیں کہ یہ امور انجام دینے والا اپنے اوپر صدقہ کر رہا ہے''۔

(صحیح مسلم، مع شرح النووی، ج: 3، ص: 91)

انسان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے حد و بے حساب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا،

ترجمہ: ''اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو انہیں شمار نہ کر سکو گے، (ابراہیم: 34)''۔

اِن بے شمار نعمتوں میں سے ایک نعمتِ وجود اور نعمتِ جان ہے۔ حدیثِ مبارک کی رو سے انسانی وجود میں 360 جوڑ (Joints) ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اس مشین کے تمام پرزے اور 360 جوڑ فعّال (Active) ہوتے ہیں تو انسان نشست و برخاست، حرکت وسکون اور چلنے پھرنے کے قابل ہوتا ہے اور اگر یہی جوڑ کام کرنا چھوڑ دیں تو انسان کا وجود لکڑی کے ایک شہتیر کی مانند ہو جاتا ہے کہ وہ حرکت کے قابل نہیں رہتا۔ فالج زدہ شخص (Paralized) کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ سانس آ جا رہا ہے، مگر حرکت کے قابل نہیں ہوتا اور دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ تو اگر انسان ایک بار حرکت کرے تو بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ 360 بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ پھر ان احادیث میں اس تشکّرِ نعمتِ باری تعالیٰ کی مختلف صورتیں بیان فرمائی گئی ہیں، جن میں مختلف تسبیحات، اَذکار واَوراد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ضرورت منداور مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کرنا، دو افراد کے درمیان صلح کرانا اور کسی کو نیکی کی کوئی بات کہہ دینا وغیرہ سب شامل ہیں، پھر ان کو 'صَدَقہ' سے تعبیر کیا ہے اور قرآنِ مجید میں یہ کلمہ کئی معنی کے لئے آیا ہے، جن میں سے چند معانی یہ ہیں: (۱) مالی صدقہ وخیرات کرنا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) وَأَنْفِقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَاكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَّأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِيْ إِلٰى أَجَلٍ قَرِيْبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ،

ترجمہ: ''اور جو رزق ہم نے تمہیں عطا کیا ہے، اس میں سے (راہِ حق میں) خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت (سر پر) آ جائے، پھر وہ کہے اے پروردگار! تو نے مجھے کچھ دنوں کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ دیتا اور نیک بندوں میں سے ہو جاتا، (المنافقون: 10)''۔

(۲) خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا،

ترجمہ: ''ان کے مال میں سے صدقہ لیجئے جس کے ذریعے آپ انہیں (بخل وحرص) سے پاک کریں اوران کے (باطن کا) تزکیہ کریں، (التوبہ:103)''۔

(۳) وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ،

ترجمہ: اور تورات میں ہم نے ان پر فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں (کا بھی) بدلہ ہے، تو جو شخص بدلہ (یعنی اپنے قصاص کا حق) معاف کردے تو یہ معافی اس کے لئے (گناہوں کا) کفارہ ہوگی، (المائدہ:45)''۔

اس آیت میں اپنا حق معاف کرنے کو بھی صدقے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(٤) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهٖ إِلَّا أَنْ يَّصَّدَّقُوا،

ترجمہ: ''کسی مومن کے لئے روا نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے، مگر یہ کہ خطا سے (یہ فعل سرزد ہوجائے)، اور جو شخص کسی مومن کو (نادانستہ یعنی) خطا سے قتل کردے، تو (اس کا کفّارہ) ایک غلام آزاد کرنا ہے اور مقتول کے وارثوں کو دِیَت (یعنی خون بہا) دینا ہے، سوائے اس کے کہ وہ (یعنی مقتول کے ورثاء اپنے اس حق کو) معاف کردیں، (النساء:92)''۔

اس آیت میں بھی اپنا حق معاف کردینے کو ''تصدُّق'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

(۵) فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَآ أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا،

ترجمہ: ''توجب وہ (برادرانِ یوسف) ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: اے عزیزِ (مصر!) ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو تکلیف پہنچی ہے اور ہم حقیری پونجی لے کر آئے ہیں، تو آپ ہمیں غلّہ پورا ناپ کردے دیجئے اور ہم پر صدقہ کیجئے، (یوسف:88)''۔

اس آیت میں کسی کو اس کے حق سے زیادہ دینے کو صدقہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

(٦) وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيٰماً وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلاً مَّعْرُوْفاً۔

ترجمہ: ''اور کم عقلوں کو اپنے وہ مال نہ دو جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری گزر اوقات کا ذریعہ بنایا ہے اور اس مال میں سے ان کو کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے خیر خواہی کی بات کرو، (النساء: 05)''۔

اس آیت میں اچھی بات کہنے کو بھی نیکی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض بزرگوں نے کہا کہ اگر آدمی فجر سے عشاء تک فرض، واجب، سنت مؤکدہ اور غیر مؤکدہ کو ملا کر کل چالیس رکعات باقاعدگی سے پڑھا کرے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی ادائیگی کی نیت کے ساتھ اپنی نعمتِ وجود کے تشکر کی بھی نیت کرے تو کسی حد تک اس حق کی ادائیگی ہو جائے گی، کیونکہ ہر رکعت کے رکوع اور سجود میں کم از کم تین تسبیحات پڑھنا مستحب ہے اور یہ کل 9 تسبیحات بن جاتی ہیں اور مجموعی طور پر چالیس رکعات میں 360 تسبیحات ہو جائیں گی۔ اس طرح سے نعمتِ وجود کا شکر بھی ادا ہو جائے گا۔

نمازِ شکر بطورِ خاص مشروع نہیں ہے، البتہ بعض اہم مواقع پر سجدۂ شکر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ تاہم اگر کوئی کسی موقع پر اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کا بطورِ خاص نماز کے ذریعے شکر ادا کرنا چاہے، تو عام نوافل کی طرح جتنے نوافل چاہے انفرادی طور پر پڑھ لے۔ نمازِ شکر کی باجماعت نماز ثابت نہیں ہے، البتہ اجتماعی طور پر دعا کی جا سکتی ہے اور دعا کو بھی رسول اللہ ﷺ نے ''مغزِ عبادت'' اور ''عینِ عبادت'' قرار دیا ہے۔

فرض نماز میں امام کے پیچھے کیا پڑھنا ضروری ہے

سوال: 25

امام کے پیچھے نیت باندھنے کے بعد مقتدی کو نماز میں کیا پڑھنا ضروری ہوتا ہے؟۔

جواب:

امام کی اقتداء میں تکبیرِ تحریمہ کہنا فرض ہے اور امام کے پیچھے حالتِ قیام میں

ثنا(سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ۔۔۔۔۔ وَلَااِلٰهَ غَيْرُكَ تک) پڑھنا سنت ہے، البتہ اگر امام نے جہراً قراءت شروع کر دی ہو تو مقتدی ثنا نہیں پڑھے گا۔ نماز میں اگر چہ اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھنا سنت ہے، لیکن چونکہ یہ قراءت کے تابع ہیں اور مقتدی پر قراءت نہیں ہے، اس لئے باجماعت نماز میں ''تعوّذ'' اور ''تَسمیہ'' پڑھنا اس کے لئے مسنون نہیں ہے، ہاں مقتدی کی اگر کوئی رکعت رہ گئی ہے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد جب وہ اپنی بقیہ رکعت پڑھے گا تو ''اعوذ باللہ'' اور ''بسم اللہ'' بھی پڑھے گا۔ سورۂ فاتحہ سے پہلے اعوذ باللہ صرف پہلی رکعت میں پڑھے گا اور بسم اللہ تمام رکعات میں سورۂ فاتحہ کے شروع میں پڑھنا سنت ہے۔ امام کا جہری نماز میں جب وہ سورۂ فاتحہ مکمل کر لے تو ''وَلَا الضَّآلِّيْن'' کے بعد آہستہ آمین کہنا۔ رکوع میں تین بار ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم'' پڑھنا اور تین سے زیادہ طاق بار مستحب ہے۔ رکوع سے اٹھتے ہوئے امام کے ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہنے کے بعد مقتدی کا ''اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْد'' کہنا۔ دونوں سجدوں میں تین بار ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى'' کہنا سنت ہے اور تین سے زائد طاق بار مستحب ہے۔ رکوع میں جاتے ہوئے اور سجود میں جاتے اور اٹھتے ہوئے ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہنا سنت ہے، قعدۂ اولیٰ اور قعدۂ اخیرہ میں پوری ''اَلتَّحِيَّات'' پڑھنا واجب ہے۔ قعدۂ اخیرہ میں درود شریف پڑھنا سنت ہے اور دعا بھی سنت ہے۔ رمضان المبارک میں وتر کی باجماعت نماز میں دعاءِ قنوت پڑھنا واجب ہے، مقتدی کے لئے امام کے ساتھ تکبیرِ قنوت کہنا واجب ہے اور عیدین کی زائد تکبیرات اور نماز عید کی دوسری رکعت میں تکبیرِ رکوع کہنا بھی واجب ہے۔ حدیث مبارک میں ہے: عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَانَ اِذَاسُئِلَ هَلْ يَقْرَاُ اَحَدٌ خَلْفَ الْاِمَامِ؟ قَالَ: اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ خَلْفَ الْاِمَامِ فَحَسْبُهٗ قِرَاءَةُ الْاِمَامِ وَاِذَاصَلّٰى وَحْدَهٗ فَلْيَقْرَاْ۔

ترجمہ: ''نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب سوال کیا جاتا کہ کیا کوئی شخص امام کے پیچھے قراءت کرے؟ تو وہ فرماتے: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قراءت اس کے لئے کافی ہے اور جب اکیلا نماز پڑھے تو

قراءت کرے،(الموطا امام مالک، باب ترک القراءۃ خلف الامام،ص:68)‘‘۔

کتنے وقفے کے بعد نماز قضا ہو جاتی ہے

سوال:26

نمازِ فجر،ظہر،عصر،مغرب اور عشاء میں کتنی دیر بعد قضاء کی نیت کی جائے گی؟۔

جواب :

ہر نماز کا وقت اُس نماز کے وقت کے اختتام تک ہے یعنی نمازِ فجر کا وقت طلوعِ آفتاب تک ہے،نمازِ ظہر کا وقت، وقتِ عصر داخل ہونے تک ہے،نمازِ عصر کا وقت غروبِ آفتاب تک ہے،مغرب کا وقت غروبِ آفتاب سے غروبِ شفق (یعنی جانبِ مغرب سرخی ختم ہونے کے بعد ایک روشنی جنوباً اور شمالاً پھیلتی ہے، جسے شفق کہا جاتا ہے)یعنی عشاء کا وقت داخل ہونے تک ہے،نمازِ عشاء اور وتر کا وقت طلوعِ فجر تک رہتا ہے۔اگر نماز کا وقت ختم ہو جائے تو پھر قضاء کی نیت سے اس کو ادا کیا جائے گا۔آج کل مساجد میں نمازوں کے اوقات کے دائمی نقشے آویزاں ہوتے ہیں،ان میں پانچوں نمازوں کا وقت شروع ہونے، طلوعِ آفتاب، زوال اور غروبِ آفتاب کے اوقات درج ہوتے ہیں ۔وقتاً فوقتاً انہیں دیکھتے رہنا چاہئے،بعض اخبارات بھی روزانہ کے اوقات نماز شائع کرتے ہیں ۔اسی طرح مساجد میں روزانہ طلوعِ آفتاب،زوال اور غروبِ آفتاب اور نمازِ اشراق کے اوقات کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے۔

دعا کا طریقہ

سوال:27

نماز ختم کرنے کے بعد شریعت میں دعا کا کیا طریقہ ہے،دعا میں کیا پڑھنا چاہئے؟۔

جواب :

پہلے دعا کے آداب بیان کئے جاتے ہیں۔ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا آدابِ دعا میں سے ہے،احادیثِ مبارکہ میں ہے:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ فِي الدُّعَاءِ لَمْ يَحُطَّهُمَا حَتّٰى يَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَهٗ۔

ترجمہ: ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب دعا میں ہاتھ بلند فرماتے، تو ہاتھوں کو نیچے نہ گراتے یہاں تک کہ چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر لیا کرتے، (سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 3386)''۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: الْمَسْأَلَةُ: أَنْ تَرْفَعَ يَدَيْكَ حَذْوَ مَنْكِبَيْكَ أَوْ نَحْوَهُمَا، وَالْاِسْتِغْفَارُ: أَنْ تُشِيْرَ بِإِصْبَعٍ وَّاحِدَةٍ، وَّالْاِبْتِهَالُ: أَنْ تَمُدَّ يَدَيْكَ جَمِيْعًا۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ سوال یعنی دعا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں کے برابر اٹھاؤ اور استغفار کا طریقہ یہ ہے کہ ایک انگلی سے اشارہ کرو اور گڑگڑا کر سوال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلاؤ''۔

(سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 1483)

عَنْ مَالِكِ بْنِ يَسَارٍ السَّكُوْنِيِّ ثُمَّ الْعَوْفِيِّ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: إِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَسَلُوْهُ بِبُطُوْنِ أَكُفِّكُمْ، وَلَا تَسْأَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا۔

ترجمہ: ''حضرت مالک بن یسار سکونی، پھر عوفی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اپنی ہتھیلیوں کے باطن سے سوال کرو اور ہتھیلیوں کی پُشت سے سوال نہ کرو (یعنی دعا کے وقت ہاتھ کی ہتھیلی کا رُخ آسمان کی طرف ہونا چاہیے)، (سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 1481)''۔

وہ فرض نمازیں جن کے بعد سنتیں ہیں یعنی ظہر و جمعہ و مغرب و عشاء، مختصر دعا کرنا چاہیے، اُن نمازوں کے بعد صرف ''اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ (تا) يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ'' یا اس کے برابر کوئی دعا پڑھیں، اس سے زیادہ لمبی دعائیں نہ کی جائیں۔ نماز کے بعد مسنون تسبیحات واذکار اور اُس کے بعد دعا کریں۔ جو دعائیں قرآن وحدیث میں وارد ہوئی ہیں، اُن کے ساتھ دعا کرے، تاہم جو دعائیں قرآن کریم میں مذکور ہیں، دعا میں

اُن کو پڑھتے وقت اُن سے تلاوت کا ارادہ نہیں ہوتا۔علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:وَاَوَّلِ الدُّعَاءِ وَاَوْسَطِهٖ وَآخِرِهٖ

ترجمہ:''اور دعا کے اول،درمیان اور آخر میں (درود شریف پڑھنا مستحب ہے)۔

(ردالمحتار جلد 2،ص:204،داراحیاء التراث العربی،بیروت)

صاحب مراقی الفلاح لکھتے ہیں:

ثُمَّ یَخْتِمُوْنَ بِقَوْلِهٖ تَعَالٰی: سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ٥

ترجمہ:''پھر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پاک (سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ) پر دعا کو ختم کریں،(کتاب الصلاۃ،فصل صفۃ الاذکار،ص:171 قدیمی کتب خانہ،کراچی)''۔

علامہ شیخ احمد طحطاوی لکھتے ہیں:(رَافِعِیْ اَیْدِیْهِمْ)حِذَاءَ الصَّدْرِ وَبُطُوْنُهَا مِمَّا یَلِی الْوَجْهَ بِخُشُوْعٍ وَّسُکُوْنٍ

ترجمہ:''(دونوں ہاتھ بلند کریں) سینے کے مقابل ہوں اور اُن کا پیٹ چہرے کے قریب (سامنے)ہو،خشوع اور سکون کے ساتھ دعا کرے''۔

(حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح،جلد 1 ص:429)

کن صورتوں میں نماز توڑی جاسکتی ہے

سوال:28

کن صورتوں میں نماز کی نیت توڑ سکتے ہیں؟۔

جواب:

کسی شے سے اذیت پہنچنے یا نقصان ہونے کا اندیشہ ہو،تو نماز توڑنے کی اجازت ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَیُبَاحُ قَطْعُهَا لِنَحْوِ قَتْلِ حَیَّةٍ،وَنَدِّ دَابَّةٍ،وَفَوْرِ قِدْرٍ،وَضِیَاعِ مَاقِیْمَتُهٗ دِرْهَمٌ،لَهٗ اَوْ لِغَیْرِهٖ۔وَیُسْتَحَبُّ لِمُدَافَعَةِ الْاَخْبَثَیْنِ،وَلِلْخُرُوْجِ مِنَ الْخِلَافِ اِنْ لَّمْ یَخَفْ فَوْتَ

وَقْتٍ أَوْ جَمَاعَةٍ۔ وَيَجِبُ لِاِغَاثَةِ مَلْهُوْفٍ وَّغَرِيْقٍ وَّحَرِيْقٍ ،لَا لِنِدَاءِ أَحَدِ أَبَوَيْهِ بِلَا اِسْتِغَاثَةٍ اِلَّا فِي النَّفْلِ ،فَاِنْ عَلِمَ اَنَّهٗ يُصَلِّيْ لَا بَأْسَ اَنْ لَّا يُجِيْبَهٗ ،وَاِنْ لَّمْ يَعْلَمْ أَجَابَهٗ۔

ترجمہ: ''اور نماز کا توڑنا (اگر چہ فرض نماز ہو) ان صورتوں میں مباح ہے: (مثلاً) سانپ کو مارنا، سواری کا بھاگ جانا، ہانڈی کا اُبلنا اور ایسی چیز کا تلف ہو جانا جس کی قیمت ایک درہم ہو، خواہ نمازی کی ہو یا کسی اور شخص کی اور اگر پیشاب پاخانہ کی حاجت ہو تو نماز توڑنا مستحب ہے (علامہ شامی نے شدید حاجت کے وقت نماز توڑنا واجب لکھا ہے کیونکہ جب ان طبعی حاجات کا غلبہ ہو تو نماز میں یکسوئی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضوری کی کیفیت قائم نہیں رہتی) تو علماء کے اختلاف سے نکلنے کے لئے نماز توڑ سکتے ہیں (یعنی اگر چہ مذہبِ مختار کے مطابق اس صورت میں نماز صحیح طور پر ادا ہو جاتی ہے، لیکن افضل یہ ہے کہ اتنی احتیاط کی جائے کہ تمام مذاہب کے مطابق بلا اختلاف نماز صحیح ہو جائے)، اگر نماز کا وقت نکل جانے یا جماعت کے فوت ہونے کا خوف نہ ہو اور جب کوئی (مصیبت میں مبتلا شخص) فریاد کر رہا ہو مثلاً کوئی شخص پانی میں ڈوب رہا ہے یا آگ میں جل رہا ہے (تو اس کی مدد کے لئے) نماز توڑنا واجب ہے۔ معمول کی صورت حال میں والدین کے بلانے پر فرض نماز توڑنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر نفل نماز پڑھتے ہوئے والدین پکاریں تو جواب دینا واجب ہے، اگر والدین کو معلوم ہو کہ نماز پڑھ رہا ہے تو جواب نہ دینے میں کچھ مضائقہ نہیں، اگر معلوم نہ ہو تو (نماز توڑ کر) جواب دے (اور پھر از سرِ نو وہ نفل نماز پڑھے)۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 368-369، بیروت)

علاوہ ازیں علامہ شامی نے چند مواقع اور ذکر کئے مثلاً بکریوں پر بھیڑیے کے حملے کے خوف سے، نابینا راہ گیر کنویں میں گرا چاہتا ہو اور یہ اُس کے بچانے پر قادر ہو۔

دعائے قنوت یاد نہ ہوتو؟

سوال:29

جب تک دعائے قنوت یاد نہ ہو کیا پڑھا جائے؟۔

جواب :

نمازِ وتر کی تیسری رکعت میں دعا پڑھنا واجب ہے اور کسی بھی دعا کے پڑھنے سے واجب ادا ہو جائے گا (شامی)، جو دعائے قنوت نہ پڑھ سکتا ہو، وہ ''رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا (آخر تک)'' پڑھے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وَمَنْ لَّایُحْسِنُ الْقُنُوْتَ یَقُوْلُ : رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً آلایۃ ۔وَقَالَ اَبُو اللَّیْثِ، یَقُوْلُ: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ،یُکَرِّرُھَا ثَلَاثًاوَّقِیْلَ یَقُوْلُ: یَا رَبِّ ثَلَاثًا ،ذَکَرَہٗ فِی ''الذَّخِیْرَۃِ'' ۔

ترجمہ:''جو دعائے قنوت نہ پڑھ سکے، وہ یہ کہے ''رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً'' (آخر تک) اور فقیہ ابو اللیث فرماتے ہیں: وہ تین مرتبہ ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ'' کہے، اور بعض نے کہا کہ تین مرتبہ ''یَارَبِّ'' کہے، ''ذخیرہ'' میں اسے ذکر کیا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2،ص:385،داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔تاہم اس دوران دعائے قنوت یادکرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے تاکہ نمازِ وتر کے اجرِ کامل سے محروم نہ رہیں۔

جماعت میں ایک مقتدی اور ایک امام ہے اور مزید افراد آ گئے

سوال: 30

اگر فجر کی نماز میں صرف امام اور ایک مقتدی ہو، چاہے مؤذن ہی ہو، تو جب جماعت کے لئے کھڑے ہوں گے تو ایک ہاتھ کا فاصلہ رکھیں گے، لیکن اگر دورانِ نماز ایک مقتدی اور آ گیا تو اب امام صاحب پاؤں اٹھا کے آگے جائیں گے یا پاؤں گھسیٹتے ہوئے آگے جائیں گے؟، (محمد رئیس، متعلم دارالعلوم نعیمیہ، کراچی)۔

جواب:

امام کے علاوہ اگر ایک مقتدی ہو تو وہ امام کے برابر دائیں جانب اس طرح کھڑا

ہو کہ مقتدی کا قدم امام سے آگے نہ ہو یعنی اس کے پاؤں کا گٹا امام کے پاؤں کے گٹے سے آگے نہ ہو۔ دورانِ نماز اگر دوسرا شخص جماعت میں شامل ہوتا ہے تو اس صورت میں یا تو امام آگے بڑھ جائے اور آنے والا شخص اُس مقتدی کے برابر کھڑا ہو جائے یا وہ مقتدی خود پیچھے ہٹ آئے یا آنے والا شخص اُس کو پیچھے کی جانب کھینچ لے (یعنی اس میں اس بات کا بھی لحاظ ہوگا کہ گنجائش کس جانب ہے، اگر آگے اور پیچھے دونوں جانب برابر گنجائش ہو تو امام آگے بڑھ سکتا ہے اور مقتدی بھی پیچھے ہٹ سکتا ہے، اگر گنجائش صرف پیچھے کی جانب ہے تو مقتدی پیچھے ہٹ جائے اور اگر گنجائش صرف آگے کی جانب ہے تو امام آگے بڑھ جائے، بعد میں آنے والا شخص پہلے سے جماعت میں شامل مقتدی کو اس صورت میں کھینچ کر پیچھے لائے، جب اُسے حُسنِ ظنّ ہو کہ اسے مسئلہ معلوم ہے)، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

اِذَا اقْتَدٰی بِاِمَامٍ فَجَاءَ آخَرُ یَتَقَدَّمُ الْاِمَامُ مَوْضِعَ سُجُوْدِہٖ، کَذَافِیْ "مُخْتَارَاتِ النَّوَازِلِ" وَفِی "الْقُھُسْتَانِیِّ" عَنِ الْجَلَّابِیِّ اَنَّ الْمُقْتَدِیَ یَتَأَخَّرُ عَنِ الْیَمِیْنِ اِلٰی خَلْفِ اِذَاجَاءَ آخَرُ۔ وَفِی "الْفَتْحِ": وَلَوِ اقْتَدٰی وَاحِدٌ بِآخَرَ فَجَاءَ ثَالِثٌ یَجْذِبُ الْمُقْتَدِیَ بَعْدَالتَّکْبِیْرِ، وَلَوْ جَذَبَہٗ قَبْلَ التَّکْبِیْرِ لَا یَضُرُّہٗ، وَقِیْلَ یَتَقَدَّمُ الْاِمَامُ۔

ترجمہ: "جب ایک مقتدی امام کے ساتھ کھڑا ہو، دوسرا شخص آیا تو (بعض نے کہا کہ) امام قدم بڑھا کر سجدے کے مقام پر چلا جائے، جیسا کہ "مختارات النوازل" میں ہے اور "قہستانی" میں جلابی سے ہے کہ جب دوسرا مقتدی آجائے تو (پہلا) مقتدی پیچھے آجائے۔ اور "فتح القدیر" میں ہے: اگر ایک شخص امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے، پس تیسرا شخص آیا تو وہ تکبیر کہہ (نیت باندھ) کر مقتدی کو پیچھے کی جانب کھینچ لے اور اگر تکبیر کہے بغیر پیچھے کھینچ لے تب بھی کوئی حرج نہیں اور بعض نے کہا کہ امام آگے بڑھ جائے"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص: 265، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: "امام اور ایک مقتدی نماز پڑھتے ہوں دوسرا مقتدی آگیا تو امام کو وہیں رہنا چاہیے یا آگے چلا جائے یا نہیں (اور آگے بڑھنے

کی جگہ ہو)''، آپ نے جواب میں لکھا: ''اگر پہلا مقتدی مسئلہ دان (یعنی اس مسئلے کو جانتا) ہے اور اسے پیچھے ہٹنے کی جگہ ہے تو وہ ہٹ آئے دوسرا مقتدی اس کے برابر کھڑا ہو جائے اور اگر یہ مسئلہ دان نہیں یا اسے پیچھے ہٹنے کو جگہ نہیں تو امام آگے بڑھ جائے اور اگر امام کو بھی آگے بڑھنے کی جگہ نہیں تو دوسرا مقتدی بائیں ہاتھ کو کھڑا ہو جائے، مگر اب تیسرا مقتدی آکر نہ ملے ورنہ سب کی نماز مکروہِ تحریمی، اور سب کو اس کا پھیرنا واجب''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 611، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اس صورت میں آگے بڑھنے والا شخص پاؤں سرکتے ہوئے آگے جائے یا قدم اٹھا کر جائے، دونوں صورتوں کا حکم ایک ہی ہے یعنی بقدر ضرورت قبلے کی طرف قدم اٹھا کر بھی چل سکتے ہیں، بلاضرورت پے در پے تین قدم چلنے سے نماز فاسد ہو جائے گی، اس مقصد کے لئے صرف ایک صف کی مقدار آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کی ضرورت ہوتی ہے، جو ایک دو قدم اٹھانے سے پوری ہو جاتی ہے۔

چند سوالات آپ کی خدمت میں پیش ہیں، امید ہے تسلی بخش جوابات عنایت فرمائیں گے۔

منظر شیخ، بلاک 7 گلشن اقبال، کراچی

قضا نمازوں کی ادائیگی سے بری الذمہ ہونے کا طریقہ

سوال: 31

(1) شریعت نے قضا نماز ادا کرنے کے لئے جو حیلہ مقرر کیا ہے، اس کا طریقہ کیا ہے؟۔

جواب:

جس شخص کے ذمے قضا نمازیں ہوں، زندگی میں اُس پر اُن نمازوں کی ادائیگی فرض ہے، جب تک اُنہیں ادا نہ کرے، آخرت کی جوابدہی سے بری الذمہ نہیں ہوگا۔ زندگی میں قضا نمازوں کی تلافی فدیہ یا کسی حیلے سے نہیں ہوسکتی، نمازیں پڑھنا لازمی ہے۔ ہاں! اگر کسی شخص نے اپنی زندگی میں وصیت کی ہو تو اُس کے ورثاء اُس کے ترکے کی ایک تہائی

مال سے نمازوں کا فدیہ ادا کریں، اگر قضا نمازیں بہت زیادہ ہیں اور ترکے کی ایک تہائی سے فدیہ پورا نہ ہوتا ہو تو اس سے زیادہ مقدار میں فدیے کی ادائیگی کا انحصار ورثاء کی مرضی پر ہے، اگر تبرّع اور احسان کے طور پر ترکے میں سے اپنے حصے سے دستبردار ہو کر ادا کرنا چاہیں، تو ان کے لئے سعادت کی بات ہوگی۔

نوٹ: روزے کے فدیہ کا حکم قرآن مجید میں ہے، فوت شدہ نمازوں کے فدیے کا حکم صراحت کے ساتھ قرآن وحدیث میں نہیں ہے۔ مگر چونکہ نماز بھی روزے کی طرح خالص بدنی عبادت ہے، اس لئے ہمارے فقہاءِ کرام نے روزے پر قیاس کر کے ایک نماز کا فدیہ ایک روزے کے برابر مقرر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قبول کی امید پر اس کی ادائیگی کرنی چاہئے، اگر وہ قبول فرمالے تو یہ بندے پر اس کا کرم ہوگا، ورنہ کم از کم فدیے کے طور پر دی ہوئی رقم کے صدقے کا اجر تو یقیناً اسے ملے گا، ان شاء اللہ العزیز

نمازوں کے فدیے کی ادائیگی

سوال:32

(2) اگر کسی کے انتقال کے بعد اس کی قضا نمازوں کا حساب لگا کر فدیہ دیں تو اس کی ادائیگی کا طریقہ کیا ہوگا؟۔

جواب:

ایک دن کی پانچ نمازوں (فرائض) اور وتر کو ملا کر چھ نمازیں شمار ہوں گی، ایک نماز کا فدیہ ایک روزے کے فدیے کے برابر ہے اور ایک دن کی نمازوں کا کل فدیہ چھ روزوں کے فدیے کے برابر ہوگا۔ ایک روزے کا فدیہ تقریباً 2 کلو 150 گرام گندم کا آٹا یا اُس کی قیمت ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں: (وَلَوْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صَلَوَاتٌ فَائِتَةٌ وَأَوْصَى بِالْكَفَّارَةِ يُعْطَى لِكُلِّ صَلَاةٍ نِصْفُ صَاعٍ مِنْ بُرٍّ) كَالْفِطْرَةِ (وَكَذَا حُكْمُ الْوِتْرِ) وَلِصَوْمِ وَإِنَّمَا يُعْطَى (مِنْ ثُلُثِ مَالِهِ)۔

ترجمہ: "اگر کوئی شخص فوت ہو گیا اور اس کی کئی نمازیں فوت شدہ (قضا) ہیں، اور اُس نے

ان نمازوں کے کفارے کی وصیت کی ہے، تو ہر نماز کے لئے نصف صاع (دو کلو گرام) گندم کفارہ دے، اسی طرح وتر اور ہر روزے کا کفارہ ہے اور یہ کفارہ اُس (میت) کے تہائی مال سے دیا جائے گا، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص:466-465، بیروت)''۔

کئی سالوں کی قضا نمازوں کا حکم

سوال:33

(3) اگر کئی سالوں کی قضا نماز ہو تو اس کا فدیہ ادا کرنے کے لئے کتنی مدت کی رقم لی جائے تاکہ ورثاء پر بھی بوجھ نہ ہو اور ادائیگی بھی ہو جائے؟۔

جواب:

اگر کئی سالوں کی نمازیں قضا ہوں اور مدت کا اندازہ نہ کیا جاسکتا ہو، تو میت کی کُل عمر شمار کی جائے اور اگر میت مرد ہو تو کل عمر سے بارہ سال (میت اگر عورت ہو تو نو سال) نکال کر بقیہ مدت کا فدیہ میت کے مال سے ادا کیا جائے۔ اگر فدیہ کی رقم تہائی ترکے سے تجاوز کر جائے تو بقیہ رقم ورثاء کی مرضی پر موقوف ہوگی کہ اگر وہ راضی ہوں تو اپنے حصے یا اپنی جانب سے بطور تبرُّع اور فضل واحسان ادا کر دیں۔

فدیہ صلوٰۃ کی ادائیگی کے وقت نیت کافی ہے

سوال:34

(4) جس کو یہ فدیہ دیا جائے تو کیا اسکو بتانا ہوگا، بغیر بتائے یہ معاملہ کس طرح کیا جائے گا؟۔

جواب:

فدیہ دینے والے کی نیت کافی ہے، بتانا ضروری نہیں کہ یہ فدیہ کی رقم ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''دینے والے کی نیت کافی ہے، لفظ کی حاجت نہیں، کَمَاصَرَّحُوْا بِهٖ فِی الزَّکٰوةِ وَقَالَ الْعَلَّامَةُ السَّیِّدُ الْحَمُوِیُّ فِیْ شَرْحِ الْاَشْبَاهِ وَالنَّظَائِرِ الْعِبْرَةُ لِنِیَّةِ الدَّافِعِ لَایُعْلَمُ الْمَدْفُوْعُ اِلَیْهِ وَفِیْ رَدِّالْمُحْتَارِ لَااِعْتِبَارَ لِلتَّسْمِیَةِ

ترجمہ: ''جیسا کہ مسئلۂ زکوٰۃ میں اس کی تصریح موجود ہے علامہ سید حموی نے ''شرح الاشباہ والنظائر'' میں فرمایا: دینے والے کی نیت کا اعتبار ہے، جسے دی جارہی ہے، اُسے معلوم ہونا ضروری نہیں۔ردالمحتار میں ہے: زبان سے نام لینے کا اعتبار نہیں۔

مگر زبان سے بھی کہہ دینے کو علماء مناسب بتاتے ہیں یہاں تک کہ طریقہ ادا میں میت کے باپ دادا تک کا نام لینا فرماتے ہیں کہ مسکین سے کہا جائے: یہ مال تجھے فلاں بن فلاں کے اتنے روزوں یا اتنی نمازوں کے فدیہ میں دیا، وہ کہے: میں نے قبول کیا، شرح نقایہ علامہ قہستانی میں ہے: یَنۡبَغِیۡ اَنۡ یَّقُوۡلَ الدَّافِعُ لِلۡمِسۡکِیۡنِ فِیۡ کُلِّ مَرَّةٍ اِنِّیۡ اُدۡفَعُكَ مَالَ کَذَا لِفِدۡیَةِ صَوۡمٍ کَذَا لِفُلَانِ بۡنِ فُلَانِ الۡمُتَوَفّٰی وَیَقُوۡلُ الۡمِسۡکِیۡنُ قَبِلۡتُہٗ۔

ترجمہ: ''مسکین کو دینے والا ہر دفعہ کہے میں تجھے فلاں بن فلاں میت کی طرف سے فدیہ صوم کے طور پر مال دے رہا ہوں اور مسکین کہے: میں نے اسے قبول کیا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص:543، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

فدیے کی ادائیگی کے وقت محض فدیے کی ادائیگی کی نیت کافی ہے، لیکن زبانی بتانا مناسب ہے۔

تکبیر تحریمہ کے فضائل

سوال:35

تکبیر تحریمہ یا تکبیر اولیٰ کی فضیلت جماعت میں کیا ہے؟ تفصیلی دلائل بیان فرمائیں، (محمد سلطان حنفی تحصیل وضلع کوٹلی، آزاد کشمیر)۔

جواب:

''تکبیرِ تحریمہ'' بیک وقت نماز کی شرائط میں بھی شامل ہے اور نماز کا رکن بھی ہے۔اسے ''تکبیر اُولیٰ'' (پہلی تکبیر) بھی کہتے ہیں۔اسے ''تحریمہ'' اس لئے کہتے ہیں کہ جب بندۂ مومن ''اللہ اکبر'' کہہ کر نماز میں داخل ہوتا ہے، تو وہ بعض ایسے امور (جیسے کھانا، پینا، کلام کرنا، چلنا پھرنا وغیرہ) جو اس کے لئے حلال ہوتے ہیں، نماز سے فراغت تک حرام ہو جاتے ہیں۔

نماز باجماعت کے لئے تکبیرِ اولیٰ کا اہتمام اور فضیلتیں احادیثِ مبارکہ میں وارد ہوئی ہیں:

(1) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ صَلّٰى لِلّٰهِ أَرْبَعِيْنَ يَوْمًا فِيْ جَمَاعَةٍ يُدْرِكُ التَّكْبِيْرَةَ الْأُوْلٰى، كُتِبَتْ لَهٗ بَرَاءَتَانِ بَرَاءَةٌ مِّنَ النَّارِ وَبَرَاءَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ۔

ترجمہ: ’’حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ کی (رضا) کے لئے چالیس دن باجماعت نماز پڑھے، تکبیرِ اولیٰ پائے، اس کے لئے دو آزادیاں لکھ دی جائیں گی: ایک جہنم سے اور دوسرا نفاق سے‘‘۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث: 241)

(2) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

مَنْ صَلّٰى فِيْ مَسْجِدٍ جَمَاعَةً أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً لَا تَفُوْتُهُ الرَّكْعَةُ الْأُوْلٰى مِنْ صَلَاةِ الْعِشَاءِ كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِهَا عِتْقًا مِّنَ النَّارِ۔

ترجمہ: ’’جو شخص چالیس راتیں مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھے کہ عشاء کی تکبیرِ اولیٰ فوت نہ ہو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دوزخ سے آزادی لکھ دے گا‘‘۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 798)

فرض نمازوں کے بعد دعا میں اختصار

سوال: 36

سنی بہشتی زیور، انوار التجلی، شرح منیۃ المصلی اور فتح القدیر میں ہے کہ جن فرائض کے بعد سنتیں ادا کی جاتی ہیں ان کے بعد لمبے وظائف نہ کرے بلکہ جلدی سنتیں ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے ورنہ سنتوں کا ثواب کم ہو جائے گا اور امداد الفتاح میں لکھا ہے: آج کل فرضوں کے بعد ہماری مساجد میں جو لمبے وظائف کا رواج پڑ گیا ہے یہ خلاف سنت ہے۔ مہربانی فرما کر بتائیں کہ فرضوں اور سنتوں کے درمیان مسنون طریقہ کے مطابق کتنا وقفہ کرنا چاہئے اور اس وقفہ میں کیا کیا پڑھنا چاہئے؟۔

(مولانا محمد احمد ساجد، ریلوے روڈ بصیر پور ضلع اوکاڑہ)

جواب:

فرض کے بعد اذکار کے بارے میں احادیث ملاحظہ ہوں: مَنْ قَرَأَ اٰیَةَ الْکُرْسِیِّ فِیْ دُبُرِ کُلِّ صَلٰوۃٍ لَمْ یَمْنَعْهُ مِنْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ اِلَّا الْمَوْتُ،

(1) ترجمہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد "آیۃ الکرسی"، پڑھی اس کے لئے جنت میں جانے سے موت کے سوا اور کوئی چیز رکاوٹ نہیں ہے۔

(مشکوٰۃ المصابیح، ص:89)

(2) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ، قَالَ: أَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ أَقْرَأَ الْمُعَوِّذَاتِ دُبُرَ کُلِّ صَلَاۃٍ۔

ترجمہ "حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں ہر نماز کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ النّاس، (یہ سورتیں) پڑھا کروں"۔

(سنن نسائی، رقم الحدیث:1335)

(3) عَنْ کَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مُعَقِّبَاتٌ لَا یَخِیْبُ قَائِلُهُنَّ "یُسَبِّحُ اللّٰهَ فِیْ دُبُرِ کُلِّ صَلَاۃٍ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ، وَیَحْمَدُهُ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ، وَیُکَبِّرُهُ أَرْبَعًا وَّثَلَاثِیْنَ"۔

ترجمہ: "کعب بن عجرہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کچھ کلمات (نماز کے بعد بلا فاصلہ کہنے کے ہیں) جن کا کہنے والا نامراد نہیں رہتا، (ان کلمات میں) نماز کے بعد تینتیس مرتبہ "سبحان اللہ" کہنا، تینتیس مرتبہ "الحمد للہ" کہنا، چونتیس مرتبہ "اللہ اکبر" کہنا، (سنن نسائی، رقم الحدیث:1348)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

یُکْرَهُ تَأْخِیْرُ السُّنَّةِ اِلَّا بِقَدْرِ: اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ الخ۔ قَالَ الْحُلْوَانِیُّ: لَا بَأْسَ بِالْفَصْلِ بِالْأَوْرَادِ، وَاخْتَارَهُ الْکَمَالُ، قَالَ الْحَلَبِیُّ: اِنْ أُرِیْدَ بِالْکَرَاهَةِ التَّنْزِیْهِیَّةُ

اِرْتَفَعَ الْخِلَافُ، قُلْتُ :وَفِیْ حِفْظِیْ حَمْلُہٗ عَلَی الْقَلِیْلَۃِ ، وَیُسْتَحَبُّ اَنْ یَّسْتَغْفِرَ ثَلَاثًا وَّیَقْرَأُ" آیۃَ الْکُرْسِیِّ وَالْمُعَوِّذَاتِ" وَیُسَبِّحُ وَیُحَمِّدُ وَیُکَبِّرُ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ؛ وَیُھَلِّلُ تَمَامَ الْمِائَۃِ وَیَدْعُوْا وَیَخْتِمُ بِسُبْحَانَ رَبِّکَ ۔

ترجمہ: ''سنتوں میں تاخیر''اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ' (حدیث پاک میں روایت کردہ پورے کلمات یہ ہیں:اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ، تَبَارَکْتَ یَا ذَاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ) اس مقدار سے زیادہ مکروہ ہے۔''حلوانی'' نے فرمایا: اذکار کے ساتھ فرائض وسُنَن میں وقفہ ہونے میں کوئی حرج نہیں،''کمال'' نے اسی کو اختیار کیا ہے۔''حلبی'' کہتے ہیں:اگر کراہت سے کراہتِ تنزیہی مراد ہے تو اختلاف ختم ہو جاتا ہے،(میں کہتا ہوں)اور مجھے اتنا یاد ہے کہ یہ کراہتِ تنزیہی قلیل فصل پر محمول ہے،اور مستحب یہ ہے کہ تین مرتبہ استغفار(مثلاً:أَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ)پڑھے،آیۃ الکرسی اور مُعَوِّذات(سورۃ الفلق وسورۃ النّاس) تلاوت کرے اور'' سبحان اللہ ،الحمد للہ ،اللہ اکبر'' تینتیس،تینتیس مرتبہ پڑھے،اور سوویں مرتبہ'' لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ" پڑھے،اس کے بعد دعا کرے اور آخر میں یہ پڑھے:"سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد2ص:218،219،داراحیاء التراث العربی، بیروت)

اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(اِلَّا بِقَدَرِ اَللّٰھُمَّ الخ)لِمَا رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِیُّ عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا قَالَتْ:"کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَا یَقْعُدُ اِلَّا بِمِقْدَارِ مَا یَقُوْلُ:" اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ ،تَبَارَکْتَ یَا ذَاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ"، وَاَمَّا مَا وَرَدَمِنَ الْاَحَادِیْثِ فِی الْاَذْکَارِ عَقِیْبَ الصَّلَاۃِ فَلَا دَلَالَۃَ فِیْہِ عَلَی الْاِتْیَانِ بِھَاقَبْلَ السُّنَّۃِ ، بَلْ یُحْمَلُ عَلٰی

الْإِتْيَانِ بِهَا بَعْدَهَا، لِأَنَّ السُّنَّةَ مِنْ لَوَاحِقِ الْفَرِيْضَةِ وَتَوَابِعِهَا وَمُكَمِّلَاتِهَا فَلَمْ تَكُنْ أَجْنَبِيَّةً عَنْهَا ، فَمَا يُفْعَلُ بَعْدَهَا يُطْلَقُ عَلَيْهِ أَنَّهُ عَقِيْبَ الْفَرِيْضَةِ۔

ترجمہ:''(یعنی مقدار: اللّٰھم الخ) کیونکہ مسلم اور ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ (فرض نماز کے بعد) صرف'' اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ يَاذَاالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ " کی مقدار ہی بیٹھتے تھے، اور دیگر روایات میں جو نماز کے بعد اذکار کا ذکر ہے، اس میں یہ دلالت نہیں کہ وہ اذکار سنتوں سے پہلے ہوتے تھے، بلکہ ان تسبیحات واوراد کے پڑھنے کو سنتوں کے بعد پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے، کیونکہ سنتیں فرائض کے ساتھ لاحق ہوتی ہیں اور ان کے تابع ہوتی ہیں، اور ان (میں نادانستہ طور پر کوئی کمی رہ جائے تو اس کی) تکمیل کا سبب ہیں، لہٰذا یہ فرض نمازوں سے الگ کوئی چیز نہیں ہیں، لہٰذا جو تسبیحات ان سنتوں کے بعد پڑھی جائیں، ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ عمل فرضوں کے بعد ہی ادا ہوا''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2 ص: 218، 219، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

وہ فرض نمازیں، جن کے بعد سنتیں ہیں، (یعنی ظہر و جمعہ و مغرب وعشاء) ان نمازوں کے بعد دعا مختصر کرنی چاہیے، امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال ہوا کہ ''بعد نمازِ جمعہ انحراف قبلہ یعنی دائیں یا بائیں مڑ کر مناجات کرنا جائز ہے یا نہیں''۔

آپ نے جواب میں تحریر فرمایا: ''امام کا بعد سلام قبلہ سے انحراف تو مطلقاً سنّت ہے اور اس کا ترک یعنی بعدِ سلام قبلہ رُو بیٹھے رہنا امام کے لئے بالاجماع مکروہ ہے۔ جمعہ وغیرہ سب نمازیں اس حکم میں برابر ہیں اور بعد سلام دعا و مناجات بھی بالاجماع جائز ہے، مگر جس نماز کے بعد سنت ہے، یعنی ظہر و جمعہ و مغرب وعشاء اس کے بعد طویل تاخیر کسی کیلئے بہتر نہیں اور اگر کرے تو منع بھی نہیں، مگر اس قدر نہ ہو کہ مقتدیوں پر گراں گزرے، عادتِ مسلمین یوں جاری ہے کہ امام بعد سلام جب تک دعا سے فارغ نہ ہو مقتدی شریکِ دعا رہتے ہیں اور اس

سے قبل اُسے چھوڑ کر نہیں اٹھتے اور یہ اگر چہ شرعاً واجب نہیں مگر حسنِ ادب سے ہے۔
ترجمہ:"(میں کہتا ہوں) اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی سے استدلال ممکن ہے" اور جب وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ کسی معاملہ میں جمع ہوتے ہیں، تو آپ کی اجازت کے بغیر جاتے نہیں"، کیونکہ دعا سے فراغت اذن ہی تصور ہوتا ہے اور اس پر عرف جاری ہے، تو ایسی حالت میں اتنی طویل دعا کہ بعض مقتدیوں پر ثقیل ہو مطلقاً نہ کرنی چاہئے اگر چہ اس کے بعد سنت نہ ہو جیسے فجر و عصر، (فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص:356 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔
تبلیغی جماعت کے شیخ عبدالحفیظ مکی "مساجد میں مجالسِ ذکر جہری کا استحباب" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: **آیات مبارکہ:** ذکر اللہ کے بارے میں قرآن مجید میں جگہ جگہ حکم خداوندی ہے کہ خوب ذکر کرو، کثرت سے ذکر کرو وغیرہ اور ہر جگہ یہ حکم مطلق ہے، یعنی کہ یہ سب حالات کو شامل ہے، اجتماعی یا انفرادی، جہری یا سری اور مساجد میں یا گھروں یا کہیں بھی، اس سلسلہ کی چند آیات مختصراً ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ،
(سورۃ البقرہ، رکوع:18)
ترجمہ: پس تم میری یاد کرو (میرا ذکر کرو) میں تمہیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرتے رہو، اور ناشکری نہ کرو۔

۲۔ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، (سورۃ آل عمران، رکوع:20)۔
ترجمہ: (پہلے سے عقل مندوں کا ذکر ہے) وہ ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے ہوئے بھی اور آسمانوں اور زمینوں کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں۔

۳۔ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ، (سورۃ رعد، رکوع:4)۔

ترجمہ: اور جو شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کو ہدایت فرماتے ہیں، وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے، خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر (میں ایسی خاصیت ہے کہ اس) سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے۔

۴۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، (سورۃ نور۔ رکوع 5)۔

ترجمہ: (کامل ایمان والوں کی تعریف کے ذیل میں ہے:) وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے نہ خرید غفلت میں ڈالتی ہے اور نہ فروخت۔

5۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيرًا o وَّسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا،

(سورۃ احزاب، رکوع:8)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کا خوب کثرت سے ذکر کیا کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہو۔

۶۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِينٌ،

(سورۃ زخرف: رکوع:4)

ترجمہ: جو شخص رحمٰن کے ذکر سے (جان بوجھ کر) اندھا ہو جائے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پس وہ (ہر وقت) اس کے ساتھ رہتا ہے۔

۷۔ أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ اٰمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ،

(سورۃ حدید۔ رکوع:2)

ترجمہ: کیا ایمان والوں کے لئے اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی یاد کے واسطے جھک جائیں۔

۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ، (سورۃ منافقون۔ رکوع 2)۔

ترجمہ: اے ایمان والو! تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کے ذکر سے (اس کی یاد سے) غافل نہ کرنے پائیں اور جو لوگ ایسا کریں گے، وہی خسارہ والے ہیں (کیونکہ یہ چیزیں تو دنیا ہی

میں ختم ہونے والی ہیں اور اس کی یادآخرت میں کام آنے والی ہے)۔

۹۔ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ أُولٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔(سورۃ المجادلۃ۔رکوع:3)۔

ترجمہ:"(پہلے سے منافقوں کا ذکر ہے)ان پر شیطان کا تسلط ہوگیا، پس اس نے ان کو ذکراللہ سے غافل کردیا، یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں خوب سمجھ لو یہ بات محقق ہے کہ شیطان کا گروہ خسارہ والا ہے۔

۱۰۔ وَإِذَا قَامُوْا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآؤُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا۔(سورۃ نساء،رکوع:21)۔

ترجمہ:(منافقوں کی حالت کا بیان ہے)اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں،صرف لوگوں کو اپنا نمازی ہونا دکھلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی نہیں کرتے مگر یوں ہی تھوڑا سا۔

یہ تمام آیات اوران کا ترجمہ انہوں نے شیخ محمد زکریا کاندھلوی کی کتاب فضائلِ ذکر سے نقل کیا ہے۔ (صدائے ختم نبوت،ص:05،شمارہ مئی 2011)

یہ حوالہ ہم نے اس لئے نقل کیا ہے کہ نماز کے بعد ذکر بالجہر اختلافی مسئلہ نہیں ہے۔

عورت کی امامت کا حکم

سوال: 37

کیا عورتیں صلوٰۃ التسبیح یا تراویح کی نماز باجماعت ادا کرسکتی ہیں؟۔

کامران اقبال، پونچھ آزاد کشمیر

جواب:

علامہ غلام سعیدی نے اپنی تفسیر تبیان القرآن ،جلد:01،ص:97-393 میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے اور مذاہب اربعہ اُن کے اصل مآخذ کے حوالہ جات کے ساتھ بیان کئے ہیں۔اس بحث کے شروع میں انہوں نے خلاصہ ان کلمات میں بیان فرمایا:

''جماعت کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ عورتوں کی جماعت ہے۔ امام شافعی کے نزدیک عورت کا عورتوں کو نماز پڑھانا اور ان کا با جماعت نماز پڑھنا جائز ہے۔ امام احمد کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ عورتوں کی جماعت مستحب ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ غیر مستحب ہے۔ امام مالک کے نزدیک عورتوں کا عورت کی اقتدا میں نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت کا عورتوں کے لئے امام ہونا مکروہِ تحریمی ہے، ہر چند کہ امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک عورت کا عورتوں کے لئے امام ہونا جائز ہے لیکن انہوں نے یہ تصریح کی ہے کہ عورتوں کا مردوں کے لئے امام ہونا ناجائز ہے اور مردوں کے لئے عورت کی امامت باطل ہونے پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے''۔

عورت کی امامت کے بارے میں اصل یہ حدیث ہے:

عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ خَلَّادِ الْاَنْصَارِيِّ، عَنْ اُمِّ وَرَقَةَ بِنْتِ نَوْفَلٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا غَزَا بَدْرًا، قَالَتْ: قُلْتُ لَهٗ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! اِئْذَنْ لِيْ فِي الْغَزْوِ مَعَكَ، اُمَرِّضُ مَرْضَاكُمْ، لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِيْ شَهَادَةً، قَالَ: "قِرِّيْ فِيْ بَيْتِكِ، فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَرْزُقُكِ الشَّهَادَةَ"، قَالَ: فَكَانَتْ تُسَمَّى الشَّهِيْدَةَ، قَالَ: وَقَدْ قَرَأَتِ الْقُرْآنَ، فَاسْتَأْذَنَتِ النَّبِيَّ ﷺ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْ دَارِهَا مُؤَذِّنًا، فَاَذِنَ لَهَا، قَالَ: وَكَانَتْ دَبَّرَتْ غُلَامًا وَجَارِيَةً، فَقَامَا اِلَيْهَا بِاللَّيْلِ، فَغَمَّاهَا بِقَطِيْفَةٍ لَّهَا حَتّٰى مَاتَتْ، وَذَهَبَا، فَاَصْبَحَ عُمَرُ فَقَامَ فِي النَّاسِ، فَقَالَ: مَنْ عِنْدَهٗ مِنْ هٰذَيْنِ عِلْمٌ اَوْ مَنْ رَاٰهُمَا فَلْيَجِئْ بِهِمَا فَاَمَرَ بِهِمَا فَصُلِبَا فَكَانَا اَوَّلَ مَصْلُوْبٍ بِالْمَدِيْنَةِ ------ وَفِيْ حَدِيْثٍ اٰخَرَ:

قَالَ: وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَزُوْرُهَا فِيْ بَيْتِهَا، وَجَعَلَ لَهَا مُؤَذِّنًا يُؤَذِّنُ لَهَا، وَاَمَرَهَا اَنْ تَؤُمَّ اَهْلَ دَارِهَا --- قَالَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ: فَاَنَا رَاَيْتُ مُؤَذِّنَهَا شَيْخًا كَبِيْرًا۔

ترجمہ: ''عبدالرحمٰن بن خلاد سے روایت ہے: اُمِ ورقہ بنت نوفل بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ جب غزوۂ بدر کے لئے تشریف لے جانے لگے، تو میں نے ان سے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اپنے ساتھ جہاد میں جانے کی اجازت عنایت فرمائیں، میں بیماروں کی تیمارداری

کروں گی، شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت عطا فرمادے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے گھر میں سکون سے رہو، اللہ عزوجلّ آپ کو یقیناً شہادت عطا فرمائے گا۔ عبدالرحمٰن بن خلاد کہتے ہیں کہ انہیں لوگ ''شہیدہ'' کہہ کر پکارتے تھے۔۔۔۔۔۔عبدالرحمٰن کہتے ہیں:

اُمِ ورقہ بن نوفل نے قرآن پڑھا ہوا تھا، تو انہوں نے نبی ﷺ سے اجازت مانگی کہ وہ اپنے گھر میں ایک مؤذن رکھ لیں، آپ ﷺ نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔

عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ اُمِ ورقہ کا ایک غلام اور ایک باندی تھیں، ان دونوں کو انہوں نے مُدبّر بنالیا تھا (یعنی یہ کہا کہ میری موت کے بعد تم دونوں آزاد ہو گے)، ایک رات وہ دونوں کھڑے ہوئے اور اُن کی چادر میں انہیں لپیٹ کر دبوچ لیا، یہاں تک کہ وہ وصال فرما گئیں اور پھر وہ دونوں بھاگ گئے۔ صبح کے وقت جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اُن کے قتل کی اطلاع ملی تو انہوں نے لوگوں سے کہا: جس شخص کو ان دونوں کے بارے میں کچھ معلوم ہو یا جس نے ان دونوں کو دیکھا ہو، وہ انہیں پکڑ کر لے آئے (قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس قتل کا اعتراف کرلیا تھا)، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر اُن دونوں کو سولی چڑھا دیا گیا اور مدینہ منورہ میں یہ پہلے دو شخص تھے جنہیں سولی چڑھایا گیا۔

(نوٹ: ''اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں جو ''شہیدہ'' قرار دیا تھا، آپ ﷺ کی یہ بشارت پوری ہوئی اور انہیں ان کے مُدبّر غلام اور باندی نے ظلماً قتل کردیا)''۔۔۔۔اگلی حدیث میں عبدالرحمٰن بن خلاد بیان کرتے ہیں: اور رسول اللہ ﷺ اُمِ ورقہ بن نوفل سے ملنے اُن کے گھر جایا کرتے تھے اور آپ ﷺ نے اُن کے لئے ایک مؤذن مقرر کر دیا تھا اور اُنہیں حکم فرمایا کہ اپنے گھر والوں کی امامت کیا کریں۔۔۔۔عبدالرحمٰن بن خلاد بیان کرتے ہیں: میں نے دیکھا کہ اُن کا مؤذن ایک بوڑھا شخص تھا، (سنن ابی داؤد: 93-592)''۔

یہ روایت الفاظ کے فرق کے ساتھ امام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری کی ''المستدرک'' اور امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی کی ''سنن کبریٰ'' میں بھی موجود ہے۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

(۱) ترجمہ: ''رائطہ حنفیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرض نمازوں میں عورتوں کی امامت کی اور اُن کے وسط میں کھڑی ہوئیں''۔

(۲) ترجمہ: ''عطاء بیان کرتے ہیں کہ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا اذان دیتی تھیں، اقامت کہتی تھیں اور عورتوں کی امامت کرتی تھیں اور ان کے وسط میں کھڑی ہوتی تھیں''۔

(سنن کبریٰ للبیہقی، جلد:03، ص:131، نشر السنہ، ملتان)

اسی طرح حضرتِ اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی عورتوں کی امامت کی روایت بھی سننِ کبریٰ میں موجود ہے اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عورت، عورتوں کی امامت کرے اور اُن کے وسط میں کھڑی ہو۔

اس پر سب کا اجماع ہے کہ عورت مردوں کی امامت نہیں کرسکتی اور جمعہ کی امامت بھی نہیں کرسکتی۔ ہمارے ائمہ میں سے علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی صاحب ''ہدایہ'' نے عورت کی امامت کو مکروہِ تحریمی کہا ہے اور علامہ کمال الدین بن ہمام صاحب ''فتح القدیر'' نے لکھا ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ مکروہِ تنزیہی یا خلافِ اولیٰ ہے۔

تاہم اگر کہیں کوئی عورت، عورتوں کی امامت کرے تو وہ آگے نہ کھڑی ہو بلکہ عورتوں کی صف کے درمیان میں کھڑی ہو۔

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں: وَتُكْرَهُ جَمَاعَتُهُنَّ، يَقِفُ الْإِمَامُ وَسْطَهُنَّ، وَلَا تَصْلُحُ إِمَامًا لِلرِّجَالِ۔

ترجمہ: ''اور عورتوں کی جماعت مکروہ ہے، عورت امام ہو تو وہ صف کے درمیان کھڑی ہو اور عورت مردوں کی امامت کی اہل نہیں ہے، (الاشباہ والنظائر، ص:316)''۔

علامہ ابن نجیم مزید اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اور عورتوں کی جماعت مکروہ ہے، کیونکہ یہ حرام کے ارتکاب سے خالی نہیں ہے اور وہ ہے عورتوں کے امام کا صف کے درمیان کھڑا ہونا، تو ننگے بدن والوں کی جماعت کی طرح یہ

جماعت بھی مکروہ ہوگی، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے۔ یہ کراہتِ تحریمی پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ امام کا صف سے آگے ہونا واجب ہے، اس لئے کہ نبی ﷺ نے اس پر مُواظبت (ہمیشگی) فرمائی، اور واجب کا ترک کراہتِ تحریمی کا سبب ہے جو گناہ ہے''۔

(البحرالرائق، جلد: 01، ص: 614)

امام ابن ہمام کا عورتوں کے لئے عورت کی امامت کو مکروہِ تنزیہی قرار دینے کا سبب وہ احادیث ہیں، جو اوپر مذکور ہوئیں، جن میں حضور ﷺ نے اُمِ ورقہ کو امامت کی اجازت دی اور حضرتِ عائشہ اور حضرتِ ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے عورتوں کی امامت فرمائی۔ امام ابن نجیم اور صاحب ہدایہ و دیگر فقہاءِ امت کا عورت کی امامت کو مکروہِ تحریمی قرار دینا فقہی اصول کی بناپر ہے، جیسے ''البحرالرائق'' میں بیان کیا گیا ہے اور شاید ان ائمہ کے نزدیک وہ اجازت اُمِ ورقہ اور بعض صحابیات کے ساتھ خاص یا ان کے نزدیک یہ منسوخ ہے۔ ہمارے عہد کے مفتیانِ کرام دینی حکمت اور ضرورت کے تحت موقع کی مناسبت سے کسی ایک موقف پر رائے دے سکتے ہیں۔

امام کے پیچھے قراءت کا حکم

سوال:38

''صلوٰۃ التسبیح'' کی جماعت میں پیچھے نماز پڑھنے والی عورتیں بھی قراءت کریں، تو کیا ان کا قراءت کرنا درست ہے؟۔

جواب:

مقتدی کا امام کے پیچھے قراءت کرنا ممنوع ہے۔ جب قرآن مجید پڑھا جائے تو خاموش رہنا اور غور سے سننا فرض ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ○

ترجمہ: ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے، (الاعراف:204)''۔

اور حدیث مبارک میں ہے: عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَانَ إِذَا سُئِلَ هَلْ يَقْرَأُ أَحَدٌ خَلْفَ الْإِمَامِ، قَالَ: إِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمْ خَلْفَ الْإِمَامِ فَحَسْبُهُ قِرَاءَةُ الْإِمَامِ وَإِذَا صَلّٰى وَحْدَهُ فَلْيَقْرَأْ۔

ترجمہ: ”نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب سوال کیا جاتا کہ کیا کوئی شخص امام کے پیچھے قراءت کرے؟، تو وہ فرماتے: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قراءت اس کے لئے کافی ہے اور جب اکیلا نماز پڑھے تو قراءت کرے“۔

(الموطا امام مالک، باب ترک القراءۃ خلف الامام، ص:68، میر محمد کتب خانہ، کراچی)

نماز میں مصحف سے دیکھ کر پڑھنے کا حکم

سوال:39

عورت اگر نماز میں قرآن مجید دیکھ کر قراءت کرے تو اس کی نماز فاسد ہو گی یا نہیں؟۔ اگر سامع دیکھ کر لقمہ دے تو کیا نماز ہو جائے گی یا نہیں؟۔

جواب:

مُصحَف (قرآن مجید) یا کسی تحریر کو دیکھ کر تلاوت کرنے سے نماز فاسد ہو جائے گی، خواہ امام نے دیکھ کر پڑھا ہو یا نماز میں شامل کسی مقتدی یا سامع نے دیکھ کر لقمہ دیا اور امام نے اُس کا لقمہ لے لیا ہو تو امام اور تمام مقتدیوں کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

وَإِذَا قَرَأَ الْإِمَامُ مِنَ الْمُصْحَفِ: فَسَدَتْ صَلَاتُهُ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ، وَقَالَا: هِيَ تَامَّةٌ، لِأَنَّهَا عِبَادَةٌ انْضَافَتْ إِلٰى عِبَادَةٍ أُخْرٰى، إِلَّا أَنَّهُ يُكْرَهُ، لِأَنَّهُ تَشَبُّهٌ بِصَنِيعِ أَهْلِ الْكِتَابِ، وَلِأَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ: أَنَّ حَمْلَ الْمُصْحَفِ، وَالنَّظَرَ فِيهِ، وَتَقْلِيبَ الْأَوْرَاقِ عَمَلٌ كَثِيرٌ، وَلِأَنَّهُ تَلَقَّنٌ مِنَ الْمُصْحَفِ، فَصَارَ كَمَا إِذَا تَلَقَّنَ مِنْ غَيْرِهٖ، وَعَلٰى هٰذَا لَا فَرْقَ بَيْنَ الْمَحْمُولِ وَالْمَوْضُوعِ،

ترجمہ: ''جب امام نے مُصحف سے دیکھ کر قراءت کی، تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ نے فرمایا: یہ نماز مکمل ہے، کیونکہ اس نماز کے ساتھ ایک اور عبادت مل گئی ہے، البتہ یہ نماز مکروہ ہے کیونکہ یہ اہلِ کتاب کی عبادت کے مُشابہ ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل یہ ہے کہ مصحف کو اٹھانا، اس کو پڑھنا اور اس کے ورق پلٹنا عملِ کثیر ہے اور اس لئے کہ اس میں مُصحف سے استفادہ ہے اور اس سے لقمہ لینا ہے، پس یہ اسی طرح ہے جس طرح خارج از نماز شخص سے نماز میں لقمہ لیا جائے۔ دوسری دلیل (یعنی یہ خارج از نماز شخص سے اصلاح لینی ہے) کے اعتبار سے اس میں کوئی فرق نہیں ہے، خواہ مصحف کو اٹھایا ہوا ہو یا رکھا ہوا ہو''۔

(ہدایہ، جلد 1، ص: 269)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَقِرَاءَ تُهُ مِنْ مُصْحَفٍ) أَيْ مَافِيهِ قُرْآنٌ (مُطْلَقًا) لِأَنَّهُ تَعَلُّمٌ، إِلَّا إِذَا كَانَ حَافِظًا لِمَا قَرَأَهُ وَقَرَأَ بِلَا حَمْلٍ، وَقِيلَ لَا تَفْسُدُ إِلَّا بِآيَةٍ۔

ترجمہ: ''اور نمازی کا قرآن مجید میں دیکھ کر پڑھنا مطلقاً مفسدِ نماز ہے، کیونکہ یہ (خارج نماز) سے سیکھنا ہے، مگر اس صورت میں یہ مفسد نہیں ہے جبکہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اس کا حافظ ہو اور قرآن کو (ہاتھ میں) اٹھائے بغیر پڑھے اور ایک قول یہ ہے کہ اگر ایک آیت سے کم مقدار میں قرآن مجید میں دیکھ کر پڑھے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (أَيْ مَافِيهِ قُرْآنٌ) عَمَّمَهُ لِيَشْمَلَ الْمِحْرَابَ، فَإِنَّهُ إِذَا قَرَأَ مَافِيهِ فَسَدَتْ فِي الصَّحِيحِ، ''بحر'' قَوْلُهُ: (مُطْلَقًا) أَيْ قَلِيلًا أَوْ كَثِيرًا، إِمَامًا أَوْ مُفْرَدًا، أُمِّيًا لَا يُمْكِنُهُ الْقِرَاءَةُ إِلَّا مِنْهُ أَوْ لَا قوله: (لِأَنَّهُ تَعَلُّمٌ) ذَكَرُوا لِأَبِي حَنِيفَةَ فِي عِلَّةِ الْفَسَادِ وَجْهَيْنِ: أَحَدُهُمَا: أَنَّ حَمْلَ الْمُصْحَفِ وَالنَّظَرَ فِيهِ وَتَقْلِيبَ الْأَوْرَاقِ عَمَلٌ كَثِيرٌ۔ وَالثَّانِي: أَنَّهُ تَلَقُّنٌ مِنَ الْمُصْحَفِ فَصَارَ كَمَا إِذَا تَلَقَّنَ مِنْ غَيْرِهِ۔

ترجمہ: ''(جو کچھ قرآن مجید سے دیکھ کر پڑھا) اس میں محراب میں لکھی ہوئی عبارت بھی

شامل ہے، پس اگراس سے دیکھ کر پڑھا، نماز فاسد ہو جائے گی، ''البحرالرائق'' میں بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔(ماتن کا قول مطلقاً کا معنی یہ ہے کہ دیکھ کر جو کچھ پڑھا اس کی مقدار) خواہ کثیر ہو یا قلیل، (پڑھنے والا) امام ہو یا تنہا شخص، اُمّی ہو اُس کا پڑھنا اُس کے لئے ممکن نہ ہو لیکن جو لکھا ہوا ہے، (اُسے پڑھ سکتا ہو) یا اُمّی نہ ہو۔(ماتن کا قول: اس لئے کہ یہ سیکھنا ہے) امام اعظم کے نزدیک دیکھ کر پڑھنے میں فساد کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں: اول: (جو ضعیف ہے) وہ یہ ہے کہ اس میں قرآن کو اٹھانا، اُس کو دیکھنا اور اُس کے ورق پلٹنا، جو کہ عملِ کثیر ہے۔ دوم: مصحف سے دیکھ کر پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے نماز سے باہر کسی شخص سے سیکھنا، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد2، ص:329، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

نماز میں لقمہ دینے کا شرعی حکم

سوال:40

دورانِ نماز امام کو کوئی خارجِ نماز شخص لقمہ دے، تو اُس کا شرعی حکم کیا ہے؟۔

جواب:

امام کا اپنے مقتدی کے سوا کسی دوسرے شخص سے لقمہ لینا مفسدِ نماز ہے۔ غیر مقتدی کے بتانے پر اگر امام نے پڑھا تو امام کے ساتھ تمام مقتدیوں کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَفَتْحُهُ عَلٰی غَیْرِ اِمَامِهٖ) اِلَّا اِذَا اَرَادَ التِّلَاوَةَ وَکَذَا الْاَخْذُ اِلَّا اِذَا تَذَکَّرَ فَتَلَا قَبْلَ تَمَامِ الْفَتْحِ (بِخِلَافِ فَتْحِهٖ عَلٰی اِمَامِهٖ) فَاِنَّهٗ لَایُفْسِدُ (مُطْلَقًا) لِفَاتِحٍ وَّآخِذٍ بِکُلِّ حَالٍ اِلَّا اِذَا سَمِعَهُ الْمُؤْتَمُّ مِنْ غَیْرِ مُصَلٍّ فَفَتَحَ بِهٖ تَفْسُدُ صَلَاةُ الْکُلِّ وَیَنْوِی الْفَتْحَ لَاالْقِرَاءَةَ۔

ترجمہ: ''نمازی کا اپنے امام کے سوا کسی دوسرے کو لقمہ دینا (یعنی قراءت میں رکنے پر اُس ک

بتانا خود اُس کے حق میں بھی)مفسدِ نماز ہے،لیکن اگر لقمہ دینے کی نیت سے نہیں پڑھا بلکہ تلاوت کی نیت سے پڑھا تو فاسد نہیں۔اور اسی طرح امام کو نمازی کا لقمہ لینا مفسدِ نماز ہے مگر جب کہ خود یاد کر کے پڑھا تو مفسدِ نماز نہیں (یعنی اگر نمازی کو دوسرا شخص بتا دے تو اگر وہ اس کا بتایا ہوا پڑھے گا تو نماز فاسد ہوگی اور اگر ابھی بتانے والا بتانہ چکا تھا کہ خود یاد آ گیا اور پڑھا تو نماز فاسد نہیں ہوگی)۔نمازی کا اپنے امام کو لقمہ دینا مطلقاً مفسدِ نماز نہیں ہے یعنی نہ لقمہ دینے والے کی نماز کے لئے مفسد ہے اور نہ لقمہ لینے والے کے لئے ہر حال میں (یعنی امام اس قدر پڑھ چکا ہو جس سے نماز درست ہو جاتی ہے یا نہ پڑھ چکا ہو،ایک آیت سے دوسری آیت کی طرف چلا گیا ہو یا نہیں ،لقمہ پہلی بار ہو یا دوسری، تیسری بار کسی طرح مفسدِ نماز نہیں)ہاں !اگر مقتدی نے کسی خارجِ نماز شخص سے لقمہ سن کر اپنے امام کو بتایا اور امام نے لے لیا تو سب کی نماز فاسد ہوگئی۔اور لقمہ دینے والا مقتدی بتانے کی نیت کرے نہ کہ قراءت کی (کیونکہ امام کے پیچھے قراءت مکروہ ہے)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار جلد 2،ص:329،دار احیاء التراث العربی، بیروت)

چار رکعت والی نماز میں قعدۂ اولیٰ بھول کر کھڑا ہو جانا

سوال:41

اگر امام دو رکعت پڑھانے کے بعد بغیر تشہد تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے اور مقتدیوں کے لقمہ دینے پر تشہد کی طرف لوٹ آئے تو سجدۂ سہو کے ساتھ نماز ہو جائے گی یا لوٹانی ہوگی؟۔(کیپٹن زوار حسین عباسی ،اسلام آباد)۔

جواب:

قعدۂ اولیٰ واجب ہے اور واجب کے بھول کر چھوٹ جانے سے سجدۂ سہو واجب ہو جاتا ہے جس سے نماز ہو جائے گی۔قعدۂ اولیٰ بھول جانے کی صورت میں

یاد آنے پر جب تک سیدھا کھڑا نہ ہو واپس لوٹ آئے اور سجدۂ سہو بھی واجب نہیں۔
لیکن اگر سیدھا کھڑا ہو گیا تو واپس نہ لوٹے اور آخر میں سجدۂ سہو کر لے، نماز ہو جائے
گی۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(سَهَا عَنِ الْقُعُوْدِ الْأَوَّلِ مِنَ الْفَرْضِ)وَلَوْ عَمَلِيًّا،أَمَّا النَّفْلُ فَيَعُوْدُ مَالَمْ يُقَيِّدْ
بِالسَّجْدَةِ (ثُمَّ تَذَكَّرَهُ عَادَ اِلَيْهِ)وَتَشَهَّدَ وَلَاسَهْوَ عَلَيْهِ فِي الْأَصَحِّ (مَالَمْ
يَسْتَقِمْ قَائِمًا)فِيْ ظَاهِرِ الْمَذْهَبِ، وَهُوَ الْأَصَحُّ۔فَتْحٌ(وَاِلَّا) أَيْ وَاِنِ اسْتَقَامَ
قَائِمًا (لَا) يَعُوْدُ لِاشْتِغَالِهِ بِفَرْضِ الْقِيَامِ (وَسَجَدَ لِلسَّهْوِ)لِتَرْكِ الْوَاجِبِ۔

ترجمہ: ”(اگر فرض نماز کا قعدۂ اولیٰ بھول گیا) اگر چہ وہ فرضِ عملی ہو (جیسے وتر)، رہا
نفل نماز کا مسئلہ تو جب تک رکعت کا سجدہ نہیں کیا ہو لوٹ آئے۔ (پھر یاد آیا تو تشہد کی
طرف لوٹ آئے) اور تشہد پڑھے۔ صحیح قول یہ ہے کہ اس پر سجدۂ سہو نہیں (جب تک وہ
سیدھا کھڑا نہیں ہوا) ظاہر مذہب کے مطابق یہی صحیح ترین ہے، (فتح القدیر)۔ (اور
اگر) سیدھا کھڑا ہو جائے تو (نہیں لوٹے گا) کیوں کہ اب وہ (رکن) یعنی قیام کے
فرض میں مشغول ہو گیا ہے اور واجب کے ترک ہونے کی بناء پر آخر میں سجدۂ سہو
کرے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2،ص:479,478)“۔

امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا: ”ایک شخص نماز فرض یا وتر میں پہلا قعدہ بھول کر
کھڑا ہو گیا یا کھڑا ہونے لگا تو اس صورت میں کیا حکم ہے، لوٹ آئے یا نہ لوٹے؟ اور
اگر کھڑا ہو گیا یا کھڑا ہونے کے قریب تھا، اس کے بعد لوٹ آیا تو نماز ہو جائے گی یا
نہیں؟“۔

آپ نے جواب میں لکھا: ”اگر ابھی قعود سے قریب ہے کہ نیچے کا آدھا بدن ہنوز
سیدھا نہ ہونے پایا جب تو بالاتفاق لوٹ آئے، اس پر سجدۂ سہو نہیں۔ اور اگر قیام سے

قریب ہوگیا یعنی بدن کا نصف زیریں سیدھا اور پیٹھ میں خم باقی ہے تو بھی اصح وارجح میں پلٹ آنے ہی کا حکم ہے، مگر اب اس پر سجدۂ سہو واجب ہے۔ اور اگر سیدھا کھڑا ہوگیا تو پلٹنے کا اصلاً حکم نہیں بلکہ ختم نماز پر سجدۂ سہو کر لے۔ پھر بھی اگر پلٹ آیا بہت برا کیا، گناہگار ہوا، یہاں تک کہ حکم ہے کہ فوراً کھڑا ہو جائے اور اگر امام ایسا کرے تو مقتدی اس کی پیروی نہ کریں، کھڑے رہیں یہاں تک کہ وہ پھر قیام میں آئے مگر مذہب اَصَح (صحیح ترین) میں نماز یوں بھی نہ جائے گی، صرف سجدۂ سہو لازم رہے گا''۔

تنویرالابصار، ردالمحتار اور درمختار میں ہے:

فِیْ تَنْوِیْرِ الْاَبْصَارِ وَالدُّرِّالْمُخْتَارِ وَرَدِّالْمُحْتَارِ (سَهَا عَنِ الْقُعُوْدِ الْاَوَّلِ مِنَ الْفَرْضِ) وَلَوْ عَمَلِیًّا، اَمَّا النَّفْلُ فَیَعُوْدُ مَالَمْ یُقَیَّدْ بِالسَّجْدَةِ (ثُمَّ تَذَکَّرَهٗ عَادَ اِلَیْهِ) وَتَشَهَّدَ وَلَاسَهْوَ عَلَیْهِ فِی الْاَصَحِّ (مَالَمْ یَسْتَقِمْ قَائِمًا) فِیْ ظَاهِرِ الْمَذْهَبِ وَهُوَ الْاَصَحُّ" فتح" یَعْنِیْ اِذَاعَادَ قَبْلَ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ قَائِمًا وَکَانَ اِلَی الْقُعُوْدِ اَقْرَبُ فَاِنَّهٗ لَاسُجُوْدَ عَلَیْهِ فِی الْاَصَحِّ وَعَلَیْهِ الْاَکْثَرُ، اَمَّا اِذَا عَادَ وَهُوَ اِلَی الْقِیَامِ اَقْرَبُ فَعَلَیْهِ سُجُوْدُالسَّهْوِ کَمَا فِیْ نُوْرِالْاِیْضَاحِ وَشَرْحِهٖ بِلَاحِکَایَةِ خِلَافٍ فِیْهِ وَصَحَّحَ اِعْتِبَارُ ذٰلِكَ فِی الْفَتْحِ بِمَا فِی الْکَافِیْ اِنِ اسْتَوَی النِّصْفُ الْاَسْفَلُ وَظَهْرُهٗ بَعْدَ مُنْحَنٍ فَهُوَ اَقْرَبُ اِلَی الْقِیَامِ وَاِنْ لَّمْ یَسْتَوِ فَهُوَ اَقْرَبُ اِلَی الْقُعُوْدِ وَاِنِ اسْتَقَامَ قَائِمًا لَایَعُوْدُ وَسَجَدَ لِلسَّهْوِ فَلَوْ عَادَ اِلَی الْقُعُوْدِ لَاتَفْسُدُ لٰکِنَّهٗ یَکُوْنُ مُسِیْئًا اَیْ یَأْثَمُ کَمَافِی "الْفَتْحِ" فَلَوْ کَانَ اِمَـا مًالَایَعُوْدُ مَعَهُ الْقَوْمُ تَحْقِیْقًا لِلْمُخَالَفَةِ وَیَلْزَمُهُ الْقِیَامُ لِلْحَالِ" شَرْحُ الْمُنْیَةِ عَنِ الْقُنْیَةِ" وَیَسْجُدُ لِتَاخِیْرِ الْوَاجِبِ وَهُوَالْحَقُّ "بَحْرٌ"۔

ترجمہ: ''اگر فرض کا قعدۂ اولیٰ بھول گیا، اگر چہ وہ فرض عملی ہو، رہا معاملہ نفل کا تو لوٹ

آ ئے جب تک رکعت کا سجدہ نہیں کیا (پھر اسے یاد آیا تو اس کی طرف لوٹ آ ئے) اور تشہد پڑھے اور صحیح ترین قول کے مطابق اس پر سجدۂ سہو نہیں (جب تک وہ سیدھا کھڑا نہیں ہوا) ظاہر مذہب کے مطابق ، اور یہی قول صحیح ترین ہے یعنی سیدھا کھڑے ہونے سے پہلے لوٹا حالانکہ قعود کے قریب تھا تو اب صحیح ترین قول کے مطابق اس پر سجدۂ سہو نہیں ۔ اکثریت کی یہی رائے ہے، اگر لوٹا، لیکن قیام کے قریب تھا تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہو جائے گا، جیسا کہ ''نورالایضاح'' اور اس کی شرح میں بلا اختلاف ذکر کیا ہے اور کافی کی اس عبارت کو ''فتح القدیر'' میں صحیح اعتبار کیا ہے کہ اگر نصف اسفل (نیچے کا آدھا دھڑ) سیدھا مگر پشت ابھی ٹیڑھی تھی تو نمازی قیام کے قریب اور اگر نچلا دھڑ سیدھا نہیں تو نمازی قعود کے قریب ہوگا۔ اور اگر کھڑا ہو گیا تو نہ لوٹے اور سجدۂ سہو کرے اور اگر اب بھی واپس لوٹ آتا ہے تو نماز فاسد نہ ہوگی، البتہ گناہ گار ہوگا جیسا کہ ''فتح القدیر'' میں ہے۔ اگر وہ امام ہے اور کھڑے ہو کر واپس لوٹے تو مقتدی اس کی موافقت میں واپس نہ لوٹیں تا کہ مخالفت ثابت ہو تو اس امام پر فوراً قیام لازم ہے۔ ''شرح المنیہ'' میں ''قنیہ'' سے ہے اور تاخیر واجب کی وجہ سے سجدۂ سہو کرے اور یہی حق ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد:8، ص:182،181)''۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر دوسری رکعت کے بعد قعدۂ اولیٰ کے لئے بیٹھنے کے بجائے تیسری رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہو گیا ہے تو قُعُود (تشہد) کی طرف نہیں لوٹے گا اور سجدۂ سہو سے نماز درست ہو جائے گی۔ اگر ابھی سیدھا کھڑا نہیں ہوا اور قعود کے قریب ہے، تو بیٹھ جائے اور اس صورت میں سجدۂ سہو نہیں کرے گا۔ اگر مقتدی یا امام سیدھا کھڑے ہونے کے بعد خود یاد آنے پر تشہد کی طرف لوٹ آئیں تو علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَلَوْعَادَ اِلَی الْقُعُوْدِ تَفْسُدُ صَلَاتُہٗ عَلَی الصَّحِیْحِ کَذَا فِی "التَّبْیِیْن"۔

ترجمہ: ”اور اگر (دوسری رکعت کے بعد قعدۂ اولیٰ کے لئے بیٹھنے کے بجائے تیسری رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہونے کے بعد) قعدے کی طرف لوٹ آیا، تو صحیح قول کے مطابق نماز فاسد ہوجائے گی۔ ”تبیین“ میں اسی طرح ہے“۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد:1، ص:127، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

لیکن سطور بالا میں امام احمد رضا قادری نے علامہ علاؤالدین حصکفی اور علامہ ابن عابدین شامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر منفرد یا امام سیدھا کھڑے ہونے کے بعد خود یاد آنے پر (قعدۂ اولیٰ کے لئے) لوٹ آئیں تو نماز فاسد نہیں ہوگی، لیکن وہ گناہگار ہوں گے اور تاخیر فرض یا ترک واجب کی بنا پر سجدۂ سہو لازم آئے گا۔ اگر امام مقتدی کے یاددلانے پر کھڑا ہونے کے بعد قعدۂ اولیٰ (جسے وہ بھول کر کھڑا ہوگیا تھا) کی طرف لوٹ آیا تو اس صورت میں امام اور مقتدی سب کی نماز فاسد ہوجائے گی، کیوں کہ یہ تلقین (مقتدی کا اپنے امام کو غلطی پر مطلع کرنے کے لئے لقمہ دینا) اور تَلَقُّن (یعنی امام کا لقمہ لینا) بلاضرورت ہے اور یہ فسادِ صلوٰۃ کا سبب ہے۔ تلقین اور تَلَقُّن کے تفصیلی دلائل ہم تفہیم المسائل، جلد: سوم، ص:54 پر تحریر کرچکے ہیں، وہاں مطالعہ فرمائیں۔

مسافر کے پندرہ دن سے کم قیام پر قصر ہے

سوال: 42

ایک شخص پشاور سے کراچی تک سفر کرتا ہے۔ ایک ہفتہ کراچی میں ہوتا ہے تو دوسرے ہفتے پشاور میں ہوتا ہے یعنی آنا جانا لگا رہتا ہے، تو ایسے شخص کی نماز کا کیا حکم ہے، وہ قصر نماز ادا کرے گا یا پوری؟۔

(صفدر اقبال نعیم، ضلع سدھنوتی، آزاد کشمیر)

جواب:

مذکورہ شخص وطنِ اصلی میں تو پوری نماز ادا کرے گا، لیکن جب حالتِ سفر میں ہوگا اور کسی مقام پر 15 دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو وہاں نماز قصر کرے گا۔ جب تک بندہ کسی مقام پر 15 دن یا اُس سے زائد عرصے کے لئے قیام کی نیت نہ کرے، تو وہ شرعاً مسافر ہی کہلائے گا، نماز میں قصر کرے گا۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (أَوْ يَنْوِیْ)وَلَوْ فِی الصَّلَاةِ إِذَا لَمْ يَخْرُجْ وَقْتُهَا وَلَمْ يَكُ لَاحِقاً (إِقَامَةَ نِصْفِ شَهْرٍ) حَقِيقَةً أَوْ حُكْمًا لِمَا فِی "الْبَزَّازِيَّةِ" وَغَيْرِهَا، (بِمَوْضِعٍ صَالِحٍ لَّهَا) مِنْ مِصْرٍ أَوْ قَرْيَةٍ أَوْ صَحْرَاءِ دَارِنَا وَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْأَخْبِيَةِ (فَيَقْصُرُ إِنْ نَوٰى)الْإِقَامَةَ (فِی أَقَلَّ مِنْهُ)أَیْ فِی نِصْفِ شَهْرٍ۔ ترجمہ: "(یا وہ نصف ماہ اقامت کی نیت کرے) اگرچہ اقامت کی نیت نماز کے اندر کرے بشرطیکہ نماز کا وقت نہ نکلا ہو اور مسافر لاحق نہ ہو، پھر اقامت کی نیت حقیقت میں ہو یا حکماً دونوں معتبر ہیں جیسے کہ "بزازیہ" وغیرہ میں اس کی مثال موجود ہے، (اقامت کی نیت کسی ایسی جگہ کرے جو اقامت کی صلاحیت رکھتی ہو) شہر ہو یا گاؤں ہو یا ہمارے ملک کا صحرا ہو اور نیت کرنے والا خانہ بدوش ہو، (پس نماز میں قصر کریں گے، اگر پندرہ دن سے کم اقامت کی نیت کی ہو)"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 528، 529، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

مساجد اور وقف کے مسائل

کسی کی ذاتی زمین پر مسجد بنانا یا اُسے مسجد میں شامل کرنا

سوال: 43

میں 2000ء میں وفاقی محتسب کے دفتر میں I.G.M کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ گورنمنٹ کی جانب سے مجھے ایک پلاٹ ملا، جس کا نمبر: L-534 سیکٹر 3 نیو کراچی الاٹ ہوا تھا۔ قریب ہی ایک جامع مسجد ہے، اُس مسجد کی انتظامیہ نے میرے پلاٹ پر غیر قانونی قبضہ کرلیا ہے اور میرے پلاٹ کو مسجد کا کمپاؤنڈ بنالیا ہے۔ میرے علاوہ قریب بارہ پلاٹ اور بھی مسجد انتظامیہ نے قبضہ کئے ہیں۔ جناب سے گذارش ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ عنایت فرمائیں کہ مسجد انتظامیہ کا طرزِ عمل درست ہے؟۔

انجینئر محمد اشفاق، تاج کمپلیکس، گلشنِ ظہور، کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کا بیان درست ہے اور مسجد انتظامیہ نے آپ کے اور دوسرے لوگوں کے ذاتی الاٹ شدہ پلاٹوں پر آپ لوگوں کی اجازت کے بغیر قبضہ کر کے مسجد میں شامل کیا ہے تو اُن کا یہ طرزِ عمل قطعاً ناجائز، خلافِ شرع اور خلافِ قانون ہے۔ آپ کے بیان کے مطابق پلاٹ کے آپ مالک ہیں، جسے مسجد کمپاؤنڈ میں شامل کیا گیا ہے، لیکن آپ کے سوال سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ آیا آپ کی زمین کو مسجد کے اُس حصے میں شامل کیا گیا ہے، جس پر نماز ادا کی جارہی ہے؟، اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا حکم شرعی یہ ہے:

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

اَلصَّلاۃُ فِیْ أَرْضٍ مَغْصُوْبَۃٍ جَائِزَۃٌ وَلٰکِنْ یُعَاقَبُ بِظُلْمِہٖ فَمَا کَانَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ یُثَابُ وَمَا کَانَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْعِبَادِ یُعَاقَبُ کَذَافِی "مُخْتَار الْفَتَاوٰی"۔

ترجمہ: "غصب شدہ زمین پر نماز جائز تو ہے (یعنی پڑھنے سے ادا ہو جائے گی)، لیکن اِس ظلم کے سبب اس کو سزا دی جائے گی، جو کچھ اُس بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے، (اگر

اللہ تعالیٰ چاہے تو اُسے نماز کا) ثواب دے گا اور جو کچھ اُس کے اور دوسرے بندوں کے درمیان ہے، اس کا مواخذہ کیا جائے گا، جیسا کہ ''مختار الفتاویٰ'' میں ہے''۔
(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 109، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

لیکن مغصوبہ زمین پر نماز کے ادا ہو جانے کا یہ فتویٰ ''اسقاطِ فرض'' کے معنی میں ہے، اس پر اجر کا مدار اللہ تعالیٰ کے کرم پر موقوف ہے اور ہمارے بعض فقہاءِ کرام نے غصب شدہ زمین پر نماز کو مکروہ قرار دیا ہے۔

علامہ طحطاوی متوفیٰ 1231ھ لکھتے ہیں: (وَ) یُکْرَہُ فِیْ (أَرْضِ الْغَیْرِ بِلَا رِضَاہُ)
ترجمہ: ''کسی شخص کی زمین پر اُس کی مرضی کے بغیر نماز پڑھنا مکروہ ہے''۔
(حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد 1، ص: 484)

اور اگر اُسے محض کمپاؤنڈ یا چہار دیواری میں شامل کر رکھا ہے، تب بھی دوسرے کی ملکیتی زمین پر غاصبانہ قبضہ ناجائز ہے، حدیث پاک میں ہے:
''مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِّنَ الْاَرْضِ ظُلْماً، طَوَّقَهُ اللّٰهُ اِیَّاهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرْضِیْنَ''۔
ترجمہ: ''جو شخص کسی کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا ظلماً اور ناحق لے گا، تو اسے سزا کے طور پر قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4055)''۔

مفتی وقار الدین علیہ الرحمہ سے سوال کیا گیا: ''کسی کی زمین میں مسجد تعمیر کی گئی، آیا وہ مالک زمین اس مسجد کو منہدم کر سکتا ہے یا نہیں؟''۔ آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''کسی شخص کا اپنی شخصی ملکیت میں مسجد بنانا جائز ہے اور اگر کوئی دوسرا شخص بنا لے تو وہ مسجد نہ ہوگی اس کے توڑ دینے کا مالک کو اختیار ہے اس لئے کہ مسجد وقف ہے اور وقف مالک ہی کر سکتا ہے، علامہ ابن عابدین شامی متوفیٰ 1252ھ نے شامی میں لکھا: ذَکَرَ فِی ''الْبَحْرِ'' أَنَّ مَفَادَ کَلَامِ الْحَاوِیْ اِشْتِرَاطُ کَوْنِ اَرْضِ الْمَسْجِدِ مِلْکًا لِّلْبَانِیْ
(کتاب الوقف، جلد 3، ص: 405، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

ترجمہ: ''''البحر الرائق'' میں ذکر کیا کہ ''الحاوی للفتاویٰ'' کے کلام کا حاصل یہ ہے

کہ (وقف کے صحیح ہونے کی) شرط یہ ہے کہ مسجد کی زمین بانیِ مسجد کی ملک میں ہو۔ مالک کی اجازت کے بغیر کسی کی زمین پر قبضہ کرنا غصب کرنا ہے اور فقہ کی تمام کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ غصب کی ہوئی زمین پر نماز مکروہ ہے، لہٰذا ایسی مسجد جو مالک کی اجازت کے بغیر بنائی گئی ہو، اس میں تو نماز پڑھنا ہی مکروہ ہے، (وقار الفتاویٰ، جلد دوم، ص:305)''۔

مذکورہ صورت میں آپ کو شرعی اور قانونی اختیار حاصل ہے کہ اپنے پلاٹ کے حصول کے لئے چارہ جوئی کر سکتے ہیں۔ مسجد انتظامیہ کے لئے مناسب صورت یہ ہے کہ پلاٹ کے مالک کے ساتھ باہمی رضامندی سے زمین کا سودا کر لیں، ایسی صورت میں وہ پلاٹ مسجد کی ملکیت بن جائے گا اور اس کا مسجد میں شامل کرنا درست ہوگا یا پلاٹ کے مالکان اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنے پلاٹوں کو مسجد کے لئے وقف کر دیں۔ ورنہ کسی کی زمین کو ظلماً غصب کر کے اور اس پر قبضہ کر کے اس کا مسجد بنانا شرعاً ناجائز ہے اور اس پر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

مسجد فنڈ سے وضوخانہ کی تعمیر

سوال: 44

مسجد کے ساتھ مدرسہ ہے اور مدرسے کی جگہ میں وضوخانہ اور استنجاء خانہ بنوانا ہے جو کہ دونوں کے لئے استعمال ہوگا، کیا ایسا کرنا درست ہوگا؟۔ نیز مسجد کی رقم سے تعمیر کی جاسکتی ہے یا نہیں، یا مدرسے کا علیحدہ فنڈ موجود ہے اُس سے تعمیر کروایا جائے؟۔

جامع مسجد عثمانیہ، اورنگی، کراچی

جواب:

فنائے مسجد یعنی مسجد کی حدود میں اگر اُس مقام پر پہلے سے کچھ تعمیر نہیں ہے، تو وہاں وضوخانہ اور استنجا خانہ بنوایا جاسکتا ہے اور مسجد و مدرسہ دونوں کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ ہاں! اگر اس جگہ پہلے ہی کچھ تعمیر ہے تو اس میں تبدیلی کرنا جائز نہیں۔ علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَلَا یَجُوزُ تَغْيِيرُ الْوَقْفِ عَنْ هَيْئَتِهِ، ترجمہ: ''وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490)''۔

مسجد کے عطیات صدقاتِ نافلہ ہوتے ہیں۔آج کل مساجد کے لئے عوام سے جو عمومی چندہ یا عطیات لئے جاتے ہیں، ان میں یہ امر معروف ہے کہ یہ مسجد کے مصارف جاریہ کے لئے ہیں، ان میں مساجد کی تعمیر ومرمت، یوٹیلٹی بلز (بجلی، لاؤڈ اسپیکر، گیس اور پانی وغیرہ) ضرورت کے وقت رنگ وروغن، دریاں، قالین، ٹیوب لائٹس، پنکھے، پانی وسیوریج کا انتظام اور مسجد کے عملے کی تنخواہیں اور دیگر مصارف شامل ہوتے ہیں، البتہ جو رقم تعمیر یا کسی معینہ مصرف کے لئے دی جائے یا لی جائے، اسے صرف اسی معیّن مصرف پر خرچ کرنا ضروری ہے۔وضوخانہ اور استنجا خانہ مسجد کی ضروریات میں سے ہے، لہٰذا اس پر مسجد کے فنڈ سے خرچ کیا جاسکتا ہے۔اگر مدرسے کا فنڈ الگ ہے اور وضوخانہ وغسل خانے وغیرہ صرف طلباء کی ضروریات کے لئے بنوانے ہیں، تو ان پر مدرسے کے فنڈ سے رقم خرچ کی جائے۔

دیہات میں عیدگاہ کا شرعی حکم

سوال:45

ہمارے دیہات میں ایک قدیم عیدگاہ قائم ہے جو کہ آبادی کے اندر واقع ہے اس کو آبادی سے باہر منتقل کرنا مقصود ہے۔کیا اس قدیمی عیدگاہ کو آبادی سے باہر منتقل کرسکتے ہیں یا نہیں؟، کیا عیدگاہ میں نصب اینٹوں کو مجوزہ عیدگاہ کے لئے استعمال کرسکتے ہیں؟۔نئی عیدگاہ کے لئے دیہات کے مکینوں نے اراضی حاصل کرلی ہے، اب پرانی عیدگاہ کے اراضی کو فروخت کرکے رقم نئے عیدگاہ کے قیام کے تصرف میں لایا جاسکتا یا نہیں؟۔

خدابخش بلوچ

چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف، کوئٹہ، بلوچستان

جواب:

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے ''عیدین میں جگہ کی تنگی کے باعث قدیمی عیدگاہ چھوڑ کر دوسری جگہ عیدگاہ منتقل کرنے اور پرانی جگہ کو قبرستان میں تبدیل کرنے

سے متعلق'' سوال ہوا، انہوں نے جواب میں لکھا: بیانِ سائل سے معلوم ہوا کہ یہ موضع ایک گاؤں ہے، اور ہمارے ائمہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم کے مذہب میں گاؤں میں عیدین جائز نہیں تو وہاں عیدہ گاہ وقف نہیں ہو سکتی کہ محض بے حاجت و بے قربت بلکہ مخالفِ قربت ہے، تو وہ زمین وعمارت مِلکِ بانیان ہیں انہیں اختیار ہے اس میں جو چاہیں کریں خواہ اپنا مکان بنائیں یا زراعت کریں یا قبرستان کرائیں اور اب وہاں دوسری عیدگاہ بنائی گئی اس کی بھی یہی حالت ہوگی۔ درمختار میں ہے: فِي "اَلْقُنْيَةِ" صَلوٰةُ الْعِيْدِفِي الْقُرٰى تُكْرَهُ تَحْرِيْمًا اَيْ لِاَنَّهٗ اِشْتِغَالٌ بِمَالَايَصِحُّ۔ ترجمہ: ''قنیہ'' میں ہے کہ گاؤں میں نمازِ عید مکروہِ تحریمی ہے یعنی ایسی چیز میں مشغول ہونا ہے جو صحیح نہیں، اُسی کی کتاب الوقف میں ہے: شَرْطُهٗ أَنْ يَكُوْنَ قُرْبَةً فِيْ ذَاتِهٖ ۔ ترجمہ: ''شرطِ وقف یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے قربتِ مقصودہ ہو، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 16، ص: 342)''۔

اعلیٰ حضرت مُحدثِ بریلی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوا کہ سابقہ پرانی عیدگاہ کا فروخت کرنا یا اس کو اپنے دوسرے تصرُّفات میں لانا جائز ہے، اسی طرح پرانی عیدگاہ کی اینٹوں کو نئی عیدگاہ کی تعمیر میں بھی استعمال کرنا جائز ہے، تاہم دیہات والوں کے لئے جو نئی عیدگاہ بنائی جائے گی، اس کا حکم بھی یہی ہوگا۔

مسجد فنڈ سے ضعیف امام کی اعانت اور کفالت اور امام کی چھٹیوں کی تنخواہ

سوال: 46

(1) اگر کوئی امام، مؤذن اور خادم عملۂ مسجد اپنی کمزوری و بُڑھاپے کی وجہ سے کام کرنا چھوڑ دے، تو کیا مسجد فنڈ سے مستقل ماہانہ اس کی مدد کی جا سکتی ہے یا نہیں؟۔ سال کے بعد عملے کا کوئی فرد (امام، مؤذن یا خادم) چھٹی بغیر انتظام کئے چلا جائے، چھٹی کی تنخواہ مسجد فنڈ سے لینا جائز ہے یا نہیں؟، (قاری خالد، کریمہ مسجد، بلدیہ ٹاؤن، کراچی)۔

(2) ہماری مسجد میں شروع ہی سے یہ معمول رہا ہے کہ امام، مؤذن اور خادم عملۂ مسجد کو چھ ماہ بعد 15 دن یا ایک سال بعد ایک ماہ کی چھٹی مع تنخواہ دی جاتی ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً

جائز ہے؟۔ نیز ہماری مسجد کے مؤذن صاحب ایک سال ایک ماہ کے بعد استعفیٰ دے کر جا رہے ہیں اور سال بھر میں انہوں نے چھٹیاں نہیں کیں۔ کیا اُنہیں ایک ماہ کی چھٹی کی تنخواہ لینا شرعاً جائز ہے؟۔ مسجد کے عملے کی تنخواہ چندے سے دی جاتی ہے، نمازیوں کے علم میں بھی یہ بات ہے (سردار احمد قادری، جامع مسجد فیضانِ اولیاء کھارادر، کراچی)۔

جواب :

اگر امام، مؤذن یا خادم وغیرہ میں سے کوئی فرد کسی بھی سبب سے اپنے منصب سے دستبردار ہو گیا تو اب مسجد کے فنڈ یا عطیات سے اُسے کوئی رقم نہیں دی جاسکتی کہ مسجد کی جمع شدہ رقم مالِ وقف ہے، جو صرف مصارفِ مسجد مثلاً مسجد کے عملے کا مشاہرہ اور ضروریات ومصالح مسجد کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ البتہ اگر مسجد کی انتظامیہ کے افراد یا اہلِ محلّہ اُس امام، مؤذن یا خادم کے عمر رسیدہ ہونے کا خیال کرتے ہوئے یا عقیدت کے سبب اس کی مالی مدد کے لئے علیحدہ فنڈ قائم کریں، خود بھی حصہ ڈالیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دیں، تو یہ اجر کی بات ہے۔ مسجد کے عطیات یا فنڈ اس مقصد کے لئے استعمال نہ کریں۔ لیکن اگر مسجد انتظامیہ نے اپنے عملے کے لئے شرائط ملازمت طے کر رکھی ہوں، جن میں ہفتہ وار یا سالانہ تعطیلات مع تنخواہ اور ایامِ ضعیفی کا گزارہ الاؤنس اور علاج معالجہ وغیرہ شامل ہیں، اور چندہ وعطیات دینے والوں پر بھی یہ مقاصد واضح ہوں اور مسجد فنڈ میں گنجائش ہو تو ایسا کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن امر ہے۔ فقہاء کرام نے ائمہ اور مُدرسین کے لئے چھٹی کے زمانے کی تنخواہ لینا جائز لکھا ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَ فِی "الْقُنْیَةِ" مِنْ بَابِ الْإِمَامَةِ :إِمَامٌ یَتْرُكُ الْإِمَامَةَ لِزِیَارَةِ اَقْرِبَائِهٖ فِی الرَّسَاتِیْقِ اُسْبُوْعًا اَوْ نَحْوَهٗ اَوْلِمُصِیْبَةٍ اَوْلِاِسْتِرَاحَةٍ لَابَأْسَ بِهٖ وَمِثْلُهٗ عَفْوٌ فِی الْعَادَةِ وَالشَّرْعِ۔

ترجمہ: ''قنیہ'' باب الامامت میں یہ ہے کہ اگر امام اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر دیہات میں ایک ہفتہ یا کم وبیش مدت کے لئے اپنے رشتہ داروں سے ملنے گیا یا کسی مصیبت کی وجہ سے گیا یا محض آرام کی خاطر گیا، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اتنی رخصت یا غیر حاضری شرعاً اور

عادتاً معاف ہے،(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6،ص:493، بیروت)"۔

سرکاری ونجی اداروں میں بھی عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ سال میں ایک مہینے کی چھٹی مع تنخواہ دی جاتی ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قَالَ فِی "الْأَشْبَاهِ" : وَقَدِ اخْتَلَفُوْا فِیْ أَخْذِ الْقَاضِیْ مَا رُتِّبَ لَهٗ فِیْ بَیْتِ الْمَالِ فِیْ یَوْمِ بِطَالَتِهٖ ،فَقَالَ فِی "الْمُحِیْطِ" :اِنَّهٗ یَأْخُذُ لِأَنَّهٗ یَسْتَرِیْحُ لِلْیَوْمِ الثَّانِیْ ،وَقِیْلَ :لَا۔ وَفِی "الْمُنْیَةِ" :اَلْقَاضِیْ یَسْتَحِقُّ الْکِفَایَةَ مِنْ بَیْتِ الْمَالِ فِیْ یَوْمِ الْبِطَالَةِ فِی الْأَصَحِّ،

ترجمہ:" الاشباہ والنظائر میں ہے: فقہاء نے قاضی کو چھٹیوں کے ایام کی تنخواہ لینے میں اختلاف فرمایا ہے، جو قاضی کے لئے بیت المال سے مقرر کیا گیا ہے،"محیط" میں فرمایا: ایامِ تعطیلات کی تنخواہ لے گا کیونکہ وہ دوسرے دن کام کے لئے ہی آرام کرتا ہے، اور بعض نے کہا کہ (تنخواہ) نہیں لے گا۔ اور "منیہ" میں ہے: صحیح ترین یہ ہے کہ قاضی ایامِ تعطیلات کی تنخواہ کفایت کے مطابق لینے کا مستحق ہے"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6،ص:444، بیروت)

امام کو متبادل انتظام کر کے یا انتظامیہ کو پیشگی اطلاع دے کر جانا چاہئے تاکہ وہ انتظام کرسکیں۔

مسجد کی حیثیت کو تبدیل کرنا

سوال: 47

ہمارے گاؤں میں ایک مسجد زیرِ تعمیر ہے جو کہ ایک مدرسہ میں ہے، تقریباً مکمل ہوچکی ہے، اس سے قبل ہمارے دادا کے وقتوں کی ایک چھوٹی سی مسجد چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اب نئی مسجد بن چکی ہے، تو پہلے والی مسجد کا کیا کریں، شہید کر کے اس جگہ کو عام استعمال میں لا سکتے ہیں یا نہیں، اگر اُسے شہید نہیں کرسکتے تو کیا کریں؟۔

محمد نعیم لطیف، حاصل پور: بہاولپور

جواب:

جب پہلے سے ایک مسجد موجود ہے تو اُس کے قریب دوسری مسجد تعمیر کرنا ہرگز

جائز نہیں تھا کہ اس سے سابقہ مسجد کی تعطیل و تخریب (بے کار کردینا و ویران کردینا) ہے، جو حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا۔

ترجمہ: ''اوراس سے بڑا ظالم اور کون ہے جو اللہ کی مساجد میں اس کے نام کے ذکر سے منع کرے اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے، (البقرہ: 114)''۔

مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد ہی ہے اور اس کی مسجدیت کبھی باطل نہیں ہوسکتی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَلَا يَجُوْزُ تَغْيِيْرُ الْوَقْفِ عَنْ هَيْئَتِهٖ، ترجمہ: ''وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص: 490، مطبوعہ مکتبہء رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مسجد آسمان کی بلندی اور زمین کی گہرائی (تحت الثریٰ) تک مسجد ہی ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

قَوْلُهٗ إِلٰى عَنَانِ السَّمَآءِ بِفَتْحِ الْعَيْنِ وَكَذَا إِلٰى تَحْتَ الثَّرٰى كَمَا فِي الْبِيْرِيِّ عَنِ الْإِسْبِيْجَابِيِّ۔

ترجمہ: ''مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثریٰ تک مسجد ہی ہے ''بیری'' میں اسبیجابی سے اسی طرح منقول ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 2، ص: 371-370)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پرانی مسجد کی جگہ چھوڑ کر نئی مسجد بنانے کے متعلق سوال کیا گیا، آپ نے جواب میں لکھا: ''حتی الامکان مسجد کا آباد کرنا فرض ہے اور ویران کرنا حرام، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا۔

ترجمہ: ''اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روکتا ہے اور ان کی بربادی کی کوشش کرتا ہے، (البقرہ: 114)''۔

مزید لکھتے ہیں کہ: جو صاحب پختہ بنانا چاہتے ہیں، اسی کو پختہ کریں اور آباد کریں، جدا مسجد بنانے میں نفل کا ثواب پائیں گے اور اس مسجد کے آباد کرنے میں فرض کا ثواب، نفل کے

ثواب کو فرض کے ثواب سے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 16، ص: 413، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

پرانی مسجد کو شہید کرنا اور کسی دوسرے استعمال میں لانا قطعاً جائز نہیں، مسجد بنانا یقیناً اجر و ثواب کا باعث ہے، لیکن اگر اُس سے پرانی مسجد ویران ہوتی ہو تو ہرگز نہیں بنانی چاہئے کہ مسجد کا ویران کرنا اور اُسے شہید کرنا حرامِ قطعی ہے۔ شرعی مسئلہ تو آپ کو نئی مسجد بننے سے پہلے معلوم کرنا چاہئے تھا، بہر حال اب جس طرح ممکن ہو کوشش یہ کرنی چاہئے کہ نئی مسجد بھی آباد ہو اور پرانی مسجد بھی آباد رہے۔ ایسی صورت میں ہمیشہ یہ تدبیر کرنی چاہئے کہ پہلے سے جو مسجد قائم ہے حسبِ ضرورت ملحق زمین حاصل کر کے اسی کی توسیع کی جائے۔ زمین نقد قیمت پر بھی خریدی جا سکتی ہے اور تبادلے کے ذریعے بھی۔ البتہ پرانی مسجد کو شہید کر کے نیا عمارتی نقشہ اس طرح بنایا جا سکتا ہے کہ پرانی مسجد نئی توسیع شدہ مسجد میں شامل ہو جائے۔

نئی مسجد بنانے سے پہلی مسجد کا حق ادا نہیں ہو سکتا ہے، وہ مسجد قیامِ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، کسی دوسرے کام میں اسے ہرگز استعمال نہیں کیا جا سکتا، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: "جو زمین متعلق مسجد ہے وہ مسجد ہی کے کام میں لائی جا سکتی ہے اور اس کے بھی اُس کام میں جس کیلئے واقف نے وقف کی، وقف کو اس کے مقصد سے بدلنا جائز نہیں، شَرْطُ الْوَاقِفِ کَنَصِّ الشَّارِعِ فِیْ وُجُوْبِ الْعَمَلِ بِہٖ۔ (واقف کی شرط وجوب عمل میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نص کی مثل ہے)۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 16، ص: 546، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

مسجد میں انگلیاں چٹخانے کا شرعی حکم

سوال: 48

مسجد میں انگلیاں چٹخانا کیسا ہے، (منور احمد، ملیر کراچی)۔

جواب:

انگلیاں چٹخانا ویسے بھی مکروہ اور ناپسندیدہ فعل ہے اور مسجد میں اس کی کراہیت

اورزیادہ بڑھ جائے گی۔

عَنْ عَلِيٍّ ،اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰه ﷺ قَالَ :لَا تُفَقِّعْ أَصَابِعَكَ وَأَنْتَ فِي الصَّلَاةِ ۔

ترجمہ:''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم نماز میں ہوتو انگلیاں نہ چٹخاؤ،(سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:965)''۔

حضرت کعب بن عجرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ فَأَحْسَنَ وُضُوْءَهُ ،ثُمَّ خَرَجَ عَامِدًا اِلَى الْمَسْجِدِ فَلَا يُشَبِّكَنَّ بَيْنَ أَصَابِعِهِ فَإِنَّهُ فِي صَلَاةٍ ۔

ترجمہ:''تم میں سے جب کوئی شخص اچھی طرح وضو کر کے مسجد میں جانے کے ارادے سے نکلے ،پس ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں نہ ڈالے کہ وہ نماز میں ہے،(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:386)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَيُكْرَهُ اَنْ يُشَبِّكَ اَصَابِعَهٗ وَاَنْ يُفَرْقِعَ كَذَا فِيْ "فَتَاوٰى قَاضِيْ خَانْ"، وَالْفَرْقَعَةُ اَنْ يَغْمِزَهَا اَوْيَمُدَّهَا حَتّٰى تَصُوْتَ، كَذَا فِي "النِّهَايَةِ" وَالْفَرْقَعَةُ خَارِجَ الصَّلٰوةِ كَرِهَهَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ كَذَافِي "الزَّاهِدِيّ" ۔

ترجمہ:''(نماز میں) انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈالنا اور انگلیاں چٹخانا مکروہ (تحریمی) ہے جیسا کہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے ۔اور انگلیاں چٹخانے کی ہرصورت، جس سے آواز پیدا ہو، (منع ہے)، خواہ انگلیاں موڑ کر دبانے سے ہو یا لمبا کرنے سے ہو، جیسا کہ ''نہایہ'' میں ہے اور نماز کے علاوہ بھی انگلیاں چٹخانا اکثر علماء کے نزدیک مکروہ ہے، جیسا کہ ''زاہدی'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:106، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَفَرْقَعَةُ الْاَصَابِعِ) وَتَشْبِيْكُهَا وَلَوْمُنْتَظِرًا لِصَلَاةٍ أَوْ مَاشِيًا اِلَيْهَا لِلنَّهْيِ ،وَلَا يُكْرَهُ خَارِجَهَا لِحَاجَةٍ۔

ترجمہ:''انگلیاں چٹخانا اور ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالنا مکروہ تحریمی ہے، خواہ نماز کے انتظار میں ہو یا نماز کے لئے جارہا ہو، اور اگر بیرونِ نماز کسی

ضرورت کے سبب ہو تو مکروہ نہیں ہے''۔
(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2،ص:353،داراحیاء التراث العربی، بیروت)

مسجد میں فتنہ وفساد برپا کرنے والے کا شرعی حکم

سوال:49

اگر کسی نمازی کے سبب مسجد میں فتنہ وفساد پیدا ہوتا ہو تو کیا ایسے نمازی کو مسجد میں آنے سے روکا جا سکتا ہے؟۔

جواب:

ایسا شخص جو فتنہ وفساد کا سبب بنے اور اس کی حرکت یا قول وفعل سے نمازیوں کو تکلیف پہنچتی ہے یا لوگوں کی نمازوں، عبادات، ذکر وفکر، تلاوت اور دیگر معمولات میں خلل واقع ہوتا ہے یا وہ خواہ مخواہ شور مچاتا ہے، لوگوں سے جھگڑتا ہے، تو ایسے شخص کو مسجد سے روکنا درست ہے، خلافِ شرع ہرگز نہیں ہے ۔احادیثِ مبارکہ اور فقہاء کرام کے اقوال سے ثابت ہے۔رسول اللہ ﷺ نے کچی پیاز، لہسن یا کوئی بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا۔عَنِ ابْنِ عُمَرَ :أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الْبَقْلَةِ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسَاجِدَنَا ،حَتّٰى يَذْهَبَ رِيْحُهَا يَعْنِي الثُّوْمَ

ترجمہ:''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس ترکاری یعنی لہسن کو کھائے ،وہ اس وقت تک ہماری مسجد کے قریب نہ آئے ،جب تک اُس کے منہ سے بدبو نہ چلی جائے ،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:1136)''۔

ایسے شخص کو مسجد میں آنے سے روکنے کی حکمت لوگوں کو اس کے منہ سے نکلنے والی بدبو کی اذیت سے بچانا ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ ،عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الْبَقْلَةِ ،الثُّوْمِ وَقَالَ مَرَّةً: مَنْ أَكَلَ الْبَصَلَ وَالثُّوْمَ وَالْكُرَّاثَ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا،فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَتَأَذّٰى مِمَّا يَتَأَذّٰى مِنْهُ بَنُوْ آدَمَ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس ترکاری یعنی لہسن کو کھائے اور ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے لہسن، پیاز اور گندنا کھایا ہو، وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ فرشتوں کو بھی اُن چیزوں سے ایذا پہنچتی ہے، جن سے انسانوں کو ایذا پہنچتی ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1141)''۔

مساجد کے احترام کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جَنِّبُوا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ وَمَجَانِيْنَكُمْ وَشِرَارَكُمْ وَبَيْعَكُمْ وَخُصُوْمَاتِكُمْ وَرَفْعَ أَصْوَاتِكُمْ وَاِقَامَةَ حُدُوْدِكُمْ وَسَلَّ سُيُوْفِكُمْ۔

ترجمہ: '' اپنی مساجد کو بچوں، پاگلوں، شریر لوگوں، خرید وفروخت کے معاملات، باہمی جھگڑوں، اپنی آوازیں بلند کرنے اور (مجرموں پر) حدودِ الٰہی قائم کرنے اور ایک دوسرے پر تلواریں سونتنے سے بچاؤ، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 750)''۔

بچوں سے مراد ایسے بچے ہیں جنہیں مسجد کے آداب کا شعور نہ ہو، شور مچاتے ہوں، دوڑ بھاگ کر لوگوں کی نمازوں میں خلل ڈالتے ہوں یا پیشاب کر کے مسجد کو آلودہ کر دیتے ہوں۔ یہی حکم ایسے افراد کے بارے میں ہے جن کا دماغی توازن درست نہ ہو اور اُن سے مسجد میں شور وشغب یا بے ادبی کا اندیشہ ہو، شرارتی اور جھگڑالو لوگ ویسے ہی فسادی ہوتے ہیں، خرید وفروخت بھی آدابِ مسجد کے منافی ہے، مسجد میں حدودِ الٰہی قائم کرنے سے منع کرنے کا سبب بھی یہی ہے کہ شور ہوگا، بے ادبی ہوگی اور مسجد آلودہ بھی ہو سکتی ہے اور تلوار سونتنے کا تو مطلب ہی لڑائی جھگڑا ہے، خواہ ڈنڈے چلیں یا کوئی اور صورت ہو۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: وَأَكْلُ نَحْوِ ثُوْمٍ، وَيُمْنَعُ مِنْهُ، وَكَذَا كُلُّ مُؤْذٍ وَلَوْ بِلِسَانِهٖ۔

ترجمہ: ''مسجد میں لہسن وغیرہ جیسی (کچی پیاز، مولی اور بُو والی) چیزیں کھا کر آنا مکروہ ہے، اور ایسے شخص کو مسجد میں آنے سے روکا جائے گا اور اسی طرح ہر وہ شخص جو (لوگوں کو) اذیت دیتا ہو، خواہ زبان سے اذیت دے، (اُسے مسجد آنے سے منع کیا جائے گا)''۔۔۔۔۔اس

کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَ كَذٰلِكَ اَلْحَقَّ بَعْضُهُمْ بِذٰلِكَ مَنْ بِفِيْهِ بَخَرٌ اَوْ جُرْحٌ لَهُ رَائِحَةٌ، وَ كَذٰلِكَ الْقَصَّابُ وَالسَّمَّاكُ وَالْمَجْذُوْمُ وَالْاَبْرَصُ اَوْلٰى بِالْاِلْحَاقِ۔

ترجمہ: ''اور بعض فقہاءِ کرام نے اسی طرح (ایذا دینے والوں میں) ایسے لوگوں کو بھی شامل کیا ہے جن کے منہ سے بدبو آتی ہے یا اُس کے زخموں سے بو آتی ہے اور اسی طرح قصاب، مچھلی بیچنے والے، برص اور کوڑھ کے مریض بھی بطریق اولیٰ شامل ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص: 377، بیروت)

قصاب یا مچھلی فروش یا اس طرح کے پیشوں والوں کی ممانعت کا حکم اس صورت میں ہے کہ ان کا بدن اور لباس آلودہ ہوں، اُن سے بدبو آئے، لوگ کراہت محسوس کریں، ورنہ اگر وہ غسل کرکے باوضو ہوکر صاف ستھرا لباس پہن کر مسجد میں آئیں تو وہ عام مسلمانوں اور نمازیوں کے حکم میں ہیں اور لائق تکریم ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تقرُّب کا مدار تقویٰ پر ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں زیر حدیث فَلَا یَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا (وہ ہرگز ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئیں) پھر ردالمحتار میں ہے:

وَاُلْحِقَ بِالْحَدِيْثِ كُلُّ مَنْ اٰذَى النَّاسَ بِلِسَانِهٖ وَبِهٖ اَفْتٰى ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا وَهُوَ اَصْلٌ فِيْ نَفْيِ كُلِّ مَنْ يَتَاَذّٰى بِهٖ۔

ترجمہ: ''اس مخالفت کے حکم میں وہ شخص بھی شامل ہے جو زبان سے لوگوں کو ایذا پہنچاتا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اسی پر فتویٰ دیا اور یہ ہر اس چیز کی نفی میں اصل ہے جس سے لوگوں کو ایذا ہوتی ہے۔ مگر طرفہ تحفظ کا لحاظ ضروری ہے اگر خود منع کرنے میں اندیشۂ فساد ہو، چارہ جوئی کرکے بند کرادیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 16، ص:413-412)''۔

اعلیٰحضرت کی اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ مسجد کی انتظامیہ ایسی حکمت اور تدبیر اختیار کرے، جس سے مسجد میں شور وشغب نہ ہو اور خود شور شغب میں مبتلا نہ ہو، اگر اس سے فتنہ دفع نہ ہو تو قانونی چارہ جوئی کے ذریعے اِس کا سدِ باب کریں۔

محراب مسجد میں شامل ہے

سوال:50

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام بیچ اس مسئلہ کے کہ: یہودیوں کی مخالفت کی وجہ سے امام محراب سے باہر کھڑے ہو کر جو نماز پڑھاتا ہے اس سے عوام تو عوام علماء تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ محراب کا حصہ مسجد سے باہر ہوتا ہے اس لئے امام محراب سے باہر نکل کر مسجد میں کھڑا ہو کر نماز پڑھاتا ہے۔ اس وجہ سے بننے والی مسجدوں کا محراب کیا مسجد سے خارج ہو جائے گا اور اگر ایسا ہوا تو معتکف کا اس کے اندر چلے جانے سے اعتکاف ٹوٹ جائے گا اور امام تو اعتکاف کر ہی نہیں سکے گا تو اس کے ازالہ کی کیا صورت ہوگی؟۔ کیا اب انتظامیہ کے محراب کو مسجد کے اندر شامل کر لینے کی نیت سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟، (عبداللہ، انجینئر نفیس احمد)۔

جواب:

امام کا بلاضرورت محراب میں اس طرح کھڑا ہونا کہ پاؤں بھی محراب کے اندر ہوں مکروہ ہے، ہاں! اگر پاؤں باہر (یعنی مسجد میں) ہوں اور سجدہ محراب کے اندر ہو، تو کراہت نہیں ہے۔ امام کا دَر میں کھڑا ہونا بھی مکروہ ہے حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ قُرَّةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ كُنَّا نُنْهٰى أَنْ نَّصُفَّ بَيْنَ السَّوَارِىْ، عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَنُطْرَدَ عَنْهَا طَرْدًا۔

ترجمہ: ”معاویہ اپنے والد قرہ بن ایاس مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہمیں دو ستونوں کے بیچ (یعنی دَروں) میں صف باندھنے سے منع فرمایا جاتا اور وہاں سے دھکے دے کر ہٹائے جاتے تھے“۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:1002)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: لَا تَصُفُّوْا بَيْنَ الْأَسَاطِيْنِ وَأَتِمُّوا الصُّفُوْفَ،

ترجمہ: ”ستونوں کے بیچ میں صفیں نہ بناؤ اور صفیں پوری کرو“۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، باب الصلوٰۃ بین السواری فی غیر جماعۃ)

علامہ علاؤالدین حصکفی نماز کے مکروہات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(وَقِیَامُ الْإِمَامِ فِی الْمِحْرَابِ، لَاسُجُوْدُہٗ فِیْ) وَقَدَمَاہُ خَارِجَۃٌ لِاَنَّ الْعِبْرَۃَ لِلْقَدَمِ۔

ترجمہ: ''امام کا محراب میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، اگر قدم باہر ہوں اور سجدہ محراب میں ہو تو یہ مکروہ نہیں ہے کیونکہ اعتبار قدموں کا ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فِی ''الْوَلْوَالِجِیَّۃِ''وَغَیْرِھَا:اِذَالَمْ یَضِقِ الْمَسْجِدُ بِمَنْ خَلْفَ الْاِمَامِ لَا یَنْبَغِیْ لَہٗ ذَالِکَ لِاَنَّہٗ یُشْبِہُ تَبَایُنَ الْمَکَانَیْنِ اِنْتَھٰی یَعْنِیْ: وَحَقِیْقَۃُ اخْتِلَافِ الْمَکَانِ تَمْنَعُ الْجَوَازَ فَشُبْھَۃُ الْاِخْتِلَافِ تُوْجِبُ الْکَرَاھَۃَ، وَالْمِحْرَابُ وَاِنْ کَانَ مِنَ الْمَسْجِدِ فَصُوْرَتُہٗ وَھَیْئَتُہٗ اِقْتَضَتْ شُبْھَۃَ الْاِخْتِلَافِ۔

قُلْتُ: أَیْ لِاَنَّ الْمِحْرَابَ اِنَّمَا بُنِیَ عَلَامَۃً لِمَحَلِّ قِیَامِ الْاِمَامِ لِیَکُوْنَ قِیَامُہٗ وَسَطَ الصَّفِّ کَمَا ھُوَ السُّنَّۃُ، لَا لِاَنْ یَقُوْمَ فِیْ دَاخِلِہٖ، فَھُوَ وَاِنْ کَانَ مِنْ بُقَاعِ الْمَسْجِدِ لٰکِنْ أَشْبَہَ مَکَانًا اٰخَرَ فَأَوْرَثَ الْکَرَاھَۃَ۔

ترجمہ: ''''الولوالجیۃ'' وغیرہ میں ہے: جب امام کے پیچھے والے نمازیوں کے لئے جگہ تنگ نہ ہو تو امام کو محراب کے اندر نہیں کھڑا ہونا چاہئے، کیونکہ اس سے اشتباہ پیدا ہوگا کہ مقتدیوں اور امام کے قیام کی جگہیں جدا جدا ہیں (الولوالجیہ کی عبارت ختم ہوئی)، یعنی مقتدیوں اور امام کی نماز باجماعت میں جائے قیام اگر حقیقتاً جدا جدا ہوں تو نماز جائز نہیں ہوگی، تو جہاں مقتدیوں اور امام کی نماز باجماعت میں قیام کی جگہ جدا جدا ہونے کا شبہ پیدا ہو (یعنی حقیقتاً جدا نہ ہو کیونکہ حقیقت میں تو محراب مسجد ہی کا حصہ ہے) وہاں یہ امر مکروہ ہوگا، محراب اگرچہ مسجد ہی کا حصہ ہے، لیکن اس کی ایک جداگانہ صورت اور ہیئت سے مقام کے جدا ہونے کا ایک شبہ پیدا ہوتا ہے، (علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں: محراب (جماعت کے وقت) امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کے تعین کی علامت کے طور پر بنائی جاتی ہے، تاکہ امام صف کے درمیان میں کھڑا ہو، جیسا کہ سنت ہے، (محراب) اس لئے

نہیں بنائی جاتی کہ امام اس کے اندر کھڑا ہو، تو محراب اگر چہ حدودِ مسجد ہی کا حصہ ہے، لیکن (اپنی جداگانہ ہیئت کی وجہ سے) ایک علیحدہ مقام کے مشابہ ہے، للہٰذا اس کے اندر کھڑا ہونا کراہت کا سبب بن جاتا ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

تَنْبِیْهٌ: فِیْ "مِعْرَاجِ الدِّرَایَةِ" مِنْ بَابِ الْإِمَامَةِ: اَلْأَصَحُّ مَارُوِیَ عَنْ أَبِیْ حَنِیْفَةَ أَنَّهٗ قَالَ: أُکْرَهُ لِلْإِمَامِ أَنْ یَّقُوْمَ بَیْنَ السَّارِیَتَیْنِ أَوْ زَاوِیَةٍ أَوْنَاحِیَةِ الْمَسْجِدِأَوْاِلٰی سَارِیَةٍ، لِأَنَّهٗ بِخِلَافِ عَمَلِ الْأُمَّةِ اه،وَفِیْهِ أَیْضًا: أَلسُّنَّةُ أَنْ یَّقُوْمَ الْإِمَامُ اِزَاءَ وَسَطِ الصَّفِّ، أَلَا تَرٰی أَنَّ الْمَحَارِیْبَ مَانُصِبَتْ اِلَّا وَسَطَ الْمَسَاجِدِ وَهِیَ قَدْ عُیِّنَتْ لِمَقَامِ الْإِمَامِ۔ اه ۔ وَفِی "التَّاتَارخَانِیَّةِ" وَیُکْرَهُ أَنْ یَّقُوْمَ فِیْ غَیْرِالْمِحْرَابِ اِلَّا لِضَرُوْرَةٍ اه وَمُقْتَضَاهُ أَنَّ الْإِمَامَ لَوْ تَرَكَ الْمِحْرَابَ وَقَامَ فِیْ غَیْرِهٖ یُکْرَهُ وَلَوْ کَانَ قِیَامُهٗ وَسَطَ الصَّفِّ ، لِأَنَّهٗ خِلَافُ عَمَلِ الْأُمَّةِ ، وَهُوَ ظَاهِرٌ فِی الْإِمَامِ الرَّاتِبِ دُوْنَ غَیْرِهٖ وَالْمُنْفَرِدِ، فَاغْتَنِمْ هٰذِهِ الْفَائِدَةَ۔

ترجمہ: ''جاننا چاہئے: ''معراج الدرایۃ'' کے باب الامامت میں ہے: امام صاحب سے صحیح ترین روایت یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا: امام کا دوستونوں کے درمیان یا مسجد کے کسی گوشے میں یا مسجد کی کسی ایک جانب یا کسی ستون کی طرف کھڑا ہونا میں ناپسند کرتا ہوں، کیونکہ یہ امت کے تعامل کے خلاف ہے اھ۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ سنت یہ ہے کہ امام صف کے درمیان کھڑا ہو، کیا آپ غور نہیں کرتے کہ محراب تو وسطِ مسجد کی تعیین کے لئے ہی بنائی گئی ہیں اور یہ امام کے کھڑے ہونے کے لئے متعین ہوتی ہیں اھ۔ تاتارخانیہ میں ہے: امام کا محراب کے علاوہ کسی اور جگہ کھڑا ہونا مکروہ ہے اھ۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر امام محراب کو چھوڑ کر کسی دوسرے جگہ کھڑا ہو جائے، اگر چہ اس کا قیام وسط صف میں ہو، تب بھی مکروہ ہوگا کیونکہ یہ امت کے تعامل کے خلاف ہے اور یہ بات اس امام کے بارے میں ہے، جو (باقاعدہ اس مسجد میں امامت کے لئے) مقرر ہو، کسی اور امام یا تنہا نماز پڑھنے

والے کے لئے یہ پابندی یا کراہت نہیں ہے، پس اس فائدہ کو غنیمت جانو"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2، ص:358,357، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

سنتِ متوارثہ یہ ہے کہ امام وسطِ مسجد میں کھڑا ہو اور صفوں کا قیام اس طرح ہو کہ امام وسطِ صف میں رہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

اَلسُّنَّةُ اَنْ يَّقُوْمَ فِي الْمِحْرَابِ ، وَكَذَا قَوْلُهٗ فِيْ مَوْضِعٍ آخَرَ: اَلسُّنَّةُ اَنْ يَّقُوْمَ الْإِمَامُ إِزَاءَ وَسَطِ الصَّفِّ ، اَلَا تَرٰى اَنَّ الْمَحَارِيْبَ مَا نُصِبَتْ إِلَّا وَسَطَ الْمَسَاجِدِ وَهِيَ عُيِّنَتْ لِمَقَامِ الْإِمَامِ۔

ترجمہ: "سنت یہ ہے کہ امام محراب میں کھڑا ہو، جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر ان کا یہ قول موجود ہے کہ: امام کا وسطِ صف میں کھڑا ہونا سنت ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ محراب مساجد کے درمیان میں ہوتی ہیں اور امام کے کھڑے ہونے کے لئے متعین ہوتی ہیں"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2، ص:266، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

محراب کے قیام میں یہی حکمت ہے کہ مسجد میں یہ ایک نشان قائم کر دیا جاتا ہے کہ یہ مقام وسطِ مسجد ہے، عہدِ رسالت مآب ﷺ وخلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین میں محراب نہیں تھیں۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: اَيِ الْمِحْرَابِ، وَفِيْهِ طَرِيْقَانِ: كَوْنُهٗ يَصِيْرُ مُمْتَازًا عَنْهُمْ ، وَكَيْ لَا يَشْتَبِهَ عَلٰى مَنْ عَنْ يَّمِيْنِهٖ وَيَسَارِهٖ حَالُهٗ حَتّٰى إِذَا كَانَ بِجَنْبَتَيِ الطَّاقِ عَمُوْدَانِ وَرَاءَ هُمَا فُرْجَتَانِ يَطَّلِعُ مِنْهُمَا أَهْلُ الْجِهَتَيْنِ عَلٰى حَالِهٖ لَا يُكْرَهُ، وَإِنَّمَا هٰذَا بِالْعِرَاقِ لِأَنَّ مَحَارِيْبَهُمْ مُجَوَّفَةٌ مُطَوَّقَةٌ، فَمَنْ إِخْتَارَ هٰذِهِ الطَّرِيْقَةَ لَا يُكْرَهُ عِنْدَهٗ إِذَا لَمْ يَكُنْ كَذَالِكَ، وَمَنْ إِخْتَارَ الْأُوْلٰى يُكْرَهُ عِنْدَهٗ مُطْلَقًا وَلَا يَخْفٰى اَنَّ إِمْتِيَازَ الْإِمَامِ مُقَرَّرٌ مَطْلُوْبٌ فِي الشَّرْعِ فِيْ حَقِّ الْمَكَانِ حَتّٰى كَانَ التَّقَدُّمُ وَاجِبًا عَلَيْهِ، وَغَايَةُ مَاهُنَا كَوْنُهٗ فِيْ مَخْصُوْصِ مَّكَانٍ، وَلَا أَثَرَ لِذَالِكَ فَإِنَّهٗ بُنِيَ الْمَسَاجِدِ الْمَحَارِيْبُ مِنْ لَّدُنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَلَوْ لَمْ تُبْنَ كَانَتِ السُّنَّةُ أَنْ يَّتَقَدَّمَ فِيْ

مَحَاذَاةِ ذَالِكَ الْمَكَانِ لِأَنَّهُ يُحَاذِيْ وَسَطَ الصَّفِّ وَهُوَ الْمَطْلُوْبُ، اِذْ قِيَامُهُ فِيْ غَيْرِ مُحَاذَاتِهٖ مَكْرُوْهٌ، وَغَايَتُهُ اِتِّفَاقُ الْمِلَّتَيْنِ فِيْ بَعْضِ الْاَحْكَامِ، وَلَا بِدْعَ فِيْهِ عَلٰى أَنَّ اَهْلَ الْكِتَابِ اِنَّمَا يَخُصُّوْنَ الْاِمَامَ بِالْمَكَانِ الْمُرْتَفِعِ عَلٰى مَا قِيْلَ فَلَا تَشَبُّهَ۔

ترجمہ: ''محراب میں کھڑے ہونے کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ یہ ہے کہ امام لوگوں سے ممتاز ہوتا کہ اس کے دائیں اور بائیں لوگوں پر اس کا حال مشتبہ نہ ہو حتی کہ اگر محراب کی دونوں طرف ستون ہوں اور اس کے سامنے کشادہ جگہ ہو اور اس کی دونوں طرف والے اس کے حال پر مطلع ہوں تو اس کا محراب میں کھڑا ہونا مکروہ نہیں ہے اور مکروہ ہونا عراق میں ہوتا ہے جن کی محرابیں کھوکھلی اور طاق کے اندر ہوتی ہیں اور یہ بات مخفی نہ رہے کہ جگہ کے اعتبار سے امام کا ممتاز ہونا شرع میں مطلوب ہے حتی کہ امام کا صفوں پر مقدم ہونا واجب ہے اور یہاں امام کی مخصوص جگہ کو مکروہ کہا ہے اور اس کی تائید میں کوئی اثر (حدیث) نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد سے مساجد میں محرابیں بنائی گئی ہیں اور اگر عہد رسالت ﷺ میں محرابیں نہ بھی بنائی گئی ہوں تب بھی سنت یہ ہے کہ امام اس کے سامنے صف کے درمیان میں سب سے آگے کھڑا ہو اور یہی مطلوب ہے کیونکہ محراب کی محاذات (سیدھ) کے بغیر امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے اور امام کے محراب میں کھڑے ہونے سے زیادہ سے زیادہ یہ لازم آئے گا کہ دو ملتوں کے بعض احکام میں متفق ہو جائیں اور اس میں کوئی بدعت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اہل کتاب امام کے لئے خصوصیت کے ساتھ بلند چبوترے بناتے ہیں اور جب امام محراب میں فرش پر کھڑا ہوگا تو اس میں اہل کتاب کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رہے گی۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: مِنْ اَنَّهُ تَشَبُّهٌ بِاَهْلِ الْكِتَابِ فَاِنَّهُمْ يَخُصُّوْنَ اِمَامَهُمْ بِالْمَكَانِ الْمُرْتَفِعِ

ترجمہ: ''اہل کتاب کے ساتھ تشبہ اس وقت ہے کہ جب امام بلند جگہ پر کھڑا ہو کیونکہ اہل کتاب امام کے لئے خاص طور پر بلند جگہ بناتے ہیں''۔
(فتح القدیر، جلد: 1، ص: 425-426، مرکز اہلسنت برکات رضا، گجرات، انڈیا)

عموماً لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ محراب مسجد سے خارج ہوتی ہے، اس لئے امام کا محراب میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، حالانکہ کراہت کا سبب مطلقاً محراب میں کھڑا ہونا نہیں بلکہ امام کا محراب میں کھڑا ہونا اس وقت مکروہ ہے، جب محراب میں امام کے کھڑے ہونے کے لئے بلند جگہ (چبوترہ) بنایا گیا ہو ورنہ امام کا محراب میں کھڑا ہونا مکروہ نہیں ہے اور یہی ابن ھمام کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے۔ نیز مسجد سے خارج وہ چیز ہوگی جس کو مسجد بناتے وقت مسجد سے خارج رکھا جائے اور عرف اس پر شاہد ہے کہ مسجد بناتے وقت محراب کو مسجد سے خارج رکھنے کا قصد اور ارادہ نہیں کیا جاتا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ''امام اگر محراب میں یا محراب کے باہر کسی بلند جگہ یا کسی چبوترے پر کھڑے ہو کر نماز پڑھاتا ہے، تو اس میں یہودیوں کے ساتھ مشابہت ہے، کراہت کا مدار مشابہت پر ہے، اگر مشابہت نہیں پائی جاتی، تو کراہت بھی نہیں ہے۔ امام کا تنہا بلند جگہ پر کھڑے ہو کر نماز پڑھانا مکروہ ہے، جس کی دلیل یہ حدیث ہے:

عَنْ عَدِيِّ بْنِ ثَابِتٍ الْأَنْصَارِيِّ، حَدَّثَنِي رَجُلٌ أَنَّهُ كَانَ مَعَ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ بِالْمَدَائِنِ، فَأُقِيمَتِ الصَّلَاةُ، فَتَقَدَّمَ عَمَّارٌ، وَقَامَ عَلَى دُكَّانٍ يُصَلِّي، وَالنَّاسُ أَسْفَلَ مِنْهُ فَتَقَدَّمَ حُذَيْفَةُ فَأَخَذَ عَلَى يَدَيْهِ، فَاتَّبَعَهُ عَمَّارٌ حَتَّى أَنْزَلَهُ حُذَيْفَةُ، فَلَمَّا فَرَغَ عَمَّارٌ مِنْ صَلَاتِهِ قَالَ لَهُ حُذَيْفَةُ: أَلَمْ تَسْمَعْ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: "إِذَا أَمَّ الرَّجُلُ الْقَوْمَ فَلَا يَقُمْ فِي مَكَانٍ أَرْفَعَ مِنْ مَقَامِهِمْ" أَوْ نَحْوَ ذَالِكَ؟ قَالَ عَمَّارٌ: لِذَالِكَ اتَّبَعْتُكَ حِينَ أَخَذْتَ عَلَى يَدَيَّ۔

ترجمہ: ''عدی بن ثابت انصاری بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے یہ حدیث بیان کی کہ وہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے ساتھ مدائن میں تھے، حضرت عمار آگے بڑھ گئے اور

ایک چبوترے پر کھڑے ہوکر لوگوں کو نماز پڑھانے لگے اور لوگ ان سے نیچے تھے، حضرت حذیفہ نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ حضرت عمار نے ان کی اتباع کی حتیٰ کہ حضرت حذیفہ نے ان کو چبوترے سے نیچے اتار لیا۔ جب حضرت عمار نماز سے فارغ ہو گئے تو حضرت حذیفہ نے ان سے کہا: کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ رسول اللہ ﷺ یہ فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص لوگوں کا امام بنے تو لوگوں سے بلند جگہ پر کھڑا نہ ہو۔ حضرت عمار نے کہا: اسی وجہ سے میں نے آپ کی اتباع کی تھی، جب آپ نے میرا ہاتھ پکڑا تھا"۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:598)

وہ تمام جگہ مسجد ہے جسے واقف نے مسجد بناتے وقت مسجد میں شامل کرنے کی نیت کی ہو اور جیسا کہ مذکورہ بالا حوالوں میں گزرا کہ محراب بھی مسجد کا حصہ ہے، لہٰذا محراب کے اندر جانے سے اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح محراب کے دائیں بائیں جو حصہ خالی ہے، وہ بھی مسجد کا حصہ ہونے کی وجہ سے مسجد کے حکم میں ہے، لہٰذا وہاں جانے سے اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔

جنازے کے مسائل

غسلِ میّت کا طریقہ

سوال: 51

مُردے کو غسل دینے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟، (شاہدہ نسیم، فیصل آباد)۔

جواب:

عموماً یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کے یہاں میت ہو جائے، تو لوگ میت کو غسل وکفن دینے کے لئے پریشان پھرتے ہیں، کسی غسّال (غسل دینے والے مرد) یا غسّالہ (غسل دینے والی عورت) کو تلاش کرتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ میت کا ولی خود اُسے غسل دے۔ میت کو غسل دینا فرضِ کفایہ ہے۔ غسل کا طریقہ یہ ہے کہ جس چارپائی یا تختے پر غسل دینے کا ارادہ ہو، اُس کو تین، پانچ یا سات بار دھونی دیں یعنی جس چیز میں خوشبو سلگ رہی ہو، اُسے چارپائی وغیرہ کے گرد پھرائیں، میت کو اُس پر لٹا کر ناف سے گھٹنوں تک کسی کپڑے سے چھپادیں، پھر نہلانے والا اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر پہلے استنجا کرائے پھر نماز کی طرح وضو کرائے یعنی منہ، کہنیوں سمیت ہاتھ دھوئیں، سر کا مسح کریں پھر پاؤں دھوئیں۔ کسی کپڑے یا روئی کو بھگو کر دانتوں، مسوڑھوں اور ہونٹوں پر پھیر دیں، سر اور ڈاڑھی کے بال (اگر ہوں تو) پاک صابن سے دھوئیں، پھر بائیں کروٹ لٹا کر سر سے پیر تک (بیری کے پتے ڈال کر نیم گرم) پانی اس طرح ڈالیں کہ تختے تک پہنچ جائے، پھر داہنی کروٹ لٹا کر بھی اسی طرح پانی بہائیں، پھر ٹیک لگا کر بٹھائیں اور نرمی کے ساتھ نیچے کی جانب پیٹ پر ہاتھ پھیریں، اگر پیٹ سے کچھ نکلے تو دھوڈالیں، وضو وغسل کا اعادہ نہ کریں، آخر میں سر سے پیر تک کافور ملا پانی بہائیں اور پھر کسی پاک کپڑے سے بدن کو آہستہ آہستہ پونچھیں۔ غسل میں ایک مرتبہ سارے بدن پر پانی بہانا فرض اور تین مرتبہ بہانا سنت ہے۔ جہاں غسل دیا جائے مستحب یہ ہے کہ پردہ کا اہتمام کرلیا جائے، غسل دینے والا باطہارت ہو۔

(مُلخص از فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:158)

قاتل اور ڈاکو کی نمازِ جنازہ کا شرعی حکم

سوال: 52

مسلمان، قاتل اور ڈاکو کی نماز جنازہ، (مسلم قبرستان میں) تدفین کے بارے میں کیا شرعی احکام ہیں؟۔ محمد رفیع یوسفی، ناظم آباد، کراچی

جواب:

ہر مسلمان کی خواہ کیسا ہی گناہ گار اور مرتکب کبائر ہو، نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، سوائے چند لوگوں کے جن کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی:

(۱) جو امامِ برحق پر خروج و بغاوت کرے اور اسی بغاوت میں مارا جائے۔

(۲) ڈاکو جو ڈاکہ ڈالتے ہوئے مارا گیا، نہ اُس کو غسل دیا جائے گا اور نہ ہی نماز پڑھی جائے گی لیکن اگر حکومتِ وقت نے اُن پر قابو پالیا ہو اور سزا کے طور پر قتل کیا تو نماز و غسل ہے، اگر طبعی موت مرے ہوں، تب بھی نماز و غسل کے حق دار ہیں۔

(۳) وہ لوگ جو آپس میں ناحق لڑتے ہوئے مارے جائیں بلکہ جو شخص اُن کا تماشا دیکھنے کے لئے وہاں رُکا رہا اور گولی وغیرہ لگنے کے سبب مارا گیا، تو اُس کی بھی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

(۴) جس نے کئی مسلمان گلا گھونٹ کر یا کسی ہتھیار کے ذریعے ناحق قتل کر دیے ہوں، جب وہ خود مرے گا تو اُس کی بھی نماز نہیں پڑھی جائے گی۔

(۵) جس نے اپنے والدین کو قتل کیا ہو، اُس کی بھی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

زمین میں فساد برپا (ڈاکہ ڈالنے یا قتلِ ناحق) کرنے والوں کی دنیوی اور اُخروی سزا کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوْا أَوْ يُصَلَّبُوْا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَالِكَ لَهُمْ

خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌO

ترجمہ:”اور جولوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے (ڈاکے ڈالتے) ہیں ان کی یہی سزا ہے کہ ان کو چن چن کر قتل کیا جائے یا ان کو سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ ایک جانب سے اور پیر دوسری جانب سے کاٹ دیئے جائیں یا ان کو (اپنے وطن کی) زمین سے نکال دیا جائے، یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے،(المائدہ:33)“۔آج کل جلاوطنی عملی طور پر ممکن نہیں ہے،اس لئے ایسے شخص کو قید میں رکھا جائے تاکہ لوگ اس کے شر سے محفوظ رہیں۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَيُصَلّٰى عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ مَاتَ بَعْدَالْوِلَادَةِ صَغِيْرًا كَانَ أَوْ كَبِيْرًا ذَكَرًا كَانَ أَوْ أُنْثٰى حُرًّا كَانَ أَوْ عَبْدًا اِلَّا الْبُغَاةَ وَقُطَّاعَ الطَّرِيْقِ

ترجمہ:”ہر مسلمان مُردے کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام سوائے باغی اور ڈاکو کے“۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:163)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَهِيَ فَرْضٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ مَاتَ، خَلَا)أَرْبَعَةٍ : (بُغَاةٍ، وَقُطَّاعِ طَرِيْقٍ) فَلَا يُغَسَّلُوْا وَلَا يُصَلّٰى عَلَيْهِمْ (اِذَاقُتِلُوْا فِي الْحَرْبِ)وَلَوْ بَعْدَهُ صُلِّيَ عَلَيْهِمْ لِأَنَّهُ حَدٌّ أَوْ قِصَاصٌ (وَكَذَا)أَهْلُ عُصْبَةٍ، وَ(مُكَابِرٍ فِيْ مِصْرٍ لَيْلًا وَخَنَّاقٍ) الخ۔۔۔۔۔(لَا) يُصَلّٰى عَلٰى (قَاتِلِ أَحَدِ أَبَوَيْهِ) اِهَانَةً لَهُ، وَأَلْحَقَهُ فِي "النَّهْرِ" بِالْبُغَاةِ۔

ترجمہ:”چار افراد کے سوا ہر مسلمان کی نمازِ جنازہ فرض ہے: باغی، رہزن (ڈاکو) نہ اُنہیں غسل دیا جائے گا اور نہ ہی اِن پر نماز پڑھی جائے گی، جبکہ یہ لڑائی میں مارے گئے ہوں اور اگر لڑائی کے بعد کسی وقت مارے جائیں تو اُن کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اس لئے کہ یہ قتل

یا حد ہے یا قصاص (یعنی حدِ شرعی یا قصاص کے طور پر مارے جانے والے کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی)، اہل عصبہ (یعنی جو ظلم پر اپنی قوم یا برادری کی حمایت میں لڑائی میں شریک ہو جائیں اور مارے جائیں)۔ تیسرا شخص مکابر یعنی جو لوگ رات کے وقت لوٹ مار کرنے کے لئے شہر میں اسلحہ لے کر گھومیں اور گلا گھونٹنے والا ۔۔۔۔۔۔ جس نے اپنے والدین یا اُن میں سے کسی ایک کو قتل کر دیا ہو، اُس کی اہانت کے لئے اُس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، "النہرالفائق" میں اُسے بھی باغیوں سے لاحق کیا ہے"۔

(ردالمختار علی الدرالمختار، جلد 3،ص:103-101، بیروت)

غسل نہ دینے اور نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کا حکم اِن کی اہانت کے لئے ہے تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں، تدفین مسلمانوں کے قبرستان میں کی جا سکتی ہے۔

نمازِ جنازہ کی تکرار جائز نہیں

سوال: 53

کیا کسی میت پر نمازِ جنازہ دوبارہ ادا کی جا سکتی ہے؟۔

شاہد علی، نارتھ ناظم آباد، کراچی

جواب:

فقہائے احناف کے نزدیک اگر میت کا ولی خود نمازِ جنازہ پڑھ لے یا اُس کی اجازت سے دوسرا شخص پڑھائے، تو دوبارہ پڑھنا جائز نہیں ہے، حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کا بھی یہی قول ہے۔ نمازِ جنازہ کی تکرار جائز نہیں سوائے اس کے کہ پہلی مرتبہ پڑھی جانے والی نماز میں میت کا ولی شامل نہیں تھا۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی لکھتے ہیں:

فَإِنْ صَلّٰى غَيْرُ الْوَلِيِّ أَوِ السُّلْطَانِ أَعَادَ الْوَلِيُّ،يَعْنِيْ إِنْ شَاءَ لِمَا ذَكَرْنَا أَنَّ الْحَقَّ لِلْأَوْلِيَاءِ ،وَإِنْ صَلَّى الْوَلِيُّ لَمْ يَجُزْ لِأَحَدٍ أَنْ يُّصَلِّيَ بَعْدَهُ لِأَنَّ الْفَرْضَ يَتَأَدّٰى

بِالْأَوَّلِ وَالتَّنَفُّلُ بِهَا غَيْرُ مَشْرُوْعٍ وَلِهٰذَا رَأَيْنَا النَّاسَ تَرَكُوْا عَنْ آخِرِهِمُ الصَّلَاةَ عَلٰى قَبْرِ النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ الْيَوْمَ كَمَا وُضِعَ۔

ترجمہ: ”اگر ولی وحاکمِ اسلام کے سوا اور لوگ نمازِ جنازہ پڑھ لیں، اور ولی اگر چاہے تو اُسے اعادہ کا اختیار ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا: جنازہ اولیاء کا حق ہے اور اگر ولی پڑھ چکا تو اب کسی کو جائز نہیں کہ اُس کے بعد پھر پڑھے، کیونکہ فرض تو پہلی نماز سے ادا ہو چکا اور نماز جنازہ بطور نفل پڑھنی مشروع نہیں ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ (خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جنازہ پڑھنے کے بعد) تمام جہان کے مسلمانوں نے نبی ﷺ کے مزارِ اقدس پر نماز جنازہ پڑھنا چھوڑ دی، حالانکہ حضور آج بھی ویسے ہی ہیں جیسے اُس دن تھے جب آپ ﷺ کو قبر مبارک میں دفن کیا گیا تھا“۔

(ھدایہ، جلد 1، ص: 415)

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: وَلَوْ كَانَ مَشْرُوْعًا لَمَا أَعْرَضَ الْخَلْقُ كُلُّهُمْ مِنَ الْعُلَمَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَالرَّاغِبِيْنَ فِي التَّقَرُّبِ إِلَيْهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ بِأَنْوَاعِ الطُّرُقِ عَنْهُ فَهٰذَا دَلِيْلٌ ظَاهِرٌ عَلَيْهِ فَوَجَبَ اعْتِبَارُهُ۔

ترجمہ: ”اگر نمازِ جنازہ کی تکرار مشروع ہوتی تو علماء، صالحین اور مختلف (جائز) طریقوں سے نبی ﷺ سے تقرُّب کا شوق رکھنے والے سب لوگ (آج تک) یہ سلسلہ ترک نہ کرتے، مزارِ اقدس پر نماز پڑھنے سے تمام جہان اعراض نہ کرتا، تو یہ (نمازِ جنازہ کے تکرار کے مشروع نہ ہونے پر) ظاہر دلیل ہے اور اس کا اعتبار واجب ہے“۔

(فتح القدیر، جلد 2، ص: 123)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: لَا يُصَلّٰى عَلٰى مَيِّتٍ إِلَّا مَرَّةً وَاحِدَةً وَالتَّنَفُّلُ بِصَلَاةِ الْجَنَازَةِ غَيْرُ مَشْرُوْعٍ كَذَا فِي ”الْإِيْضَاحِ“۔

ترجمہ: ”کسی میت پر ایک بار کے سوا نماز (جنازہ) نہ پڑھی جائے اور نمازِ جنازہ نفل ادا کرنا

غیر مشروع ہے، ''ایضاح'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:163، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَلَهُ) أَيْ لِلْوَلِيِّ، وَمِثْلُهُ كُلُّ مَنْ يُقَدَّمُ عَلَيْهِ مِنْ بَابِ أَوْلَى (اَلْإِذْنُ لِغَيْرِهٖ فِيهَا) لِأَنَّهُ حَقُّهُ فَيَمْلِكُ إِبْطَالَهُ۔

ترجمہ: '' اور ولی یا وہ سب (جیسے سلطان، قاضی، امام الحی) جن کو اَوْلَوِیَّت (More Entitlement) کی بنا پر نمازِ جنازہ میں تقدُّم (Priority) کا حق حاصل ہے، وہ دوسرے کو بھی جنازہ پڑھانے کی اجازت دے سکتے ہیں، کیونکہ یہ اُن کا حق ہے اور وہ اپنے حق سے دست بردار ہونے کا اختیار رکھتا ہے (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:115)''۔

مغفرت وایصالِ ثواب کے لئے اجتماعی دعا

سوال: 54

ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ میت کی دعا کے لئے آنے والے حضرات قرآن شریف کی چند آیات یا ایک سورت پڑھ کر اجتماعی دعا برائے مغفرتِ میت کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تعزیت کے گھر میں پہلے سے موجود کوئی قاری یا عالمِ دین یا کوئی بھی مسلمان تلاوت کے بعد اجتماعی دعا کرتے ہیں۔ عرصہ دراز سے جاری اس رواج کو بعض حضرات منع کرتے ہیں۔ کیا اُن کا منع کرنا درست ہے؟، (عبدالوکیل، چترال)۔

جواب:

مذکورہ صورت درحقیقت ایصالِ ثواب ہے، جو شرعاً جائز بلکہ مستحسن امر ہے۔ ''ایصالِ ثواب'' کے معنی ہیں: کسی شخص کا اپنے کسی عملِ خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچانا، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پاچکا ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِأَخِيْ وَأَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ.

(1) ترجمہ: ''حضرت موسیٰ نے التجا کی: اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی ہارون کو

بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے،(الاعراف:151)''۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ۔

(2)ترجمہ:''(حضرت ابراہیم نے دعا کی)اے ہمارے رب! حساب(یعنی قیامت) کے دن میری، میرے والدین اور تمام اہل ایمان کی بخشش فرمانا،(ابراہیم:41)''۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ۔

(3)ترجمہ:''اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی (بھی مغفرت) فرما، جو ہم سے پہلے وفات پا چکے(یا ایمان لانے میں ہم سے سبقت حاصل کر چکے ہیں)،(الحشر:10)''۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔

(4)ترجمہ:''(حضرت نوح نے دعا کی)اے میرے رب! میری اور میرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور (جملہ) ایمان والے مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما،(نوح:28)''۔

ایصال ثواب کا ذریعہ دعائے مغفرت بھی ہے، مالی صدقات بھی ہیں اور دیگر عبادات بھی ہیں، مثلاً حج بدل وعمرہ، تلاوتِ قرآنِ پاک، اذکار، درود پاک وغیرہ۔علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْاَصْلُ فِیْ ھٰذَا الْبَابِ اَنَّ الْاِنْسَانَ لَهٗ اَنْ یَّجْعَلَ ثَوَابَ عَمَلِهٖ لِغَیْرِهٖ صَلَاةً کَانَ اَوْ صَوْمًا اَوْ صَدَقَةً اَوْ غَیْرَهَا کَالْحَجِّ وَقِرَاءَةِ الْقُرْاٰنِ وَالْاَذْکَارِ وَزِیَارَةِ قُبُوْرِ الْاَنْبِیَاءِ عَلَیْهِمُ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَالشُّهَدَاءِ وَالْاَوْلِیَاءِ وَالصَّالِحِیْنَ وَتَکْفِیْنِ الْمَوْتٰی وَجَمِیْعِ اَنْوَاعِ الْبِرِّ کَذَا فِیْ ''غَایَةِ السُّرُوْجِیِّ شَرْحِ الْهِدَایَةِ''۔

ترجمہ:''قاعدہ یہ ہے کہ انسان اپنے عمل کا ثواب دوسرے شخص کو پہنچا سکتا ہے، خواہ نماز ہو یا

روزہ یا صدقہ ہو یا کوئی اور نیک عمل، جیسے حج اور قرآن مجید کی تلاوت اور اذکار اور انبیاء علیہم السلام کی قبور کی زیارت اور شہداء اور اولیاء اور صالحین کی قبروں کی زیارت اور مردوں کو کفن دینا اور دیگر تمام نیکی کے کام، اسی طرح ''غایۃ السروجی شرح ہدایہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 257، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

دعا عبادت کی روح ہے، عبادت کا مغز اور نچوڑ ہے اور ایک حدیث مبارک میں دعا کو عین عبادت قرار دیا گیا ہے (اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ، سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2969)، کیونکہ بندہ اپنے آپ کو عاجز محتاج اور بے کس و بے بس سمجھ کر اپنے خالق و مالک کو پکارتا ہے، اسی کا نام بندگی ہے۔ دعا انفرادی طور پر کی جائے یا اجتماعی طور پر بہرصورت مستحسن و مستحب عمل ہے، حرمین طیّبین میں بھی ختمِ قرآن کے موقع پر نمازِ تراویح میں اور خطباتِ مبارکہ میں اجتماعی دعا کی جاتی ہے، تو جب یہ اجتماعی دعا نماز کے اندر جائز ہے تو نماز سے باہر اس کی ممانعت کیوں ہوگی۔ جو اجتماعی دعا کی ممانعت کا دعویٰ کرتا ہے، اُس پر لازم ہے کہ دلیل پیش کرے۔ اب تو تبلیغی اجتماع میں بھی اجتماعی دعا کی جاتی ہے اور لوگ بڑے اہتمام سے اس میں شرکت کے لئے جاتے ہیں، تو ایک خاص موقع اور مقام پر اس کے جواز اور باقی مواقع اور مقامات پر اس کی ممانعت کی کیا دلیل ہے، سوائے اس کے کہ کوئی شخص خود شارع بننے کی کوشش کرے اور ''مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ'' (خیر کے کاموں سے بہت زیادہ روکنے والا) بننا چاہتا ہو۔

شوہر، بیوی کا وارث ہے، ولی نہیں

سوال: 55

ایک سے زائد مرتبہ نمازِ جنازہ ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟۔ عورت کی وفات کے بعد اس کے ورثاء کون لوگ ہوتے ہیں، شوہر بیٹے یا بھائی؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شوہر وارث نہیں ہوتا، صرف بھائی اور بیٹے وارث ہوسکتے ہیں، اس لئے ان دونوں میں سے کسی ایک نے جنازے میں شرکت نہ کی ہو تو دوبارہ جنازہ ہوسکتا ہے؟۔ جان بوجھ کر ایک بیٹا نمازِ

جنازہ میں شرکت نہیں کرتا تاکہ دوسری مرتبہ جنازہ میں شرکت کرے، کیا بلا عذرِ شرعی ایسا کرنا جائز ہے؟۔ (قاری اللہ دتہ سعیدی، مظفر گڑھ)۔

جواب :

نمازِ جنازہ کی تکرار جائز نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اگر پہلی مرتبہ پڑھی جانے والی نماز میں میت کا ولی شامل نہیں تھا، تو اب ولی دوبارہ نماز پڑھ سکتا ہے اور اُس کے ساتھ ہر وہ شخص جو پہلی نماز میں شریک نہیں تھا، نماز پڑھ سکتا ہے، لیکن اگر ولی نے نمازِ جنازہ پڑھ لی تو دوبارہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ آپ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شوہر وارث نہیں ہوتا، یہ درست نہیں، بلکہ شوہر وارث ہوگا اور شرعاً بیوی کے ترکے سے حصہ پائے گا، جیسا کہ سورۃ النساء میں شوہر کے حصے کی بابت ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۔

ترجمہ: "اور تمہارے لئے آدھا (مال) ہے اُس کا جو چھوڑ جائیں تمہاری بیویاں، اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو اور اگر ان کی اولاد ہو تو تمہارے لئے اُن کے ترکہ کا چوتھائی حصہ ہے، (النساء:12)"۔

شوہر بیوی کا وارث تو بنے گا، لیکن ولی نہیں ہے بلکہ اُس کے بیٹوں کو ولایت حاصل ہے اور اگر عورت کا کوئی ولی موجود نہ ہو تو ولایت شوہر کو حاصل ہو جائے گی، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ وَلِيٌّ فَالزَّوْجُ ثُمَّ الْجِيْرَانُ ،

ترجمہ: "پس اگر اُس کا کوئی ولی نہ ہو تو شوہر ولی ہوگا، پھر پڑوسی، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد3، ص:114، داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ عورت کی ولایت بیٹوں کو حاصل ہوگی، اگر کسی ایک بیٹے نے بھی نمازِ جنازہ ادا کر لی ہے، تو دوبارہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ

لکھتے ہیں:

وَلَوْ مَاتَتْ اِمْرَأَةٌ وَّلَهَا زَوْجٌ وَّابْنٌ عَاقِلٌ بَالِغٌ مِّنْهُ، فَالْوِلَايَةُ لِلْاِبْنِ دُوْنَ الزَّوْجِ، لٰكِنْ يُكْرَهُ لِلْاِبْنِ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَبَاهُ وَيَنْبَغِيْ اَنْ يُّقَدِّمَهٗ فَاِنْ كَانَ لَهَا ابْنٌ مِّنْ زَوْجٍ آخَرَ فَلَا بَأْسَ بِاَنْ يَّتَقَدَّمَ لِاَنَّهٗ هُوَ الْوَلِيُّ۔

ترجمہ: ''اور اگر کسی عورت کا انتقال ہو گیا اور (ورثاء میں) اُس کا شوہر اور بالغ و عاقل بیٹا موجود ہیں، پس ولی بیٹا ہوگا، شوہر نہیں، لیکن بیٹے کا اپنے (حقیقی) باپ پر پیش قدمی کرنا مکروہ ہے، مناسب یہ ہے کہ اپنے باپ کو مقدم رکھے، پس اگر یہ بیٹا عورت کے پہلے شوہر سے ہو تو کوئی حرج نہیں کہ یہ اپنے سوتیلے باپ پر سبقت کرے، اس لئے کہ یہ (بیٹا اُس عورت کا) ولی ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:163، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''فتاویٰ امام قاضی خان وظہیریہ وشرح نقایہ برجندی وخلاصہ وولوالجیہ وتجنیس وواقعات وبحرالرائق وغیرہا میں ہے: اِنْ كَانَ الْمُصَلِّيْ سُلْطَانًا وَّالْاِمَامَ الْاَعْظَمَ وَالْقَاضِيَ اَوْوَالِيَ الْمِصْرِ اَوْاِمَامَ حَيٍّ لَيْسَ لِلْوَلِيِّ اَنْ يُّعِيْدَ۔

ترجمہ: ''یعنی اگر بادشاہِ اسلام یا امیر المؤمنین یا قاضی شرع یا اسلامی حاکم مصر یا امام الحی (محلے یا بستی کا امام) نماز پڑھ چکا، تو اب ولی کو بھی اعادہ کا اختیار نہیں۔ شرح نقایہ علامہ قہستانی میں ہے: لَايُصَلّٰى عَلٰى مَيِّتٍ اِلَّا مَرَّةً، ترجمہ: ''کسی مُردے پر ایک بار سے زیادہ نماز نہ پڑھی جائے۔

سراج الوہاج وبحرالرائق وردالمحتار وجامع الرموز وجوہرۂ نیرہ وہندیہ ومجمع الانہر وغیرہ میں ہے: وَاللَّفْظُ لِلْبَحْرِ عَنِ السِّرَاجِ اِنْ صَلَّى الْوَلِيُّ عَلَيْهِ لَمْ يَجُزْ اَنْ يُّصَلِّيَ اَحَدٌ بَعْدَهٗ، ترجمہ: ''سراج الوہاج سے بحرالرائق کے الفاظ ہیں کہ اگر ولی نے اس پر نماز پڑھ لی تو اس کے بعد اب کسی کو جائز نہیں کہ نمازِ جنازہ پڑھے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 274-273، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

کسی ایک بیٹے کا جان بوجھ کر نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہونا درست نہیں اور شریک نہ ہونے کے سبب اُسے دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا بھی حق حاصل نہیں، کہ دوسرے بیٹے (بحیثیتِ ولی) نماز پڑھ چکے، جب ایک درجے کے چند اولیاء موجود ہوں تو کسی ایک کے نمازِ جنازہ میں شامل ہونے سے دوسرے ولی کا حق ساقط ہو جائے گا۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَلَوْ صَلّٰی عَلَیْهِ الْوَلِیُّ وَلِلْمَیِّتِ أُوْلِیَاءُ أُخَرُ بِمَنْزِلَتِهٖ لَیْسَ لَهُمْ أَنْ یُّعِیْدُوْا کَذَا فِی الْجَوْهَرَةِ النَّیِّرَةِ۔

ترجمہ: ''اگر کسی ایک ولی نے نمازِ جنازہ پڑھ لی اور میت کے اولیاء میں اُس درجے کے اور بھی ولی ہیں تو اُن کے لئے نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا، ''جوہرۂ نیرہ'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 164، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

قبروں کو مسمار کرنا یا ان کی بے حرمتی ناجائز ہے

سوال: 56

ہمارے شہر میں واقع مرکزی قبرستان ہے، قبرستان کی چاردیواری کے باہر تینوں اطراف پکی سڑک بنی ہوئی ہے اور تینوں اطراف راستہ پہلے سے موجود ہے اور قبرستان میں مزید راستہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شہر میں دوسری جگہ قبرستان میں وافر مقدار میں نئی قبریں بنانے کے لئے جگہ موجود ہے۔ کچھ احباب کی رائے ہے کہ پرانی قبریں مسمار کر کے قبرستان میں مٹی بھروائی جائے جبکہ اس قبرستان میں بھی خاصا رقبہ تدفین کے لئے خالی ہے اور تھوڑے فاصلے پر ایک شخص نے تین کنال زمین مزید قبرستان کے لئے وقف کی ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ:

کیا قبرستان میں پرانی قبریں مسمار کر کے نئی قبریں بنائی جا سکتی ہیں؟۔

بعض احباب نے تو قبروں کے اوپر سے راستے بنا لئے ہیں اور اُن جگہوں کو نشان زدہ کر کے

فٹ پاتھ بنانا چاہتے ہیں۔قبرستان میں جہاں قبریں پرانی اور بوسیدہ ہوچکی ہیں، کچھ کے نشانات مٹ چکے ہیں اور کچھ کے نشان باقی ہیں، کیا وہاں باقاعدہ فٹ پاتھ تعمیر کرکے مستقل راستہ بنادینا چاہئے؟۔(تجمل حسین، تحصیل کلرسیّداں ضلع راولپنڈی)۔

جواب :

جب قبرستان میں تدفین کے لئے جگہ موجود ہے اور ساتھ ہی دوسرا قبرستان بھی موجود ہے تو اگرچہ وہ دور ہو، وہیں مردے دفن کئے جائیں گے۔ مسلمانوں کی قبروں کے جب تک نشانات باقی ہیں، اُنہیں مسمار کرنا جائز نہیں۔قبر کھود کر دوسری میت کو اس میں دفن کرنا اُس وقت تک جائز نہیں، جب تک پہلی میت کی ہڈیاں مٹی میں مل کر ختم نہ ہوجائیں۔ جان بوجھ کرکسی مسلمان کی قبر کھودنا جائز نہیں ہے، اگر قبر کھودنے کے بعد پتا چلا کہ یہاں قبر تھی اور ہڈیاں وغیرہ نکلیں اور وہاں دوسری جگہ قبر کے لئے خالی نہیں تو ان ہڈیوں کو اسی قبر میں ایک طرف دفن کرکے دوسری میت کو دفن کردیں۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَلَا یُدْفَنُ اِثْنَانِ فِیْ قَبْرٍ وَّاحِدٍ اِلَّا لِضَرُوْرَۃٍ قَالَ:فِی "اَلْفَتْحِ" : وَلَا یُحْفَرُ قَبْرٌ لِدَفْنِ آخَرَ اِلَّا اِنْ بَلِیَ الْاَوَّلُ فَلَمْ یَبْقَ لَہٗ عَظْمٌ اِلَّا اَنْ لَّا یُوْجَدَ فَتُضَمُّ عِظَامُ الْاَوَّلِ وَیُجْعَلُ بَیْنَھُمَا حَاجِزٌ مِنْ تُرَابٍ۔

ترجمہ:''اور بلاضرورت دومیتوں کو ایک قبر میں دفن نہیں کریں گے ۔''فتح القدیر''میں ہے: دوسری میت کی تدفین کے لئے پہلی قبر کو نہیں کھودا جائے گا سوائے اس صورت کے کہ اگر پہلی میت بوسیدہ ہوکر مٹی ہوچکی ہو اور اس کی ہڈیاں بھی باقی نہ رہیں، لیکن اگر پہلی میت کی ہڈیاں موجود ہوں تو ان دونوں کے درمیان مٹی سے منڈیر بنادی جائے گی''۔-------

مزید لکھتے ہیں: قَالَ فِی "اَلْحِلْیَۃِ": وَخُصُوْصًا اِنْ کَانَ فِیْھَا مَیِّتٌ لَمْ یَبْلَ،وَمَا یَفْعَلُہٗ جَھَلَۃُ الْحَفَّارِیْنَ مِنْ نَبْشِ الْقُبُوْرِ الَّتِیْ لَمْ تَبْلَ اَرْبَابُھَا ،وَاِدْخَالِ اَجَانِبَ عَلَیْھِمْ فَھُوَ

مِنَ الْمُنْكَرِ الظَّاهِرِ،وَلَيْسَ مِنَ الضَّرُورَةِ الْمُبِيحَةِ لِجَمْعِ مَيِّتَيْنِ فَأَكْثَرَ ابْتِدَاءً فِي قَبْرٍ وَّاحِدٍ۔

ترجمہ:''حلیہ میں خصوصاً ذکر کیا گیا کہ اگر میت قبر میں بوسیدہ نہیں ہوئی اور جاہل گورکن جو سلامت جسم والی قبروں کو کھود دیتے ہیں اور دوسری میت ان قبروں میں دفن کر دیتے ہیں، پس یہ واضح طور پر شرعاً ممنوع ہے اور ضرورت کے تحت دو یا دو سے زیادہ میتوں کو شروع ہی سے ایک قبر میں دفن کرنے کے (جواز کے) حکم میں بھی نہیں آتا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:129، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

مسلمانوں کے قبرستان کو (خواہ کتنا ہی قدیم کیوں نہ ہو) مسمار کرنا یا کسی دوسرے مقصد کے لئے استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:وَسُئِلَ هُوَ (أَيِ الْقَاضِي الْإِمَامُ شَمْسُ الْأَئِمَّةِ مَحْمُودُ الْأُوزْجَنْدِيُّ) عَنِ الْمَقْبَرَةِ فِي الْقُرَى إِذَا انْدَرَسَتْ وَلَمْ يَبْقَ فِيهَا أَثَرُ الْمَوْتَى لَا الْعَظْمُ وَلَا غَيْرُهُ هَلْ يَجُوزُ زَرْعُهَا وَاسْتِغْلَالُهَا؟، قَالَ: لَا،وَلَهَا حُكْمُ الْمَقْبَرَةِ ،كَذَا فِي الْمُحِيطِ۔

ترجمہ:''شمس الائمہ امام قاضی محمود اوزجندی سے دیہات میں موجود ایسے قبرستان کی بابت پوچھا گیا، کہ جس کے نشانات مٹ چکے ہوں اور اُس میں میت کی ہڈیاں یا کوئی دوسرے آثار (اعضاء وغیرہ) باقی نہ رہے ہوں، تو کیا اس پر کھیتی کرنا اور اس سے غلہ حاصل کرنا جائز ہے؟، آپ نے جواب میں فرمایا: نہیں بلکہ وہ قبرستان ہی کے حکم میں ہے، جیسا کہ ''محیط'' میں ہے''۔

محشی نے اس پر حاشیہ لکھا: قَوْلُهُ قَالَ :لَا ،هٰذَا لَا يُنَافِي مَاقَالَهُ الزَّيْلَعِيُّ فِي بَابِ الْجَنَائِزِ مِنْ أَنَّ الْمَيِّتَ إِذَابَلِيَ وَصَارَ تُرَابًا جَازَ زَرْعُهُ وَالْبِنَاءُ عَلَيْهِ اه لِأَنَّ الْمَانِعَ هُنَا كَوْنُ الْمَحَلِّ مَوْقُوفًا عَلَى الدَّفْنِ فَلَا يَجُوزُ اِسْتِعْمَالُهُ فِي غَيْرِهِ فَلْيَتَأَمَّلْ وَلْيُحَرَّرْ

ترجمہ:''مصنف کا قول ''لا''، ''امام زیلعی'' کے اُس قول کے منافی نہیں ہے جو باب الجنائز

میں ہے کہ ''جب (قبر میں) میت بوسیدہ اور مٹی ہو جائے، تو اُس پر زراعت اور تعمیر کرنا جائز ہے''، یہاں (زراعت سے) ممانعت اس لئے ہے کہ یہ مقام تدفین کے لئے وقف ہے، اس کا دوسرے مصرف میں استعمال جائز نہیں، پس غور کرنا اور بچنا چاہئے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 470، 471، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

قبروں کے اوپر چلنا اور اُن پر راستہ بنانا حرام ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لِاَنَّهُمْ نَصُّوا عَلٰى أَنَّ الْمُرُوْرَ فِيْ سِكَّةٍ حَادِثَةٍ فِيْهَا حَرَامٌ۔

ترجمہ: ''علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ قبرستان کے اندر نئے بنے ہوئے راستے پر چلنا حرام ہے، (ردالمحتار جلد 1 صفحہ: 482، داراحیاء التراث العربی بیروت)''۔

رسول اللہ ﷺ نے قبورِ مسلمین کی تعظیم وادب کا حکم ارشاد فرمایا ہے، حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَاَنْ يَّجْلِسَ اَحَدُكُمْ عَلٰى جَمْرَةٍ فَتُحْرِقَ ثِيَابَهٗ حَتّٰى تَخْلُصَ اِلٰى جِلْدِهٖ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّجْلِسَ عَلٰى قَبْرٍ"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ آگ کپڑے جلا کر جلد تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے بجائے اس کے کہ قبر پر بیٹھے، (ابوداؤد، رقم الحدیث: 3220)''۔

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَاَنْ اَمْشِيَ عَلٰى جَمْرَةٍ اَوْ سَيْفٍ اَوْ اَخْصِفَ نَعْلِيْ بِرِجْلِيْ اُحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَمْشِيَ عَلٰى قَبْرِ مُسْلِمٍ وَمَا اُبَالِيْ اَوَسْطَ الْقُبُوْرِ قَضَيْتُ حَاجَتِيْ، اَوْ وَسَطَ السُّوْقِ"۔

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے آگ یا تلوار پر چلنا یا پاؤں سے جوتے پر پیوند لگانا زیادہ پسند ہے، بہ نسبت اس کے کہ کسی مسلمان کی قبر پر چلوں، اور مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ قبر کے وسط میں میری حاجت پوری ہوتی ہے یا بازار کے درمیان، (ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1568)''۔

مزارات پر حاضری کا طریقہ

سوال:57

قبر کی زیارت کے لئے جانا شرعاً کیسا ہے؟، مزارات پر حاضری کا صحیح طریقہ کیا ہے؟۔

جواب:

قبر کی زیارت کرنا شرعاً جائز بلکہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی نے مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے لکھا ہے:

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَأْتِي قُبُوْرَ الشُّهَدَاءِ بِأُحُدٍ عَلَى رَأْسِ كُلِّ حَوْلٍ فَيَقُوْلُ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ ہر سال شُہداء احد کی قبروں پر تشریف لے جاتے تھے اور یہ فرماتے: ''تم پر سلامتی ہو اس لئے کہ تم نے صبر کیا، پس آخرت کا گھر کیا ہی اچھا ہے، (الرعد:24)، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد3، ص:140، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''زیارتِ قبور سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: اَلَا فَزُوْرُوْهَا فَاِنَّهَا تُزَهِّدُكُمْ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُكُمُ الْاٰخِرَةَ۔

ترجمہ: ''سن لو! قبور کی زیارت کیا کرو تمہارے اندر دنیا سے بے رغبتی پیدا کرے گی اور آخرت یاد دلائے گی، (فتاویٰ رضویہ، جلد29، ص:282)''۔

مزارات پر حاضری کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کرتے ہوئے پائنتی کی جانب سے حاضر ہو اور چہرے کے سامنے آ کر قبلہ کی جانب پیٹھ کر کے مزار سے چار ہاتھ کے فاصلے پر کھڑا ہو، پھر دعا کرے اور اگر بیٹھنا چاہے تو حسب مرتبہ اس کے قریب یا دور اتنے فاصلے سے بیٹھے، جیسا زندگی میں اس کا معمول تھا۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وفی ''شرحِ اللُّباب'' لِلمُلّا علی القاری: ثُمَّ مِنْ آدَابِ الزِّيَارَةِ مَاقَالُوْا: مِنْ اَنَّهُ

يَـأتِـي الـزَّائِـرُ مِـنْ قِبَـلِ رِجْـلَـي الْمُتَوَفّٰى لَامِنْ قِبَلِ رَأسِهٖ اَتْعَبُ لِأنَّهٗ لِبَصَرِ الْمَيِّتِ، بِـخِلَافِ الْاَوَّلِ لِأنَّـهٗ يَـكُوْنُ مُقَابِلَ بَصَرِهٖ ،لٰكِنْ هٰذَا اِذَا اَمْكَنَهٗ،وَاِلَّا فَقَدْ ثَبَتَ "اَنَّهٗ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ قَرَأَ اَوَّلَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ عِنْدَ رَأْسِ مَيِّتٍ وَّآخِرَهَا عِنْدَ رِجْلَيْهِ "۔ وَمِنْ آدَابِهَا أنْ يُّسَلِّمَ بِلَفْظِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ عَلَى الصَّحِيْحِ لَا"عَلَيْكُمُ السَّلَامُ" ،فَاِنَّهٗ وَرَدَ: اَلسَّلَامُ عَـلَيْـكُمْ دَارَقَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ،وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ ،وَنَسْأَلُ اللّٰهَ لَـنَـاوَلَـكُـمُ الْـعَـافِيَةَ " ثُـمَّ يَـدْعُـوْ قَـائِمًا طَوِيْلاً ،وَّاِنْ جَلَسَ يَجْلِسُ بَعِيْدًا أوْ قَرِيْبًا بِحَسْبِ مَرْتَبَتِهٖ فِيْ حَالِ حَيَاتِهٖ ۔

ترجمہ:''علامہ علی قاری''شرح اللباب''میں لکھتے ہیں: زیارت (قبور) کے آداب میں جو کہا گیا کہ زائر قبر کے سرہانے کی طرف سے نہ آئے بلکہ پائنتی کی طرف سے آئے تاکہ میت کو اُسے دیکھنے میں دشواری نہ ہو یعنی نظر گھما کر نہ دیکھنا پڑے، اس کے برعکس پائنتی کی طرف سے آتے ہوئے وہ اس کی نظروں کے سامنے رہے گا، لیکن ایسا کرنا ہر صورت میں لازم نہیں ہے، جب اس کے لئے یہ طریقہ آسان ہو تو اسے اختیار کرے ۔ورنہ نہیں ''رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے سورۂ بقرہ کا اول (رکوع) میت کے سرہانے کی جانب پڑھا اور سورۃ کا آخری حصہ میت کی پائنتی کی جانب پڑھا''۔اور آداب میں سے یہ بھی ہے کہ ''السلام علیکم'' کے الفاظ سے سلام کرے، صحیح یہی ہے علیکم السلام نہ کہے، حدیث میں سلام کے الفاظ اس طرح وارد ہوئے:

اَلسَّلَامُ عَـلَيْـكُـمْ دَارَقَـوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ،وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ،وَنَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ۔

ترجمہ:''السلام علیکم ! اے مومنین کے گھر والو! ہم ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں اور ہم اللہ سے اپنے لئے اور تمہارے لئے معافی کا سوال کرتے ہیں''۔

پھر کھڑے رہ کر دعا کرے اور اگر چاہے تو بیٹھ جائے ، حسب مرتبہ اس کے قریب یا دور اتنے

فاصلے سے بیٹھے، جیسا زندگی میں اس کا معمول تھا، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3 ص: 141)"۔
زیارتِ قبر کے لئے جاتے ہوئے احادیث میں اور بھی کلمات آئے ہیں، ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:
سلیمان بن بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ جب وہ قبرستان کی طرف جائیں تو ان میں سے ایک کہنے والا یہ کہے: "
اَلسَّلَامُ عَلیٰ أَھْلِ الدِّیَارِ، وَفِیْ رِوَایۃِ زُھَیْرٍ: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ أَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ لَلَاحِقُوْنَ أَسْأَلُ اللّٰہَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَۃَ ۔
ترجمہ: "السلام علیکم! اے بستی والو! زہیر کی روایت میں ہے کہ (اس طرح کہے:) السلام علیکم! اے مومنین اور مسلمین کی بستی والو! ان شاء اللہ ہم تم سے ملنے والے ہیں، میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے لئے معافی کا سوال کرتے ہیں، (صحیح مسلم: 2255)"۔
☆ زازان بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب قبرستان میں داخل ہوتے تو فرماتے: اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنْ فِیْ ھٰذِہِ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ اَنْتُمْ لَنَا فَرَطٌ وَّنَحْنُ لَکُمْ تَبَعٌ وَّاِنَّا بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔
ترجمہ: "اس دیارِ مومنین و مسلمین (یعنی قبرستان) میں جو بھی ہیں، ان سب پر سلام ہو، آپ لوگ ہمارے پیش رو ہیں اور ہم آپ کے پیچھے آنے والے ہیں اور ہم تم سے ملنے والے ہیں بیشک ہم سب اللہ ہی کے لئے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔
(مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث: 11904)
ایک روایت میں ہے: " اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَاِنَّا بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ "۔
ترجمہ: "تم پر سلام ہو اور ہم تم سے ملنے والے ہیں، (مصنف ابن ابی شیبہ: 11910)"۔
اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَصْحَابَ الْقُبُوْرِ، اَلسَّلَامُ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ کے الفاظ بھی آئے ہیں، (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث: 11911)۔

قبروں/مزارات پر پھول ڈالنے کا شرعی حکم

سوال:58

مزارات پر پھول ڈالنے کی حقیقت کیا ہے ؟۔

جواب:

قبر پر پھول ڈالنا مستحسن ہے اور اس کی اصل یہ حدیث ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا : مَرَّ النَّبِیُّ ﷺ عَلٰی قَبْرَیْنِ ،فَقَالَ: اِنَّھُمَا لَیُعَذَّبَانِ ، وَمَا یُعَذَّبَانِ مِنْ کَبِیْرٍ ،ثُمَّ قَالَ: بَلٰی ،اَمَّا اَحَدُھُمَا فَکَانَ یَسْعٰی بِالنَّمِیْمَۃِ ،وَاَمَّا اَحَدُھُمَا فَکَانَ لَایَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِہٖ،قَالَ: ثُمَّ اَخَذَ عُوْدًا رَطْبًا ، فَکَسَرَہٗ بِاثْنَتَیْنِ ،ثُمَّ غَرَزَ کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا عَلٰی قَبْرٍ ،ثُمَّ قَالَ: لَعَلَّہٗ یُخَفَّفُ عَنْھُمَا مَالَمْ یَیْبَسَا۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایسی دو قبروں کے پاس سے گزرے ،جن کو عذاب دیا جارہا تھا،آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک ان کو عذاب دیا جارہا ہے اوران کو کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جارہا،ان دونوں میں سے ایک تو پیشاب (کے قطروں) سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغلی کھاتا تھا،پھر آپ ﷺ نے کھجور کے درخت کی ایک تر شاخ لی ،اُس کے دو ٹکڑے کئے ،پھر ہر ایک کی قبر پر ایک ٹکڑا گاڑ دیا،آپ ﷺ نے فرمایا: امید ہے کہ جب تک یہ شاخیں خشک نہیں ہوں گی،ان کے عذاب میں تخفیف ہوتی رہے گی،(صحیح بخاری،رقم الحدیث:1378)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَاِذَا اَرَادَ زِیَارَۃَ الْقُبُوْرِ یُسْتَحَبُّ لَہٗ اَنْ یُّصَلِّیَ فِیْ بَیْتِہٖ رَکْعَتَیْنِ یَقْرَأُ فِیْ کُلِّ رَکْعَۃِ الْفَاتِحَۃَ وَ آیَۃَ الْکُرْسِیِّ مَرَّۃً وَّاحِدَۃً وَّالْاِخْلَاصَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَّیَجْعَلُ ثَوَابَھَا لِلْمَیِّتِ یَبْعَثُ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَی الْمَیِّتِ فِیْ قَبْرِہٖ نُوْرًا وَّیَکْتُبُ لِلْمُصَلِّیْ ثَوَابًا کَثِیْرًا۔

ترجمہ:''اور جب زیارت قبور کے ارادے سے نکلے تو مستحب یہ ہے کہ پہلے اپنے گھر پر ہی

دو رکعت نفل پڑھے، ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور آیۃ الکرسی ایک مرتبہ اور سورۂ اخلاص (قُـلْ هُـوَ اللّٰـهُ اَحَد) تین مرتبہ پڑھے اور اس کا ثواب میت کو ایصال کر دے، اللہ تعالیٰ اُس (ثواب) کو نور کی صورت میں مردے کی قبر میں داخل فرمائے گا اور نمازی (ایصالِ ثواب کرنے والے) کے لئے ڈھیروں ثواب لکھے گا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 350)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَضْعُ الْـوَرْدِ وَالـرَّيَاحِيْنَ عَلَى الْقُبُوْرِ حَسَنٌ وَاَنْ تَصَدَّقَ بِقِيْمَةِ الْوَرْدِ كَانَ أَحْسَنَ۔

ترجمہ: ''پھولوں اور خوشبو دار چیزوں کو قبر پر رکھنا مستحسن ہے اور اگر ان کی قیمت کو صدقہ کر کے میت کو ثواب پہنچا دے تو یہ افضل ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 351، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

بِـأَنَّهُ مَادَامَ رَطْباً يُسَبِّحُ اللّٰهَ تَعَالىٰ فَيُؤْنِسُ الْمَيِّتَ وَتَنْزِلُ بِذِكْرِهِ الرَّحْمَةُ وَنَحْوَهُ فِي "الْـخَـانِيَّةِ"۔ أَقُـوْلُ: وَدَلِيْـلُهُ مَاوَرَدَ فِي الْحَدِيْثِ مِنْ وَّضْعِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ الْـجَرِيْدَةَ الْـخَـضْـرَاءَ بَـعْـدَ شَـقِّهَـا نِـصْـفَيْنِ عَلَى الْقَبْرَيْنِ اللَّذَيْنِ يُعَذَّبَانِ، وَتَعْلِيْلُهُ بِـالتَّـخْفِيْفِ عَنْهُمَا مَالَمْ يَيْبَسَا: أَيْ يُخَفَّفُ عَنْهُمَا بِبَرَكَةِ تَسْبِيْحِهِمَا، اِذْهُوَ أُكْمَلُ مِـنْ تَسْبِيْحِ الْيَابِسِ لِمَا فِي الْأَخْضَرِ مِنْ نَوْعِ حَيَاةٍ، وَعَلَيْهِ فَكَرَاهَةُ قَطْعِ ذَالِكَ وَاِنْ نَبَـتَ بِـنَـفْسِـهِ وَلَـمْ يَـمْـلِكْ لِأَنَّ فِيْـهِ تَفْوِيْتَ حَقِّ الْمَيِّتِ، وَيُؤْخَذُ مِنْ ذَالِكَ وَمِنَ الْـحَـدِيْـثِ نَدْبَ وَضْعُ ذَالِكَ لِلْاِتِّبَاعِ، وَيُقَاسُ عَلَيْهِ مَا اُعْتِيْدَ فِيْ زَمَانِنَا مِنْ وَضْعِ أَغْصَانِ الْآسِ وَنَحْوِهِ،

ترجمہ: ''پھول جب تک تر رہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر کے میت کا دل بہلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے، اسی کی مثل ''خانیہ'' میں بھی ہے۔ میں کہتا ہوں: اس کی دلیل جیسا کہ حدیث مبارک میں وارد ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہری شاخ

کو توڑ کر نصف نصف اُن دونوں قبروں پر لگا دیا، جن پر عذاب ہو رہا تھا اور وجہ اسکی یہ بیان فرمائی کہ جب تک یہ تر ہیں، ان کے عذاب میں تخفیف ہو جائے گی یعنی اُن کے تسبیح کرنے کی برکت سے عذاب میں کمی واقع ہوگی، کیونکہ وہ خشک شے کی تسبیح سے زیادہ کامل ہوتی ہے، کیونکہ تر نباتات میں ایک قسم کی حیات ہوتی ہے اور اسی بنا پر اس کا توڑنا مکروہ ہے اگرچہ وہ خود بخود اُگ آیا ہو اور کسی کی ملکیت نہ ہو، اس لئے کہ اس میں میت کے حق کا فوت ہونا ہے۔ اس بات سے اور حدیث پاک کی اتباع کے لحاظ سے اس کا قبر پر رکھنا مستحب ہے۔ اسی پر اُس کا قیاس بھی ہوگا جو ہمارے زمانے میں آس وغیرہ کی شاخیں رکھنے کا دستور ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:145، بیروت)"۔

قبروں کو سجدہ کرنے اور بوسہ دینے کا حکم

سوال:59

کیا قبر کو سجدہ کرنا یا بوسہ دینا جائز ہے؟۔

جواب:

قبر کو سجدہ کرنا سخت ناجائز وحرام ہے اور اُسے بوسہ دینا ممنوع ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَلَا يَمْسَحُ الْقَبْرَ وَلَا يُقَبِّلُهُ فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَادَةِ النَّصَارٰى وَلَا بَأْسَ بِتَقْبِيلِ قَبْرِ وَالِدَيْهِ كَذَا فِي الْغَرَائِبِ۔

ترجمہ: "نہ قبر کو چھوئے نہ بوسہ دے کیونکہ یہ نصاریٰ کی عادت ہے، البتہ ماں باپ کی قبر کو بوسہ دینے میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ "الغرائب" میں ہے"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:351، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے "سجدۂ تعظیمی" کی حُرمت پر" اَلزُّبْدَةُ الزَّكِيَّةُ لِتَحرِيمِ سُجُودِ التَّحِيَّةِ" کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا اور اس میں قرآن وحدیث اور فقہ کے 150 حوالہ جات سے سجدۂ تعظیمی کی حرمت کو ثابت کیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ سجدے کی

دو قسمیں ہیں ایک ''سجدۂ عبادت'' یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لئے قطعاً اور بلا اختلاف شرک وکفر ہے۔ دوسرا ''سجدۂ تعظیمی''، انہوں نے اسے حرام قرار دیا ہے، چنانچہ آپ نے لکھا: ''مسلمان اے مسلمان! اے شریعتِ مصطفوی کے تابع فرمان؛ جان کہ سجدہ حضرتِ عزّت جَلالُہٗ کے سوا کسی کے لئے نہیں، اس کے غیر کو ''سجدۂ عبادت'' تو یقیناً اجماعاً شرک مُہین وکفر مبین (یعنی انتہائی حقیر شرک اور واضح کفر) اور ''سجدۂ تحیت'' (یعنی سجدۂ تعظیمی) حرام وگناہِ کبیرہ بالیقین اور اس کے کفر ہونے میں اختلافِ علمائے دین، ایک جماعتِ فقہاء سے تکفیر منقول اور عندالتحقیق وہ کفر صوری (یعنی صورتاً کفر) پر محمول''۔ مزید لکھتے ہیں: ''مزارات کو سجدہ یا ان کے سامنے زمین چومنا حرام اور حدِ رکوع تک جھکنا ممنوع''۔

''علامہ علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ'' کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

وَلَا یَمَسُّ عِنْدَ الزِّیَارَۃِ الْجِدَارَ وَلَا یُقَبِّلُہٗ وَلَا یَلْتَصِقُ وَلَا یَطُوْفُ وَلَا یَنْحَنِیْ وَلَا یُقَبِّلُ الْاَرْضَ فَاِنَّہٗ اَیْ کُلَّ وَاحِدٍ غَیْرُ مُسْتَحْسَنَۃٍ۔

ترجمہ: ''زیارتِ روضۂ انور سید اطہر ﷺ کے وقت نہ دیوار کو ہاتھ لگائے، نہ چومے، نہ اس سے چمٹے، نہ طواف کرے، نہ جھکے، نہ زمین چومے کہ یہ سب بدعاتِ قبیحہ ہیں۔'' آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: ''مزار کو سجدہ درکنار، کسی قبر کے سامنے اللہ عزّ وجلّ کو بھی سجدہ جائز نہیں اگرچہ وہ قبلہ رُخ ہی کھڑا ہو''۔ اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ دلائلِ شرعیہ کے ساتھ فتاویٰ رضویہ، جلد 22، ص: 426 تا 537، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور کیا جا سکتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ اولیائے کرام کی قبور کو بوسہ دینا، اُن کا طواف اور تعظیماً اُنہیں سجدہ کرنا شریعتِ مُطہرہ فقہ حنفی کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟، اُنہوں نے جواب میں لکھا: بلاشبہ غیرِ کعبہ معظمہ کا طوافِ تعظیمی ناجائز ہے اور غیر خدا کو سجدہ ہماری شریعت میں حرام ہے اور بوسۂ قبر میں علماء کو اختلاف ہے اور احوط منع ہے، خصوصاً مزاراتِ طیبہ اولیائے کرام کہ ہمارے علماء نے تصریح فرمائی کہ کم از کم چار ہاتھ

فاصلہ سے کھڑا ہو، یہی ادب ہے پھر تقبیل (بوسہ) کیونکر متصور ہے؟ (یعنی جب ادباً فاصلے پر کھڑا ہوگا تو بوسہ کیسے دے سکتا ہے؟) یہ وہ ہے جس کا فتویٰ عوام کو دیا جاتا ہے اور تحقیق کا مقام دوسرا ہے، لِكُلِّ مَقَامٍ مَقَالٌ وَلِكُلِّ مَقَالٍ رِجَالٌ وَلِكُلِّ رِجَالٍ مَجَالٌ وَلِكُلِّ مَجَالٍ مَنَالٌ ، نَسْأَلُ اللّٰهَ حُسْنَ الْمَآلِ۔ (احکامِ شریعت، حصہ سوم، ص:150)

ہم جب امام احمد رضا قادری اور اکابر اُمت کے حوالے سے قبروں کو بوسہ دینے کی ممانعت کا مسئلہ لکھتے ہیں تو ہمارے بعض علماءِ کرام اس پر اپنے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ بعض علماءِ کرام کے نزدیک اُن کے دلائل کی روشنی میں یہ جائز ہے۔ اس موقف میں علماء کے اختلاف رائے کی طرف اشارہ موجود ہے، لیکن اس کے باوجود عوام کے لئے سب سے زیادہ شرعی احتیاط پر مبنی یہی فتویٰ ہے کہ اُنہیں منع کیا جائے، کیونکہ بعض جُہلاء بوسے سے تجاوز کر کے سجدے تک جا پہنچتے ہیں اور اسے عقیدت کا نام دیتے ہیں، اس غلوّ (یعنی عقیدت کے زُعم میں شرعی حدود سے تجاوز کرنے) سے عوام کو محفوظ رکھنا ازحد ضروری ہے۔

عورتوں کا مزارات پر جانا

سوال: 60

مزارات پر عورتوں کی حاضری کے بارے میں کیا حکم ہے؟ ساتھ ہی فاتحہ پڑھنے کی جگہ اور راستہ بھی ایک ہونا کیسا؟

جواب:

ابتدائے اسلام میں رسول اللہ ﷺ نے مطلقاً مرد و عورت سب کو قبرستان جانے سے منع فرمایا تھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ، فَزُوْرُوْهَا ترجمہ: ''میں نے (ابتداءً) تمہیں قبرستان جانے سے منع کیا تھا، مگر اب (میں اجازت دیتا ہوں کہ) وہاں جایا کرو، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:2258)''۔

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: فَزُوْرُوا الْقُبُوْرَ ، فَاِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الْمَوْتَ ۔

ترجمہ:''قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ تمہیں موت کی یاد دلاتی ہیں''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث:2257)

حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ اجازت عام ہے، مردوں کے ساتھ بظاہر تخصیص کا کوئی قرینہ نہیں ہے، مگر اس کے باوجود فقہائے کرام نے عورتوں کو قبرستان جانے سے اس لئے منع کیا ہے کہ کہیں وہ بے پردہ ہو کر نہ جائیں، غیر محرم مردوں کے سامنے نہ آئیں، وہاں جا کر نوحہ خوانی نہ کریں، الغرض شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ ہو اور دعا و ایصالِ ثواب تو گھر بیٹھ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مرد و عورت کا اختلاط کسی مقام پر بھی جائز نہیں ہے، حیاتِ نبوی ﷺ میں جب خواتین مسجدِ نبوی میں نماز باجماعت ادا کرتیں تو آپ ﷺ تھوڑی دیر اپنی جگہ ٹھہرے رہتے تاکہ عورتیں اپنے گھروں کو چلی جائیں۔ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سَلَّمَ قَامَ النِّسَاءُ حِيْنَ يَقْضِيْ تَسْلِيْمَهٗ وَيَمْكُثُ هُوَ فِيْ مَقَامِهٖ يَسِيْرًا قَبْلَ اَنْ يَّقُوْمَ، قَالَ: نُرٰى وَاللّٰهُ اَعْلَمُ اَنَّ ذَالِكَ كَانَ لِكَيْ يَنْصَرِفَ النِّسَآءُ قَبْلَ اَنْ يُّدْرِكَهُنَّ اَحَدٌ مِّنَ الرِّجَالِ۔

ترجمہ:''جب رسول اللہ ﷺ سلام پھیرتے تھے تو آپ ﷺ کے سلام پھیرنے کے بعد عورتیں کھڑی ہو جاتی تھیں اور آپ کھڑے ہونے سے پہلے تھوڑی دیر اپنی جگہ پر رُکے رہتے تھے۔ زُہری نے کہا: اللہ زیادہ جانتا ہے! ہمارا گمان یہ ہے کہ آپ اس لئے رُکے رہتے تھے کہ عورتیں مردوں کے اختلاط سے پہلے گزر جائیں''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:870)

فقہائے کرام نے شرعی احتیاط کے پیشِ نظر عورتوں کو قبرستان جانے سے اور مساجد میں آنے سے بھی منع کیا ہے، لیکن آج کل دین کی طرف رغبت دلانے اور دینی مسائل سے آگہی کے لئے مساجد میں عورتوں کے لئے نمازِ جمعہ اور تراویح میں شرکت کی اجازت دینا میرے نزدیک دین کی حکمت کے مطابق ہے اور مستحسن ہے، بشرطیکہ وہ باپردہ ہوں، ان کے

آنے جانے کا راستہ جدا ہو، مردوں سے میل جول نہ ہو اور ان کی نماز کی جگہ میں پردے کا اہتمام ہو اور اُنہیں تاکید کی جائے کہ وہ ایسے چھوٹے بچوں کو لے کر نہ آئیں، جنہیں مسجد کے آداب کا شعور نہ ہو، جو مسجد میں شور مچا کر لوگوں کی نماز میں خلل ڈالیں اور مسجد کو آلودہ کریں۔ اِنہی شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے مُعمّر عورتوں کو اپنے کسی عزیز کی قبر پر جانے کی اجازت دی جاسکتی ہے جبکہ وہاں جا کر نوحہ خوانی اور ادب میں حد سے تجاوز نہ ہو، لیکن خواتین سے ایسی احتیاط کی توقع کم ہوتی ہے اس لئے احتیاط کے پیشِ نظر علماء عورتوں کو مطلقاً مزارات پر جانے سے منع فرماتے ہیں۔

غیر شرعی منت کا حکم

سوال: 61

بغیر چپل (برہنہ پا) پیدل چلنے کی منت یا ہزاروں کی تعداد میں چادریں چڑھانے یا مزار کے سرہانے دھاگے باندھنے کی منت جیسے معاملات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔

جواب:

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسی نذر جو تعبُّدی ہو یعنی جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو اور اس نذر کا پورا کرنا کوئی نیک کام ہو، اس نذر کا پورا کرنا واجب ہے۔ اپنے نفس کو ضرورت کے بغیر تکلیف اور عذاب دینے میں اللہ عزوجل کی کوئی عبادت ہے نہ کوئی نیک کام، ایسی نذر کا پورا کرنا واجب نہیں ہے۔

مزار پر چادر چڑھانے کی نذر ماننا نذرِ شرعی نہیں ہے کیونکہ یہ کوئی امر تعبُّدی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی جنس سے کوئی عبادتِ مقصودہ واجب ہے، اسی طرح مزار پر تالے لگانے، دھاگے باندھنے اور کھولنے کی نذر بھی باطل ہے۔ عوام کو ایسی جاہلانہ نذریں ماننے سے روکنا چاہئے اور علماء کو اپنے خطباتِ جمعہ میں اصلاحی تقریریں کرنی چاہئیں۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَىٰ شَيْخًا يُهَادَىٰ بَيْنَ ابْنَيْهِ، قَالَ: مَا بَالُ هٰذَا؟،

قَالُوْا: نَذَرَ أَنْ يَّمْشِيَ، قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ عَنْ تَعْذِيْبِ هٰذَا نَفْسَهٗ لَغَنِيٌّ وَأَمَرَهٗ أَنْ يَّرْكَبَ۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص اپنے دو بیٹوں کے (کندھوں پر) ٹیک لگا کر چل رہا تھا، آپ ﷺ نے پوچھا: اس کو کیا ہوا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس نے پیدل چلنے کی نذر مانی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ جو اپنے آپ کو عذاب دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے (یعنی اسے بندوں سے ایسے اعمال مطلوب نہیں ہیں) اور آپ ﷺ نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1865)

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ: نَذَرَتْ أُخْتِيْ أَنْ تَمْشِيَ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ، وَأَمَرَتْنِيْ أَنْ أَسْتَفْتِيَ لَهَا النَّبِيَّ ﷺ فَاسْتَفْتَيْتُهٗ فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: لِتَمْشِ وَلْتَرْكَبْ۔

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری بہن نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ بیت اللہ تک پیدل جائیں گی اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے لئے نبی ﷺ سے یہ مسئلہ معلوم کروں، پس میں نے جب نبی ﷺ سے اس کے متعلق استفسار کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی مرضی پیدل جائے یا سواری پر جائے (یعنی پیدل چل کر حج کرنے کی منت پر عمل ضروری نہیں ہے)، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:1866)''۔

مزارات پر ڈھول اور رقص وغیرہ جیسی خرافات کا حکم

سوال: 62

جو لوگ مزارات پر رقص، ڈھول وغیرہ کے ساتھ حاضری دیتے ہیں، اُن کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟۔

جواب:

شریعت مطہرہ میں عام حالات میں بھی مسلمان کے طرز زندگی میں رقص وسرور، ڈھول، گانے باجے وغیرہ کو مکروہ عمل فرمایا ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (وکرہ

كُلُّ لَهْوٍ) أَيْ كُلُّ لَعِبٍ وَّعَبَثٍ ،فَالثَّلَاثُ بِمَعْنًى وَّاحِدٍ كَمَا فِيْ "شَرْحِ التَّأْوِيْلَاتِ"، وَالْإِطْلَاقُ شَامِلٌ لِنَفْسِ الْفِعْلِ ، وَاسْتِمَاعِهِ كَالرَّقْصِ وَالسُّخْرِيَّةِ وَالتَّصْفِيْقِ وَضَرْبِ الْأَوْتَارِ مِنَ الطُّنْبُوْرِ وَالْبَرْبَطِ وَالرَّبَابِ وَالْقَانُوْنِ وَالْمِزْمَارِ وَالصَّنْجِ وَالْبُوْقِ ، فَإِنَّهَا كُلُّهَا مَكْرُوْهَةٌ لِأَنَّهَا زِيُّ الْكُفَّارِ،

ترجمہ: ''(ہر کھیل مکروہ ہے) یعنی لہو، لعب اور عَبَث تینوں معنی ایک ہیں، جیسا کہ ''شرح التاویلات'' میں ہے۔ اِطلاق (بلا قید ذکر کرنا) نفسِ فعل اور اس کی سماعت کو شامل ہے، جیسے رقص کرنا، مذاق کرنا اور تالیاں بجانا، ڈھول بجانا، ستار بجانا، سارنگی بجانا، چنگ بجانا، قانون (ایک تار والا باجا) بجانا، مزامیر کا استعمال، جھانجھ (مجیرا) بجانا اور بگل بجانا، یہ سب مکروہ ہیں کیونکہ یہ عاداتِ کفار ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص: 481، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

مزارات پر رقص کے متعلق ایک سوال کے جواب میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''بازاری عورتوں کا رقص حرام ہے، (یہ ہم نے امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز کی عبارت کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، اس میں مردوں اور عورتوں کے مخلوط اور بے حجاب اجتماعات کی تمام صورتیں شامل ہیں)، اولیائے کرام کے اَعراس میں بے قید جاہلوں نے یہ معصیت پھیلائی ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 29، ص: 92، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

زکوٰۃ کے مسائل

زکوٰۃ وفطرہ کی جبری وصولی

سوال: 63

بعض علاقوں میں کچھ لوگ بدمعاشی اور طاقت کے بل پر لوگوں سے جبراً زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ اور صدقات وصول کرتے ہیں۔ اور لوگ ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے نہ ہی حکومت لوگوں کو ایسے مسلح گروپوں سے تحفظ دیتی ہے، اس لئے لوگ اپنی جان، مال اور آبرو کے تحفظ کی خاطر مجبوراً ان لوگوں کو زکوٰۃ وصدقات دے دیتے ہیں۔ کیا جبر، خوف اور ڈر سے چندے کی صورت میں زکوٰۃ، فطرے کی ادائیگی سے شرعی حکم پورا ہو جاتا ہے یا دوبارہ مستحق افراد کو ادائیگی کرنا ضروری ہے؟، (محمد رفیع یوسفی، ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مصارفِ زکوٰۃ قرآن مجید کی سورۂ توبہ، آیت: 60 میں متعین فرما دیئے ہیں اور وہ آٹھ مدات یہ ہیں:

(1) فُقَراء (2) مساکین (3) عاملینِ زکوٰۃ (4) مُؤَلَّفۃُ القلوب (5) غارمین: جن کی گردن کسی بڑے مالی بار تلے دبی ہوئی ہو (6) فی الرِّقاب: جن پر کوئی بھاری تاوان آگیا ہو، جس سے گلوخلاصی کی کوئی سبیل نہ ہو (7) فی سبیل اللہ: جو اپنے آپ کو ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے وقف کر چکے ہوں اور معاشی تگ و دو کے لئے انہیں وقت میسر نہ ہو، جیسے دین کا طالب علم، مجاہد فی سبیل اللہ (8) ابنُ السَّبیل: جو مسافر کسی ایسے مقام پر گِھر گئے ہوں کہ ''قُوتِ لَایَمُوت'' (زندگی کی بنیادی ضروریات) دستیاب نہ ہوں اور گھر سے رابطہ اور مالی معاونت کا حصول ممکن نہ ہو۔

جبری زکوٰۃ وفطرہ کی وصولی کے متعلق فقہاء کے دو قول ہیں: (۱) زیادہ بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ دوبارہ ادا کر دی جائے (۲) آسانی اس میں ہے کہ اگر ان کو دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت کر لی جائے تو دوبارہ ادا نہ کی جائے۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

وَاِذَا أَخَذَ الْخَوَارِجُ الْخَرَاجَ وَصَدَقَةَ السَّوَائِمِ لَا يُثَنّٰى عَلَيْهِمْ لِأَنَّ الْإِمَامَ لَمْ يَحْمِهِمْ وَالْجِبَايَةُ بِالْحِمَايَةِ وَأَفْتَوْا بِأَنْ يُعِيْدُوْهَا دُوْنَ الْخَرَاجِ فِيْمَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ اللّٰهِ تَعَالٰى لِأَنَّهُمْ مَصَارِفُ الْخَرَاجِ لِكَوْنِهِمْ مُقَاتِلَةً وَالزَّكٰوةُ مَصْرَفُهَا الْفُقَرَاءُ فَلَا يَصْرِفُوْنَهَا اِلَيْهِمْ وَقِيْلَ اِذَا نَوٰى بِالدَّفْعِ التَّصَدُّقَ عَلَيْهِمْ سَقَطَ عَنْهُ وَكَذَا مَا دَفَعَ اِلٰى كُلِّ جَائِرٍ لِأَنَّهُمْ بِمَا عَلَيْهِمْ مِنَ التَّبِعَاتِ فُقَرَاءُ وَالْأَوَّلُ أَحْوَطُ ـ

ترجمہ: ''اور اگر خارجیوں نے خراج (ٹیکس) کو اور سائمہ (چرنے والے) جانوروں کی زکوٰۃ (جبراً) وصول کر لی، تو لوگوں سے دوبارہ نہیں لی جائے گی، کیونکہ امام نے لوگوں کی حفاظت نہیں کی ہے اور ٹیکس تو لوگوں کی ظالموں سے حفاظت کے سبب ہے اور لوگوں کو فتویٰ دیا جائے گا کہ وہ زکوٰۃ دوبارہ (فقیروں کو) دیدیں، خراج دوبارہ نہ دیں۔ (یہ دوبارہ زکوٰۃ دینا) ان کے اور اللہ کے درمیان ہے اس لئے خوارج، خراج کا مصرف ہیں، کیونکہ خوارج بھی لڑنے والوں میں ہیں اور زکوٰۃ کا مصرف فقراء ہیں اور (غالب امکان یہ ہے کہ) خوارج اس کو فقیروں پر خرچ نہ کریں گے اور کہا گیا (فقیہ ابوجعفر کا قول) ہے کہ: جب مال کے مالک نے خارجیوں کو دیتے وقت ان کو صدقہ دینے کی نیت کی تو مالک سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اور ایسے ہی ہر اُس مال کے دینے میں جو کسی ظالم کو دینا پڑے چونکہ ان لوگوں نے لوگوں کے حقوق اور مال ظلماً غصب کئے ہیں (جن پر ان کا حق نہیں ہے، لہٰذا یہ شرعاً اس مال کے مالک بھی نہیں ہیں، صرف غاصب ہیں)، اس لئے فقیر کے حکم میں ہیں اور قولِ اوّل میں زیادہ احتیاط ہے (یعنی شرعاً احتیاط اسی میں ہے کہ مالدار آدمی دوبارہ اپنی زکوٰۃ ادا کرے)''۔

علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

قَالَ فِي "الْجَامِعِ الصَّغِيْرِ" لِقَاضِيْ خَانْ: وَكَذٰلِكَ السُّلْطَانُ اِذَا صَادَرَ رَجُلًا،

وَأَخَذَ مِنْهُ أَمْوَالاً ،فَنَوىٰ صَاحِبُ الْمَالِ الزَّكَاةَ عِنْدَالدَّفْعِ سَقَطَتْ عَنْهُ الزَّكَاةُ، لِأَنَّهُمْ بِمَا عَلَيْهِمْ مِنَ التَّبِعَاتِ فُقَرَاءُ،فَإِنَّهُمْ إِذَا رَدُّوْا أَمْوَالَهُمْ إِلَى مَنْ أَخَذُوْهَا مِنْهُمْ لَمْ يَبْقَ مَعَهُمْ شَيْءٌ ۔

ترجمہ:’’’’الجامع الصغیر‘‘میں قاضی خان سے منقول ہے:اسی طرح حاکم اگر کسی شخص کے اموال (زبردستی) چھیننے کا حکم صادر کردے اور صاحب مال ، مال دیتے وقت زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کرلے تو مالک سے زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی ،اس لئے کہ یہ لوگ ،لوگوں کا مال ظلماً لینے کی وجہ سے فقیر ہیں، اگران سے یہ لوٹا ہوا سارا مال لے کر صاحبِ حق لوگوں کو دے دیا جائے تو ان کے پاس کچھ باقی نہیں رہے گا،(ہدایہ،جلد2،ص:32-31)‘‘۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ظلماً لئے ہوئے مال پر ظالم و غاصب کی ملکیت کا حق ثابت نہیں ہوتا،وہ صرف غاصب ہے اور مظلوموں کے حقوق کو ادا کرنا ان پر شرعاً لازم ہے۔لہٰذا اگر کبھی ان سے مظلوموں کے غصب کئے ہوئے مال اور حقوق وصول کر لئے جائیں،تو وہ فقیر رہ جائیں گے۔تاہم ہر غاصب وظالم کے بارے میں ایسا قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے پاس اپنا کوئی مال نہیں ہے۔لہٰذا احتیاطاً زکوٰۃ دوبارہ ادا کرنے کے قول ہی پر عمل بہتر ہے۔کیونکہ آج کل جو مسلح گروہ زبردستی زکوٰۃ ،فطرہ اور صدقات وصول کرتے ہیں،وہ خود بھی بااثر اور مال دار ہوتے ہیں۔

صاحب ہدایہ اس مسئلے کی تفہیم اس انداز سے کرتے ہیں کہ جب خوارج اہلِ عدل کے شہر میں گھس گئے اور وہاں کے کفار سے زبردستی خراج اور مسلمانوں سے زبردستی زکوٰۃ وصول کر لی تو اُن سے دوبارہ خراج یا زکوٰۃ نہیں لی جائے گی کہ امام عادل نے اُن کی کوئی حفاظت نہیں کی،کفار سے محصول (ٹیکس) حفاظت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے،جب امامِ عادل حفاظت نہیں کرسکا تو محصول (ٹیکس) واجب نہیں۔مسلمانوں کو فتویٰ یہ دیا جائے گا کہ وہ دیانتاً زکوٰۃ دوبارہ خود محتاجوں کو دیدیں ،کفار خراج نہ دیں،اس لئے کہ خوارج خراج کا مصرف ہیں،

کیونکہ وہ باغی ہیں۔رہا زکوٰۃ کا مسئلہ تو زکوٰۃ کا مصرف مسلمان فقیر ہیں،خوارج اس کو فقیروں پر خرچ نہیں کریں گے،خوارج کے نزدیک اہلِ عدل کا قتل مباح ہے تو یہ مسلمان فقیروں پر زکوٰۃ کا مال کیسے خرچ کریں گے اور جب مسلمانوں کی زکوٰۃ صحیح مصرف میں خرچ نہ ہوئی تو دیانتاً دوبارہ ادا کرنے کا فتویٰ دیا جائے گا۔فقیہ ابوجعفر نے کہا کہ جب مالک نے خارجیوں کو دیتے وقت زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت کرلی تو اس کی زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔ایسے ہی کسی ظالم طاقتور کو دیتے وقت نیت کرلے کہ اس فقیر کو زکوٰۃ دیتا ہوں تو زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی،دوبارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔صاحبِ ہدایہ نے فرمایا کہ پہلے قول میں احتیاط ہے کہ دوبارہ بذاتِ خود فقراء کو دینے سے زکوٰۃ یقینی اور قطعی ادا ہو جائے گی،لیکن دوسرے قول میں آسانی ہے۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(أَخَذَ الْبُغَاةُ)وَالسَّلَاطِيْنُ الْجَائِرَةُ (زَكَاةَ) الْأَمْوَالِ الظَّاهِرَةِ كَ(السَّوَائِمِ وَالْعُشْرِ وَالْخَرَاجِ لَا إِعَادَةَ عَلٰى أَرْبَابِهَا إِنْ صُرِفَ) الْمَأْخُوْذُ (فِيْ مَحَلِّهِ) الْآتِيْ ذِكْرُهُ (وَإِلَّا) يُصْرَفْ (فِيْهِ فَعَلَيْهِمْ) فِيْمَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ اللّٰهِ (إِعَادَةٌ غَيْرَ الْخَرَاجِ) لِأَنَّهُمْ مَصَارِفُهُ،وَاخْتَلَفَ فِي الْأَمْوَالِ الْبَاطِنَةِ،فَفِي "الْوَلْوَالِجِيَّةِ" وَ"شَرْحِ الْوَهْبَانِيَّةِ": اَلْمُفْتٰى بِهِ عَدَمُ الْإِجْزَاءِ،وَفِي "الْمَبْسُوْطِ": اَلْأَصَحُّ الصِّحَّةُ إِذَا نَوٰى بِالدَّفْعِ لِظَلَمَةِ زَمَانِنَا الصَّدَقَةَ عَلَيْهِمْ لِأَنَّهُمْ بِمَا عَلَيْهِمْ مِنَ التَّبِعَاتِ فُقَرَاءُ حَتّٰى أَفْتٰى أَمِيْرُ بَلْخٍ بِالصِّيَامِ لِكَفَّارَةِ عَنْ يَمِيْنِهِ؛ وَلَوْ أَخَذَهَا السَّاعِيْ جَبْرًا لَمْ تَقَعْ زَكَاةً لِكَوْنِهَا بِلَا اِخْتِيَارٍ،وَلٰكِنْ يُجْبَرُ بِالْحَبْسِ لِيُؤَدِّيَ بِنَفْسِهِ لِأَنَّ الْإِكْرَاهَ لَا يُنَافِي الْاِخْتِيَارَ۔وَفِي "التَّجْنِيْسِ": اَلْمُفْتٰى بِهِ سُقُوْطُهَا فِي الْأَمْوَالِ الظَّاهِرَةِ لَا الْبَاطِنَةِ۔

ترجمہ:''اگر باغی اور ظالم حکمران لوگوں سے (زبردستی) ظاہری اموال کی زکوٰۃ لے لیں، جیسے اونٹوں (جانوروں کی زکوٰۃ)،عشر اور خراج وغیرہ،تو مالک کے ذمے دوبارہ ادائیگی لازم نہیں،بشرطیکہ اُنہوں نے اُسے صحیح مصرف پر صرف کیا ہو،جس کا بیان''بابُ المصرف''میں

آ ئے گا۔اور اگر مصرف میں خرچ نہیں کیا تو دیانتاً مال کے مالک پر لازم ہے کہ زکوٰۃ دوبارہ ادا کرے سوائے خراج کے کہ اُس کا اعادہ لازم نہیں کیونکہ خراج مقاتلین کا حق ہے کہ وہ خراج کے مستحق ہیں اور اہلِ بغی اہلِ حرب سے مقاتلہ کرتے ہیں۔

اموالِ باطنہ (نقود اور زیورات وغیرہ) میں اختلاف ہے ''ولوالجیہ'' اور ''شرح الوہبانیہ'' میں ہے: مفتیٰ بہ قول یہی ہے کہ اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، یعنی پھر سے ادا کرنا ہوگی۔ اور ''مبسوط'' میں ہے: صحیح ترین قول یہ ہے کہ ادا ہو جائے گی یعنی مالک پر دوبارہ ادائیگی لازم نہیں جبکہ اموالِ باطنہ (پوشیدہ مال) کی زکوٰۃ باغیوں اور ظالموں نے لے لی ہو بشرطیکہ مال کا مالک ظالموں کو دیتے وقت اُن پر صدقہ کی نیت کر لے کہ ان پر لوگوں کے واجب الادا حقوق کے سبب وہ فقیر ہیں، اور اسی لئے امیر بلخ کو علماء نے فتویٰ دیا کہ وہ اپنی قسم توڑنے پر روزہ رکھ کر کفارہ ادا کرے (یعنی اس کے پاس جو مال ہے، وہ ظلماً لوگوں سے لیا گیا ہے، لہٰذا اس مال پر اس کی مِلک صحیح نہیں ہے کہ اُس نے قسم کا جو مالی کفارہ ادا کیا ہے اُسے صحیح تسلیم کیا جائے)۔اور اگر کوئی زکوٰۃ دینے سے انکار کرتا ہے اور حاکم کے مُحصِّل (Recovery Inspector) نے اُس سے زبردستی زکوٰۃ لے لی، تو اُس کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، کیونکہ اُس نے یہ بلا اختیار دیا۔اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں نیت اور اختیار ضروری ہے۔لیکن ایسے شخص کو قید کر کے مجبور کیا جائے گا تا کہ وہ خود زکوٰۃ ادا کرے کہ مجبور کرنا اختیار کے منافی نہیں ہے۔''تجنیس'' میں ہے کہ: جابر حاکم کو دینے کی صورت میں مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ اموالِ ظاہری میں زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے نہ کہ باطنی میں، (یعنی ان اموال کی زکوٰۃ دوبارہ دینی ہوگی، آج سونے، چاندی کے زیورات، نقد رقوم، بینک ڈپازٹس اور مختلف نوعیت کے سیونگ سرٹیفکیٹ، شیرز اور مالِ تجارت اموالِ باطنہ میں شمار ہوتے ہیں)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3 ص: 199 تا 201، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

زکوٰۃ کے مصارف اور اُن میں خرد بُرد

عرض یہ ہے کہ راقم کا تعلق قوم آرائیں دہلی سے ہے، جسے آج ماڈرن دور میں راعی +راعیان کہلوایا جارہا ہے۔ برادری کا فرد ہونے کے ناطے انجمن دہلی راعیان کے عہدیداروں کی غیر اسلامی، غیر اخلاقی حرکات وسکنات پر تنقید برائے تعمیر کو سامنے رکھتے ہوئے نشاندہی کرتا رہتا ہوں، مگر عہدیداروں کی ہٹ دھرمی نے پوری قوم کو تباہی کے دہانے پہنچادیا ہے۔ میرے چند سوالات ہیں:

سوال: 64

1۔ آرائیں برادری کے مُخیّر حضرات ہر سال رمضان المبارک میں لاکھوں روپے (زکوٰۃ وصدقات) نادار گھرانوں کی کفالت کے لئے انجمن دہلی راعیان کے عہدیداروں کو امین بناتے ہیں، پھر چرمِ قربانی کی مَد میں لاکھوں روپے کی رقم جمع ہوتی ہے۔ عہدیداران رمضان المبارک تا عیدِ قرباں منظرِ عام پر رہ کر غائب ہوجاتے ہیں۔ جمع شدہ زکوٰۃ کی رقم سال بھر خرچ نہیں کرتے، ضرورت مند افراد ایک ایک پیسے کو ترستے ہیں، چرمِ قربانی کی آمدنی پانچ سالوں سے بینک میں سیونگ اکاؤنٹ میں جمع ہے، جسے ضرورت کے باوجود خرچ نہیں کیا جارہا۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

سوال: 65

2۔ آرائیں میڈیکل سینٹر جو 24 گھنٹے دکھی انسانیت کی خدمت انجام دے رہا ہے، کے فنڈ منجمد کردیئے گئے ہیں۔ ایک مرحومہ کے لواحقین نے میڈیکل سینٹر کی توسیع کے لئے لاکھوں روپے عطیہ کئے۔ اُس کے اثاثے میڈیکل سینٹر کے کام تو نہ آئے، عہدیدار اس سے اپنی ضرورتیں پوری کررہے ہیں۔ مفتی صاحب! ایسے لوگوں کے لئے قرآن کیا کہہ رہا ہے؟۔ (داروغہ اقبال احمد، سیکٹر E-5 نیو کراچی)۔

جواب:

کمیونیٹیز یا انجمنوں کے ذمہ داران زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے اہلِ ثروت حضرات کے صرف وکیل ہوتے ہیں، اگر وہ اس ذمہ داری کو شرعی احکام کے مطابق ادا نہیں کریں گے تو عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔ زکوٰۃ جب تک مستحق تک نہیں پہنچے گی، محض کمیونیٹیز یا برادریوں کے فنڈ/اکاؤنٹ میں جمع ہونے سے ادا نہیں ہوگی، نیز فطرہ وزکوٰۃ کی رقوم جب تک الگ مَد میں رکھ کر تملیک (کسی کو مال کا مالک بنانا) کے شرعی اصول کے مطابق مستحق افراد کو ادا نہیں کی جائے، ادا نہیں ہوگی۔ مذکورہ صورت میں ذمہ داران صرف امین ہیں اور اُس رقم کو صحیح طور پر خرچ نہ کرنا یا غبن کرنا، خیانت کے زمرے میں آئے گا، امانت میں خیانت سے متعلق قرآنِ مجید میں آیاتِ کریمہ اور احادیثِ مبارکہ بکثرت موجود ہیں اور اُخروی عذاب کی وعیدیں بھی ہیں۔ مذکورہ ذمہ داران پر اس رقم کا تاوان دینا لازم ہے اور زکوٰۃ دینے والوں پر اپنی زکوٰۃ کی دوبارہ ادائیگی لازم ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز ایک حدیث کا حوالہ درج فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

مَاخَالَطَتِ الصَّدَقَةُ اَوْ مَالُ الزَّكوٰةِ مَالاً اِلَّا اَفْسَدَتْهُ رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَ الْبَيْهَقِيُّ عَنْ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ الصِّدِّيْقَةِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ کا مال جس مال میں ملا ہوگا، اُسے تباہ و برباد کردے گا، اس حدیث کو بزار اور بیہقی نے ام المومنین الصدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 172، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اسی حدیث کی شرح میں علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''بعض ائمہ نے اس حدیث کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ زکوٰۃ واجب ہوئی اور ادا نہ کی اور اپنے مال میں ملائے رہا تو یہ حرام اُس حلال کو ہلاک کردے گا اور امام احمد نے فرمایا کہ معنی یہ ہیں کہ مال دار شخص مالِ زکوٰۃ لے تو یہ

مالِ زکوٰۃ اس کے مال کو ہلاک کردے گا کہ زکوٰۃ فقیروں کے لئے ہے اور دونوں معنی صحیح ہیں۔(بہارِ شریعت، جلد اوّل، ص: 357)"۔

ہلاکت کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ وہ مال ہلاک ہو جائے گا اور دوسرا یہ کہ زکوٰۃ کے اختلاط سے اس مال میں برکت نہیں رہے گی۔

ایسے اراکین جو زکوٰۃ وفطرہ کی رقم مستحقین تک نہیں پہنچاتے اُس میں غبن کرتے ہیں، برادری/انجمن کے ذمہ داران کو چاہئے کہ اُنہیں فوری طور پر معزول کردیں، اسی طرح مرحومہ کے لواحقین نے جو رقم میڈیکل سینٹر کے لئے دی، وہ محض اُسی کام کے لئے وقف تھی، اُسے کسی دوسرے مصرف یا ذاتی مصارف میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

زکوٰۃ اور کمیونٹی فنڈز

سوال:66

انجمن ارائیاں، آرائیں برادری کی نمائندہ سماجی وفلاحی رجسٹرڈ تنظیم ہے، آرائیں برادری کی فلاح وبہبود اور تعمیر وترقی کے علاوہ غریب ونادار، یتیم ومسکین طلبا وطالبات، بیواؤں، جہیز کی حق دار بچیوں اور دیگر ضرورت مند افراد کی زکوٰۃ فنڈ سے مدد کرتی ہے، جس کے لئے صاحب حیثیت افراد سے زکوٰۃ کی رقم جمع کی جاتی ہے۔ انجمن آرائیں کے تحت شہرِ کراچی واندرونِ سندھ فری ڈسپنسری، سلائی سینٹر، ناظرہ قرآن کی تعلیم کے سینٹر، ٹیوشن سینٹر وغیرہ بھی چلائے جاتے ہیں۔ کیا ہم زکوٰۃ فنڈ سے ملازمین کی تنخواہیں، دفتری اخراجات اور دیگر ضروریات کی مَد میں استعمال کرسکتے ہیں؟۔

(۲) انجمن ارائیاں کے حلقہ جات میں سماجی اداروں کے لئے عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں، جن میں ڈسپنسری، سلائی سینٹرز وغیرہ۔ کیا ہم زکوٰۃ فنڈ سے ان اداروں کی تعمیر کرسکتے ہیں؟۔

حاجی مشتاق احمد آرائیں

نائب صدر زکوٰۃ ووظائف کمیٹی

جواب:

بعض کمیونیٹیز، برادریوں، مخصوص خاندانی یا علاقائی وحدت کے لوگوں نے اپنی کمیونیٹی یا برادری کے افراد کے لئے فنڈ قائم کر رکھے ہیں، جس میں زکوٰۃ و فطرہ کی رقوم وصول کی جاتی ہیں۔ عمومی طور پر ان رقوم کے خرچ کرتے وقت شرعی معیار کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اول تو زکوٰۃ کی رقم محض برادری کے فنڈ میں جمع ہونے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی تاوقتیکہ مستحقِ زکوٰۃ تک نہ پہنچادی جائے۔ دوسرا یہ کہ زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم جب تک الگ مَد میں رکھ کر تملیک کے شرعی اصول کے مطابق مستحق افراد کو نہیں دی جائے گی، ادا نہیں ہوگی۔ انجمنوں (Associations) کے ذمہ داران زکوٰۃ کا مال صَرف کرنے کے لئے اہل ثروت کے وکیل ہوتے ہیں اور اگر وہ اس ذمہ داری کو شرعی احکام کے مطابق ادا نہیں کریں گے، تو عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔

رفاہی ادارے جو مریضوں کے علاج کے لئے زکوٰۃ کی رقم جمع کرتے ہیں، وہ اگر حدودِ شرع میں رہ کر زکوٰۃ خرچ کرنا چاہتے ہیں، تو اس کی چند صورتیں یہ ہیں: (۱) جو دوا نادار مستحق زکوٰۃ کی مِلک میں دے دی جائے گی، وہ جائز ہے (۲) ڈاکٹر کی فیس، بیڈ کے کرائے، ایکسرے، میڈیکل ٹیسٹ وغیرہ پر جو خرچ آئے، وہ مریض خود ادا کرے اور استحقاق کے تعین کے بعد شعبۂ زکوٰۃ سے مریض کو ان مصارف کے عوض کل یا گنجائش کے تناسب سے جتنی رقم دی جاسکتی ہے، دے دی جائے (۳) زکوٰۃ و فطرہ یعنی صدقاتِ واجبہ کی رقم صرف مستحق مریضوں کو دی جائے، غیر مسلم نادار مریضوں کے لئے الگ سے ''ویلفیئر فنڈ'' قائم کیا جائے جو عطیات پر مشتمل ہو، یہ نفلی خیرات، صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ کے زمرے میں آئے گا، جسے (Voluntary Charity) کہتے ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ نفلی صدقہ وخیرات اور عطیات پر مشتمل ایک رفاہی فنڈ (Welfare Fund) قائم کریں، جس سے ضرورت مندوں کو علاج معالجے کی سہولتیں دیں اور اُسی

رقم سے ڈسپنسری کے اخراجات اور انجمن کے کارکنان کی تنخواہیں ادا کریں۔

زکوٰۃ کی رقم تعمیرات کی مد میں استعمال نہیں کی جاسکتی، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَلَا يَجُوزُ أَنْ يُبْنَى بِالزَّكَاةِ الْمَسْجِدُ وَكَذَا الْقَنَاطِرُ وَالسِّقَايَاتُ وَإِصْلَاحُ الطُّرُقَاتِ وَكَرْيُ الْأَنْهَارِ وَالْحَجُّ وَالْجِهَادُ وَكُلُّ مَا لَا تَمْلِيكَ فِيهِ.

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ کی رقم سے مسجد کی تعمیر جائز نہیں اور اسی طرح پلوں کی تعمیر، کنووں کی کھدائی، راستوں کی درستگی، نہروں کی کھدائی اور حج اور جہاد کے لئے (زکوٰۃ کی رقم کا براہِ راست استعمال) جائز نہیں ہے، (اسی طرح) ہر اُس کام کے لئے جس میں تملیک نہیں پائی جاتی (زکوٰۃ کی رقم کا استعمال) جائز نہیں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 188، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

سوال میں مذکور اداروں کی تعمیری مصارف میں بھی زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی کہ وہاں بھی تملیک موجود نہیں ہے۔ سلائی سنٹر، ناظرہ قرآن کی تعلیم کے مدرسے، ٹیوشن سنٹر سے جو زکوٰۃ کے مستحق لوگ استفادہ کرتے ہیں، ان کی زکوٰۃ سے مدد کی جائے اور وہ اپنی فیس ادا کریں تو یہ طریقہ کار شریعت کے مطابق ہوگا۔

زکوٰۃ فنڈ سے پگڑی پر مکان لینے کے لئے مدد کرنا

سوال: 67

ہماری جماعت ایک فلاحی ادارہ ہے، جس کے تحت ہمارے غریب اور مستحق اراکین کی فلاح و بہبود کا کام کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہمارے مُخیر حضرات غریب اور مستحق اراکین کی رہائش کے لئے زکوٰۃ کی مد میں عطیہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے علاقے میں چونکہ رہائشی فلیٹ تقریباً پگڑی پر ملتے ہیں، غریب مستحق افراد خود ہی ایسے مکان ڈھونڈ لیتے ہیں اور جماعت میں درخواست دے دیتے ہیں۔ ہمارے مُخیر حضرات یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ ایسے غریب اور ضرورت مند اراکین کے لئے ہماری جماعت کو زکوٰۃ فنڈ دے کر

پگڑی کا مکان رہائش کے لئے دلوانے میں مدد کر سکتے ہیں اور اس طرح ان کی زکوٰۃ
ادا ہو جائے گی؟۔

آنریری جنرل سیکریٹری، محمد صدیق صولی، پور بندر میمن جماعت، کراچی

جواب:

ہمارے بعض علماءِ کرام پگڑی پر جائیداد کے لین دین کے قائل ہیں اور بعض اس
کو نا جائز کہتے ہیں۔ جو جواز کے قائل ہیں ان کے نزدیک حقوق کی بیع جائز ہے، کیونکہ اس
پر عرف جاری ہے۔لہٰذا ان کے نزدیک پگڑی پر دکان یا مکان کی خرید وفروخت جائز
ہے۔تو ان کے نزدیک زکوٰۃ فنڈ سے کسی مستحق کو پگڑی پر مکان لے کر دینا بھی جائز
ہے۔پس جو لوگ احتیاط پر عمل کرنا چاہیں وہ اس سے احتراز کریں اور جو اس سے استفادہ
کرنا چاہیں، وہ ان علماء پر اعتماد کر کے ایسا کر سکتے ہیں۔ ہمارے معاصر علماء میں سے مفتی
محمد رفیق حسنی، مفتی محمد ابراہیم قادری، مفتی وسیم اختر المدنی، مفتی محمد اسماعیل نورانی زید مجدہم
پگڑی پر جائیداد کے لین دین کو جائز کہتے ہیں۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے تملیک (مالک بنانا) شرط ہے یعنی جسے زکوٰۃ دی جارہی ہے، اُسے
اُس مال پر تصرُّف کا مکمل اختیار حاصل ہونا چاہئے جبکہ پگڑی سسٹم میں مکان یا فلیٹ کی
ملکیت نہ پائے جانے کے سبب مالکانہ تصرُّف کا اختیار باطل ہو جاتا ہے۔علامہ علاؤالدین حصکفی
زکوٰۃ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:(هِیَ) لُغَةً :اَلطَّهَارَةُ وَالنَّمَاءُ، وَشَرْعاً:
(تَمْلِيكٌ) خَرَجَ الْإِبَاحَةُ ،فَلَوْأَطْعَمَ يَتِيمًا نَاوِيًا الزَّكَاةَ لَايُجْزِيهِ إِلَّا إِذَا دَفَعَ إِلَيْهِ
الْمَطْعُومَ، كَمَالَوْ كَسَاهُ بِشَرْطِ أَنْ يَّعْقِلَ الْقَبْضَ إِلَّا إِذَا حَكَمَ عَلَيْهِ بِنَفَقَتِهِمْ۔

ترجمہ:''زکوٰۃ لغت میں پاک ہونے اور بڑھنے کو کہتے ہیں اور شرعاً فقیر کو (شارع کے معیّن
کردہ) حصے کا مالک کرنا ہے، تملیک کی قید سے محض مباح کرنا (یعنی اُس چیز کو استعمال
کرنے کی عمومی اجازت دینا) خارج ہو گیا، پس اگر کسی نادار یتیم کو زکوٰۃ کی نیت سے کوئی

شخص کھانا کھلا دے تو تملیک نہ ہونے کے سبب، ادائے زکوٰۃ کے لئے کافی نہیں ہوگا، مگر جب کھانے کی چیز یتیم کے حوالے کر دے، تو کافی ہوگا جیسے ادائے زکوٰۃ کے لئے یتیم کو کپڑا پہنائے بشرطیکہ وہ قبضے کی حقیقت کو سمجھتا ہو، لیکن اگر حاکم نے اس شخص پر یتیم کو نان نفقہ دینے کا حکم صادر کر دیا ہے، تو اب یتیم پر خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی (بلکہ وہ یتیم کی کفالت کر کے اپنا فرض ادا کرے گا)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:3، ص:161)"۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: وَیُشْتَرَطُ اَنْ یَّکُوْنَ الصَّرْفُ (تَمْلِیْکًا) لَا اِبَاحَةً کَمَا مَرَّ۔

ترجمہ: "اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ نادار کو زکوٰۃ کے مال پر مالکانہ تصرف کا اختیار دیا جائے نہ کہ محض استعمال کرنے کی اجازت ہو، جیسا کہ گزرا، (حوالۂ مذکورہ، ص:263)"۔

اگر آپ کی برادری یا کمیونٹی کے اُمراء زکوٰۃ کے مستحق بے گھر لوگوں کو سر چھپانے کے لئے پگڑی پر فلیٹ یا مکان دلوانا چاہتے ہیں تو وہ اُن علماء کے فتوے پر عمل کر سکتے ہیں، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ کی برادری کی انجمن کم قیمت کے مکانات یا فلیٹ مالکانہ بنیادوں پر اپنی برادری کے مستحقین زکوٰۃ کو دلا دیں۔

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

سوال:68

سرکاری یا نجی اداروں میں جن ملازمین کو اُن کی ریٹائرمنٹ کے بعد پراویڈنٹ فنڈ دیا جاتا ہے، یہ رقم حکومت کے فنڈ میں جمع رہتی ہے دورانِ ملازمت ملازم اُس رقم سے قرض بھی لے سکتا ہے، کیا اس فنڈ پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟۔

(امیر ممتاز ی میوہ شاہی، کراچی واٹر سیوریج بورڈ)

جواب:

سرکاری محکموں اور پرائیویٹ کمپنیوں میں ملازمین کی تنخواہوں سے ہر ماہ کچھ رقم بطور فنڈ کاٹ لی جاتی ہے اور مدت ملازمت کی تکمیل یا ریٹائرمنٹ سے پہلے ملازمت

چھوڑنے پر طے شدہ قواعد کے مطابق محکمے یا کمپنی کی طرف سے کچھ رقم مزید ملا کر ملازم کو دی جاتی ہے۔ دوران ملازمت بھی اگر اس ملازم کو اُس فنڈ سے کچھ رقم نکالنی ہو تو قرض کے طور پر لیتا ہے، جو اسے قسطوں میں واپس کرنی ہوتی ہے۔ یہ رقم چونکہ ملازم کی مِلک میں نہیں آتی بلکہ اُس محکمے یا ادارے کے پاس ہی جمع رہتی ہے اور ملازم اس میں اپنی مرضی سے تصرُّف بھی نہیں کرسکتا، جب تک جی۔ پی فنڈ کی رقم ملازم کے اکاؤنٹ میں نہیں آجاتی یا اسے وصول نہیں ہوجاتی اور اس پر اسے ملکیت و قبضہ حاصل نہیں ہوجاتا، وہ اس کا مال اور نصاب ہی نہیں کیونکہ محکمہ یا کمپنی اس فنڈ پر ملازم کا صرف حق تسلیم کرتی ہے اور اسے اپنے اوپر واجب الادا سمجھتی ہے۔ اسے واجب الادا قرار دینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ملازم کو اس فنڈ کا تب ہی مالک بنایا جائے گا اور اس کے قبضے میں دیا جائے گا جب وہ ریٹائرمنٹ کی شرائط پوری کرلے گا۔ اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک اس رقم پر مکمل قبضہ اور تصرُّف حاصل نہ ہو، اس پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی اور قبضہ حاصل ہونے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ اُس پر واجب نہیں ہوگی بلکہ اس سال اور آنے والے سالوں میں جتنی رقم اسکے پاس مجموعی طور پر جمع ہے، اُس پر اسے زکوٰۃ دینی ہوگی۔ جی۔ پی فنڈ کی وصولی کے وقت اگر ملازم کے پاس پہلے سے نصاب کے مطابق نقد رقم موجود ہو تو جی۔ پی فنڈ سے ملنے والی رقم کو بھی اس کے ساتھ شامل کرلیا جائے گا اور جب پہلے سے موجود رقم کا سال مکمل ہوگا تو اس کا بھی سال مکمل سمجھا جائے گا اور رقم کے اس مجموعے سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اگر فنڈ کی وصولی سے پہلے ملازم صاحب نصاب نہ ہو تو اس فنڈ پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بیوی کا مہر زکوٰۃ واجب ہونے سے مانع نہیں

سوال: 69

کسی شخص پر اگر بیوی کا مہر واجب ہو، تو اُسے قرض شمار کرتے ہوئے کیا اُس شخص پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟۔(امتیاز اورنگی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب :

آج کل بالعموم عورتوں کا مہر مؤجل ہی ہوتا ہے، جس کا مطالبہ دونوں میں سے کسی ایک کی موت یا طلاق کے بعد ہی ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایسا قرض نہیں ہے، جس کی ادائیگی وجوبِ زکوٰۃ میں مانع ہو۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قَالَ مَشَايِخُنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالیٰ فِیْ رَجُلٍ عَلَيْهِ مَهْرٌ مُّؤَجَّلٌ لِأَمْرَأتِهٖ وَهُوَ لَایُرِیْدُ أَدَائَهٗ لَایُجْعَلُ مَانِعًا مِّنَ الزَّكٰوة لِعَدَمِ الْمُطَالَبَةِ فِی الْعَادَةِ۔

ترجمہ: ''ہمارے مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے مرد کے بارے میں فرماتے ہیں، جس کے ذمے مہرِ مؤجل ہے اور وہ اس کی ادائیگی کا ارادہ نہیں رکھتا، تو یہ قرض وجوبِ زکوٰۃ کیلئے رکاوٹ نہیں ہوگا، (کیونکہ اس کی فوری ادائیگی لازم نہیں ہے) اور عورت عادتاً مہر کا مطالبہ بھی نہیں کرتی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 173، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

پینشن بینیفٹ اکاؤنٹ کی رقم پر زکوٰۃ

سوال: 70

میں ایک 84 سالہ پنشنر ہوں۔ ریٹائرمنٹ پر مجھے جو رقم ملی تھی، اسے میں نے پینشن بینیفٹ اکاؤنٹ میں جمع کر دیا تھا جس پر مجھے ماہانہ کچھ رقم ملتی ہے، پینشن اور اس رقم سے میری گزر اوقات ہوتی ہے۔ کیا پی بی اے اکاؤنٹ میں جمع شدہ اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہے؟، (اے اے شاہ، ڈی ایچ اے، کراچی)۔

جواب:

اگر اس رقم کی اصل مالیت 612.36 گرام چاندی یا 87.48 گرام سونے کی موجودہ بازاری قیمت کے برابر ہے اور وہ سال بھر آپ کے نام جمع رہی ہے تو سال کے اختتام پر ڈھائی فیصد کی شرح سے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

زکوٰۃ کے مسائل

سوال: 71

میرے بڑے بھائی بے روزگار ہیں۔ان کے پاس جائیداد، بینک بیلنس یا کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے۔ایک بیوی اور ایک تین سالہ بیٹی ان کے زیرِ کفالت ہے۔ان کی بیوی کے پاس کچھ زیورات ہیں جو نصابِ زکوٰۃ کو پہنچتے ہیں، لیکن وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ میرا کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے اور نہ ہی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے میرے پاس رقم ہے۔ ویسے بھی زکوٰۃ میرے شوہر کو دینی چاہئے ، اگر وہ نہیں دیتے ،تو گناہگار بھی وہی ہوں گے۔زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا گناہ بھائی کو ہوگا یا بھابھی کو؟۔واضح رہے کہ یہ زیورات بھابھی کی ملکیت ہیں۔کیا میں اپنے بھائی کو زکوٰۃ کی رقم دے سکتا ہوں اور میں اپنی زکوٰۃ کی رقم سے ان کا قرض ادا کرسکتا ہوں؟، میری کپڑے کی دکان ہے۔مجھ سے بعض غریب اور یتیم امداد میں کپڑے مانگتے ہیں، کیا میں اپنی زکوٰۃ کی رقم سے انہیں کپڑے دے سکتا ہوں؟، کیا صدقے کی رقم سے پانی کا نل لگا کر وقف کیا جاسکتا ہے؟۔

(مشتاق احمد، انارکلی بازار، چکوال)

جواب:

سونے کے زیورات چونکہ آپ کی بھابھی کی ملکیت ہیں، اگر ان کا وزن 87.48 گرام یا اس سے زیادہ ہے تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس مال میں سے زکوٰۃ دی جائے۔اگر کوئی نقد رقم نہیں ہے تو سونے کے مجموعی وزن کا چالیسواں حصہ اس میں سے نکال کر دینا واجب ہے اور سونے کو جمع رکھنا مقاصدِ شریعت میں سے نہیں ہے۔زکوٰۃ نہ دینے پر آخرت میں جواب دہی آپ کی بھابھی پر ہوگی، بھائی پر نہیں۔ ہاں، اگر آپ کے بھائی مال دار ہوتے اور وہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے اپنی بیوی کی مالی اعانت کرتے تو یہ ان کی طرف سے حسنِ سلوک ہوتا۔

(2) اگر آپ کے بھائی کے پاس ساڑھے باون تولے یا 612.36 گرام چاندی کی موجودہ قیمت کے برابر فاضل رقم یا ان کی حاجت سے زائد اتنی مالیت کا سامان جمع نہیں ہے تو وہ مستحقِ زکوٰۃ ہیں۔ آپ انہیں زکوٰۃ دے سکتے ہیں، بلکہ اس میں زیادہ اجر ہوگا: ایک فرض ادا کرنے کا اور دوسرا صلۂ رحمی کا۔ جب آپ اپنے بھائی کو زکوٰۃ دے دیں گے تو پھر وہ اسے اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی کفالت پر خرچ کر سکتے ہیں۔

(3) حدیثِ پاک کی رُو سے پانی کا کنواں کھدوانا یا پمپ لگوانا بہترین صدقۂ جاریہ ہے۔ آپ کے لئے سعادت کی بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ اپنے طیب مال میں سے اس صدقۂ جاریہ کا اہتمام کریں، لیکن اگر آپ ایسا کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں ہیں تو کسی مستحقِ زکوٰۃ کو اچھی خاصی رقم دے دیں اور اسے ترغیب دیں کہ اپنی ضروریات بھی پوری کرے اور کنویں کے مصارف بھی ادا کردے، لیکن آپ ان پر یہ لازم نہیں کر سکتے۔

روزے کے مسائل

بچوں کو روزہ رکھوانے کا حکم

سوال: 72

بچوں کو کس عمر میں روزہ رکھوانا چاہیے؟۔(محمد امیر ممتازی، F.B ایریا، کراچی)

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اگر علاماتِ بلوغ ظاہر ہوجائیں تو اس پر بلوغت کا حکم لگایا جائے گا اور اُس پر احکامِ شرعیہ فرض ہوجائیں گے، اگر علامات ظاہر نہ ہوں تو پندرہ سال پورے ہونے پر بالغ تصور کیا جائے گا۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَيُؤْمَرُ الصَّبِيُّ بِالصَّوْمِ اِذَا أَطَاقَهٗ وَيُضْرَبُ عَلَيْهِ ابْنُ عَشْرٍ ، كَالصَّلَاةِ فِي الْأَصَحِّ۔

ترجمہ:''اور جب بچہ روزہ رکھنے کے قابل ہوجائے تو اُسے روزہ رکھنے کا کہا جائے گا اور جب دس سال کا ہوجائے تو صحیح ترین قول کے مطابق اسے سرزنش کرکے روزہ رکھوایا جائے جیسا کہ نماز کے بارے میں حکم ہے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:وَقَدَّرَ بِسَبْعٍ ،وَالْمُشَاهَدُ فِيْ صِبْيَانِ زَمَانِنَا عَدَمُ اِطَاقَتِهِمُ الصَّوْمَ فِيْ هٰذَا السِّنِّ ه قُلْتُ يَخْتَلِفُ ذَالِكَ بِاخْتِلَافِ الْجِسْمِ وَاخْتِلَافِ الْوَقْتِ صَيْفًا وَّشِتَاءً،وَالظَّاهِرُ اَنَّهٗ يُؤْمَرُ بِقَدْرِ الْاِطَاقَةِ اِذَالَمْ يُطِقْ جَمِيْعَ الشَّهْرِ ۔

ترجمہ:''بعض فقہاء نے بچے کے روزہ رکھنے کے قابل ہونے کی عمر سات سال بتائی ہے، (وہ لکھتے ہیں) ہمارے زمانے کا مشاہدہ یہ ہے کہ اتنی عمر میں بچہ روزہ رکھنے کے قابل نہیں ہوتا اور اس کا مدار ہر ایک کی جسمانی صلاحیت،صحت اور موسم (گرمایا سرما) پر ہے اور ظاہر یہ ہے کہ جتنے دن آسانی سے وہ روزہ رکھ سکے،اسے کہا جائے ،پورے مہینے کے روزے رکھوانا ضروری نہیں ہے،(مزید لکھتے ہیں) اگر نابالغ بچہ روزہ رکھنے کے بعد بغیر عذر کے توڑ دے تو اس پر قضا نہیں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد3 ص:344،داراحیاء التراث العربی، بیروت)

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ جن بچوں کی عمر بلوغت سے کم ہو، اُن پر روزہ رکھنا واجب نہیں ہے، متقدمین کی ایک جماعت نے مستحب قرار دیا ہے۔ ابن سیرین اور زہری کا بھی یہی قول ہے اور یہی امام شافعی کا قول ہے، اُنہوں نے کہا کہ جب بچے روزے رکھ سکیں تو ان کو مشق کرانے کے لئے ان سے روزے رکھوانے چاہئیں۔ امام شافعی کے اصحاب کے نزدیک اس کی حد نماز کی طرح سات سال اور دس سال ہے اور اسحاق کے نزدیک اس کی حد بارہ سال ہے اور امام احمد کے نزدیک ایک روایت میں اس کی حد دس سال ہے اور امام مالک کا مشہور قول یہ ہے کہ بچوں کے حق میں روزہ مشروع نہیں ہے۔ علامہ ابن بطال نے کہا ہے کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ عبادات اور فرائض صرف بلوغ کے وقت لازم ہوتے ہیں مگر اکثر علماء نے برکت کے لئے بچوں کو عبادات کی مشق کرانا مستحسن قرار دیا ہے تاکہ بچے عبادات کے عادی ہو جائیں اور جب ان پر عبادت لازم ہو، تو ان کے لئے عبادت کرنا آسان ہو اور جو اُن کو عبادت کی مشق کرائے گا، اس کو اجر ملے گا، (نعمۃ الباری، جلد:04، ص:437)''۔

مسجد میں افطار کرنے کا حکم

سوال: 73

ماہِ رمضان المبارک میں مسجد میں افطار کا اہتمام کیا جاتا ہے، کیا یہ درست ہے؟، (محمد حسان بن امیر، گوہر آباد، کراچی)

جواب:

بہتر تو یہ ہے کہ مسجد کے متصل کوئی جگہ بنالی جائے جہاں افطار کریں، مسجد میں معمول بنا کر کھانا درست نہیں ہے۔ مسجد میں کھانے کی صورت میں دو باتوں کی احتیاط رکھی جائے: (۱) مسجد میں کھانے کے ذرات نہ گریں اور مسجد ملوّث نہ ہو۔ (۲) مسجد میں داخل ہوتے وقت نفلی اعتکاف کی نیت کرلیں۔

قے سے روزہ ٹوٹنے کا حکم

سوال: 74

قے ہو جانے کی صورت میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟۔

(محمد منور احمد، ملیر کراچی)

جواب:

خود بخود بلا اختیار قے ہو جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، چاہے منہ بھر ہو یا کم ہو۔
قصداً (جان بوجھ کر) قے کرنے سے (اگر منہ بھر ہو تو) بالاتفاق روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَاِنْ ذَرَعَهُ الْقَیْئُ وَخَرَجَ) وَلَمْ یَعُدْ (لَا یُفْطِرُ مُطْلَقًا) مِلاءً أَوْ لَا۔

ترجمہ: ''اگر بلا اختیار قے ہوگئی اور حلق میں نہ لوٹی تو مطلقاً روزہ نہیں ٹوٹے گا خواہ منہ بھر ہو یا منہ بھر نہ ہو''۔

مزید لکھتے ہیں: (وَاِنْ اِسْتَقَاءَ) أَیْ طَلَبَ الْقَیْئَ (عَامِدًا) أَیْ مُتَذَکِّرًا لِصَوْمِهٖ (اِنْ کَانَ مِلْءَ الْفَمِ فَسَدَ بِالْاِجْمَاعِ) مُطْلَقاً (وَاِنْ أَقَلَّ لَا) عِنْدَالثَّانِیْ وَهُوَ الصَّحِیْحُ

ترجمہ: ''اور اگر قصداً (جان بوجھ کر) قے کی یعنی اسے اپنا روزہ دار ہونا یاد تھا، تو اگر منہ بھر ہے تو اس پر اجماع ہے کہ روزہ ٹوٹ گیا اور اگر منہ بھر سے کم ہے تو امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹتا یہی صحیح ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 3، ص: 349 تا 352، بیروت)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَهٰذَا کُلُّهٗ اِذَا کَانَ الْقَیْئُ طَعَاماً أَوْ مَاءً أَوْ مِرَّةً فَاِنْ کَانَ بَلْغَمًا فَغَیْرُ مُفْسِدٍ لِلصَّوْمِ۔

ترجمہ: ''قے کے یہ احکام اس وقت ہیں جب قے میں کھانا یا صفراء یا خون آئے، اگر بلغم آیا تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 204)''۔

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: مَنْ ذَرَعَهُ الْقَیْئُ فَلَیْسَ عَلَیْهِ قَضَاءٌ وَمَنِ اسْتَقَاءَ

عَمْدًا فَلْيَقْضِ ۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: جس نے بے اختیار قے کی ، اُس پر قضا نہیں اور جس نے قصداً قے کی ، اُس پر روزے کی قضا ہے،(سُنن ترمذی،رقم الحدیث:720)''۔

روزے کی حالت میں بچے کو دودھ پلانے کا حکم

سوال: 75

کیا بچے کو دودھ پلانے والی عورت روزے کے دوران بچے کو دودھ پلا سکتی ہے،روزہ ٹوٹ تو نہیں جائے گا؟،(طاہرہ،بوٹ بیسن،کراچی)۔

جواب:

بچے کو دودھ پلانے والی عورت اگر بہت کمزور ہے اور روزہ رکھنے کی صورت میں اس کی صحت کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے یا بچے کے لئے اُس کا دودھ نہ ہونے یا انتہائی کم ہونے کی صورت میں بچے کی صحت کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے،تو اسے عذر کی بنا پر رمضان کا روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے،جس کی بعد میں قضا لازم ہے۔تاہم اگر بچے کو دودھ پلانے والی عورت رمضان المبارک کا روزہ بھی رکھتی ہے اور بچے کو دودھ بھی پلاتی ہے تو اس کے روزے پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔احادیث وآثار میں فقہی اصول یہ بیان کیا گیا ہے:

''اَلفِطْرُ مِمَّا دَخلَ وَلَيْسَ مِمَّا خَرَجَ''۔

ترجمہ:''روزے دار کے معدے میں کسی چیز کے داخل ہونے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، خارج ہونے سے نہیں ٹوٹتا''۔اور ماں کا دودھ اُس کے وجود سے خارج ہوتا ہے۔

امام بخاری بیان کرتے ہیں:وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَعِكْرِمَةُ : اَلصَّوْمُ مِمَّا دَخلَ وَلَيْسَ مِمَّا خَرَجَ

ترجمہ:''حضرت ابن عباس اور عکرمہ بیان کرتے ہیں: روزہ کسی چیز کے داخل ہونے سے ٹوٹتا ہے،خارج ہونے سے نہیں ٹوٹتا''۔

(صحیح بخاری،باب الحجامة و القیئ للصّائم ،جز ثانی،ص:576،مکتبۂ عصریہ،بیروت)

روزے کی حالت میں احتلام ہونے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

سوال: 76

روزے کی حالت میں دن کے کسی حصے میں یا سحری کے وقت اگر غسل فرض ہوجائے، تو کیا روزہ باقی رہے گا یا نہیں؟۔(منور احمد، ملیر، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں (ماہ رمضان میں) طلوع فجر تک کھانے پینے اور عملِ ازدواج کی اجازت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ،

ترجمہ: ''پس اب (چاہو تو) اپنی بیویوں سے مباشرت کرو، اور طلب کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھا ہو، اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ (ممتاز ہوکر) ظاہر ہوجائے تمہارے لئے صبح کا سفید دھاگہ (رات کے) سیاہ دھاگے سے (یعنی صبحِ صادق شروع ہوجائے)، (البقرہ: 187)''۔

جب طلوع فجر تک ازدواجی فعل میں مشغول رہنا جائز ہوا، تو حالتِ جنابت میں روزے کی نیت کرنا بھی جائز ہوگیا۔ صحیحین میں ام المؤمنین حضرت عائشہ اور ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُدْرِكُهُ الْفَجْرُ، وَهُوَ جُنُبٌ مِّنْ أَهْلِهٖ، ثُمَّ يَغْتَسِلُ وَيَصُوْمُ۔ ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ ازواج مطہرات سے قربت فرماتے اور (کبھی) حالتِ جنابت میں صبح صادق ہوجاتی، پھر آپ غسل فرماتے، اور روزہ رکھتے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1926)''۔

اِنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ قَالَتْ قَدْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُدْرِكُهُ الْفَجْرُ فِيْ رَمَضَانَ وَهُوَ جُنُبٌ مِّنْ غَيْرِ حُلُمٍ فَيَغْتَسِلُ وَيَصُوْمُ۔

ترجمہ: ''ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ماہِ رمضان میں کبھی رسول اللہ ﷺ پر احتلام کے بغیر حالتِ جنابت میں صبح صادق آجاتی، آپ غسل فرماتے اور روزہ رکھتے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:2486)''۔

حالتِ جنابت میں صبح صادق ہوئی ہو یا روزے کی حالت میں دن کے کسی حصے میں احتلام کے سبب غسل فرض ہوگیا ہو، تو روزے پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ أَبِیْ سَعِیدِ ىِ الْخُدرِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ثَلَاثٌ لَا یُفْطِرْنَ الصَّائِمَ: اَلْحِجَامَةُ ،وَالْقَیْءُ ،وَالْاِحْتِلَامُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین چیزیں (روزے دار کا) روزہ نہیں توڑتیں: پچھنا (فصد) لگوانا اور قے اور احتلام''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:719)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَمَنْ أَصْبَحَ جُنُباً أَوِ احْتَلَمَ فِی النَّهَارِ لَمْ یَضُرُّهُ كَذَافِی مُحِیطِ السَّرَخْسِیِّ ۔

ترجمہ: ''اور جس نے حالتِ جنابت میں صبح کی یا دن میں احتلام ہوگیا، تو یہ اس کے (روزے) کے لئے نقصان دہ نہیں، ''محیط سرخسی'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:200)

تاہم بیدار ہونے کے بعد غسل کرکے پاک ہونا چاہئے اور غسل واجب میں اتنی تاخیر مکروہ تحریمی ہے، جس سے کوئی فرض نماز قضا ہوجائے، اگر نماز قضا ہوگئی تو گناہ گار ہوگا۔ اگر سحری کے وقت بیدار ہوا اور اس پر غسل جنابت واجب ہے اور روزہ بند ہونے یعنی صبح صادق طلوع ہونے میں وقت اتنا تنگ ہے کہ اگر غسل کرتا ہے تو سحری کا وقت نہیں رہتا، تو ہاتھ منہ دھو کر سحری کرکے روزہ رکھ لے اور اس کے بعد غسل واجب کرلے۔

نمازِ تراویح کے اجتماعات میں تلفظ کی ادائیگی وقراءت کا حکم

سوال: 77

ماہِ رمضان المبارک میں جگہ جگہ 5 روزہ ،10 روزہ اور 15 روزہ تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں اکثر حفاظ قرآن پاک کو غلط انداز میں پڑھتے ہیں جبکہ مقتدیوں کا بھی تصور یہ ہوتا ہے کہ چند روزہ تراویح کے بعد مزید نہیں پڑھنی ،دوسری طرف ان محافلِ تراویح میں شامل اکثر لوگ پیچھے بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے ہیں اور رکوع میں جانے سے پہلے جماعت میں شامل ہوجاتے ہیں۔کیا اس طرح کی تراویح کا اہتمام کرنا مناسب ہے؟،(حاجی رضوان الٰہی، نارتھ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید مطلقاً صحیح پڑھنا فرض ہے،خواہ نماز میں ہو یا بیرونِ نماز ،قرآن مجید کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے:وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا۔

ترجمہ:''اور قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھو،(المزمل:4)''۔

حروف کی ادائیگی اُن کے مخارج سے درست طور پر ہو،وہ صفات جن سے ایک مخرج کے چند حروف ایک دوسرے سے ممتاز ہوں،اُن کی رعایت کی جائے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:لَا يَنْبَغِيْ لِلْقَوْمِ اَنْ يُّقَدِّمُوْا فِي التَّرَاوِيْحِ الْخُوشُخْوانُ وَلٰكِنْ يُّقَدِّمُوا الدُّرُسْتُخْوانُ فَاِنَّ الْاِمَامَ اِذَاقَرَاَ بِصَوْتٍ حَسَنٍ يَشْغَلُهٗ عَنِ الْخُشُوْعِ وَالتَّدَبُّرِ وَالتَّفَكُّرِ كَذَافِيْ فَتَاوٰى قَاضِيْ خَانْ۔

ترجمہ:''قوم کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ نمازِ تراویح میں محض خوش الحان کو اپنا امام بنائیں بلکہ درست خواں (صحیح پڑھنے والے) کو امام بنانا چاہئے۔کیونکہ بعض اوقات لوگ خوش الحان قاری کی آواز کے سحر میں کھو کر نماز میں خشوع وخضوع اور آیاتِ الٰہی میں تدبر وتفکر سے غافل ہوجاتے ہیں،جیسا کہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے''۔

نوٹ:فتاویٰ عالمگیری کے حاشیہ میں ''بحراوی'' کے حوالے سے ''خوشخواں'' کے معنیٰ ''اچھی

آواز کے ساتھ پڑھنے والا'' اور'' درست خواں'' کے معنیٰ ''صحیح قراءت کے ساتھ پڑھنے والا'' کئے ہیں۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:116، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ اس مسئلے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''افسوس صد افسوس کہ اس زمانے میں حفاظ کی حالت ناگفتہ بہ ہے، اکثر تو ایسا پڑھتے ہیں کہ ''یعلمون، تعلمون'' کے سوا کچھ پتا نہیں چلتا، الفاظ وحروف کھا جایا کرتے ہیں، جو اچھا پڑھنے والے کہے جاتے ہیں، اُنہیں دیکھئے تو حروف صحیح ادا نہیں ہوتے۔ ہمزہ، الف، عین اور ذ، ز، ظ اور ث، س، ص، ت، ط وغیرہا حروف میں تفرقہ نہیں کرتے، جس سے قطعاً نماز ہی نہیں ہوتی، (بہارِ شریعت، جلد اول، حصہ پنجم، ص:271)''۔

پانچ روزہ، دس روزہ یا پندرہ روزہ تراویح کی ادائیگی میں شرعی طور پر تو کوئی قباحت نہیں ہے، بشرطیکہ قرآن مجید صحیح پڑھا جائے، الفاظ کی ادائیگی صحیح ہو اور سننے والے کی سمجھ میں آئے نیز تراویح شاہراہِ عام پر نہ پڑھی جائے۔ اگر پانچ یا دس روزہ تراویح وختمِ قرآن سے یہ سمجھا جائے کہ بس ایک قرآن ختم ہو گیا، اب تراویح سے بھی فارغ، تو یہ طرزِ عمل اور سوچ بالکل غلط ہے، تراویح پورے ماہِ رمضان کی سنت ہے، ختمِ قرآن خواہ ستائیسویں شب کو ہو یا اِس سے کم دنوں میں، بقیہ دنوں کی تراویح بھی باقاعدگی سے پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔ دورانِ نماز مقتدیوں پر خاموشی کے ساتھ تلاوت سننا فرض ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ O

ترجمہ: ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے، (الاعراف:204)''۔

سہ روزہ، پنج روزہ، شش روزہ یا دس روزہ تراویح میں شرکت کرنے والے بعض افراد کا عمل جو آپ نے نقل کیا ہے، یہ انتہائی افسوس ناک ہے، یہ ایک طرح سے نماز، قرآن اور قیام کی اہمیت کو کم کرنا ہے اور اہانت کے مترادف ہے، ایسے لوگ اپنا طرزِ عمل درست کریں اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں۔

صدقۂ فطر کس پر واجب ہے؟

سوال: 78

کیا زکوٰۃ کی طرح صدقۂ فطر بھی صاحبِ نصاب پر واجب ہے، یا ہر مسلمان پر واجب ہے؟۔موجودہ مہنگائی کے دور میں مشاہدہ ہے کہ بعض سفید پوش گھرانے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو صدقۂ فطر ادا کرنے کے لئے رقم نہیں رکھتے، تو کیا ایسے لوگوں پر بھی صدقۂ فطر واجب ہوگا ؟، اگر واجب ہے تو کیا بعد میں رقم آنے پر اُن پر اُس کی قضا لازم ہوگی؟۔(وقاص رحمٰن، نکیال آزاد کشمیر)۔

جواب:

صدقۂ فطر کا نصاب بھی وہی ہے، جو زکوٰۃ کا ہے یعنی جس شخص کے پاس 87،48 گرام سونا یا 612،36 گرام چاندی یا اُس کے مساوی رقم موجود ہو، اُس پر صدقۂ فطر واجب ہے۔ صدقۂ فطر کے وجوب کے لئے نصاب پر سال گزرنا یا سال بھر صاحبِ نصاب رہنا شرط نہیں کیونکہ صدقۂ فطر شخص پر واجب ہوتا ہے، مال پر نہیں۔ ہر صاحبِ نصاب پر اس کی نابالغ اولاد کا صدقۂ فطر ادا کرنا بھی واجب ہے جبکہ وہ خود مالکِ نصاب نہ ہوں ورنہ صدقۂ فطر ان ہی کے مال سے ادا کیا جائے البتہ مجنون اولاد اگرچہ بالغ ہوں ان کا صدقۂ فطر والد پر واجب ہے جبکہ وہ مالکِ نصاب نہ ہوں۔ صدقۂ فطر نمازِ عید سے قبل ادا کرنا افضل ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس عید الفطر کے دن طلوعِ فجر کے وقت یعنی یکم شوال المکرّم کو وقتی ضرورت سے زائد کم از کم زکوٰۃ کے نصاب کے برابر رقم نہیں ہے، تو اُس پر صدقۂ فطر واجب نہیں ہوگا اور نہ ہی اُس پر بعد میں اُس کی قضا واجب ہوگی۔ ہاں! اگر عید الفطر یعنی یکم شوال المکرّم کو صاحبِ نصاب ہوتے ہوئے فطرہ ادا نہ کیا ہوتا تو جب تک اُسے ادا نہ کیا جائے، ساقط نہیں ہوتا۔ بعد میں جب بھی ادا کرے گا ادا ہی ہوگا قضا نہ ہوگا۔

صدقۂ فطر کی ادائیگی کے لئے قرض لیا جا سکتا ہے؟

سوال: 79

صدقۂ فطر کی ادائیگی کے لئے قرض لیا جا سکتا ہے یا نہیں؟۔محمد رفیق شاہ، کراچی

جواب:

صدقۂ فطر ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر واجب ہے، لیکن صدقۂ فطر کے وجوب کے لئے نصاب پر سال گزرنا یا سال بھر صاحبِ نصاب رہنا شرط نہیں ہے۔نصابِ شرعی کی مقدار 612.36 گرام چاندی یا اُس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم ہے جو اس کی بنیادی ضرورت سے زائد ہو۔

سونے کا نصاب اس وقت معتبر ہے جب کسی کے پاس صرف سونا ہو، اگر کچھ سونا ہے مثلاً ایک یا دو تولے اور کچھ چاندی یا نقد رقم ہے تو پھر پوری مالیت نکالی جائے گی اور چاندی کا نصاب (یعنی 612،36 گرام چاندی کی موجودہ قیمت) کا معتبر ہوگا۔

اگر عیدالفطر کے دن یعنی یکم شوال المکرّم کو وقتی ضرورت سے زائد کم از کم نصابِ زکوٰۃ کے برابر رقم نہیں ہے تو ایسے شخص پر فطرہ واجب نہیں ہے اور اِس کی ادائیگی کے لئے قرض لینے کی حاجت نہیں ہے۔ ایسا شخص جو فطرہ ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، اُس پر فطرہ ادا کرنا واجب نہیں ۔البتہ وہ صدقۂ فطر لینے کا استحقاق رکھتا ہے، اگر سب ہی فطرہ دینے والے ہوں تو لینے والا کون ہوگا؟۔قرض لے کر وہ اپنے اوپر ایک غیر واجب چیز کو از خود واجب کر رہا ہے۔

مفلس شخص اگر چہ مُکلّف نہیں لیکن اگر قرض لے کر فطرہ ادا کیا تو فطرہ ادا ہو جائے گا۔ مالدار شخص اگر کسی سبب سے اُس وقت فطرہ کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو چونکہ اُس پر فطرہ واجب ہے، لہٰذا اُس پر لازم ہے کہ قرض لے کر فطرہ ادا کرے۔

تیس رمضان کو دن کے وقت چاند نظر آنے سے متعلق شرعی مسائل
رویتِ ہلال سے متعلق چند اہم مسائل

سوال:80

30 رمضان المبارک کی شام غروبِ آفتاب سے قریب 20 منٹ پہلے ہمارے شہر میں چاند نظر آ گیا، معتکفین نے اعتکاف ختم کر دیا، کچھ لوگوں نے روزہ توڑ دیا اور چند ائمۂ مساجد نے بھی اِس کی حوصلہ افزائی کی اور مساجد سے چاند نظر آنے کا اعلان کیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ جن لوگوں نے روزہ توڑا، اُن کے لئے شرعی حکم کیا ہے، صرف روزہ کی قضا کریں یا کفارہ بھی ادا کریں؟۔اس کے بعد لوگوں کو یہ اشتباہ ہو رہا ہے کہ کہیں یہ یکم شوال المکرّم یا عیدالفطر کا دِن تو نہیں تھا؟، کیا یہ درست ہے؟، (جنید، میانوالی)۔

جواب:

اس سال 2010ء جمعرات 09 ستمبر یعنی 29 رمضان المبارک کی شام کو شوال المکرّم کا چاند نظر نہیں آیا تھا، لہٰذا جمعۃ المبارک 10 ستمبر کو 30 رمضان المبارک تھی اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہمیں ایک مزید روزے کی سعادت نصیب ہوئی۔اُس دِن سہ پہر کو غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے اسلام آباد اور بعض علاقوں میں لوگوں کو چاند نظر آ گیا۔اس سے لوگ شکوک وشبہات میں مبتلا ہوئے، کیونکہ ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ہم بہت سے توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں۔بعض باتیں جو روایتی طور پر چلی آ رہی ہیں، ہم اُن کے حصار سے نہیں نکل پاتے اور اس میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ حضرات میں بھی بعض اوقات کوئی فرق نہیں رہتا، خواہ جدید سائنسی علم ہو یا دینی علم۔اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا علم صرف نظریاتی (Theoratical) ہوتا ہے، عملی (Practical) اور اطلاقی (Applied) نہیں ہوتا۔

ہمیں بتایا گیا کہ بعض روزے داروں نے روزہ توڑ دیا اور بعض معتکفین نے اعتکاف توڑ دیا۔کم علمی کے سبب بعض مساجد سے غروبِ آفتاب سے پہلے چاند نظر آنے کا اعلان کر دیا

گیا۔ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے کے تمام ضروری پہلوؤں پر گفتگو کریں تا کہ جو لوگ مثبت ذہن کے مالک ہیں اور روایات وتوہمات کے اسیر نہیں ہیں ،اُن میں آگہی (Awairness) پیدا ہو اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ وہ حق بات کو قبول کریں۔یہ علمی بحث اس لئے ضروری ہے کہ یہ شریعت کا ایک دائمی اور ہمیشہ جاری رہنے والا مسئلہ ہے۔

قمری مہینے کا دورانیہ: قمری مہینہ یا تو 29 دن کا ہوتا ہے یا 30 دن کا۔حدیث پاک میں ہے:سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ : اَلشَّهْرُ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وهٰكَذَا،يَعْنِيْ:ثَلَاثِيْنَ ،ثُمَّ قَالَ: وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا ۔يَعْنِيْ تِسْعًا وَّعِشْرِيْنَ، يَقُوْلُ : مَرَّةً ثَلَاثِيْنَ ،وَمَرَّةً تِسْعًاوَّ عِشْرِيْنَ ۔

ترجمہ:''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے (اپنے دونوں ہاتھوں کی دس انگلیوں کو کشادہ کر کے تین مرتبہ اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا:(قمری مہینہ) اس طرح ،اس طرح اور اس طرح ہوتا ہے،یعنی پورے تیس دن کا۔پھر آپ ﷺ نے (اسی طرح تین بار اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو کشادہ کر کے تین بار اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا:(قمری مہینہ) اس طرح ،اس طرح اور اس طرح ہوتا ہے،(اور آخری بار آپ نے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کو دبالیا) یعنی 29 دن کا۔یعنی کبھی مہینہ پورے 30 دن کا ہوتا ہے اور کبھی 29 دن کا،(صحیح بخاری،رقم الحدیث:5302)''۔

کیا کئی قمری مہینے مسلسل 29 دن یا 30 دن کے ہو سکتے ہیں:؟

شریعت میں اس طرح کا کوئی طے شدہ ضابطہ نہیں ہے کہ سال میں کتنے قمری مہینے مسلسل 30 دن کے یا مسلسل 29 دِن کے ہو سکتے ہیں؟۔قرآن وسنت میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتنے قمری مہینے مسلسل 30 دن کے ہو سکتے ہیں اور کتنے مسلسل 29 دن کے ہو سکتے ہیں۔امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے علامہ قطب الدین شیرازی مصنف تحفۂ شاہیہ وزیج الغ بیگی کے حوالے سے لکھا ہے کہ:''زیادہ سے زیادہ مسلسل چار قمری مہینے 30 دن کے ہو سکتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مسلسل تین قمری

مہینے ممکنہ طور پر 29 دن کے ہوسکتے ہیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 26، ص: 423، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد قسطلانی نے ارشاد الساری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے: ''2 یا 3 قمری مہینے مسلسل 29 دِن کے ہوسکتے ہیں، 4 ماہ سے زائد مسلسل 29 دِن کے نہیں ہوسکتے، (جلد: 3، ص: 357)''۔ ایک ماہرِ فلکیات نے لکھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسلسل 5 قمری مہینے 29 دن کے ہوسکتے ہیں، لیکن یہ سب امکانات کی بات ہے، ان پر کسی شرعی فیصلے کا مدار نہیں ہے۔

نئے چاند کا چھوٹا بڑا ہونا:

نئی قمری تاریخ کے تعیّن کا مدار شرعاً اور سائنسی طور پر ہلال کے چھوٹا بڑا ہونے یا غروب آفتاب کے بعد مطلع پر اس کے موجود ہونے کی مقدارِ وقت (Timing) سے نہیں ہوتا، جیسا کہ ہمارے ہاں بعض اوقات اہلِ علم بھی کہہ دیتے ہیں کہ چاند کافی بڑا ہے اور کافی دیر تک مطلع پر موجود رہا، لگتا ہے کہ ایک دن پہلے کا ہے۔ یہ سوچ اور طرزِ فکر غیر شرعی اور غیر سائنسی ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِی الْبَخْتَرِیّ قَالَ: خَرَجْنَا لِلْعُمْرَۃِ، فَلَمَّا نَزَلْنَا بِبَطْنِ نَخْلَۃَ، قَالَ: تَرَآئَیْنَا الْھِلَالَ، فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: ھُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ، وَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: ھُوَ ابْنُ لَیْلَتَیْنِ، قَالَ: فَلَقِیْنَا ابْنَ عَبَّاسٍ فَقُلْنَا: اِنَّا رَأَیْنَا الْھِلَالَ، فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: ھُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ، وَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: ھُوَ ابْنُ لَیْلَتَیْنِ، فَقَالَ: اَیَّ لَیْلَۃٍ رَأَیْتُمُوْہُ؟ قَالَ: فَقُلْنَا لَیْلَۃَ کَذَا وَکَذَا، فَقَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ مَدَّہٗ لِلرُّؤْیَۃِ، فَھُوَ لِلَیْلَۃٍ رَأَیْتُمُوْہُ،

ترجمہ: ''ابوالبختری بیان کرتے ہیں کہ ہم عمرے کے لئے گئے، جب ہم وادیٔ نخلہ میں پہنچے تو ہم نے چاند دیکھنا شروع کیا، بعض لوگوں نے کہا: ''یہ تیسری تاریخ کا چاند لگتا ہے'' اور بعض نے کہا: ''یہ دوسری تاریخ کا چاند لگتا ہے''۔ راوی بیان کرتے ہیں: پھر ہماری ملاقات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہوئی، تو ہم نے (قیاس کی بنیاد پر

اختلاف کی) یہ صورتِ حال ان سے بیان کی، تو انہوں نے فرمایا: ''تم نے چاند کس رات کو دیکھا تھا''؟، ہم نے کہا: ''فلاں رات کو''، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے دیکھنے کے لئے اسے بڑھا دیا، درحقیقت یہ اسی رات کا چاند ہے، جس رات کو تم نے اسے دیکھا ہے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2418)''۔

یہ حدیث اس مسئلے میں شریعت کی اصل ہے کہ نئے چاند کا مدار رویت پر ہے، اس امر پر نہیں ہے کہ اس کا سائز چھوٹا ہے یا بڑا یا مطلع پر اس کے نظر آنے کا دورانیہ کم ہے یا زیادہ۔ اس لئے کسی عالم یا تعلیم یافتہ شخص کا نیا چاند دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ دو یا تین تاریخ کا لگتا ہے، یہ غیر شرعی اور غیر عالمانہ ہے۔ اسی طرح سائنسی حقیقت بھی یہی ہے، مثلاً کسی قمری مہینے کے 29 تاریخ گزرنے کے بعد شام کو نئے چاند کا غروبِ آفتاب کے فوراً بعد مطلع پر ظہور تو ہے مگر اس کا درجہ چار یا پانچ ہے، اس کی عمر 18 گھنٹے ہے اور مطلع پر اس کا ظہور پندرہ بیس منٹ ہے۔ تو اس صورت میں چاند مطلع پر موجود تو ہے لیکن اس کی رویت کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا یہ قمری مہینہ 30 دن کا قرار پائے گا۔ اب اگلی شام کو اس چاند کی عمر 42 گھنٹے ہو جائے گی، مطلع پر اس کا درجہ 12 یا اس سے اوپر ہو جائے گا اور مطلع پر اس کا استقرار بھی نسبتاً زیادہ وقت کے لئے ہوگا، مثلاً پچاس منٹ اور اس کا حجم (Size) بھی بڑا ہوگا، لیکن یہ قطعیت کے ساتھ چاند کی پہلی تاریخ ہوگی۔ لہٰذا میری اہلِ علم اور اہلِ وطن سے اپیل ہے کہ توہمات کے حصار سے نکلیں اور حقیقت پسند بنیں۔

اِس موضوع پر ہم رویت ہلال ریسرچ کونسل کے سیکریٹری جنرل خالد اعجاز مفتی صاحب کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں:

نئے چاند کی جسامت (سائز) بڑی محسوس ہونے پر غلط رویت ہونے کا قیاس

''بعض لوگ قمری مہینے کی 30 تاریخ کی شام کو دکھائی دینے والے نئے چاند کی جسامت کو نسبتاً بڑا دیکھ کر یہ قیاس آرائی کرنے لگتے ہیں کہ یہ لازمی طور پر دوسری رات کا چاند

ہے۔ یہ سوچ چاند کے فلکیاتی نظام سے لاعلمی پر مبنی ہے۔ نئے چاند کی جسامت کا کوئی خاص پیمانہ نہیں ہوتا۔ اس کا اندازہ اس کی عمر سے کیا جا سکتا ہے۔ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ ماہرین فلکیات کے مشاہدوں کے مطابق 20 گھنٹے تک کی عمر کا چاند عموماً دکھائی نہیں دیتا اور 20 سے 30 گھنٹے کے درمیان عمر کا چاند دکھائی دینے کا انحصار تعدد فلکیاتی کیفیات پر ہوتا ہے۔ اس طرح چاند کے پہلی مرتبہ نظر آنے کی عمر 50 سے بھی زائد گھنٹوں تک ہو سکتی ہے، لہٰذا مختلف عمروں کے چاند مختلف جسامت (Size) کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کی وضاحت درج ذیل مثالوں سے ہو گی۔

مثال (1): ایک قمری مہینے کی 29 تاریخ کی شام کو ایک مقام پر چاند کی عمر 21 گھنٹے ہے اور اس کے دیکھے جانے میں کوئی فلکیاتی کیفیت مزاحم نہیں، لہٰذا رویت ہلال ہو گئی۔ اگر اس کی عمر 18 گھنٹے ہوتی تو وہ نظر نہ آتا بلکہ اگلی شام کو مزید 24 گھنٹے گزر جانے کے باعث (18+24) 42 گھنٹے کی عمر ہو جانے پر پہلی مرتبہ دکھائی دیتا۔ اب اندازہ کیجئے کہ نیا چاند اول صورت میں 21 گھنٹے کی عمر میں نظر آ گیا جبکہ صورت دوم میں 42 گھنٹے کی عمر میں دکھائی دیا۔ دونوں چاند پہلی رات کے ہیں لیکن مؤخر الذکر صورت میں اس کی عمر دوگنا ہو جانے کے باعث اسی قدر جسامت کا حامل ہو گا اور اسی حساب سے افق سے کافی بلند ہو گا جسے لوگ غلطی سے دوسری رات کا چاند خیال کریں گے۔

مثال (2): یہ کم از کم کیفیت ہے، نیا چاند اس سے بھی بڑی جسامت کا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ 20 سے 30 گھنٹوں کے درمیان عمر کا چاند دکھائی دینے کا انحصار متعدد فلکیاتی کیفیات پر بھی ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ 24 گھنٹے کی عمر کا چاند دیگر فلکیاتی کیفیات کے موزوں نہ ہونے کے باعث دکھائی نہ دے

سکا۔ (جیسا کہ پچھلے عنوان کے تحت نقشہ اول میں ہم اس کے عملاً واقع ہونے کی صورت میں دیکھ چکے ہیں)۔ جب وہ اگلی شام کو نظر آئے گا تو اس کی عمر (24+24) 48 گھنٹے ہو چکی ہوگی، لہٰذا وہ مثال اول میں 42 گھنٹے کی عمر میں دکھائی دینے والے چاند سے بھی بڑا ہوگا۔

مثال (3): یہی نہیں بلکہ ایک صورت میں پہلی رات کا چاند دوسری رات کے چاند سے بھی بڑا ہو سکتا ہے۔ مثال اول میں 21 گھنٹے کی عمر کا چاند نظر آ گیا لہٰذا اگلی شام کو جب یہ دوسری تاریخ میں داخل ہو گیا تو اس کی عمر (21+24) 45 گھنٹے ہوگی۔ مثال دوم میں پہلی رات کا چاند 48 گھنٹے کی عمر میں دکھائی دیا۔ ظاہر ہوا کہ پہلی رات کا 48 گھنٹے کی عمر کا چاند دوسری رات کے 45 گھنٹے کی عمر کے چاند سے بھی بڑا ہے۔

درج بالا مثالوں سے واضح ہوا کہ تیس کے چاند کی جسامت کو بڑا دیکھ کر یہ قیاس کرنا کہ یہ ضروری طور پر دوسری رات کا چاند ہے، درست نہیں۔

چودھویں رات کے چاند سے رویتِ ہلال کی درستگی کا اندازہ کرنا:

عوام الناس میں یہ تصور عام ہے کہ رویت ہلال کے مطابق چودھویں رات کو چاند پوری شب مکمل دائرے کی صورت میں روشن ہوتا ہے۔ اس تصور کے تحت بعض لوگ چاند کی گولائی کی ظاہری تکمیل سے اس ماہ کی رویت ہلال کی درستگی کا اندازہ کرتے ہیں۔ یہ معیار قطعاً درست نہیں۔ چاند کی روشن جسامت ہر لمحے مسلسل بڑھتی یا گھٹتی رہتی ہے۔ قمری مہینے کے نصف اول میں بڑھتے رہنے کے عمل کے بعد ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ زمین کے مقابل چاند کی پوری جسامت روشن ہو جاتی ہے۔ فلکیات کی اصطلاح میں اسے ''فل مون (full moon)'' یا ''ماہِ کامل'' کہتے ہیں اور یہ وقت کرۂ ارض پر صبح، دوپہر، شام اور رات کے چوبیس گھنٹوں پر پھیلے ہوئے اوقات میں کوئی لمحہ بھی ہو سکتا

ہے۔ اس کے فوراً بعد اس کی روشن سطح کے گھٹنے کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ چاند ساری رات یکساں جسامت کے ساتھ روشن نہیں رہتا۔

محض آنکھوں سے چاند دیکھ کر یہ اندازہ کرنا کہ یہ پورا چاند ہے، بالکل ممکن نہیں اور نہ ہی بظاہر پورا دکھائی دینے والے چاند پر گھنٹوں نظر جما کر بھی یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تکمیل کے مرحلے میں ہے یا اس کے بعد مسلسل گھٹنے کے عمل میں ہے۔ یہ کام رصدگاہی آلات ہی انجام دے سکتے ہیں۔ جس طرح ماہرین فلکیات اپنے خصوصی فارمولوں سے چاند کی پیدائش کے ماہانہ اوقات کا تعین کرتے ہیں، اسی طرح وہ ہر مہینے کے ماہِ کامل کے اوقات بھی معلوم کرتے ہیں۔ پس چودھویں رات کے عمومی تصور سے اس ماہ کی رویت ہلال معلوم کرنے کا معیار مقرر کرنا درست نہیں"۔

دِن کے وقت نظر آنے والے چاند کے بارے میں وضاحت: چاند کی رویت سے متعلق یہ ضابطہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ دِن کے وقت نظر آنے والا چاند، خواہ وہ زوال سے پہلے نظر آئے یا بعد میں، آئندہ آنے والی رات کا قرار پائے گا۔ اور اب جو رات آئے گی، مہینے کا آغاز اُسی سے ہوگا، امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا قول یہی ہے اور یہی قول مختار ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَرُؤْيَتُهٗ بِالنَّهَارِ لِلَّيْلَةِ الْآتِيَةِ مُطْلَقًا عَلَى "الْمَذْهَبِ"

ترجمہ: "اور جو چاند دِن کے وقت نظر آئے، صحیح مذہب کے مطابق وہ ہر صورت میں اگلی رات کا شمار کیا جائے گا"۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

أَیْ سَوَاءٌ رُئِیَ قَبْلَ الزَّوَالِ أَوْ بَعْدَهٗ، وَقَوْلُهٗ "عَلَى الْمَذْهَبِ": أَیِ الَّذِیْ هُوَ قَوْلُ أَبِیْ حَنِیْفَةَ وَمُحَمَّدٍ۔ قَالَ فِی "الْبَدَائِعِ": فَلَا یَکُوْنُ ذَالِكَ الْیَوْمُ مِنْ رَمَضَانَ عِنْدَهُمَا، وَقَالَ أَبُوْ یُوْسُفَ: إِنْ کَانَ بَعْدَ الزَّوَالِ فَکَذَالِكَ، وَإِنْ کَانَ قَبْلَهٗ فَهُوَ لِلَّیْلَةِ الْمَاضِیَةِ وَیَکُوْنُ الْیَوْمُ مِنْ رَمَضَانَ، وَعَلٰی هٰذَا الْخِلَافِ هِلَالُ شَوَّالٍ: فَعِنْدَهُمَا

يَكُوْنُ لِلْمُسْتَقْبِلَةِ مُطْلَقًا ،وَيَكُوْنُ الْيَوْمُ مِنْ رَمَضَانَ ،وَعِنْدَهُ لَوْ قَبْلَ الزَّوَالِ يَكُوْنُ لِلْمَاضِيَةِ وَيَكُوْنُ الْيَوْمُ يَوْمَ الْفِطْرِ،لِأَنَّهُ لَايُرٰى قَبْلَ الزَّوَالِ عَادَةً اِلَّا أَنْ يَّكُوْنَ لِلَيْلَتَيْنِ ،فَيَجِبُ فِيْ هِلَالِ رَمَضَانَ كَوْنُ الْيَوْمِ مِنْ رَمَضَانَ،وَفِيْ هِلَالِ شَوَّالَ كَوْنُهُ يَوْمَ الْفِطْرِ،وَالْاَصْلُ عِنْدَهُمَا اَنَّهُ لَاتُعْتَبَرُ رُؤْيَتُهُ نَهَارًا ،وَاِنَّمَا الْعِبْرَةُ لِرُؤْيَتِهِ بَعْدَ غُرُوْبِ الشَّمْسِ لِقَوْلِهِ ﷺ : صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهِ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهِ، أَمَرَ بِالصَّوْمِ وَالْفِطْرِ بَعْدَالرُّؤْيَةِ،فَفِيْمَا قَالَهُ اَبُوْ يُوْسُفَ مُخَالَفَةُ النَّصِ،وَفِيْ "الْفَتْحِ":أَوْجَبَ الْحَدِيْثُ سَبْقَ الرُّؤْيَةِ عَنِ الصَّوْمِ وَالْفِطْرِ،وَالْمَفْهُوْمُ الْمُتَبَادِرُ مِنْهُ الرُّؤْيَةُ عِنْدَ عَشِيَّةِ آخِرِ كُلِّ شَهْرٍ عِنْدَالصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَمَنْ بَعْدَهُمْ ،بِخِلَافِ مَاقَبْلَ الزَّوَالِ مِنَ الثَّلَاثِيْنَ وَالْمُخْتَارُ قَوْلُهُمَا اھ۔

ترجمہ:''یعنی (دن میں چاند) زوال سے قبل نظر آئے یا زوال کے بعد (اس کا حکم ایک ہی ہے)،''مذہب پر'' ہونے کا معنی یہ ہے کہ یہ قول امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا ہے۔ ''بدائع الصنائع'' میں فرمایا: پس طرفین (امام اعظم اور امام محمد) کے نزدیک وہ دن رمضان کا نہیں ہوگا ،امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ: اگر زوال کے بعد نظر آیا تو بے شک آئندہ شب کا ہے اور اگر زوال سے قبل نظر آیا تو پچھلی شب کا ہے اور وہ دِن رمضان کا ہوگا۔اور ائمۂ احناف کے اسی اختلاف پر (امام ابو یوسف کے نزدیک) یہ شوال کا چاند ہے، یعنی طرفین (امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ) کے نزدیک (دن میں چاند زوال سے پہلے نظر آئے یا زوال کے بعد) ہر صورت میں آئندہ شب کا ہے اور وہ دن رمضان کا ہوگا۔امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک اگر زوال سے پیشتر نظر آیا تو چاند شب گذشتہ کا ہے اور یہ دن عید کا ہے،اس لئے کہ ہلال عادتاً زوال سے قبل نظر نہیں آتا سوائے اِس کے کہ دو رات کا چاند ہو،پس ہلالِ رمضان میں وہ دِن رمضان کا ہونا ضروری ہوا اور شوال کے چاند میں عید کا دِن۔اور طرفین کے نزدیک اصل یہ ہے کہ دِن کی رویت کا اعتبار نہیں ،اعتبار غروب کے بعد کا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:'' (رمضان کا) چاند دیکھ کر روزے رکھو

اور(شوال کا) چاند دیکھ کر ہی روزہ چھوڑو۔(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1909)''۔ پس صوم وافطار کا حکم رؤیت کے بعد ہے، اس صورت میں امام ابو یوسف کا قول نص کے مخالف ہے۔
''فتح القدیر'' میں ہے: حدیث شریف میں روزہ رکھنے یا عید منانے کے لئے یہ لازم قرار دیا ہے کہ چاند پہلے نظر آئے ،صحابۂ کرام ،تابعین اور اُن کے بعد والے (ائمۂ کرام) کے نزدیک رویت سے ظاہر مفہوم یہی ہے کہ ہر قمری مہینے کی آخری شام کو(غروبِ آفتاب کے بعد) چاند نظر آئے ،یعنی ہر مہینے کی تیس تاریخ کو زوال سے قبل کی رویت معتبر نہیں ہے،اور مختار قول امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا ہے''۔
(ردالمحتار علی الدرالمختار ،جلد 3 ،ص: 322 ،داراحیاء التراث العربی ،بیروت)
امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''اخیر تاریخ رمضان شریف کا روزہ چاند دیکھ کر افطار کرلینا جائز ہے یا نہیں یعنی تیسویں کا چاند اکثر تیسرے پہر سے نظر آتا ہے تو آیا اُسی وقت روزہ کھول لیں یا غروبِ آفتاب کے بعد؟۔آپ نے جواب میں لکھا: کسی تاریخ کا روزہ دن سے افطار کرلینا ہرگز جائز نہیں بلکہ حرام قطعی ہے،اللہ تعالیٰ نے فرض کیا کہ روزہ رات تک پورا کرو یعنی جب آفتاب ڈوبے اور دن ختم اور رات شروع ہو ،اُس وقت کھولو۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيۡلِ ترجمہ: ''پھر روزہ کو شام تک پورا کرو،(بقرہ: 187)''۔

درمختار میں ہے: لَاعِبۡرَةَ بِرُؤۡيَةِ الۡهِلَالِ نَهَارًا مُطۡلَقاً عَلٰى مَذۡهَبِ الۡاِمَامِ الصَّحِيۡحِ الۡمُعۡتَمَدِ ،وَاَمَّا عَلٰى قَوۡلِ الثَّانِىۡ مِنۡ اَنَّهٗ اِنۡ رَاٰى قَبۡلَ الزَّوَالِ فَلِلۡمَاضِيَةِ فَلَيۡسَ الۡاِفۡطَارُ بِمَعۡنٰى نَهَارَالصَّوۡمِ بَلۡ لِثُبُوۡتِ الۡعِيۡدِ عِنۡدَهٗ بِذَاكَ وَلَيۡسَ هٰذامَعۡنٰى قَوۡلِهٖ ﷺ: صُوۡمُوۡا لِرُؤۡيَتِهٖ وَافۡطِرُوۡا لِرُؤۡيَتِهٖ وَالۡاٰيُوۡجِبُ الصَّوۡمَ بِمُجَرَّدِ رُؤۡيَةِ الۡهِلَالِ بَعۡدَالۡمَغۡرِبِ وَهٰذَا وَاضِحٌ جِدًّا۔
ترجمہ: ''امام کے صحیح معتمد مذہب کے مطابق ہر حال میں دن کو چاند دیکھنے کا کوئی اعتبار نہیں، مگر امام ثانی (امام ابو یوسف) کے قول پر ہے کہ اگر زوال سے پہلے دیکھا تو یہ گذشتہ رات

کا ہوگا، تو اب افطار کا یہ معنیٰ نہیں کہ یہ دن کے روزے کا افطار ہے بلکہ اس سے امام ثانی کے نزدیک ثبوتِ عید ہو رہا ہے، کیونکہ گذشتہ رات کا چاند ہے تو عید کی وجہ سے افطار ہے اور حضور ﷺ کے فرمان مبارک ''چاند دیکھنے پر روزہ رکھو اور چاند دیکھنے پر عید کرو'' کا معنی یہ نہیں کہ جب دیکھو تو افطار کرو ورنہ یہ لازم آئے گا کہ مغرب کے بعد محض چاند دیکھنے سے اُسی وقت روزہ لازم ہو جائے اور یہ نہایت ہی واضح ہے''۔

نوٹ: درمختار میں جو عبارت ملی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ''وَرُؤْيَتُهُ بِالنَّهَارِ لِلَّيْلَةِ الْآتِيَةِ مُطْلَقًا عَلَى الْمَذْهَبِ ذَكَرَهُ الْحَدَّادِيُّ، وَاخْتِلَافُ الْمَطَالِعِ وَرُؤْيَتُهُ نَهَارًا قَبْلَ الزَّوَالِ أَوْ بَعْدَهُ غَيْرُ مُعْتَبَرٍ عَلَى ظَاهِرِ الْمَذْهَبِ''، درمختار میں لا عبرة الخ کے الفاظ نہیں ہیں۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 388-389، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اعتکاف اور روزہ توڑنے والوں کا حکم:

اعتکاف خواہ قصداً توڑا ہو یا کسی عذر کے سبب، اُس کی قضا واجب ہے اور جس دن توڑا فقط اُس ایک دِن کی قضا لازم ہے، یہ قضا روزے کے ساتھ ہوگی۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَاِذَا فَسَدَ الْاِعْتِكَافُ الْوَاجِبُ، وَجَبَ قَضَاؤُهُ، فَاِنْ كَانَ اعْتِكَافُ شَهْرٍ بِعَيْنِهِ ،اِذَا اَفْطَرَ يَوْمًا يَقْضِي ذَالِكَ الْيَوْمَ۔

ترجمہ: ''اور جب اعتکاف واجب فاسد ہوگیا، تو اُس کی قضا واجب ہے، پس اگر وہ کسی معین مہینے کا اعتکاف تھا، تو جس دن افطار کیا (یعنی اعتکاف فاسد ہوا)، اُسی ایک دن کی قضا اُس کے ذمے لازم ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 213)

علامہ غلام رسول سعیدی تفسیر تبیان القرآن میں علامہ ابن عابدین شامی حنفی کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف ہر چند کہ نفل ہے لیکن شروع کرنے سے لازم ہو جاتا ہے، اگر کسی شخص نے ایک دن کا اعتکاف کر کے فاسد کر دیا تو امام ابو یوسف کے نزدیک اس پر پورے دس دن کی قضا لازم ہے اور امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے

نزدیک اس پر صرف اسی دن کی قضا لازم ہے (یعنی روزے کے ساتھ ایک دن کا اعتکاف)، اس کے برعکس نفل میں اگر کچھ دیر مسجد میں بیٹھ کر باہر نکل گیا تو اس پر قضا نہیں کیونکہ اس کے باہر نکلنے سے وہ اعتکاف ختم ہو گیا''۔

(تبیان القرآن، جلد 1، ص: 739)

جن لوگوں نے روزہ توڑ دیا اُن کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ بعد میں اُس ایک روزے کی قضا رکھیں، کفارہ لازم نہیں۔ اس کی نظیر یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی نے رمضان یا عید کا چاند دیکھا مگر اس کی گواہی کسی سبب سے رَد کر دی گئی، مثلاً فاسق ہے یا عید کا چاند اُس نے تنہا دیکھا تو اسے حکم ہے کہ روزہ رکھے اگرچہ اس نے خود عید کا چاند دیکھا ہے، مگر اس روزہ کو توڑنا جائز نہیں اگر توڑے گا تو کفارہ لازم نہیں۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(رای) مُکَلَّفٌ (هِلَالَ رَمَضَانَ أَوِ الْفِطْرِ وَرُدَّ قَوْلُهُ) بِدَلِيْلٍ شَرْعِيٍّ (صَامَ) مُطْلَقًا وُجُوْبًا، وَقِيْلَ نَدْبًا (فَإِنْ أَفْطَرَ قَضَى فَقَطْ) فِيْهِمَا لِشُبْهَةِ الرَّدِّ۔

ترجمہ: ''کسی عاقل بالغ نے رمضان یا عید کا چاند دیکھا اور اُس کا قول دلیل شرعی کی بنا پر رَد کر دیا گیا (یعنی اس کی گواہی قبول کر کے اس پر فیصلہ نہیں کیا گیا)، تو اس کے لئے مُطلقاً روزہ رکھنا واجب ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس کے لئے روزہ رکھنا مستحب ہے، اگر روزہ نہ رکھا تو فقط قضا ہے، کیونکہ گواہی رَد ہونے کی بنا پر اس کے لئے صورت مسئلہ مشتبہ ہے (اور حدود و کفارات شبہے کی بنا پر ساقط ہو جاتے ہیں)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص: 313، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

فقہی حوالہ جات کی روشنی میں شرعی مسئلہ واضح کرنے کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ سائنسی اور فنی وجوہات کو بھی قارئین کے سامنے لائیں، اس سلسلے میں رویتِ ہلال ریسرچ کونسل کے سیکریٹری جنرل خالد اعجاز مفتی صاحب کی سائنسی توجیہہ درج ذیل ہے:

10 ستمبر 2010ء کی سہ پہر اسلام آباد میں چاند دکھائی دینے کی وجوہ

09 ستمبر 2010ء بمطابق 29 رمضان المبارک کی شام پاکستان کے کسی بھی حصے سے رویتِ ہلال کی مستند شہادتیں موصول نہ ہونے کے باعث مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی نے 10 ستمبر 2010ء جمعۃ المبارک کو 30 رمضان قرار دیتے ہوئے 11 ستمبر 2010ء کو یکم شوال المکرم 1431ھ قرار دیا۔

جمعۃ المبارک 10 ستمبر کو سہ پہر تقریباً تین بجے اسلام آباد میں چاند دکھائی دینا کوئی غیر معمولی بات نہیں بلکہ سائنس کے عین مطابق ہے۔ یہ واقعہ غیر معمولی اس لئے قرار پا گیا کہ گذشتہ شام رویتِ ہلال کی سائنسی لحاظ سے ناقابل یقین شہادتوں کو مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی نے رد کر دیا تھا جبکہ صوبہ خیبر پختونخوا کی حکومت انہیں قبول کرتے ہوئے عید منا رہی تھی۔ اس واقعہ کی بدولت مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے 10 ستمبر 2010ء کو 30 رمضان المبارک قرار دینے کے فیصلہ کو مشکوک یا غلط قرار دینے سے قبل ہمیں ''نئے چاند'' کی فلکیاتی اور دینی اصطلاحات کے علاوہ رویتِ ہلال کے سائنسی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔

اگر ہم چاند کے بڑھنے گھٹنے کے عمل پر غور کریں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ قمری ماہ کے پہلے دو ہفتے یہ ہمیں روز بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے، یہاں تک کہ ایک موقع پر یہ دائرے کی صورت میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلے دو ہفتے اس کی جسامت ہر روز کم ہوتی نظر آتی ہے اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس کا وجود بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چاند بڑھنے کا عمل نئے سرے سے شروع ہوتا ہے۔ عین اس وقت کو قرانِ شمس و قمر (Conjunction) یا اتصال شمس و قمر یا اماوس کہتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب سورج اور چاند ایک سیدھ میں صفر درجہ پر ہوتے ہیں۔ علمِ فلکیات میں یہی اُس کے ''نیا چاند'' کہلانے کا وقت ہے اور رصدگاہی کتب میں نئے چاند کے اوقات اسی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسے نئے چاند کی پیدائش

بھی کہتے ہیں اور چاند کی طبعی عمر اسی وقت سے شمار کی جاتی ہے۔
فلکیاتی اصطلاح کا نیا چاند اپنے ابتدائی دور میں بال سے زیادہ باریک، سورج سے بہت قریب اور اس کی طاقت ور شعاعوں کی براہ راست زد میں ہوتا ہے۔ لہٰذا انسانی آنکھیں یا غیر معمولی قوت کی دُور بینیں بھی اسے دیکھنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ جوں جوں چاند کی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اس کی جسامت بڑھتی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ سورج سے دور ہٹتے ہوئے اس کی شعاعوں کی طاقت سے بھی ایک حد تک محفوظ ہوتا جاتا ہے۔ بالآخر ایک وقت اس کا وجود اس قدر ہو جاتا ہے کہ سورج سے ایک خاص فاصلے پر غروب آفتاب کے بعد انسانی آنکھوں کو پہلی بار نظر آنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ بصری (Visval) نیا چاند ہے جو دوسرے الفاظ میں رویت ہلال کے معروف نام سے موسوم ہے۔
فلکیاتی اور مقامی احوال کے تحت رویت ہلال پر اثر انداز ہونے والے عوامل یوں ترتیب دیئے جا سکتے ہیں۔

فلکیاتی کیفیات:

(الف) چاند کی عمر (ب) غروبِ شمس اور غروبِ قمر کے درمیان فرق (ج) چاند کا سورج سے زاویائی فاصلہ (Longitudinal Distance) (د) سورج کا اُفق سے نیچے ہونا (ح) چاند کا ارتفاع (Altitude of Moon) (و) چاند کا زمین سے فاصلہ

مقامی کیفیات:

(1) مَطلَع (Horizon) کی کیفیت (2) فضا کا شفاف پن (Transparency) (3) مقام مشاہدہ کا محل وقوع یعنی طول بلد (Longitude) اور عرض بلد (Latitude) مقام مشاہدہ کی سطح سمندر سے بلندی اگر کم ہو تو اِنعطاف نور (Refraction of Light) کی شرح زیادہ ہوگی اور رُویَت ہلال کے لیے زیادہ سازگار ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہاڑوں کی نسبت ساحل سمندر پر نیا چاند دکھائی دینے کے

امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔سائنسی اور فلکیاتی توضیحات کی باریکیوں میں الجھے بغیر ایک عام آدمی بھی مطلع صاف ہونے کی صورت میں صرف دو معلومات کی بناء پر کسی حد تک رویتِ ہلال کے امکان کا پیشگی تعین کر سکتا ہے یا شہادتوں کے معیار کو پرکھ سکتا ہے۔اول چاند کی عمر اور دوئم غروبِ شمس اور غروب قمر کا درمیانی فرق۔

رویتِ ہلال کیلئے چاند کی عمر کم از کم بیس گھنٹے نیز غروبِ شمس اور غروبِ قمر کا درمیانی فرق کم از کم چالیس منٹ ہونا چاہئے،اگر چاند کی عمر 30 گھنٹوں سے بڑھ جائے تو غروبِ شمس اور غروبِ قمر کا درمیانی فرق 35 منٹ ہونے پر بھی ہلال نظر آجاتا ہے یا اگر غروبِ شمس اور غروبِ قمر کا درمیانی فرق 50 منٹ سے بڑھ جائے تو تقریباً 19 گھنٹے کی عمر کا چاند بھی دکھائی دے جاتا ہے۔

اصل مسئلہ: رویتِ ہلال کے لئے غروبِ آفتاب کا وقت اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس سے قبل ہم نیا چاند دیکھنے کی کوشش کریں گے تو سورج کی تیز روشنی کے باعث ہماری آنکھیں چندھیا جائیں گی اور ہم اتنا باریک چاند موجودگی کے باوجود دیکھ نہیں پائیں گے۔نیا چاند دکھائی دینے کیلئے سورج کا غروب ہونا یا سورج کی براہِ راست شعاعوں کا عدم وجود ضروری ہے۔ستمبر 2010ء میں نیا چاند 8، ستمبر کو پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق سہ پہر تین بجکر تیس منٹ پر پیدا ہوا۔9، ستمبر کو غروبِ آفتاب کے وقت اگر چہ چاند کی عمر پاکستان کے تمام شہروں میں ساڑھے 26 گھنٹوں سے بھی تجاوز کر چکی تھی لیکن غروبِ شمس اور غروبِ قمر کا درمیانی فرق کسی بھی شہر میں 28 منٹ سے زائد نہیں تھا،لہٰذا جمعرات کی شام نیا چاند دکھائی نہیں دیا۔اگر نیا چاند سہ پہر ساڑھے تین بجے کی بجائے گیارہ بجے قبل از دوپہر پیدا ہوا ہوتا تو وہ جمعرات کی شام دکھائی دے جاتا۔

جمعتہ المبارک 10، ستمبر بمطابق 30 رمضان المبارک کی سہ پہر اسلام آباد میں سورج کے آگے اتنے گھنے بادل آگئے کہ وہ سورج کی براہ راست روشنی کے آئی نائن سیکٹر پہنچنے کی راہ میں مزاحم ہو گئے،جبکہ بادلوں کے اوپر سے سورج کی روشنی چاند کے جس حصے پر پہنچ رہی

تھی، وہ روشن ہو رہا تھا۔ لہٰذا وہ پتنگ اڑاتے بچے کو بھی دکھائی دے گیا، حالانکہ وہ بچہ رویتِ ہلال کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ یہ امر مدنظر رہے کہ اس وقت چاند کی عمر 47 گھنٹوں سے بھی تجاوز کر چکی تھی۔ اگر بادل سورج کی روشنی میں مزاحم نہ ہوتے تو کوئی بھی انسان چاند کی وہاں موجودگی کے باوجود اُسے تلاش کرنے کی کوشش کرتا تو آنکھیں چندھیا جانے کے باعث اُسے دیکھ نہ پاتا۔

رہا یہ سوال کہ اس واقعہ سے ماہِ شوال 1431ھ کا 10 ستمبر کی شام سے آغاز مشکوک قرار پاتا ہے تو اس کا انتہائی سادہ جواب یہ ہے کہ جب 9 ستمبر کی شام رویتِ ہلال نہیں ہوئی تھی تو شرعی حکم کے مطابق رمضان المبارک کے تیس ایام مکمل کرنے کے بعد ہی شوال کا آغاز ہونا تھا۔ 9 ستمبر کی شام رویتِ ہلال نہ ہونے کے فیصلے کی بات ہوگی تو خیبر پختونخوا کی بیس یا بائیس شہاداتِ کا ذبہ کا ذکر بھی ضرور آئیگا جن کو قبول کر کے تفرقہ پیدا کیا گیا۔ ان شہادتوں کو پرکھنے کیلئے ہمیں پھر سائنس سے رجوع کرنا ہوگا۔

راقم الحروف نے 18، اگست کو چیئرمین مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان اور 19، اگست کو وزارتِ مذہبی امور، اسلام آباد کو ای میل کے ذریعے 9، ستمبر 2010ء کی شام پاکستان کے تقریباً تمام اہم شہروں کی رویتِ ہلال کے حوالے سے فلکیاتی کیفیات بشمول متذکرہ شہر کے طول بلد، عرض بلد، اوقات غروبِ شمس اور غروبِ قمر، شمس وقمر کے غروب کے درمیان وقت کا فرق، چاند کی عمر اور کیفیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ خیبر پختونخوا کے شہروں ایبٹ آباد، چارسدہ، چترال، ڈیرہ اسماعیل خان، دِیر، ہری پور، ہزارہ، کوہاٹ، مالاکنڈ، مانسہرہ، مردان، نوشہرہ اور پشاور کے علاوہ باغ، کرم، کوٹلی، مالاکنڈ، میرپور اور مظفرآباد میں کہیں بھی ننگی آنکھ تو درکنار ٹیلی سکوپ سے بھی چاند دکھائی دینے کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا۔

یہ عمل بھی غور طلب ہے کہ اگر پشاور کے گرد ونواح میں کہیں چاند کی رویت ہوگئی تھی جب کہ وہاں غروبِ آفتاب کا وقت 6 بجکر 28 منٹ تھا، تو پھر آدھ گھنٹہ بعد سورج غروب ہونے والے شہروں گوادر، جیوانی اور کراچی کے علاوہ بلوچستان اور سندھ کے اُن شہروں میں چاند

کیوں دکھائی نہ دیا جہاں مطلع صاف تھا اور نہ صرف چاند کی عمر زیادہ ہو چکی تھی بلکہ غروب شمس اور غروبِ قمر کا درمیانی فرق بھی زیادہ ہو چکا تھا۔ پشاور میں اکثر چند لوگوں کو دکھائی دے جانے والا چاند آخر کہاں غائب ہو جاتا ہے کہ کراچی اور گوادر میں صاف آسمان پر لاکھوں متلاشی نگاہوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ رمضان المبارک کے چاند سے متعلق فلکیاتی کیفیات بتاتے ہوئے یہ رائے دی گئی تھی کہ 11، اگست کی شام مطلع صاف ہونے کی صورت میں چاند واضح دکھائی دے گا اور اسی طرح ہوا۔ مختلف ٹی وی چینلز نے چاند کو کیمرے کے ذریعے ناظرین کو براہ راست دکھا دیا تھا۔ ''چن چڑھیا کل عالم ویکھے''

(چاند جب نکلتا ہے تو سب کو نظر آتا ہے)

رویتِ ہلال سے متعلق بعض غلط فہمیاں

29 یا 30 دنوں کے کم از کم مسلسل مہینے

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ 30 دنوں کے مسلسل دو مہینوں کے بعد تیسرا مہینہ ضروری طور پر 29 دن کا ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ 29 دنوں کے مسلسل دو مہینوں کے بعد تیسرا لازمی طور پر 30 دن کا تصور کرتے ہیں۔ فلکیاتی توضیحات سے قطع نظر اگر ان کے اس خیال کو درست سمجھ لیا جائے تو بھی یہ صورت فقہی اصولوں کی روشنی میں ناقابلِ عمل ہوگی۔ مثال ملاحظہ ہو۔

فرض کیجئے کہ قدرت کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق ایک علاقے میں کسی سال کے پہلے چار مہینوں کی تعداد اس طرح ہے:

محرم (29) صفر (30) ربیع الاول (29) ربیع الآخر (29)

ہوا یوں کہ اس علاقے میں محرم کی 29 تاریخ کو مطلع ابر آلود ہونے کے باعث چاند دیکھے جانے کی کوئی شرعی شہادت موصول نہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح فقہی طور پر یہ مہینہ 30 دن کا قرار پایا۔

ایک دن کی اس تاخیر کے باعث صفر کی 29 تاریخ کو (جو پچھلے ماہ مطلع ابر آلود نہ ہونے کی صورت میں رویت ہلال ہو جانے کے باعث 30 تاریخ ہوتی) چاند نظر آ گیا، لہٰذا عملی طور پر ماہ صفر 29 دن کا ہو گیا۔ ربیع الاول کا مہینہ اپنے حساب سے 29 دن کا ہوا۔ اس طرح صفر اور ربیع الاوّل دو ماہ مسلسل 29 دن کے ہو گئے۔ اس سے اگلے مہینے ربیع الآخر کے ایام بھی فلکیاتی نظام کے تحت اسی قدر ہیں، لہٰذا تین مہینے مسلسل انتیس کے ہوں گے۔ یہ درست نہیں کہ تیسرے ماہ کو محض اس وجہ سے، کہ پچھلے دو ماہ انتیس کے ہو چکے، پہلے ہی تیس کا قرار دے دیا جائے۔ خیال کیجئے کہ ایسی صورت میں جب ربیع الآخر کی 29 تاریخ کو چاند نظر آ جائے تو پھر کیا کیفیت برپا ہو گی؟۔ ایسی ہی سطحی معلومات کی بنا پر پروفیسر طاہر القادری نے آغاز شوال 1420 ہجری کے بارے میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان کے فیصلے پر تنقید کرتے ہوئے اسے توڑ دینے کا مطالبہ کر دیا۔ اعتراض یہ تھا کہ جب رجب اور شعبان کے مہینے تیس تیس کے ہو چکے تو پھر اس سے اگلا ماہ رمضان بھی تیس کا کیوں قرار دیا گیا؟۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اخباری خبروں کے مطابق کمیٹی کے سامنے چاند دیکھنے کا دعویٰ کرنے والے چند باریش حضرات پیش ہوئے تھے لیکن جب انہیں قرآن اٹھا کر شہادت دینے کو کہا گیا تو وہ واپس چلے گئے۔ (بے سوچے سمجھے محض کلمہ گو، باریش یا نمازی ہونے کے ناطے قبل از وقت رویت ہلال کی ناقابلِ یقین شہادتیں دھڑا دھڑ قبول کر لینے والے ہمارے صوبہ سرحد کے علما کے لئے لمحہ فکریہ ہے)۔ اس سے بھی زیادہ لطف کی بات یہ ہوئی کہ معترضین کے فلسفۂ رویت ہلال کے برعکس پاکستان کے اکثر علاقوں میں شوال کی 29 تاریخ کو (جو اُن کے حساب سے 30 تاریخ تھی) مطلع صاف ہونے کے باوجود اگلے مہینے کا چاند بھی دکھائی نہ دیا۔ اس طرح مسلسل چار مہینے

تیس تیس کے ہو گئے ۔ واضح ہو کہ ہمارے ایک ماہرِ فلکیات سید صمد حسین رضوی اس سے قبل ہی 2000ء میں واقع ہونے والی ہر قمری مہینے کی رویت ہلال کی پیشین گوئیوں کی تفصیل میں واضح طور پر یہ بتا چکے تھے کہ گو چاند 29 شوال کو نظر آنے کے قابل ہو گا مگر پاکستان میں دکھائی نہیں دے گا ۔ (دیکھئے ماہنامہ تہذیب کراچی، جنوری 2000ء، صفحہ 49) ۔اب آیئے اس مسئلے کی فلکیاتی توضیح کی جانب۔

چاند کی بے قاعدہ گردش کے باعث قمری مہینوں کی مدت یکساں نہیں ہوتی ۔ایک نئے چاند کی پیدائش سے اگلے نئے چاند کی پیدائش کا عرصہ 29 دن 6 گھنٹے اور 29 دن 20 گھنٹے کے درمیان منٹوں تک کے فرق کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کسی بھی دور کے متعدد مہینوں کی مقدار مدت کا کسی اور دور کے مہینوں کی مدت سے موازنہ کیا جائے تو ان میں قطعاً یکسانیت نہیں پائی جائے گی ۔ یہ سلسلہ تیرہ چودہ گھنٹے کے پھیلاؤ میں کم سے زیادہ اور زیادہ سے کم مدت کی جانب ایک غیر یکساں تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ کبھی یہ کم از کم یا زیادہ سے زیادہ مدت کے قریب تک پہنچ کر واپس ہوتا ہے اور کبھی ذرا دور ہی سے پلٹ جاتا ہے۔ اگر یہ سلسلہ مہینوں کی زیادہ سے زیادہ مدت کے قریب تر ہو تو 30 دنوں کے مسلسل تین مہینوں کا بھی امکان ہوتا ہے اور اگر ان کے فوراً بعد کے مہینے کی 29 تاریخ کو متعدد فلکیاتی کیفیات رویت ہلال میں مزاحم ہوں تو مسلسل چار مہینے تیس کے ہو جاتے ہیں ۔اب ہم متذکرہ بالا چاروں مہینوں کے قرِان شمس و قمر یعنی نئے چاند کی پیدائش کے اوقات کی بنیاد پر ایک نقشہ ترتیب دیتے ہیں جس سے علوم فلکیات کی رُو سے ہر 29 تاریخ کو چاند نظر نہ آنے کی وجوہ معلوم ہوں گی ۔اس کے علاوہ ان مہینوں کے نئے چاند کی پیدائش کے اوقات کے درمیانی عرصہ یعنی ہر مہینے کی مقدار مدت سے قمری مہینوں کی غیر یکسانیت بھی واضح ہو گی اور ساتھ ہی مہینوں کے اس

سلسلے کے زیادہ سے زیادہ ماہانہ مدت کے قریب تر ہونے کے باعث تیس کے مسلسل چار مہینے ہو جانے کی مذکورہ بالا وضاحت کی تصدیق ہو گی۔

ماہ ہائے 1420ھ ہجری مطابق 1999ء۔ 2000ء

		رجب	شعبان	رمضان	شوال
کیم ماہ قمری	*	11/اکتوبر	10 نومبر	10 دسمبر	9 جنوری
29 ماہ قمری	*	8 نومبر	8 دسمبر	7 جنوری	6 فروری
تاریخ پیدائش نیا چاند	9/اکتوبر	8 نومبر	8 دسمبر	6 جنوری	5 فروری
وقت پیدائش (۱)	16-34	08-53	03-32	23-14	18-03
29 کو چاند کی عمر	*	9 گھنٹے	14 گھنٹے	18/19	24 گھنٹے
کیفیت رویت ہلال	*	نظر نہیں آیا	نظر نہیں آیا	آیا	نظر نہیں آیا
مہینے کے ایام	*	30 دن	30 دن	30 دن	30 دن

مقدار ماہ	*	منٹ۔گھنٹے	منٹ۔گھنٹے	منٹ۔گھنٹے	منٹ۔گھنٹے
(29دن+..)		16-19	18-39	19-42	18-49

ماہرینِ فلکیات کے مشاہدوں کے مطابق 20 گھنٹے تک کی عمر کا چاند عموماً دکھائی نہیں دیتا۔20 سے 30 گھنٹے کی درمیانی عمر کا چاند دکھائی دینے کا انحصار متعدد فلکیاتی کیفیات پر ہوتا ہے، جن میں چاند کا ارتفاع، اس کا افقی زاویہ، غروب شمس وقمر میں تفاوت کی مقدار وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

نقشے میں ملاحظہ کیجئے کہ پہلے تین مہینوں میں چاند کی عمر رویت ہلال کے معیار سے کم تھی اس لئے دکھائی نہ دیا، جبکہ چوتھے ماہ میں فلکیاتی کیفیات کے موزوں نہ ہونے کے سبب نظر نہ آیا۔اس طرح چار مہینے مسلسل تیس کے ہوگئے۔یہ کوئی استثنائی مثال نہیں، اس سے پہلے ایسا ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔وقفوں وقفوں سے ایسی مثالیں مشاہدے میں آتی رہتی ہیں، البتہ تیس کی نسبت انتیس کے مسلسل مہینے بہت کم واقع ہوتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قمری مہینے کی اوسط مدت ساڑھے انتیس دن سے تقریباً پون گھنٹہ زائد ہوتی ہے اس لئے قمری تقویم میں تیس کے مہینے زیادہ آتے ہیں۔اس کے علاوہ چاند کی بے قاعدہ گردش کا رخ اوسط سے زائد مدت کی جانب زیادہ ہوتا ہے لہٰذا تیس کے مسلسل مہینوں کے سلسلے زیادہ واقع ہوتے ہیں۔درج بالا نقشے کی تائید میں مستقبل میں واقع ہونے والے ایک اور سلسلے کے کوائف درج ہیں جن سے صورت حال اور کھل کر واضح ہوتی ہے۔

ماہ ہائے 1439 ہجری مطابق 2017ء۔2018ء

		ربیع الاول	ربیع الثانی	جمادی الاول	جمادی الثانی

متوقع یکم ماہ قمری	*	20 نومبر	20 دسمبر	19 جنوری	18 فروری
29 ماہ قمری	*	18 دسمبر	17 جنوری	16 فروری	18 مارچ
تاریخ پیدائش نیا چاند	18 نومبر	18 دسمبر	17 جنوری	16 فروری	17 مارچ
وقت پیدائش	16-42	11-31	07-17	02-05	18-12
29 کو چاند کی عمر	*	6 گھنٹے	10/11 گھنٹے	16 گھنٹے	24 گھنٹے
کیفیت رویت ہلال	*	ناقابلِ رویت	ناقابلِ رویت	ناقابلِ رویت	؟
مہینے کے ایام	*	30 دن	30 دن	30 دن	؟
مقدار ماہ (29 دن+...)	*	منٹ۔گھنٹے 18-49	منٹ۔گھنٹے 19-46	منٹ۔گھنٹے 18-48	منٹ۔گھنٹے 16-07

اس مثال میں بھی تیس کے مسلسل تین مہینے بالکل واضح ہیں کیونکہ ان کی 29 تاریخوں کو چاند کی عمر زیادہ سے زیادہ 16 گھنٹے ہوگی جو رویت کے لئے ناکافی ہے۔ چوتھا مہینہ چونکہ حدِ فاصل پر ہے اس لئے اس کے تیس یا انتیس کے ہونے کے متعلق متعدد

فلکیاتی کیفیات کی تفصیل معلوم ہونے پر ہی کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تیس کے مسلسل تین ماہ تو گاہے بگاہے آتے رہتے ہیں بلکہ مسلسل چوتھے مہینے کے امکانات بھی موجود ہوتے ہیں''۔ ہم نے شرعی اور سائنسی دونوں پہلوؤں کی وضاحت کر دی ہے۔ سائنسی اور فلکیاتی اعتبار سے قمری ماہ کی اُنتیس یا تیس تاریخ کو دِن کے وقت بعض موسمی احوال کی وجہ سے چاند نظر آ سکتا ہے، لیکن اُس سے چاند کی تاریخ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، وہ چاند گذشتہ شب ہی سے متعلق ہوتا ہے۔ شرعی اور سائنسی اعتبار سے نئے قمری ماہ کا آغاز اُسی صورت میں ہوگا جب چاند اُس دِن غروبِ آفتاب کے بعد نظر آئے۔ یہ تفصیلی بحث ہم نے اِس لئے کی کہ جب تک دنیا قائم ہے، نظامِ شمس وقمر بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے جاری رہے گا، شمسی اور قمری مہینوں کا آغاز اور اختتام بھی ہوتا رہے گا اور اُن کے ساتھ جو دینی امور متعلق ہیں وہ بھی جاری و ساری رہیں گے۔ بس یہ ضابطہ ذہن میں رہے کہ نئے قمری مہینے کا آغاز اُسی وقت ہوگا، جب قمری مہینے کی اُنتیس تاریخ کو غروبِ آفتاب کے بعد مَطلَع پر چاند نظر آئے، ورنہ وہ قمری مہینہ تیس کا قرار پائے گا اور اگلے دِن کو بعض موسمی وجوہ اور فلکیاتی احوال کے باعث کسی وقت آسمان پر چاند نظر بھی آ جائے، تو اُس سے قمری تاریخ میں کوئی رَدوبدل نہیں ہوگا۔ اِس لئے تمام برادرانِ ملّت سے گزارش ہے کہ وہ اِس حوالے سے توہّمات اور ضعیف الاعتقادی میں مبتلا نہ ہوں۔

حج کے مسائل

شوال اور ذو القعدہ کے ابتدائی دنوں میں عمرے کی ادائیگی

سوال: 81

کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ: شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ کے ابتدائی دنوں میں عمرہ ادا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟، وضاحت کے ساتھ جواب مرحمت فرمائیں، (محمد طلحہ، نیو کراچی)۔

جواب :

حدیث پاک میں ہے: (۱) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ الْحُصَيْنِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ جَمَعَ بَيْنَ حَجٍ وَّعُمْرَةٍ ثُمَّ لَمْ يَنْزِلْ فِيْهَا كِتَابٌ وَلَمْ يَنْهَنَا عَنْهُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فِيْهَا رَجُلٌ بِرَأْيِهِ مَا شَاءَ۔

ترجمہ: ''حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے حج اور عمرہ کو جمع کیا، پھر کتاب اللہ میں ایسا کوئی حکم نازل نہیں ہوا (جس میں اس سے روکا ہو) اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور جس شخص نے (اس کے خلاف) جو کہا وہ محض اپنی رائے سے کہا، (صحیح مسلم: 2975)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تَمَتُّع سے منع کرتے تھے، اس کی تشریح میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا تَمَتُّع سے منع کرنا ان کے اجتہاد کی وجہ سے تھا اور وہ تنزیہاً منع کرتے تھے تحریماً منع نہیں کرتے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک اِفراد، تَمَتُّع اور قِران سے افضل تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے اس مسئلہ میں بحث کی اور فرمایا تم جانتے ہو کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تَمَتُّع (قِران) کیا ہے، حضرت عثمان نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم اس وقت خوف زدہ تھے، شاید حضرت عثمان کی مراد سات ہجری کا عمرۂ قضاء تھا، کیونکہ مسلمانوں کے خوف زدہ ہونے کا اس کے بعد کوئی تصور بھی نہیں تھا، دس ہجری میں حج تَمَتُّع ہوا ہے اور اس وقت مسلمانوں کے

خوف زدہ ہونے کا کوئی تصور نہیں تھا، چونکہ حضرت عثمان کے جواب سے حضرت علی کا سوال نہیں اٹھتا تھا، اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان کے جواب کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا اور ان سے اس مسئلہ میں بحث کی، حضرت عثمان نے کہا مجھے چھوڑ دو، حضرت علی نے فرمایا میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ اور حضرت عثمان کے منع کرنے کے باوجود قران کا احرام باندھا، اس سے معلوم ہوا کہ علمی مسائل میں مذاکرہ اور مناظرہ کرنا چاہئے اور دینی مسائل میں تبلیغ کرنی چاہئے۔ حاکمِ وقت اگر اپنے اجتہاد سے بھی رسول اللہ ﷺ کی سنت کے خلاف کوئی حکم دے تو حاکم کے منصب کی پرواہ کئے بغیر تمام لوگوں کو سنت رسول پر عمل کی دعوت دینی چاہئے، ان احادیث سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ پیغامِ حق سنانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور شیعہ حضرات کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف تَقِیَّہ کی نسبت کرنا بالکل باطل اور مردود ہے۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضرت علی کے نزدیک قران اِفراد سے افضل تھا، اور رسول اللہ ﷺ نے حجِ قران کیا تھا اور حضرت عثمان کے نزدیک بھی رسول اللہ ﷺ کا حجِ قران ہی تھا کیونکہ حضرت عثمان نے قران کی تاویل کی، انکار نہیں کیا۔

نوٹ: یاد رہے کہ صحابۂ کرام قران پر بھی تَمَتُّع کا اطلاق کرتے تھے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ حضرت علی نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا اور یہ قران ہے، قران اور تَمَتُّع میں اصطلاحی فرق بعد کی بات ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد:03، ص:449-50)"۔

(۲) عَنِ ابْنِ شِهَابٍ: أَنَّ سَالِمَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ حَدَّثَهُ أَنَّهُ سَمِعَ رَجُلًا مِنْ أَهْلِ الشَّامِ، وَهُوَ يَسْأَلُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ عَنِ التَّمَتُّعِ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ، فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ: هِيَ حَلَالٌ فَقَالَ الشَّامِيُّ، إِنَّ أَبَاكَ قَدْ نَهَى عَنْهَا، فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ: أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ أَبِي نَهَى عَنْهَا، وَصَنَعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَأَمْرَ أَبِي نَتَّبِعُ أَمْ أَمْرَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ؟ فَقَالَ الرَّجُلُ: بَلْ أَمْرَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: لَقَدْ صَنَعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ۔

ترجمہ: "ابن شہاب روایت کرتے ہیں کہ سالم بن عبداللہ نے ان سے بیان کیا کہ انہوں

نے سنا کہ شام کے ایک شخص نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے تَمَتُّع کے بارے میں (یا ایک ہی احرام کے ساتھ پہلے عمرہ اور پھر حج کرے، جسے قِران کہتے ہیں) سوال کیا: تو عبداللہ بن عمر نے کہا: یہ جائز ہے، شامی نے کہا: کہ آپ کے والد نے تو اِس سے منع کیا ہے، تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب دیا: ''تم بتاؤ! ایک کام سے میرے باپ نے منع کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے وہ کام کیا ہے، ہم اپنے باپ کے حکم کی پیروی کریں گے یا رسول اللہ ﷺ کے حکم کی؟''، اُس شخص نے کہا: بلکہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی، تو عبداللہ بن عمر نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے تو یہ کام کیا ہے (یعنی اشھُرِ حج میں عمرہ ادا کیا ہے)، (سنن ترمذی:824)''۔

نوٹ: گزشتہ حدیث کے ذیل میں یہ وضاحت کردی گئی ہے کہ صحابۂ کرام ''حجِ قِران'' پر بھی تَمَتُّع کا اطلاق کرتے تھے۔ بعد میں دو الگ اصطلاحات وضع ہوئیں، اگر عمرہ کر کے احرام کھول دیا جائے اور پھر حرم سے آٹھ ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھ کر حج ادا کیا جائے، تو اسے ''تَمَتُّع'' کہتے ہیں اور اگر ایک ساتھ عمرے اور حج کا احرام باندھا جائے اور عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام نہ کھولا جائے بلکہ اسی احرام میں حج مکمل کیا جائے تو اسے ''قِران'' کہتے ہیں۔ صحابۂ کرام قِران پر بھی تَمَتُّع کا اطلاق کرتے تھے۔

اس سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے جذبۂ اخلاص ورضا کا پتا چلتا ہے، ان کے والدِ گرامی حضرت عمر رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، امیر المؤمنین اور رسول اللہ ﷺ دوسرے خلیفۂ راشد ہیں۔ لیکن اس جلالتِ شان کے باوجود اُن کی نظر میں مقامِ رسول اللہ ﷺ سب سے بلند ہے، وہ پیکرِ صدق وصفا اور مظہرِ اخلاص ووفا تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے جو چیز ثابت ہو، بعد میں کسی کی رائے اُس سے معارِض ہو، تو فعلِ رسول اور امرِ رسول اللہ ﷺ ہر صورت میں مُقدَّم رہے گا۔

مندرجہ بالا حدیث کی شرح میں شیخ عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں:

''''الباجی'' نے کہا: حضرت عمر کا تَمَتُّع سے روکنا اس بنا پر تھا کہ اُن کے نزدیک حجِ اِفراد،

تَـمَتُّـع سے افضل ہے، لہٰذا یہ نہی تحریمی نہیں تھی (تنزیہی تھی)۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں:
امام نووی نے کہا مختار یہ ہے کہ حضرت عمر و حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اُس ''متعۂ معروفہ'' سے روکتے تھے کہ اشہرِ حج میں پہلے عمرہ ادا کیا جائے، پھر اسی احرام میں رہتے ہوئے حج ادا کیا جائے، یہ نہی تنزیہی پر محمول ہے، تاکہ حجِ افراد کی ترغیب دی جائے (جو ان کے نزدیک افضل تھا)، پھر اس پر اجماع ہو گیا کہ تَـمَتُّـع بغیر کسی کراہت کے جائز ہے، اور افضلیت میں اختلاف باقی رہا، ''المُحَلّٰی شَرحُ المُوَطّا'' میں بھی اسی طرح ہے، (تحفۃ الاحوذی، جلد:02، ص:82)''۔

(۳) عَنْ عِـمْـرَانَ رَضِـيَ اللّٰهُ عَـنْـهُ قَالَ تَمَتَّعْنَا عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَنَزَلَ الْقُرْاٰنُ قَالَ رَجُلٌ بِرَاْيِهٖ مَاشَآءَ ۔

ترجمہ:''حضرت عمران رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تمتع کیا اور قرآن نازل ہوا اور ایک شخص نے محض اپنی رائے سے جو چاہا کیا''۔
(صحیح بخاری:1571)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
فَـمَـنْ تَـمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْـحَـجِّ وَسَبْـعَةٍ اِذَا رَجَـعْـتُـمْ تِـلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔

ترجمہ:''تو جو شخص حج کے ساتھ عمرہ ملائے تو وہ ایک قربانی کرے جس کو وہ آسانی کے ساتھ کر سکے۔ اور جو قربانی نہ کر سکے وہ تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات روزے جب تم لوٹ آؤ، یہ کامل دس (روزے) ہیں، یہ (حجِ تَـمَتُّـع کا) حکم اس شخص کے لئے ہے جس کے اہل و عیال مسجد حرام (مکہ مکرمہ) کے رہنے والے نہ ہوں، (البقرہ:196)''۔

حضرتِ عکرمہ سے ایک طویل حدیث روایت ہے، جسے میں آگے چل کر بیان فرمایا:
ترجمہ:''سو ان لوگوں نے ایک سال میں حج اور عمرہ کی دو عبادتیں جمع کر لیں، اس حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے اور یہ اس کے نبی ﷺ کی سنت ہے اور اس

تَمَتُّع کومکہ والوں کے سوا باقی تمام مسلمانوں کے لیے مشروع فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ذَالِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (یعنی یہ اس کے لیے جس کے اہل حرم میں نہ رہتے ہوں)"۔ اور حج کے جن مہینوں کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے، وہ شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں، سو جو شخص ان مہینوں میں تمتع کرے اس پر قربانی لازم ہے یا روزے"۔

(صحیح بخاری، جلد: 01، ص: 14-213، مطبوعہ: نور محمد، اصح المطابع، کراچی، 1381)

اس کے ذیل میں علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبی ﷺ نے جو حج کیا وہ حج قران تھا اور یہی سب سے افضل حج ہے۔

(۴) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: كَانُوا يَرَوْنَ أَنَّ الْعُمْرَةَ فِيْ أَشْهُرِ الْحَجِّ مِنْ أَفْجَرِ الْفُجُوْرِ فِي الْأَرْضِ، وَيَجْعَلُوْنَ الْمُحَرَّمَ صَفَرًا، وَيَقُوْلُوْنَ: إِذَا بَرَأَ الدَّبَرُ، وَعَفَا الْأَثَرُ، وَانْسَلَخَ صَفَرُ، حَلَّتِ الْعُمْرَةُ لِمَنِ اعْتَمَرَ، فَقَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ وَأَصْحَابُهٗ صَبِيْحَةَ رَابِعَةٍ مُهِلِّيْنَ بِالْحَجِّ، فَأَمَرَهُمْ أَنْ يَجْعَلُوْهَا عُمْرَةً، فَتَعَاظَمَ ذَالِكَ عِنْدَهُمْ، فَقَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ، أَيُّ الْحِلِّ؟ قَالَ الْحِلُّ كُلُّهٗ۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ بیان کرتے ہیں کہ (زمانہ جاہلیت میں) لوگ یہ گمان کرتے تھے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا زمین پر سب سے بڑا گناہ ہے اور وہ محرم کے مہینہ کو صفر قرار دیتے تھے، وہ کہتے تھے کہ جب اونٹنیوں کی پیٹھیں اچھی ہو جائیں اور راستہ سے حاجیوں کے نشانِ قدم مٹ جائیں اور صفر کا مہینہ ختم ہو جائے، تو عمرہ کرنے والوں کے لیے عمرہ حلال ہو جاتا ہے۔ جب ذوالحج کی چار تاریخ کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ احرام باندھے ہوئے مکہ میں آئے، تو آپ نے حکم دیا کہ اس احرام کو عمرے کے احرام میں تبدیل کر دو، صحابہ کرام پر یہ بات گراں گزری، انہوں نے پوچھا: یارسول اللہ! ہم کس طرح حلال ہوں، فرمایا: پورے حلال ہو جاؤ، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1240)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَوَقْتُهَا جَمِيعُ السَّنَةِ إِلَّا خَمْسَةَ أَيَّامٍ تُكْرَهُ فِيهَا الْعُمْرَةُ لِغَيْرِ الْقَارِنِ، كَذَا فِي "فَتَاوٰى قَاضِيخَانْ"، وَهِيَ يَوْمُ عَرَفَةَ وَيَوْمُ النَّحْرِ وَأَيَّامُ التَّشْرِيقِ۔

ترجمہ: ''عمرے کا وقت غیر قارن (جس نے حج وعمرہ دونوں کا ایک ساتھ احرام نہ باندھا ہو) کے لئے سارا سال ہے، سوائے پانچ دنوں کے (یعنی 9 تا 13 ذوالحجہ)، مگر جس نے حج قِران کا احرام باندھا ہو وہ ان دنوں میں بھی عمرہ ادا کرسکتا ہے، ''فتاوی قاضی خان'' میں بھی اسی طرح ہے اور یہ یوم عرفہ، یوم النحر اور (دیگر) ایامِ تشریق ہیں''۔

(فتاوی عالمگیری، جلد: 1، ص: 237، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ عبدالرحمٰن الجزیری لکھتے ہیں: لَهَا مِيقَاتٌ زَمَانِيٌّ وَمِيقَاتٌ مَكَانِيٌّ، فَأَمَّا الزَّمَانِيُّ فَهُوَ كُلُّ السَّنَةِ، فَيَصِحُّ إِنْشَاءُ الْإِحْرَامِ لِلْعُمْرَةِ مِنْ غَيْرِ كَرَاهَةٍ فِي أَوْقَاتِ السَّنَةِ، إِلَّا فِي أَحْوَالٍ مُفَصَّلَةٍ فِي الْمَذَاهِبِ، أَمَّا مِيقَاتُهَا الْمَكَانِيُّ فَهُوَ كَمِيقَاتِ الْحَجِّ۔

ترجمہ: ''میقات (وقت مقررہ) ظرف کا صیغہ ہے اور ظرف زمانی بھی ہوتا ہے اور مکانی بھی)، عمرے کے لئے ایک میقات زمانی ہے، جو پورا سال ہے، لہٰذا سال کے تمام اوقات میں عمرہ بغیر کسی کراہت کے جائز ہے، سوائے ان احوال کے جن کی تفصیل مذاہب فقہ میں بیان کی گئی ہے۔ اور ایک میقات مکانی ہے، پس جہاں تک میقاتِ مکانی کا تعلق ہے، تو عمرے کے لئے بھی میقات وہی ہے، جو حج کے لئے ہے''۔

(الفقہ علی مذاہب الاربعہ، جلد: 1، ص: 685)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سارے سال حتیٰ کہ شوال، ذیقعدہ، یا ذی الحجہ کے ابتدائی دنوں میں بھی بغیر کسی کراہت کے عمرہ ادا کیا جاسکتا ہے اور شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اجنبی عورت کا مُحرم بن کر عمرہ کرنا

سوال: 82

میری عمر 38 سال ہے، ایک کاروانِ حج وعمرہ کے توسط سے میں نے عمرہ پر جانے کی تیاریاں کی اور الحمد للہ چند روز میں روانگی ہے۔ حج وعمرہ سے متعلق سعودی

گورنمنٹ کی جانب سے پابندی عائد ہوگئی ہے کہ 40 سال سے کم کوئی شخص محرم عورت کے بغیر تنہا حج وعمرہ کے لئے نہیں جاسکتا۔اس قانون کا علم مجھے بہت بعد میں ہوا،عمرہ پر روانگی کی تمام کاروائی میں نے پہلے انجام دے دی تھی۔اب میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا میرا اس طرح جانا درست ہوگا؟،جبکہ روانگی کی تاریخ بھی کنفرم ہوچکی ہے۔سعودی قانون کا کاروانِ حج وعمرہ والوں نے حل یہ کیا ہے کہ اپنے گروپ میں موجود کسی خاتون کو وہ کاغذات میں اُس کا محرم ثابت کردیتے ہیں،کاغذی کاروائی پوری ہوجاتی ہے اور اس طرح عمرے پر جانے والے مرد وخواتین حج یا عمرے پر چلے جاتے ہیں،لیکن اِس دوران وہ اجنبی ہی رہتے ہیں۔الگ الگ ہی رہائش ہوتی ہے،الگ ہی تمام معاملات انجام دیتے ہیں،صرف کاغذات میں وہ ایک دوسرے کے مَحرم شمار ہوتے ہیں۔کاروان والے ازخود یہ کارروائی کرتے ہیں اور حج وعمرہ پر جانے والے کا اِس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا جیسا کہ میرے معالے میں ہوا۔معلوم یہ کرنا ہے کہ ایک شخص جس کی عمر 38 سال ہے،اب وہ سعودی قانون کو اہمیت دے یا عمرہ کی ادائیگی کے لئے جانے کو؟،نیز کیا اس شخص کا حج یا عمرہ کی ادائیگی درست ہوگی؟،(طاہر حسین،ڈبل اسٹوری مکان نمبر 23 سیکٹر D-11 نیو کراچی)۔

جواب:

عمرے کی ادائیگی کے لئے شریعت کی رو سے عُمر کی شرط نہیں ہے،یہاں تک کہ حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ لَقِيَ رَكْبًا بِالرَّوْحَاءِ فَقَالَ: مَنِ الْقَوْمُ؟،قَالُوا:الْمُسْلِمُونَ،فَقَالُوا:مَنْ أَنْتَ؟،قَالَ: رَسُولُ اللهِ فَرَفَعَتْ إِلَيْهِ امْرَأَةٌ صَبِيًّا فَقَالَتْ: أَلِهٰذَا حَجٌّ ؟قَالَ: نَعَمْ وَلَكِ أَجْرٌ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رَوحاء کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کی چند سواروں کے ایک قافلے سے ملاقات ہوئی،آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کون لوگ ہیں؟،انہوں نے عرض کی: ہم مسلمان ہیں،پھر اُن لوگوں نے پوچھا:

آپ کون ہیں؟،آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا رسول، پھر ایک عورت نے ایک بچہ آپ کے سامنے اٹھا کر پوچھا: ''کیا اس کا بھی حج ہے (یعنی اسے حج کا ثواب ملے گا)''؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں (یعنی اسے بھی حج کا ثواب ملے گا) اور تمہارے لئے بھی (اسے گود میں اٹھا کر حج کرانے کا) اجر ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3143)''۔

البتہ فرض حج کی ادائیگی کے لئے عاقل و بالغ ہونا شرط ہے اور عمرہ اپنی اصل کے اعتبار سے نفلی عبادت ہے۔لہٰذا اگر آپ عمرے پر چلے جائیں تو عمرہ صحیح طور پر ادا ہو جائے گا۔لیکن آپ کے کاروان والوں نے جھوٹ بول کر اور دھوکا دے کر آپ کا ویزا حاصل کیا ہے اور یہ گناہ ہے۔آپ کے بیان کے مطابق ابتدا میں تو آپ اس گناہ میں شامل نہیں تھے، لیکن اب چونکہ آپ کو حقیقت معلوم ہو گئی ہے، اس لئے اگر آپ یہ جاننے کے باوجود عمرے پر جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اپنے ٹریول ایجنٹ کی جھوٹ کے ذریعے حاصل کی ہوئی عمرے کی سہولت کو قائم رکھنے پر راضی ہیں اور گناہ پر راضی ہونا بھی گناہ ہے اور عمرے جیسی پاکیزہ اور بابرکت عبادت کا آغاز گناہ سے کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ آپ جب ائیر پورٹ پر ان کے امیگریشن سے گزریں گے تو گویا آپ یہ ظاہر کر رہے ہوں گے کہ آپ کسی خاتون کے مَحرم ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، اسی طرح کاروان والوں کو بھی جعل سازی اور دروغ بیان سے گریز کرنا چاہئے، ہمارے بہت سے اہلِ وطن کو ٹریول ایجنٹوں کی خلافِ قانون دستاویزات کے سبب دوسرے ممالک میں قید کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ سعودی حکومت کا چالیس سال سے کم عمر والے ایسے مردوں پر، جو کسی خاتون کا مَحرم بن کر عمرے پر نہ جا رہے ہوں، عمرے کی پابندی لگانا شرعی حکم تو نہیں ہے؟، یہ بات بالکل درست ہے، لیکن حکومتوں کو اپنی انتظامی مصلحتوں کے تحت مباح امور میں قانون بنانے کا اختیار رہتا ہے، جیسے مختلف ممالک کے لئے حج کا کوٹہ مقرر کرنا۔اور کسی کے ملک

میں جب ہم ویزا لے کر داخل ہوتے ہیں تو اس کے قوانین کی پابندی ہم پر لازم ہوتی ہے، اور قانون توڑنے کی صورت میں اگر گرفت میں آ گیا تو عزت پامال ہوتی ہے اور مسلمان کو اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اسی طرح ویزا لیتے وقت جھوٹ بولنا گناہ ہے اور یہ کوئی ایسی اضطراری صورت حال نہیں ہے کہ جھوٹ اور غلط بیانی کی رخصت دی جائے۔

حدیث پاک میں ہے:

وَاِنَّ الْكِذْبَ يَهْدِىْ اِلَى الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِىْ اِلَى النَّارِ۔

ترجمہ: ''جھوٹ (اللہ کی) نافرمانی کا راستہ دکھاتا ہے اور فُجور (اللہ کی نافرمانی انسان کو) جہنم کا راستہ دکھاتی ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6094)''۔

عمرے کا طریقہ

سوال: 83

عمرے کا طریقہ کیا ہے اور رمضان میں عمرہ کرنے کی فضیلت بیان فرمائیں؟۔

جواب:

عمرہ احرام باندھنے کے بعد چند افعال کا نام ہے، جس کا مفصل طریقہ درج ذیل ہے:

میقات سے پہلے احرام باندھے، جب احرام باندھنے کا ارادہ ہو تو پہلے غسل کرے (اگر کوئی مجبوری ہو تو وضو بھی کافی ہے)، حجامت کرائے، ناخن تراشے، بدن کی اچھی طرح صفائی کر کے احرام باندھ لے، احرام کی دو چادریں (نئی یا دھلی ہوئی سفید بہتر ہیں)، ایک اوڑھیں اور ایک تہبند کے طور پر باندھیں، سنت طریقہ یہ ہے کہ طواف کے وقت چادر داہنی بغل کے نیچے کر کے دونوں پلو بائیں مونڈھے پر ڈالیں اور طواف کے علاوہ باقی وقتوں میں عادت کے مطابق چادر اوڑھی جائے یعنی دونوں مونڈھے اور پیٹ، سینہ سب چھپا رہے۔ وقتِ مکروہ نہ ہو تو دو رکعت نماز بہ نیتِ احرام پڑھیں، پھر نیت کریں: اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اُرِيْدُ الْعُمْرَةَ فَيَسِّرْهَا لِىْ وَتَقَبَّلْهَا مِنِّىْ، نَوَيْتُ الْعُمْرَةَ وَاَحْرَمْتُ بِهَا مُخْلِصًا لِلّٰهِ تَعَالٰى

ترجمہ: ''اے اللہ! میں عمرہ کرنے کا ارادہ کرتا ہوں میرے لئے اسے آسان فرما اور مجھ سے اسے قبول فرما اور میں خالص اللہ کے لئے احرام باندھتا ہوں۔ پھر تلبیہ (لَبَّيْكَ ، اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ، لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ ، لَاشَرِيْكَ لَكَ) پڑھے اور کثرت سے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے پڑھتا رہے، یاد رہے کہ خانۂ کعبہ پر جب پہلی نظر پڑے تو دعا مانگے، اس وقت جو بھی دعا کرے گا، ضرور قبول ہوگی۔ حجر اسود کے سامنے پہنچے تو یہ دعا پڑھے: لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

طواف شروع کرنے سے قبل مرد اضطباع کرلے یعنی چادر کو دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر دائیں مونڈھا کھلا رکھیں اور دونوں کنارے بائیں مونڈھے پر ڈال دے۔ حرم شریف پہنچنے کے بعد کعبہ کی طرف منہ کر کے حجرِ اسود کے داہنی طرف رکن یمانی کی جانب سنگِ اسود کے قریب اس طرح کھڑا ہو کہ حجرِ اسود داہنے ہاتھ کی طرف رہے، پھر طواف کی نیت کریں: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُرِيْدُ طَوَافَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ فَيَسِّرْهُ لِيْ وَتَقَبَّلْهُ مِنِّيْ۔

اس نیت کے بعد کعبہ کی طرف منہ کئے ہوئے اپنی دہنی جانب چلئے، کانوں تک ہاتھ اٹھا کر (کہ ہتھیلیاں حجرِ اسود کی طرف رہیں) پڑھو: بِسْمِ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ۔

ممکن ہو تو دونوں ہتھیلیاں اور ان کے بیچ میں منہ رکھ کر حجرِ اسود کو بوسہ دو یا ہاتھ سے چھو کر یا اشارے سے یا لکڑی سے چھو کر بوسہ دو، اسے ''اِستلام'' کہتے ہیں۔ طواف کے پہلے تین پھیروں میں مرد رَمَل کرتا ہوا چلے یعنی چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے ہوئے شانے ہلاتے ہوئے چلے لیکن اس عمل میں کسی کو ایذا نہ دے، باقی چار پھیروں میں آہستہ بغیر شانے ہلائے معمول کی رفتار سے چلے۔ جب سات پھیرے مکمل ہو جائیں تو آخر میں حجرِ اسود کو بوسہ دے ہر ایک پھیرے کی طرح۔ ساتوں پھیروں میں جو مسنون دعائیں ہیں انہیں کسی معتبر

کتاب سے یاد کرلے۔ مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھے، حدیث مبارک میں ہے کہ: جو مقامِ ابراہیم پر دو رکعت پڑھے اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ پھر ملتزَم پر آکر دعا کریں، پھر زمزم پی کر صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے، سعی عمرے کے واجبات میں سے ہے۔ کوہِ صفا سے سعی کا آغاز کیا جائے گا، اگر مروہ سے شروع کی تو یہ شمار نہیں ہوگی۔ سعی کے ساتوں پھیرے پے در پے کرے ''میلین اخضرین'' کے دوران ہلکی رفتار سے دوڑیں (نوٹ: آج کل ان کی نشاندہی کے لئے مَسعیٰ میں ہری روشنی والی دو لائٹیں لگی ہوئی ہیں)، سعی کے بعد حلق یا قصر کرے، اگر بال اتنے چھوٹے ہوں کہ ایک پور کے برابر نہ کتروا سکیں تو حلق ہی کرنا ہوگا۔ حلق کے معنی سر منڈانا ہے اور قصر سے مراد کم از کم انگلی کی ایک پور کے برابر بال کتروانا ہے۔ حلق یا قصر کے بعد احرام کھول دے، عام لباس پہنے، اس طرح عمرہ مکمل ہوگیا۔ متبرک مقامات کی زیارت مستحب ہے۔

عورتیں احرام میں سلے ہوئے کپڑے ہی پہنے رہیں، صرف چہرہ کھلا رہے، تلبیہ بلند آواز سے نہ پڑھیں بلکہ آہستہ آہستہ پڑھیں رمل نہ کریں۔ سعی کے وقت ''میلین اخضرین'' کے درمیان عام رفتار سے چلیں۔ سعی کے بعد اپنے بالوں کے آخری سرے سے صرف ایک پور انگلی کے برابر بال کتریں، ان کے لئے حلق جائز نہیں۔

رمضان میں عمرے کے بعد شوال تک قیام اور حج کی فرضیت

سوال: 84

ہمارے کافی لوگ رمضان میں عمرے کے لئے جاتے ہیں۔ ان میں سے جو رمضان میں واپس نہیں آپاتے اور ان پر شوال کا آغاز مکہ مکرمہ ہی میں ہو جاتا ہے، وہ حسبِ توفیق عمرہ ادا کر کے شوال میں واپس آتے ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جو شخص ایامِ حج (یعنی شوال، ذیقعدہ اور ذوالحجہ) میں کسی بھی وجہ سے مکہ مکرمہ (یعنی حدودِ حرم) میں موجود ہو، اس پر حج فرض ہو جاتا ہے، حالانکہ ان واپس آنے والوں میں سے بعض کے پاس وہاں مزید قیام کے مصارف نہیں ہوتے، اور اگر کسی کے پاس مالی استطاعت ہو تب بھی سعودی

حکومت کے نزدیک یہ قیام غیر قانونی اور جرم ہے۔ حکومت ایسے لوگوں کو گرفتار بھی کرتی ہے۔ کیا شریعت کی روشنی میں ان لوگوں پر حج فرض ہو جائے گا اور نہ کرنے پر وہ گناہگار ہوں گے، (منور احمد صدیقی، ملیر کراچی)۔

جواب:

رمضان المبارک میں عمرے کی ادائیگی بے شمار فضیلتوں اور برکات کی حامل ہے۔ حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار کی ایک عورت سے کہا: مَا مَنَعَكِ أَنْ تَحُجِّيْ مَعَنَا ؟، قَالَتْ: لَمْ يَكُنْ لَّنَا اِلَّا نَاضِحَانِ فَحَجَّ أَبُوْ وَلَدِهَا وَابْنُهَا عَلٰى نَاضِحٍ وَّتَرَكَ لَنَا نَاضِحًا نَنْضِحُ عَلَيْهِ، قَالَ: فَاِذَا جَاءَ رَمَضَانُ فَاعْتَمِرِيْ، فَاِنَّ عُمْرَةً فِيْهِ تَعْدِلُ حَجَّةً ۔

ترجمہ: ''تم ہمارے ساتھ حج کرنے کیوں نہیں جاتیں؟''، اس نے جواب دیا: ہمارے پاس پانی لانے کے دو ہی اونٹ تھے، ایک پر میرا شوہر اور بیٹا حج کرنے گئے ہیں اور دوسرا اونٹ ہمارا پانی لانے کے لئے ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ''اچھا جب رمضان آئے تو عمرہ کر لینا، کیوں کہ رمضان میں عمرہ کرنے کا ثواب حج کے برابر ہے''۔
(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3036)

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں: فَعُمْرَةٌ فِيْ رَمَضَانَ تَقْضِيْ حَجَّةً، أَوْ حَجَّةً مَعِيَ۔
ترجمہ: ''رمضان میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے''۔ یا یہ ارشاد فرمایا: ''میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3037)''۔

شوال میں عمرہ کرنے والے پر استطاعت کے بغیر حج فرض ہونے کی تحقیق کے ضمن میں علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''ہمارے زمانے میں یہ مشہور ہے کہ جس شخص نے پہلے حج نہ کیا ہو، وہ اگر شوال میں عمرہ کرے تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے، خواہ اس کے پاس ایام حج تک وہاں ٹھہرنے اور کھانے پینے کی استطاعت نہ ہو اور خواہ اس کے پاس وہاں ٹھہرنے کے لئے سعودی عرب کا ویزا نہ ہو۔ اگر وہ حج کیے بغیر واپس آ گیا تو حج کا فرض اس کے

ذمے ہوگا۔اس پر لازم ہے کہ وہ کسی سے قرض لے کر یا کسی بھی طرح حج کرے۔اگر اس نے حج نہیں کیا اور مر گیا تو گناہ گار ہوگا۔یہ فتویٰ قرآن، حدیث اور فقہ کے صریحاً خلاف ہے۔قرآن مجید میں آیا ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ O

ترجمہ:''لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ اس کے گھر کا حج کریں جو اس کے راستے کی استطاعت رکھتے ہوں اور جو (استطاعت کے باوجود حج نہ کرے اور) کفرانِ نعمت کرے تو اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے،(آل عمران:97)''۔

اس آیت سے واضح ہو گیا کہ استطاعت کے بغیر حج فرض نہیں ہوتا۔

استطاعت کی تفسیر میں مولانا امجد علی لکھتے ہیں:''سفر خرچ اور سواری پر قادر ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ یہ چیزیں اس کی حاجت سے فاضل ہوں،یعنی مکان،لباس،خادم اور سواری کا جانور اور پیشہ کے اوزار اور خانہ داری کے سامان۔اور قرض سے اتنا زائد ہو کہ سواری پر مکہ معظمہ جائے اور وہاں سے سواری پر واپس آئے۔اور جانے سے واپسی تک کے ایام کا نفقہ اور مکان کی مرمت کے لئے کافی مال چھوڑ جائے اور جانے آنے میں اپنے نفقے اور گھر اہل وعیال کے نفقے میں قدر متوسط کا اعتبار ہے،نہ کمی نہ اسراف۔عیال سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا نفقہ اس پر واجب ہے''۔

(بہار شریعت(بحوالہ:درمختار،عالمگیری)،جلد:6،ص:11,12،شیخ علی اینڈ سنز،کراچی)

اس عبارت سے واضح ہو گیا کہ شوال میں عمرہ کرنے والے جس شخص کے پاس حج کرنے تک مکہ معظمہ میں ٹھہرنے اور طعام کی استطاعت نہیں،اس پر حج فرض نہیں ہے۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ مَلَكَ زَادًا وَّرَاحِلَةً تُبَلِّغُهٗ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ اَنْ يَّمُوْتَ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا۔

ترجمہ: ''جس شخص کو حج کرنے سے کوئی ظاہری حاجت (طعام، قیام اور سفر خرچ کی کمی) مانع نہ ہوئی، نہ ظالم بادشاہ نہ کوئی ایسی بیماری جو حج سے مانع ہو، وہ شخص اس حال میں مرجائے کہ اس نے حج نہ کیا ہو، تو اس کے لئے برابر ہے خواہ وہ یہودی ہو کرے مرے یا نصرانی ہو کر، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 812)''۔

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ ظالم بادشاہ کے منع کرنے سے بھی حج فرض نہیں ہوتا اور جو شخص شوال میں واپسی کا ویزا لے کر عمرہ کرنے گیا ہے، اسے سعودی حکام مکے میں قیام کرنے سے منع کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں اور جو پکڑا جائے اسے پہلے گرفتار کر کے سزا دیتے ہیں پھر واپس اس کے ملک بھیج دیتے ہیں۔ اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ جو لوگ شوال میں عمرہ کرنے والے پر بغیر استطاعت حج کرنے کو فرض کہتے ہیں، ان کا دعویٰ بلا دلیل ہے، (تبیان القرآن)۔

پھر ہر مسلمان پر اپنی عزت نفس کی پاسداری لازم ہے لہٰذا شوال تا ذوالحجہ مکہ مکرمہ میں قیام اور مصارف حج کی استطاعت کے باوجود قانون شکنی کر کے اپنے آپ کو مجرم بنانا، بعض لوگوں کا قیدی بن جانا یا ملک بدر کیا جانا اور اپنی عزت نفس کو پامال کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

قربانی اور ذبح کے مسائل

دین کے فرائض وواجبات کو ساقط کرنے کا کسی کو اختیار نہیں

سوال: 85

ایک ادارے کا سربراہ یہ کہتا ہے کہ ہمارے ملک میں لوگ بدترین سیلاب کی زد میں ہیں، لوگوں کے گھر، مال، مویشی اور جانیں تباہ ہورہی ہیں، لہٰذا 10 ذوالحجہ کو سنتِ ابراہیمی کے طور پر جو قربانی کی جاتی ہے، اس سال نہ کی جائے اور وہ رقم سیلاب زدگان کو بطور امداد دی جائے تاکہ اُن کی مشکلات میں کمی ہوسکے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ علمائے کرام نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ لوگ حج وعمرہ کے بجائے یہ رقم سیلاب زدگان پر خرچ کریں تو انہیں کئی حج اور عمرہ کا ثواب ملے گا۔ مزید یہ کہ حج صاحبِ استطاعت پر فرض ہے اور قربانی سنت۔ اس سلسلے میں رہنمائی فرمائیں۔

قاری محمد جمیل قادری، پاکستان رینجرز ہیڈکوارٹر، غازی روڈ، لاہور

جواب:

اِس مسئلے کے حل سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ دین میں قربانی کی حیثیت کیا ہے؟، کیا اِس کا مقام یہی ہے کہ اِسے ہر شخص کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے کہ جو چاہے، جب چاہے، اپنی مرضی سے اِس کے حکم کو باطل کردے یا نافذ کردے۔ قربانی ہر صاحب نصاب بالغ مرد وعورت پر واجب ہے۔ قربانی کو واجب قرار دینے کے سلسلے میں ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

ترجمہ: ''اپنے رب کی نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے، (کوثر:2)''۔

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَاعَمِلَ آدَمِیٌّ مِنْ عَمَلٍ یَوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اِهْرَاقِ الدَّمِ ،اِنَّهَا لَتَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا ،وَاِنَّ الدَّمَ لَیَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ یَّقَعَ مِنَ الْاَرْضِ فَطِیْبُوْا بِهَا نَفْسًا۔

ترجمہ: ''اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قربانی کے دِن بنی آدم کا کوئی بھی عملِ (خیر) اللہ تعالیٰ کے نزدیک (قربانی کے جانور

کا) خون بہانے سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔ اور قربانی کا یہ جانور قیامت کے دِن اپنے سینگوں، بالوں اور کھر وں کے ساتھ (اللہ تعالیٰ کے حضور) آئے گا۔ اور (قربانی کے جانور کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کے درجے کو پالیتا ہے، پس (اے مومنو!) تم خوش دِلی سے قربانی کیا کرو، (سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1493)''۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ كَانَ لَهٗ سَعَةٌ ،وَّلَمْ يُضَحِّ ،فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا ۔

ترجمہ:'' جس شخص کے پاس گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے ، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:3123)''۔

قربانی نہ کرنے پر وعید کا لاحق ہونا، اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب قربانی واجب ہو۔

عَنْ جُنْدُبِ بْنِ سُفْيَانَ قَالَ: شَهِدْتُ الْاَضْحٰى مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهٗ بِالنَّاسِ ،نَظَرَ اِلٰى غَنَمٍ قَدْ ذُبِحَتْ ،فَقَالَ: مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ ، فَلْيَذْبَحْ شَاةً مَكَانَهَا ،وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ ذَبَحَ ،فَلْيَذْبَحْ عَلَى اسْمِ اللّٰهِ ۔

ترجمہ:'' حضرت جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں عیدالاضحیٰ کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا، جب آپ ﷺ لوگوں کو نماز پڑھا کر فارغ ہوئے، تو آپ ﷺ نے ذبح کی ہوئی بکری کو دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے نماز سے پہلے قربانی کی ہے، وہ اِس کی جگہ دوسری بکری کو ذبح کرے اور جس نے ابھی تک ذبح نہیں کیا، وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:5060)''۔

آیت اور احادیث مبارکہ میں قربانی کا امر (حکم) کیا ہے اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔

جس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے قربانی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنّت فرمایا ہے (سنّة ابيكم ابراهيم ،سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:3127)، اُس سے مراد یہ ہے کہ قربانی دین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے اور یہ وجوب کی نفی نہیں کرتا۔

امام برہان الدین علی المرغینانی لکھتے ہیں: اَلْاُضْحِيَةُ وَاجِبَةٌ عَلٰى كُلِّ حُرٍّ مُسْلِمٍ مُقِيْمٍ

مُوسِرٍ فِیْ یَوْمِ الْاَضْحٰی عَنْ نَفْسِہٖ وَعَنْ وُلْدِہِ الصِّغَارِ، وَ اَمَّا الْوُجُوْبُ فَقَوْلُ اَبِیْ حَنِیْفَةَ وَمُحَمَّدٍ وَّزُفَرَ وَحَسَنٍ وَّاِحْدَی الرِّوَایَتَیْنِ عَنْ اَبِیْ یُوْسُفَ۔

ترجمہ: ''ہر آزاد، مسلمان، مقیم، مالدار پر ایامِ قربانی (10 تا 12 ذوالحجہ) میں اپنی طرف سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے قربانی کرنا واجب ہے، امام ابوحنیفہ، امام محمد، امام زفر، امام حسن اور ایک روایت میں امام ابو یوسف رحمہم اللہ اجمعین کے نزدیک قربانی واجب ہے، (ہدایہ، جلد 7، ص: 154)''۔

''ظاہر الروایۃ'' کے مطابق نابالغ پر قربانی واجب نہیں ہے، چنانچہ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: فَتَجِبُ التَّضْحِیَةُ عَلٰی حُرٍّ مُسْلِمٍ مُقِیْمٍ مُوْسِرٍ عَنْ نَفْسِہٖ لَا عَنْ طِفْلِہٖ عَلَی الظَّاھِرِ بِخِلَافِ الْفِطْرَةِ،

ترجمہ: ''ہر آزاد مقیم مالدار مسلمان پر اپنی طرف سے قربانی واجب ہے، (حنفی مذہب کی) ''ظاہر الروایۃ'' کے مطابق نابالغ بچے کی جانب سے قربانی واجب نہیں ہے، البتہ نابالغ کا فطرہ واجب ہے، ۔۔۔۔۔۔۔۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''ظاہر الروایۃ'' کے مطابق نابالغ کے لئے قربانی واجب نہیں بلکہ مستحب ہے البتہ صدقۂ فطر واجب ہے، امام حسن کی روایت کے مطابق اپنی نابالغ اولاد اور یتیم پوتے پوتی کی قربانی واجب ہے، مگر فتویٰ ''ظاہر الروایۃ'' پر ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی بالغ اولاد اور بیوی کی جانب سے قربانی کرے تو ان کی اجازت لے کر کرے۔ ایک روایت میں اگر بلا اجازت بھی کر دی تو استحساناً جائز ہے، (ردالمحتار، جلد: 9، ص: 382)''۔

فقہائے مالکیہ میں متقدمین قربانی کے وجوب کے قائل ہیں اور متاخرین کے نزدیک سنتِ مؤکدہ ہے۔ حنابلہ اور شافعیہ کے نزدیک قربانی سنتِ مؤکدہ ہے۔ مذکور شخص کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ علماء نے فتویٰ دیا ہے کہ ''لوگ حج و عمرہ کے بجائے یہ رقم سیلاب زدگان پر خرچ کریں تو انہیں کئی حج اور عمروں کا ثواب ملے گا''۔ دراصل اُس شخص نے علماء کے موقف کو صحیح نہیں سمجھا۔ علماء کا بیان یہ تھا کہ فرض حج تو کسی طور پر بھی ساقط نہیں ہوتا، البتہ نفلی حج کو مؤخر

کر کے یہ رقم سیلاب زدگان پر خرچ کی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ اہلِ پاکستان پر ایک بہت بڑی آزمائش تھی اور عمرہ اپنی اصل کے اعتبار سے ہی ایک نفلی عبادت ہے۔لیکن واجب قربانی کو نہ تو ترک کیا جا سکتا ہے، نہ ساقط کیا جا سکتا ہے۔البتہ مالی حیثیت والے لوگ اگر اپنے روزمرّہ کے مصارف یا تعیُّشات میں کمی کر کے پس انداز کی ہوئی رقم سیلاب زدگان کی مدد پر صرف کریں تو یہ اُن کی دینی اور اخلاقی ذمہ داری بھی ہے اور اعلیٰ انسانی قدر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ○ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ○ فَكُّ رَقَبَةٍ ○ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ○ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ○ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ○

ترجمہ: ''پس وہ دشوار گھاٹی سے کیوں نہیں گزرا، اور آپ کیا سمجھے وہ دشوار گھاٹی کیا ہے؟، (قرض یا غلامی سے) گردن چھڑانا یا بھوک کے دِن کھانا کھلانا، ایسے یتیم کو جو رشتے دار بھی ہو یا (افلاس کے مارے ہوئے) خاک نشین مسکین کو، (البلد:16-11)''۔

(2) مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ○ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ○

ترجمہ: ''(قیامت کے روز جہنمیوں سے پوچھا جائے گا:) کیا چیز تمہیں جہنم میں لے جانے کا سبب بنی، وہ کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، (المدثر:44-42)''۔

(3) وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ

ترجمہ: ''اور جو چیز لوگوں کو نفع دیتی ہے، اُسے زمین پر قرار ملتا ہے، (الرعد:17)''۔

ارشادِ رسول ﷺ ہے: خَيْرُ النَّاسِ: أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ۔

ترجمہ: ''بہترین انسان وہ ہے، جس کی ذات انسانیت کے لئے زیادہ نفع رساں ہو''۔

(الجامع الکبیر، رقم الحدیث:11760)

قربانی بھی ضرورت مند انسانوں کی خدمت کا ایک ذریعہ ہے۔مویشی پالنے والے لوگ

سال بھر اسی آس پر جانور پالتے ہیں کہ ایامِ قربانی میں اُنہیں فروخت کر کے اپنی ضروریات پوری کریں گے، پھر قربانی کے گوشت سے بھی غریبوں اور ناداروں کی مدد کی جاتی ہے اور کھال بھی ناداروں کی مدد کا ایک ذریعہ ہے۔ نیز قربانی اسلام کا ایک شِعار ہے، حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام اور امام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سنّتِ جلیلہ ہے اور اس کی بے شمار شرعی حکمتیں اور برکات ہیں۔

قربانی کا وقت گزرنے کے بعد قربانی کا جانور زندہ صدقہ کر دیا جائے

سوال: 86

زید نے دو گائے قربانی کی نیت سے خریدیں، پہلے دن ایک گائے، حضور ﷺ، حضرت امام حسن وحضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما، حضور غوثِ اعظم، حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ، اپنے بیٹے اور اپنے نام سے ذبح کی اور دوسری گائے تیسرے دن ذبح کرنا تھی، جس میں اُس کی زوجہ، مرحوم والدین اور چار حصے اپنی اولاد کی جانب سے رکھے تھے، لیکن تیسرے دن اچانک بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا، جس کی وجہ سے دوسری گائے ذبح نہیں کی جاسکی۔ اب اُس گائے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ گیارہویں کے لنگر میں استعمال کی جائے یا آئندہ سال قربان کی جائے؟۔

محمد راشد خان، سیکٹر F-11 نیو کراچی

جواب:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَلَوْ تُرِكَتِ التَّضْحِيَةُ وَمَضَتْ اَيَّامُهَا تَصَدَّقَ بِهَا حَيَّةً نَاذِرٌ لِمُعَيَّنَةٍ وَفَقِيْرٌ شِرَاهَا لَهَا وَبِقِيْمَتِهَا غَنِيٌّ شِرَاهَا اَوْلَا۔

ترجمہ: ''اگر قربانی چھوڑ دی گئی اور ایامِ قربانی گزر گئے تو معینہ قربانی کی نذر ماننے والا اور فقیر جس نے جانور کی قربانی نیت سے خریدا ہو، وہ اُسے زندہ صدقہ کرے اور مال دار نے خواہ جانور خریدا ہو یا نہ خریدا ہو، اُس کی قیمت صدقہ کرے۔۔۔۔۔۔اس کی شرح میں طویل بحث کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''میں کہتا ہوں ''بدائع الصنائع'' میں ہے کہ قربانی کے لئے خریدی ہوئی بکری کی جب قربانی نہ کی یہاں تک کہ وقت گزر گیا، تو فقیر کی طرح مال دار بعینہٖ زندہ اُس جانور کو صدقہ کرے، اِس میں ہمارے علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے، کیوں کہ امام محمد نے کہا: یہ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور ہمارا قول ہے، اس مسئلے کی تفصیل وہاں پر موجود ہے اور یہ اُسی کے مطابق ہے جو ہم نے ابھی ''غایۃ البیان'' کے حوالے سے بیان کیا، اور ہر صورت میں ظاہر یہ ہے کہ اُس جانور کو جب ذبح کرے تو اُس کے لئے گوشت کا خود کھانا جائز نہیں ہے، جیسا کہ اُس کی قیمت میں سے کوئی چیز روکنا جائز نہیں ہے، توجہ طلب بات ہے۔ علامہ حصکفی نے جو یہ لکھا: ''(فَالْمُرَادُ بِالْقِيمَةِقِيمَةُ شَاةٍ تُجْزِئُ فِيهَا (یعنی قیمت سے مراد ایسی بکری کی قیمت جو قربانی کے معیار پر پورا اترے)''، یہ صاحبِ ''تنویر الابصار'' کے اِس مجمل قول کی تفصیل ہے، جو انہوں نے کہا: ''تَصَدَّقَ بِـقِيمَتِهَا''، ظاہر ہے کہ یہ اُس صورت کا بیان ہے، جب جانور پہلے سے خریدا ہوا تھا، کیونکہ اُس کی قیمت معلوم ہے، لیکن اگر پہلے سے خریدا ہوا نہیں تھا، تو ''اُس کی قیمت صدقہ کرے'' کے کیا معنی؟، کیونکہ وہ تو معین نہیں ہے، پس واضح ہوا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب پہلے سے خریدا ہوا نہ ہو، تو ایسے جانور کی قیمت صدقہ کرے جو قربانی کے معیار پر پورا اترتا ہو''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 9، ص: 89-388)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: وَلَوْ تُرِكَتِ التَّضْحِيَةُ حَتّٰى مَضٰى وَقْتُهَا، تَصَدَّقَ بِهَا صَاحِبُهَا حَيَّةً إِنْ كَانَتْ مَنْذُوْرَةً أَوْ جَبَهَا عَلٰى نَفْسِهٖ، أَوْمُشْتَرَاةً مِنْ فَقِيْرٍ أَوْ غَنِيٍّ لِلْأُضْحِيَةِ، لِأَنَّهَا فِيْ حُكْمِ الْمَنْذُوْرَةِ عُرْفًا۔ وَأَمَّا الْغَنِيُّ إِذَا لَمْ يَشْتَرِالْأُضْحِيَةَ، فَيَتَصَدَّقُ بِقِيْمَةِ شَاةٍ عَلَى الصَّحِيْحِ، كَمَا فِي "الْبَدَائِعِ" وَهُوَ قَوْلُ الْإِمَامِ وَصَاحِبَيْهِ، لِأَنَّ الْأُضْحِيَةَ وَاجِبَةٌ عَلَى الْغَنِيِّ، وَتَجِبُ عَلَى الْفَقِيْرِبِالشِّرَاءِ بِنِيَّةِ الْأُضْحِيَةِ۔

ترجمہ: ''اور اگر قربانی چھوڑ دی یہاں تک کہ قربانی کے دن گزر گئے، تو اس کا مالک اُسے زندہ صدقہ کرے، کیوں کہ اگر اُس کی نذر مانی تھی، تو اُس شخص نے خود اپنے اوپر واجب کر دیا یا

فقیر یا مال دار نے قربانی کی نیت سے جانور خریدا تھا، کیونکہ یہ بھی عرفاً نذر ہی کے معنی میں ہے۔ لیکن اگر مال دار نے قربانی کے لئے جانور خریدا نہیں تھا (اور ایامِ قربانی میں قربانی نہیں کی)، تو صحیح قول کے مطابق وہ بکری کی قیمت صدقہ کرے، جیسا کے "بدائع الصنائع" میں ہے اور یہی امام اعظم اور صاحبین کا قول ہے، کیونکہ مال دار پر فی نفسہٖ قربانی واجب ہے اور فقیر پر قربانی کی نیت سے خریدنے سے واجب ہو جاتی ہے"۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ، جلد: 04، ص: 2715)

آپ نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے، بظاہر زید مال دار ہے اور اُس نے ایصالِ ثواب کیلئے مرحوم والدین کے لئے نفلی قربانی کی نیت کی تھی اور اپنی زوجہ اور اولاد کی قربانی ادا کرنا مقصود تھی، صاحبِ "بدائع الصنائع" کے مطابق ائمہ احناف کا متفق علیہ قول یہی ہے کہ قربانی کے لئے خریدے ہوئے جانور کی قربانی اگر ایامِ قربانی میں کسی وجہ سے نہ کی ہو، تو فقیر کی طرح مالدار بھی بعینہٖ اُس جانور کو زندہ صدقہ کرے اور ذبح کر کے صدقہ کرنے کی صورت میں اُس کا گوشت خود نہ کھائے، کیوں کہ اس جانور کا صدقہ کرنا واجب ہے اور جانور کو ذبح کرنے سے قیمت میں جتنی کمی آئی، اتنی رقم صدقہ کرنا ہوگی۔ اگر اسے گیارہویں شریف کے لنگر میں استعمال کیا جائے تو وہ لنگر صرف مستحق زکوٰۃ فقراء کو کھلایا جائے۔ آئندہ سال تک مؤخر نہیں کرنا چاہئے۔

قربانی کے جانور میں عقیقے کا حکم

سوال: 87

قربانی کے جانور میں عقیقہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ محمد آصف اقبال اشرفی، کراچی

جواب:

قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ شامل کیا جا سکتا ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: هٰـكَـذَا لَـوْ أَرَادَ بَـعْـضُـهُـمُ الْعَقِيقَةَ عَنْ وَلَدٍ قَدْوُلِدَ لَهٗ مِنْ قَبْلُ لِأَنَّ ذَالِكَ جِهَةُ التَّقَرُّبِ بِالشُّكْرِ عَلٰى نِعْمَةِ الْوَلَدِ،

ترجمہ:''اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے بچے کے عقیقے کا ارادہ کرے، قربانی سے قبل جس بچے کی ولادت ہوئی ہو (تو کرسکتا ہے) کیونکہ یہ نعمت اولاد کا شکر ادا کرنے کے سبب اللہ تعالیٰ کی عبادت کی حیثیت رکھتا ہے، (ردالمحتار، جلد 9، ص:395، بیروت)''۔

لڑکے اور لڑکی کے عقیقے کا فرق

سوال:88

عقیقے میں لڑکے اور لڑکی کی جانب سے کتنے جانور ذبح کئے جاتے ہیں؟۔

سید ناصر علی قادری، گلشن اقبال، کراچی

جواب:

عقیقہ کرنا سنت ہے۔ سنت یہ ہے کہ لڑکے کے عقیقے میں دو بکرے یا بکری اور لڑکی کے عقیقے میں ایک بکری یا بکرا ذبح کی جائے، اگر بڑے جانور یعنی گائے وغیرہ میں حصہ لیا ہو تو لڑکے کی طرف سے دو حصے اور لڑکی کی طرف سے ایک حصہ شمار ہوگا۔ لڑکے کے عقیقے میں نر جانور اور لڑکی کے عقیقے میں مادہ جانور مناسب ہے لیکن اگر اس کے برعکس یا کسی ایک جنس کے جانور ذبح کئے جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

احادیثِ مبارکہ میں ہے:

عَنْ یُوسُفَ بْنِ مَاهَكَ: اَنَّهُمْ دَخَلُوْا عَلٰی حَفْصَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ فَسَأَلُوْهَا عَنِ الْعَقِیْقَةِ فَأَخْبَرَتْهُمْ أَنَّ عَائِشَةَ أَخْبَرَتْهَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَمَرَهُمْ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ۔

ترجمہ:''حضرت یوسف بن ماہک بیان کرتے ہیں کہ ہم حفصہ بنت عبدالرحمٰن کے پاس گئے اور اُن سے عقیقے کے بارے میں سوال کیا، اُنہوں نے ہمیں بتایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خبر دی کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے ہمیں لڑکے کے عقیقے میں دو بکریاں اور لڑکی کے عقیقے میں ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1513، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:3162)

حضرت اُمّ کرز رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عقیقے کے بارے میں سوال کیا:

فَقَالَ: عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ ،وَعَنِ الْاُنْثٰی وَاحِدَۃٌ وَّلَا یَضُرُّکُمْ ذُکْرَانًا کُنَّ اَمْ اِنَاثًا۔

ترجمہ: "آپ ﷺ نے فرمایا: لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری (ذبح کرو) اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ (جانور) نر ہو یا مادہ"۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 1516، سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 2827)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ،اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَقَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ کَبْشًا کَبْشًا۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے (عقیقے میں) ایک ایک مینڈھا ذبح کیا، (سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 2834)"۔

سُنن نسائی کی ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: عَقَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ، رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا بِکَبْشَیْنِ کَبْشَیْنِ۔

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن اور حضرت حسین کی طرف سے دو دو مینڈھے ذبح کئے، (سُنن نسائی، رقم الحدیث: 4230)"۔

شارح بخاری ومسلم شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی صاحب اس حدیث کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں جن احادیث کا ذکر ہے وہ سب سُنن ابوداؤد اور سُنن نسائی میں بھی مذکور ہیں، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سُنن ابوداؤد میں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے ایک ایک مینڈھے کو ذبح کرنے کا تذکرہ ملتا ہے اور سُنن نسائی میں دو دو مینڈھے ذبح کرنے کا ذکر ہے تو اس کی کیا توجیہہ ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی ولادت کے دن ایک ایک مینڈھا ذبح کیا اور ساتویں دن

ایک ایک مینڈھا اور ذبح کیا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک مینڈھا آپ نے اپنی طرف سے ذبح کیا اور حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کو دوسرا مینڈھا ذبح کرنے کا حکم دیا۔ تو جس نے ایک ایک مینڈھے کے ذبح کی روایت کی اس نے آپ کی طرف ذبح کی حقیقی نسبت کی اور جس نے دو دو مینڈھے ذبح کرنے کی روایت کی اس نے آپ کی طرف مجازاً نسبت کی۔ (تبیان القرآن، جلد 2، ص:133)''۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ : أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ أَنْ نَّعُقَّ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَيْنِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةً

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری کا عقیقہ کرنے کا حکم دیا''۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:3163)

طوطے کی حلت یا حرمت کا شرعی حکم

سوال:89

طوطا حلال ہے یا حرام؟۔ (محمد اعیان، سیکٹر D-11، نیو کراچی)

جواب:

اس سوال کے جواب سے پہلے حُرمت (Prohibition) کی فقہی تعریف، اُس کے ثبوت کا شرعی معیار اور اُس کے حکم کا جاننا ضروری ہے۔ فقہی اعتبار سے حرام کی دو قسمیں ہیں: (1) حرام قطعی (2) حرامِ ظنّی یا مکروہِ تحریمی (1) حرام قطعی (Definite Prohibition)، حرام قطعی اُس حرام کو کہتے ہیں: جس کی حُرمت کا حکم ایسی دلیل سے ثابت ہو، جو قطعیُ الثّبوت اور قطعیُ الدّلالت ہو۔ قطعیُ الثّبوت سے مراد یہ ہے کہ نصِ قرآنی یا حدیثِ متواتر سے ثابت ہو، اُس کے ثبوت کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہ ہو۔ اور قطعی الدلالت سے مراد یہ ہے کہ جس عبارت یا کلمے سے کوئی حرام ثابت ہے، اُس کی دلالت اپنے معنی پر حتمی، قطعی اور یقینی ہو، اُس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو اور نہ ہی وہ کلمہ ذو معنی ہو یعنی ایک سے زائد معانی کا احتمال رکھتا ہو، جیسے قتلِ ناحق، زنا، مُحرمات سے

نکاح، مُردار، ذبح کے وقت جانور کا بہنے والا خون، خنزیر اور وہ حلال جانور جس کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی اور کے نام پر تقرّب (یعنی بندگی اور حصولِ ثواب) کی نیت سے ذبح کیا گیا ہو اور خمر، ان چیزوں کی حُرمت مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی سے ثابت ہے:

(۱) إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ

ترجمہ: ''اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کیا مُردار اور (رگوں سے بہا ہوا) خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا، (البقرہ: 173)''۔

(۲) إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ

ترجمہ: ''تم پر حرام کیا ہے صرف مُردار اور (رگوں سے بہا ہوا) خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا، (النحل: 115)''۔

(۳) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ ط

ترجمہ: '' حرام کی گئیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری (وہ) مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی بہنیں اور تمہاری عورتوں کی مائیں، (النسا: 23)''۔

(۴) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اس کے سوا کچھ نہیں کہ شراب اور جوا اور بت اور جوئے کے تیر (سب) ناپاک ہیں شیطانی کاموں سے ہیں تو تم ان سے بچو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ، (المائدہ: 90)''۔

(۵) وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ط

ترجمہ: ''اور زنا کے قریب نہ جاؤ بے شک وہ بے حیائی ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے، (بنی اسرائیل: 32)''۔

(٦) وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا o

ترجمہ: ''جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے اور (اللہ تعالیٰ نے) اس کیلئے عذابِ عظیم تیار کر رکھا ہے''، (سورۃ النساء:93)۔

(2) حرامِ ظنّی (Indefinite Prohibition):

یہ اُس حرام کو کہتے ہیں جس کی حُرمت کا حکم ایسی دلیل سے ثابت ہو جو (۱) قطعی الدلالت، مگر ظنّی الثبوت ہے (۲) ظنّی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے، جیسے کُچلیوں سے شکار کرنیوالے درندوں (جیسے شیر، چیتا، بھیڑیا، کتا، بلی وغیرہ) اور پنجوں سے شکار کرنے والے پرندوں (جیسے باز، چیل، گدھ، کوا وغیرہ) کو رسول اللہ ﷺ نے حدیثِ پاک میں حرام قرار دیا۔ حدیث پاک میں ہے:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ كُلِّ ذِىْ نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ وَعَنْ كُلِّ ذِىْ مِخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے تمام کُچلیوں والے درندوں اور چُنگل (ناخنوں) والے پرندوں کو کھانے سے منع فرمایا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:4989)''۔

عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ، عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ: اَلَا اِنِّىْ اُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ، اَلَا يُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَقُوْلُ: عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ، فَمَا وَجَدْتُّمْ فِيْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ، وَمَا وَجَدْتُّمْ فِيْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ! اَلَا لَا يَحِلُّ لَكُمْ لَحْمُ الْحِمَارِ الْاَهْلِىِّ، وَلَا كُلُّ ذِىْ نَابٍ مِّنَ السَّبُعِ۔

ترجمہ: ''حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آگاہ ہو جاؤ! مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اُس کا مثل (حدیث) بھی، خبردار! عنقریب ایک پیٹ بھرا اپنی مسند پر ٹیک لگائے ہوئے کہے گا کہ: اِس قرآن کو لازم سمجھو، سو

جو چیز تم اس میں حلال پاؤ، اُسے حلال جانو اور جو چیز تم اِس میں حرام پاؤ اُسے حرام جانو۔سنو! تمہارے لئے پالتو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ ہی کُچلیوں سے شکار کرنے والا درندہ،(سُنن ابوداوٗد،رقم الحدیث:4594)‘‘۔

عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَلَا هَلْ عَسَى رَجُلٌ يَبْلُغُهُ الْحَدِيْثُ عَنِّيْ وَهُوَ مُتَّكِئٌ عَلٰى أَرِيكَتِهِ فَيَقُوْلُ: بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ،فَمَا وَجَدْنَا فِيْهِ حَلَالاً اِسْتَحْلَلْنَاهُ وَمَا وَجَدْنَافِيْهِ حَرَاماً حَرَّمْنَاهُ،وَاِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ۔

ترجمہ:’’حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سنو! عنقریب ایک شخص جسے میری حدیث پہنچے گی اور وہ یہ کہے گا: تمہارے اور ہمارے درمیان اللہ کی کتاب (کافی) ہے،سو جو ہم اُس میں حلال پائیں گے،اُس کو حلال جانیں گے اور جو اُس میں حرام پائیں گے،اُس کو حرام جانیں گے،بے شک رسول اللہ ﷺ کا حرام فرمایا ہوا بھی ویسے ہی حرام ہے،جیسے اللہ تعالیٰ کا حرام فرمایا ہوا،(سُنن ترمذی،رقم الحدیث:2664)‘‘۔

جانوروں کے حلال یا حرام ہونے کے حوالے سے فقہاء کا بیان کردہ قاعدہ یہ ہے:

علامہ یحیٰی بن شرف النووی شافعی لکھتے ہیں:

وَفِيْ هٰذِهِ الْاَحَادِيْثِ دَلَالَةٌ لِمَذْهَبِ الشَّافِعِيِّ وَأَبِيْ حَنِيْفَةَ وَأَحْمَدَ وَدَاوٗدَ وَالْجُمْهُوْرُ أَنَّهُ يَحْرُمُ أَكْلُ كُلِّ ذِيْ نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ وَكُلِّ ذِيْ مِخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ۔ وَقَالَ مَالِكٌ: يُكْرَهُ وَلَا يَحْرُمُ،قَالَ أَصْحَابُنَا:اَلْمُرَادُ بِذِي النَّابِ مَايَتَقَوّٰى بِهٖ وَيَصْطَادُ وَاحْتَجَّ مَالِكٌ بِقَوْلِهٖ تَعَالٰى ﴿قُلْ لَّا أَجِدُ فِيْ مَا أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّماً الانعام:145﴾وَاحْتَجَّ أَصْحَابُنَا بِهٰذِهِ الْاَحَادِيْثِ قَالُوْا: وَالْاٰيَةُ لَيْسَ فِيْهَا إِلَّاالْإِخْبَارُ بِأَنَّهٗ لَمْ يَجِدْ فِيْ ذَالِكَ الْوَقْتِ مُحَرَّمًا إِلَّا الْمَذْكُوْرَاتِ فِي الْاٰيَةِ ثُمَّ أُوْحِيَ إِلَيْهِ بِتَحْرِيْمِ كُلِّ ذِيْ نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ فَوَجَبَ قَبُوْلُهٗ وَالْعَمَلُ بِهٖ ۔

ترجمہ: ''امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام احمد، داؤد (ظاہری) اور جمہور فقہاءِ اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ تمام کچلیوں والے درندے اور چنگل (ناخنوں) والے پرندے حرام ہیں اور ان احادیث میں جمہور کی دلیل ہے۔ اور امام مالک فرماتے ہیں: حرام نہیں ہیں بلکہ مکروہ ہیں۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں کچلیوں والے درندوں سے مراد وہ جانور ہیں جو پنجوں سے گرفت کرتے ہیں اور شکار کرتے ہیں اور امام مالک نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا (آپ فرمادیجئے! میں نہیں پاتا اُس وحی میں جو میری طرف کی گئی کسی کھانے والے پر کوئی حرام کی ہوئی چیز، الانعام: 145)۔ ہمارے علماء نے ان احادیث سے استدلال کیا ہے اور آیت کے بارے میں فرمایا کہ اس میں تو صرف خبر ہے کہ اُس وقت مذکورہ چیزوں کے علاوہ حرام نہیں پایا گیا پھر اللہ تعالیٰ نے (رسول اللہ ﷺ کی طرف) کچلیوں والے درندوں کے بارے میں حرمت کی وحی فرمائی، اب اس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 6، ص: 11)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَلَا يَحِلُّ ذُوْنَابٍ يَصِيْدُ بِنَابِهِ) فَخَرَجَ نَحْوُ الْبَعِيْرِ (أَوْ مِخْلَبٍ) يَصِيْدُ بِمِخْلَبِهِ أَيْ ظُفُرِهِ، فَخَرَجَ نَحْوَ الْحَمَامَةِ (مِنْ سَبُعٍ) بَيَانٌ لِذِيْ نَابٍ وَالسَّبُعُ: كُلُّ مُخْتَطِفٍ مُنْتَهِبٍ جَارِحٍ قَاتِلٍ عَادَةً (أَوْ طَيْرٍ)

ترجمہ: ''اور جو (درندے) کچلیوں سے شکار کرتے ہیں اور جو (پرندے) اپنے پنجوں سے شکار کرتے ہیں، حلال نہیں ہیں، کچلیوں سے شکار کی قید لگانے سے اونٹ اِس سے نکل گیا اور پنجوں سے شکار کی قید لگانے سے کبوتر نکل گیا (اگرچہ وہ چنگل دار ہے لیکن چنگل سے شکار نہیں کرتا)۔ اور درندہ ہر وہ جانور ہے جو اپنی عادت کے مطابق اُچک لے جانے والا غارت گر، پھاڑنے والا، قاتل ہوتا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص: 368)''۔

فقیہ اعظم علامہ مفتی الحاج نور اللہ نعیمی رحمہ اللہ سے طوطے کی بابت پوچھا گیا کہ اس کا کھانا حلال ہے یا حرام؟ سائل نے طوطے کے حرام ہونے کی بابت یہ دلیل دی کہ طوطا پنجے سے

کھاتا ہے اور جو پرندہ پنجے سے کھائے وہ حرام ہے۔۔۔۔۔(خلاصۂ سوال)۔آپ نے جواب میں لکھا: ''قواعد وضوابطِ شریعتِ غرّ اء (روشن شریعت) کی رُو سے طوطا حلال ہے کہ ایسا پرندہ جس میں بہنے والا خون ہو، اُس کی حرمت اِن دو چیزوں سے ثابت ہوتی ہے: (۱) چنگل (مخلب) سے شکار کرنا (۲) مردار خور ہونا۔ علامہ نوراللہ بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے موقف کی تائید میں جلیل القدر فقہاءِ کرام کی عبارات نقل کی ہیں، اُن میں یہی دو اصول بیان کئے گئے ہیں، یعنی مردار خور جانور کا گوشت حرام سے نشوونما پاتا ہے، لہٰذا وہ عادتاً خبیث ہوتا ہے۔۔۔۔۔آگے چل کر اُنہوں نے فتاویٰ برہنہ جلد 2 ص: 152 کا حوالہ بھی دیا ہے کہ حلال جانوروں کے بیان میں لکھا ہے: ''و ہمچنیں بر طوق دار کما فی خزانۃ المفتیین''۔۔۔۔۔۔آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''بلکہ صریح طوطے کی تصریح بھی اسی صفحہ میں ہے: ''و ہمچنیں طوطی و علیہ الفتویٰ''، بلکہ ہمارے امام اعظم علیہ الرحمہ کے ساتھ ائمۂ اربعہ سے حضرت امام مالک، حضرت امام احمد بن حنبل علیہما الرحمۃ بھی متفق ہیں، بلکہ ایک قول میں امام شافعی بھی متفق ہیں، میزانِ شعرانی، جلد 2 صفحہ 62 میں ہے: وَالنَّظْمُ مِنَ الْمِيْزَانِ مِنْ ذَالِكَ قَوْلُ الْاَئِمَّةِ الثَّلَاثَةِ فِي الْمَشْهُوْرِ عَنْهُمْ اَنَّهٗ لَاكَرَاهَةَ فِيْمَا نُهِيَ عَنْ قَتْلِهٖ كَالْخُطَّافِ (الی ان قال) وَالْبَبَّغَاءِ كَمَا فِي "الْغِيَاثِ" وَ"الصُّرَاحِ" وَ"منتهی الارب" وَ"مُنْتَخَبِ اللُّغَاتِ" وَالطَّاؤُوْسِ مَعَ قَوْلِ الْاِمَامِ الشَّافِعِيِّ فِيْ اَرْجَحِ الْقَوْلَيْنِ اَنَّهٗ حَرَامٌ اَیْ وَالْقَوْلُ الْاٰخَرُ اَنَّهٗ حَلَالٌ وَكَذَا عُدَّ فِيْ كِتَابِ الْفِقْهِ عَلَى الْمَذَاهِبِ الْاَرْبَعَةِ الْبَبَّغَاءُ فِي الطُّيُوْرِ الْحَلَالِ فِيْ ج ۲ ص ۲ عِنْدَ الْاَئِمَّةِ الثَّلَاثَةِ، (فتاویٰ نوریہ، جلد 3، ص: 332 تا 335)''۔

علامہ نوراللہ بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے طوطے کے حلال ہونے کا فتویٰ فقہی اصول کی بنیاد پر دیا ہے، لیکن ہمیں ائمہ مجتہدین کے فتاویٰ میں اس کے حلال ہونے کا صریح قول نہیں ملا، تاہم جن فقہاء نے طوطے کو حرام کہا ہے، اُن کی مراد حرامِ ظنّی اور حرامِ اجتہادی ہے اور حرامِ ظنّی مکروہِ تحریمی ہوتا ہے، حرامِ قطعی نہیں۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: اَلْحَيَوَانُ

فِی الْأَصْلِ نَوْعَانِ : نَوْعٌ یَعِیْشُ فِی الْبَحْرِ وَنَوْعٌ یَعِیْشُ فِی الْبَرِّ، ـــ وَأَمَّا الَّذِیْ یَعِیْشُ فِی الْبَرِّ فَأَنْوَاعٌ ثَلَاثَۃٌ مَالَیْسَ لَہٗ دَمٌ أَصْلًا وَمَالَیْسَ لَہٗ دَمٌ سَائِلٌ وَمَالَہٗ دَمٌ سَائِلٌ فَمَالَادَمَ لَہٗ مِثْلُ الْجَرَادِ وَالزُّنْبُوْرِ وَالذُّبَابِ وَالْعَنْکَبُوْتِ وَالْخُنْفَسَاءِ وَالْعَقْرَبِ وَالْبَبَّغَاءِ وَنَحْوُھَا لَایَحِلُّ أَکْلُہٗ اِلَّاالْجَرَادَ خَاصَّۃً۔

ترجمہ:''حیوان اصل میں دو قسموں پر ہیں: ایک قسم وہ جو پانی میں رہتے ہیں اور دوسری قسم وہ جو خشکی میں رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: ترجمہ:''اور رہے وہ جانور جو خشکی میں رہتے ہیں، اُن کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جن میں بالکل خون نہیں ہوتا اور دوسرے وہ جن میں بہنے والا خون نہیں ہوتا اور تیسرے وہ جن میں خون بہنے والا ہوتا ہے۔ پس وہ (جانور) جن میں خون نہیں ہوتا مثلاً ٹڈی، بھڑ، مکھی، مکڑی، گبریلا، بچھو، طوطا اور اُس کی مثل دوسرے جانور، (ان میں سے) ٹڈی کے سوا کسی کا کھانا جائز نہیں''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 289، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ نے طوطے کی حُرمت کی وجہ دمِ مسفوح نہ ہونا بیان کی ہے، جو کہ مشاہدے کے خلاف ہے، اس لئے عالمگیری کا یہ فتویٰ اُس طوطے کے بارے میں نہیں، ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ جس طوطے کی حُرمت کا فتویٰ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ دیتے ہیں، وہ کوئی اور ہو۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وحرم الشافعی الخطاف والببغاء والطّاوس والھد ھد۔

ترجمہ:''امام شافعی نے خطاف (سیاہ رنگ کا چھوٹے پاؤں والا پرندہ) طوطا، مور اور ہُد ہُد کو حرام فرمایا ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، ص: 371، بیروت)''۔

علامہ عبدالوہاب شعرانی متوفی 973ھ لکھتے ہیں:

مِنْ ذَالِکَ قَوْلُ الْأَئِمَّۃِ الثَّلَاثَۃِ فِی الْمَشْھُوْرِ عَنْھُمْ: أَنَّہٗ لَا کَرَاھَۃَ فِیْمَا نُھِیَ عَنْ قَتْلِہٖ کَالْخُطَّافِ وَالْھُدْھُدِ وَالْخُفَّاشِ وَالْبُوْمِ وَالْبَبَّغَاءِ وَالطَّاوُوْسِ، مَعَ قَوْلِ الْإِمَامِ الشَّافِعِیِّ: فِیْ أَرْجَحِ الْقَوْلَیْنِ: أَنَّہٗ حَرَامٌ، فَالْأَوَّلُ مُخَفَّفٌ وَالثَّانِیْ مُشَدَّدٌ فَرَجَعَ

الْأَمْرُ إِلٰى مَرْتَبَتَي الْمِيزَانِ، وَوَجْهُ الْأَوَّلِ: أَنَّهُ لَوْ كَانَ أَكْلُهُ يُؤْذِي لَمَا كَانَ نُهِيَ عَنْ قَتْلِهِ، وَوَجْهُ الثَّانِي: أَنَّهُ لَايَلْزَمُ مِنَ النَّهْيِ عَنْ قَتْلِهِ حِلُّ أَكْلِهِ فَقَدْ يَحْرُمُ وَذَالِكَ كَلَحْمِ كَلْبِ الصَّيْدِ وَالْمَاشِيَةِ فَافْهَمْ۔

ترجمہ:''ائمہ ثلاثہ کامشہور قول اورامام شافعی کاقول یہی ہے کہ: جس کے قتل سے منع کیا گیا ہےاس (کے کھانے) میں کوئی کراہت نہیں ہے، مثلاً: خطاف (سیاہ رنگ کا چھوٹے پاؤں والا پرندہ) ہُد ہُد، چمگادڑ، اُلّو، طوطااور مور، امام شافعی کاایک قول (ائمہ ثلاثہ) کے ساتھ ہےاور دوقولوں میں سے راجح قول یہ ہے کہ: یہ(مذکورہ پرندے) حرام ہیں، پہلے (قول یعنی جس میں عدمِ کراہت کو بیان کیا گیا) میں تخفیف ہےاور دوسرے قول میں شدّت ہے، پھر معاملہ میزان کے دومرتبوں کی طرف لوٹے گا (یعنی حلت اور حرمت کی دلیل کو دیکھاجائے گا کہ کس جانب دلیل قوی ہے)۔پہلی (عدمِ کراہت) کی وجہ: اگراُن کا کھانا موذی ہوتا توان کے قتل سے نہ روکا جاتا، اوردوسری وجہ (حرمت کی) یہ ہے: اوراُن کے قتل سے روکنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کا کھانا حلال ہےاور کبھی حرام بھی ہوتا ہے جیسے شکاری کتے کا گوشت اور چرواہے کے ساتھ (مویشیوں کی حفاظت کے لئے) چلنے والا کتا، پس یہ مقام غورکا ہے، (میزان الکبریٰ الشعرانیہ، جلد 2، ص:73، بیروت)''۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

وَحَرَّمَ الشَّافِعِيَّةُ أَكْلَ الْبَبَّغَاءِ وَالطَّاوُوْسِ لِخُبْثِ لَحْمِهِمَا، كَمَا حَرَّمُوْا أَكْلَ الْهُدْهُدِ وَالصُّرَدِ (وَهُوَ طَائِرٌ فَوْقَ الْعُصْفُوْرِ يَصِيْدُ الْعَصَافِيْرَ)

ترجمہ:'' امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے طوطے اور مور کا کھانا اُس کے گوشت کے ناپاک (گندہ) ہونے کے سبب حرام فرمایا ہے، جیسے ہُد ہُد اورصُرَد (موٹے سر، سفید پیٹ اورسبز پیٹھ کاایک پرندہ جوچھوٹے پرندوں کوشکار کرتا ہے) کا کھاناحرام فرمایا ہے''۔

(الفقہ الاسلامی وأدلتہ، جلد 4، ص:2796-2797)

عبدالرحمٰن الجزیری لکھتے ہیں: وَيَحِلُّ مِنَ الطَّيْرِ أَكْلُ الْعَصَافِيْرِ بِأَنْوَاعِهَا وَالسُّمَانِ

وَالْقُنبُرِ وَالزُّرْزُوْرِ وَالْقَطَا وَالْكَرْوَانِ وَالْبُلْبُلِ وَالْبَبَّغَاءِ۔

ترجمہ: ''پرندوں میں سے چڑیوں کی تمام اقسام، بٹیر، چنڈول یا چکاوک، زَرزُور (چڑیا سے بڑا ایک پرندہ)، قطا، کروان، بلبل اور طوطا کا کھانا حلال ہے''۔

(کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد 2، ص: 2، بیروت)

علامہ محمد بن موسیٰ بن عیسیٰ کمال الدین الدمیری رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

يَحْرُمُ أَكْلُهَا عَلَى الْأَصَحِّ فِي الرَّافِعِيِّ وَنَقَلَهُ فِي الْبَحْرِ عَنِ الصُّمَيْدِيِّ وَأَقَرَّهُ عَلَّلَ ذَالِكَ بِخُبْثِ لَحْمِهَا وَقِيلَ حَلَالٌ لِأَنَّهَا تَأْكُلُ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَلَيْسَتْ مِنْ ذَوَاتِ السُّمُوْمِ وَلَامِنْ ذَوَاتِ الْمِخْلَبِ وَلَا أُمِرَ بِقَتْلِهَا وَلَا نُهِيَ عَنْهُ۔

ترجمہ: ''رافعی میں لکھا ہے کہ صحیح قول کے مطابق طوطے کا گوشت حرام ہے، اس قول کو ''الصمیدی'' نے ''البحر'' میں لکھ کر برقرار رکھا ہے۔ طوطے کے حرام ہونے کی علت گوشت کی گندگی ہے۔ بعض اہلِ علم نے طوطے کا گوشت حلال قرار دیا ہے اس لئے کہ اس کی غذا پاکیزہ چیزیں ہیں چنانچہ طوطا زہریلے پرندوں میں سے نہیں ہے اور نہ ہی چنگل مارنے والوں میں سے ہے، نیز نہ طوطے کے مارنے کا حکم دیا گیا اور نہ اس سے منع کیا گیا ہے۔

(حیاۃ الحیوان، ص: 104)

مندرجہ بالا تفصیلی دلائل کی روشنی میں، میں مفتی محمد نور اللہ بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے سے متفق ہوں کہ طوطا اور مور حلال ہیں، کیونکہ جس چیز کی حُرمت قرآن وسنت میں منصوص نہ ہو، تو اُس کا حکم ہمیں قرآن وسنت اور فقہ میں بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں دینا پڑے گا۔ اِس مسئلے میں اگرچہ اکابر فقہاء میں سے کسی کی رائے یا اَخذ کردہ نتیجے سے ہمیں دلیل کی بنیاد پر اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ تاہم جن فقہائے اُمّت نے حرام کہا ہے، اُنہوں نے بھی اپنی معلومات اور علمی وفقہی دیانت کی بنیاد پر فیصلہ کیا ہے۔

نکاح کے مسائل

حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہ کا نکاح

سوال: 90

حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہ کا نکاح کس نے پڑھایا تھا؟۔

افتخار احمد، ایف بی ایریا، کراچی

جواب:

ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے اعلانِ نبوت سے پہلے ہوا اور اس دور کے دستور کے مطابق زوجین کے خاندان کے کوئی بزرگ بطورِ ولی وکالت کرتے اور اپنے خاندان کے فضائل اور تفاخر کی باتیں اپنے خطبے میں بیان کرتے تھے۔

حضرت خدیجہ کی طرف سے ان کے چچا عمرو بن اسد وکیل بنے۔خواجہ ابو طالب نے حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی طرف سے وکالت کا فریضہ انجام دیا۔انہوں نے اس وقت ایک فصیح و بلیغ خطبہ نکاح ارشاد فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَنَا مِنْ ذُرِّیَّةِ اِبْرَاهِیْمَ وَزَرْعِ اِسْمَاعِیْلَ وَضِئْضِیٔ مَعْدٍ وَّعُنْصُرِ مُضَرَ، وَجَعَلَنَا حَضَنَةَ بَیْتِهٖ وَسُوَّاسَ حَرَمِهٖ، وَجَعَلَ لَنَا بَیْتًا مَّحْجُوْجًا وَّحَرَمًا اٰمِنًا وَجَعَلَنَا الْحُكَّامَ عَلَی النَّاسِ ثُمَّ اِنَّ ابْنَ اَخِیْ هٰذَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ (ﷺ) لَا یُوْزَنُ بِرَجُلٍ اِلَّا رَجَحَ بِهٖ وَاِنْ كَانَ فِی الْمَالِ قُلًّا وَّاِنَّ الْمَالَ ظِلٌّ زَائِلٌ وَّاَمْرٌ حَائِلٌ وَّمُحَمَّدٌ (ﷺ) مَنْ قَدْ عَرَفْتُمْ قَرَابَتَهٗ وَقَدْ خَطَبَ خَدِیْجَةَ بِنْتَ خُوَیْلِدٍ، وَقَدْ بَذَلَ لَهَا مِنَ الصَّدَاقِ مَا اٰجِلُهٗ وَعَاجِلُهٗ اثْنَتَا عَشَرَةَ اُوْقِیَّةً ذَهَبًا وَّنَشًّا وَهُوَ وَاللّٰهِ بَعْدَ هٰذَا لَهٗ نَبَأٌ عَظِیْمٌ وَخَطَرٌ جَلِیْلٌ۔

ترجمہ:"سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں،جس نے ہمیں حضرت ابراہیم کی اولاد سے، حضرت اسماعیل کی کھیتی سے،معد کی نسل اور مضر کی اصل سے پیدا فرمایا۔اور ہمیں ایک ایسا (مقدس) گھر دیا جس کا حج کیا جاتا ہے۔اور ایسا حرم بخشا جہاں امن ہی امن ہے اور

ہمیں لوگوں پر حاکم بنایا۔ حمد کے بعد میرا یہ بھتیجا محمد بن عبداللہ (ایسی شان کا مالک ہے کہ) دنیا کے جس بڑے آدمی کے ساتھ بھی اس کا مقابلہ کیا جائے گا، اِس کا درجہ بلند ہوگا۔ اگر چہ یہ مالدار نہیں ہے (تو کوئی بات نہیں) کیونکہ مال ایک ڈھلنے والا سایہ ہے اور یہ لوگوں کے درمیان گردش کرتا رہتا ہے۔ اور محمد ﷺ، جن کی قرابت کو تم خوب جانتے ہو، انہوں نے خدیجہ بنت خویلد کا رشتہ مانگا ہے اور ساڑھے بارہ اوقیہ سونا مہر میں دیا ہے، بخدا مستقبل میں ان کے لئے بڑی نوید ہے اور ان کا مرتبہ بلند ہے"۔

اس کے بعد حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل نے جوابی خطبہ دیا، جو درج ذیل ہے:

ترجمہ: "سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے ہمیں وہ فضیلتیں بخشیں جن کو آپ نے گنا ہے۔ پس ہم سارے عرب کے سردار اور رہبر ہیں۔ ا رتم بھی ان صفات سے متصف ہو۔ قبیلہ کا کوئی فرد ان کا انکار نہیں کرتا اور کوئی شخص تمہاری فضیلت کو رد نہیں کرتا۔ ہم اپنا تعلق تم سے استوار کرنے میں بڑا اشتیاق رکھتے ہیں۔ اے خاندانِ قریش کے سردارو! گواہ رہو: میں نے خدیجہ دختر خویلد کا نکاح محمد بن عبداللہ کے ساتھ کر دیا ہے"۔

پھر خواجہ ابو طالب کی خواہش پر حضرت خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد نے بھی چند کلمات کہے، جو درج ذیل ہیں:

اِشْهَدُوْا يَامَعَاشِرَ قُرَيْشٍ اِنِّىْ قَدْ اَنْكَحْتُ مُحَمَّدَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ (ﷺ) خَدِيْجَةَ بِنْتَ خُوَيْلِدٍ وَّشَهِدَ عَلٰى ذَالِكَ صَنَادِيْدُ قُرَيْشٍ،

ترجمہ: "اے قبائل قریش! گواہ رہنا کہ میں نے محمد بن عبداللہ (ﷺ) کا نکاح خدیجہ بنت خویلد کے ساتھ کر دیا ہے اور اس پر قریش کے بڑے بڑے سردار گواہ ہیں"۔

(ضیاء النبی، جلد: دوم، ص: 137-136، بحوالہ: خاتم النبیین مصنفہ امام محمد ابوزہرہ)

نکاح کے وقت حضور ﷺ کی عمر مبارک 25 سال تھی اور حضرت خدیجہ کی عمر 40 سال تھی، وہ اس سے پہلے دو بار بیوہ ہو چکی تھیں۔

نکاح میں ایک بار ایجاب وقبول کافی ہے

سوال: 91

نکاح کے وقت دولہا سے تین مرتبہ قبول کرانا ضروری ہے یا ایک مرتبہ ہی کے قبول کروانے سے نکاح منعقد ہوجاتا ہے؟۔(محمد رمیز،سیکٹر D-11،نارتھ کراچی)۔

جواب:

عقدِ نکاح ہو یا کوئی اور عقد (معاہدہ) ہو،ایک بار ہی قبول کرنا کافی ہے تین مرتبہ کہنے کی حاجت نہیں اور اگر تین مرتبہ کہا جائے،تو اِس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ نکاح کرنے والے کو تین مرتبہ قبول کرنا شرط ہے یا ایک بار؟،آپ نے جواب میں لکھا کہ"نکاح،خواہ کوئی اور عقد ہو،میں تین بار قبول اصلاً ضرور نہیں،ایک ہی بار کافی ہے اور تین بار تین طرح الفاظِ قبول ادا ہونا کچھ مضر نہیں،(فتاویٰ رضویہ،جلد 11،ص:217)"۔یعنی ایجاب وقبول کے الفاظ ایک ہی بار کہنے سے نکاح منعقد ہوجائے گا،تین بار کہنا ضروری نہیں ہے اور کہنے میں حرج بھی نہیں ہے،بس مزید تاکید ہوجائے گی۔

خطبۂ نکاح کب پڑھا جائے اور کیسے (کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر)

سوال:92

نکاح کا خطبہ ایجاب وقبول سے پہلے پڑھا جائے یا بعد میں اور یہ خطبہ کھڑے ہوکر پڑھنا چاہئے یا بیٹھ کر؟۔(محمد رمیز،سیکٹر D-11،نارتھ کراچی)۔

جواب:

نکاح کا خطبہ ایجاب وقبول سے پہلے پڑھنا مستحب ہے،علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:وَیَنْدُبُ اِعْلَانُہٗ وَتَقْدِیْمُ خُطْبَۃٍ ، ترجمہ:"اور نکاح کا علانیہ ہونا اور اس سے پہلے خطبہ پڑھنا مستحب ہے"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار،جلد 4،ص:57،داراحیاء التراث العربی،بیروت)

تمام خطبے خواہ نمازِ جمعہ کے ہوں یا عیدین کے، اُن میں قیام (کھڑا ہونا) افضل ہے، لیکن نکاح کا خطبہ نفل ہے، بیٹھ کر بھی پڑھا جا سکتا ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ خطبۂ نکاح کھڑے ہوکر پڑھنا چاہئے یا بیٹھ کر؟، آپ نے جواب میں لکھا:

''اگرچہ خطبے میں مطلقاً افضل قیام ہے کہ آواز بھی دور پہنچتی ہے اور باعثِ توجہ حاضرین بھی ہوتا ہے اور اس امر میں سب خطبے مشترک ہیں، ہاں جو خطبہ سواری پر ہوتا ہے جیسے خطبۂ عرفہ، وہاں قیامِ مَرکب قائم مقام راکب ہے، مگر نفلی خطبات بیٹھ کر بھی ثابت ہیں، ''اِبْنُ جَرِیْرٍ'' عَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ قَالَ سَمِعْتُ مَعْرُوْرًا أَوِابْنَ مَعْرُوْرٍ التَّمِیْمِیَّ قَالَ: سَمِعْتُ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ وَصَعِدَ الْمِنبَرَقَعَدَ دُوْنَ مَقْعَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِمَقْعَدَیْنِ فَقَالَ :أُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰهِ وَاسْمَعُوْا وَأَطِیْعُوْا لِمَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ تَعَالٰی أَمْرَکُمْ۔

ترجمہ: ''ابن جریر نے سماک بن حرب سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا: میں نے معرور یا ابن معرور تمیمی سے سنا اُنہوں نے کہا: میں نے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا: جب آپ منبر پر حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی نشست گاہ سے دو سیڑھیاں نیچے تشریف فرما ہوئے، تو آپ نے فرمایا: ''میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور جسے اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے معاملات کا والی بنایا ہو، اس کے فرمان کو سنو اور اس کے احکام کی اطاعت کرو''۔ اور خطبۂ نکاح نفل ہی ہے، تو بیٹھ کر بھی مضائقہ نہیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص:222، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ٹیلی فون پر لڑکے اور لڑکی کا ایجاب وقبول

سوال: 93

روزنامہ ایکسپریس ''تفہیم المسائل'' کالم میں آپ نے ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے: ''تین چیزیں ایسی ہیں (کہ ہر طور پر نافذ اور مؤثر ہوتی ہیں) سنجیدگی سے کہی جائیں تب بھی اور مذاق میں کہی جائیں تب بھی، نکاح، طلاق اور رجعت''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث:1184)

سوال یہ ہے کہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی کی منگنی ہوئی۔ لڑکے نے ٹیلی فون پر لڑکی سے کہا: "مجھ سے یہ جملہ کہو، تو مجھے قبول ہے"۔ لڑکی نے کہہ دیا: "تم مجھے قبول ہو، تم مجھے قبول ہو" حالاں کہ اس وقت وہاں کوئی گواہ نہیں تھا، کیا یہ نکاح ہو گیا؟۔ بعد میں ان کی منگنی ٹوٹ گئی اور لڑکی کی کسی دوسری جگہ شادی ہو گئی؟۔ کیا لڑکی نے نکاح پر نکاح نہیں کیا؟۔ اگر طلاق مذاق میں ہو جاتی ہے تو کیا نکاح مذاق میں نہیں ہوتا؟۔

(محمد بشیر، ساہیوال، ضلع سرگودھا)

جواب:

ٹیلی فون پر یا تنہائی میں لڑکے اور لڑکی کے ایجاب وقبول سے نکاح منعقد نہیں ہوتا، ایسا نکاح فاسد ہے۔ نکاح کے لئے چند امور ضرور ہیں: نکاح کا علانیہ طور پر ہونا مستحب ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أَعْلِنُوا هٰذَا النِّكَاحَ، وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ، وَاضْرِبُوا عَلَيْهِ بِالدُّفُوْفِ۔

ترجمہ: "(لوگو!) نکاح کا اعلان کیا کرو (یعنی اس کی تشہیر کیا کرو) اور مسجدوں میں نکاح کرو اور اس کی تشہیر کے لئے دف بجایا کرو"۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1089)

نکاح کے صحیح طور پر منعقد ہونے کے لئے رکنِ نکاح ایجاب وقبول کے موقع پر مجلسِ نکاح میں دو گواہوں کا ہونا شرط (ضروری) ہے، خواہ لڑکا اور لڑکی براہِ راست ایجاب وقبول کریں یا بذریعۂ وکیل، اگر وکیل کے ذریعے ایجاب وقبول ہو تو اس امر کے ثبوت کے طور پر کہ لڑکی نے ایک مقررہ مہر پر اس لڑکے کے ساتھ اس وکیل کو اپنے نکاح کا اختیار دیا ہے، الگ سے دو گواہوں کا ہونا بہتر ہے۔ گواہوں کے بغیر نکاح پر وعید آئی ہے۔

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلْبَغَايَا اللَّاتِيْ يُنْكِحْنَ أَنْفُسَهُنَّ بِغَيْرِ بَيِّنَةٍ۔

ترجمہ: "بدکار عورتیں وہ ہیں جو بغیر گواہوں کے اپنا نکاح کرتی ہیں"۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1103)

امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا کہ اگر عورت مرد باہم ایجاب وقبول کرلیں اور کسی کو اطلاع نہ ہو تو کیا یہ نکاح ہو جائے گا؟۔

آپ نے جواب میں لکھا کہ دو گواہوں کی موجودگی کے بغیر نکاح فاسد ہے۔ پھر آپ نے مندرجہ بالا حدیث مبارک کا حوالہ دیا۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 11، ص: 219، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

شیخ الاسلام برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الفرغانی لکھتے ہیں:

(وَلَا یَنْعَقِدُ نِکَاحُ الْمُسْلِمِیْنَ اِلَّا بِحُضُوْرِ شَاهِدَیْنِ حُرَّیْنِ عَاقِلَیْنِ بَالِغَیْنِ مُسْلِمَیْنِ رَجُلَیْنِ أَوْ رَجُلٍ وَّامْرَأَتَیْنِ عُدُوْلًا کَانُوْا أَوْ غَیْرَ عُدُوْلٍ أَوْ مَحْدُوْدَیْنِ فِی الْقَذْفِ۔

ترجمہ: ”(جب تک مجلسِ نکاح میں) دو آزاد، عاقل اور بالغ مسلمان مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں موجود نہ ہوں، مسلمانوں کا نکاح (شرعی طور) پر منعقد ہی نہیں ہوتا وہ گواہ خواہ عادل ہوں یا غیر عادل یا محدود فی القذف ہوں“۔ اس کی شرح میں علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: أَمَّا اشْتِرَاطُ الشَّهَادَةِ فَلِقَوْلِهٖ ﷺ لَا نِکَاحَ اِلَّا بِشُهُوْدٍ۔

ترجمہ: ”نکاح کے صحیح طور پر منعقد ہونے کے لئے فقہائے کرام نے دو گواہوں کی جس موجودگی کو شرط قرار دیا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے ثابت ہے: ”(غیر کفو میں) ولی کی اجازت کے بغیر اور (اسی طرح) دو گواہوں کی موجودگی کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا“۔

(فتح القدیر مع ہدایہ، جلد: 3، ص: 190,191، مطبوعہ: مرکز اہلسنت برکات رضا)

وَالصَّحِیْحُ مَارُوِیَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَوْلُهٗ: لَانِکَاحَ اِلَّا بِبَیِّنَةٍ۔

امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے: ”گواہوں کے بغیر نکاح جائز نہیں“۔ (سُنن ترمذی، جلد 2، ص: 185)

امام اعظم ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے نزدیک نکاح کے صحیح طور پر منعقد

ہونے کے لئے دوگواہوں کا ہونا شرط ہے۔

آپ نے میرے ایک سابقہ فتوے کا اقتباس نقل کرتے ہوئے، ایک حدیث کا حوالہ دیا جس میں واضح ہے کہ نکاح اور طلاق کے کلمات سنجیدگی سے ادا کئے جائیں (یعنی ارادۂ نکاح وطلاق سے بولے جائیں) یا مذاق میں، ہر صورت میں، وہ شرعاً مؤثر اور نافذ العمل ہوجاتے ہیں۔ ان کا ثبوت بھی دوگواہوں کی موجودگی کی شرط کے ساتھ ہوگا۔

حقیقی چچا، رضاعی بھائی اور اس کی اولاد سے نکاح

سوال: 94

ایک بچے نے چھ ماہ کی عمر میں اپنی دادی کا دودھ پیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ بچہ اپنے چچا کا رضاعی بھائی ہوا۔ کیا اسی چچا کی بیٹی سے نکاح شرعاً درست ہے؟۔

(شاہد عزیز ساغر، ضلع ملتان)

جواب:

وہ بچہ جس نے ایامِ رضاعت میں اپنی دادی کا دودھ پیا ہے، اُس کے تمام چچا اور پھوپھیاں اس کے رضاعی (دودھ شریک) بھائی اور بہنیں ہیں اور چچا زاد لڑکیاں بالترتیب اس کی رضاعی بھتیجیاں اور بھانجیاں ہیں، لہٰذا ان میں سے کسی سے بھی اس کا نکاح جائز نہیں ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

يَحْرُمُ عَلَى الرَّضِيعِ أَبَوَاهُ مِنَ الرَّضَاعِ وَأُصُولُهُمَا وَفُرُوعُهُمَا مِنَ النَّسَبِ وَالرَّضَاعِ جَمِيعًا حَتَّى أَنَّ الْمُرْضِعَةَ لَوْ وَلَدَتْ مِنْ هٰذَا الرَّجُلِ أَوْ غَيْرِهِ قَبْلَ هٰذَا الْإِرْضَاعِ أَوْ بَعْدَهُ أَوْ أَرْضَعَتْ رَضِيعًا أَوْ وُلِدَ لِهٰذَا الرَّجُلِ مِنْ غَيْرِ هٰذِهِ الْمَرْأَةِ قَبْلَ هٰذَا الْإِرْضَاعِ أَوْ بَعْدَهُ أَوْ أَرْضَعَتْ اِمْرَأَةٌ مِنْ لَبَنِهِ رَضِيعًا، فَالْكُلُّ إِخْوَةُ الرَّضِيعِ وَأَخَوَاتُهُ وَأَوْلَادُهُمْ أَوْلَادُ إِخْوَتِهِ وَأَخَوَاتِهِ وَأَخُو الرَّجُلِ عَمُّهُ وَأُخْتُهُ عَمَّتُهُ وَأَخُو الْمُرْضِعَةِ خَالُهُ وَأُخْتُهَا

خَالَتُهٗ وَ كَذَا فِي الْجَدِّ وَالْجَدَّةِ۔

ترجمہ:'' دودھ پینے والے پر اس کے رضاعی ماں باپ اور ان کے تمام اصول اور فروع حرام ہو جاتے ہیں، خواہ وہ نسبی رشتے سے اصول وفروع ہوں یا رضاعی رشتے سے، حتّٰی کہ اگر دودھ پلانے والی کے ہاں اسکے موجودہ شوہر سے یا کسی اور شوہر سے کوئی اولاد ہو، خواہ دودھ پلانے سے پہلے ہو یا دودھ پلانے کے بعد ہو یا وہ کسی اور بچے کو دودھ پلائے یا دودھ پلانے والی کے شوہر کی کسی اور بیوی سے اولاد ہو، خواہ اس کو دودھ پلانے سے پہلے یا بعد میں، تو یہ سب دودھ پینے والے کے بھائی اور بہن اور ان کی اولاد اس کے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد ہیں۔ دودھ پلانے والی کے شوہر کا بھائی اس کا چچا ہے اور اس کی بہن اس کی پھوپھی ہے اور دودھ پلانے والی کا بھائی اس کا ماموں ہے اور بہن اس کی خالہ ہے۔ اسی طرح دادا، دادی اور نانا، نانی کے رشتے ہیں، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: اول، ص: 343، مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

حقیقی خالہ کی نواسی سے نکاح جائز ہے

سوال: 95

میری خالہ کی حقیقی بیٹی کی ایک بیٹی ہے، جو رشتے کے اعتبار سے میری بھانجی لگتی ہے۔ کیا اُس سے میرا نکاح جائز ہے؟، (محمد ریحان علی، ایف۔ بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

جی ہاں! حرمتِ نکاح کا کوئی اور سبب موجود نہ ہو، تو یہ نکاح جائز ہے۔ جب خود خالہ کی بیٹی سے نکاح ہو سکتا ہے، تو اس کی بیٹی سے بطریقِ اولیٰ ہو سکتا ہے۔ خالہ کی بیٹی محرمات (وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے) میں شامل نہیں، خالہ کی بیٹی سے بھی ہو سکتا ہے۔ جن خواتین سے شرعاً نکاح حرام ہے، قرآن مجید سورۂ نساء کی آیات 22 تا 24 میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور پھر مزید فرمایا: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ۔

ترجمہ:'' اور ان (مذکورہ محرمات عورتوں) کے علاوہ باقی سب عورتوں کے ساتھ تمہارا نکاح

جائز ہے،(النساء:24)‘‘۔
مفتی محمد نور اللہ نعیمی نور اللہ مرقدہٗ سے ایک سوال ہوا کہ:’’ آیا زید کی حقیقی خالہ کی حقیقی نواسی سے زید کا نکاح از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟‘‘ کے جواب میں لکھتے ہیں:’’ہاں! جائز ہے،اللہ رب العالمین جلّ وعلا نے فرمایا: وَأُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذَالِكُمْ (پارہ:۵)اور شامی جلد2،ص:380 میں فتح القدیر سے ہے: وَفُرُوْعُ أَجْدَادِهٖ وَجَدَّاتِهٖ بِبَطْنٍ وَّاحِدٍ فلهٰذا تَحْرُمُ الْعَمَّاتُ وَالْخَالَاتُ وَتَحِلُّ بَنَاتُ الْعَمَّاتِ وَالْأَعْمَامِ وَالْخَالَاتِ وَالْأَخْوَالِ۔ (یعنی اجداد وجدات کے فروع جوایک بطن سے ہوں (ان سے نکاح جائز ہے)،لہٰذا پھوپھیوں اور خالاؤں سے تو نکاح حرام ہے،(لیکن)پھوپھی زاد، چچازاد،خالہ زاد اور ماموں زاد بہنوں سے نکاح جائز ہے)اور یونہی کتاب الفقہ جلد4،ص:61،62 میں بھی ہے،(فتاویٰ نوریہ،جلد2،ص:446)‘‘۔

سالی کی نواسی سے نکاح جائز نہیں

سوال: 96

میں ملک محمد بنارس ولد ملک محمد عارف پہلے سے شادی شدہ ہوں،لیکن اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔میری بیوی اپنی بہن کی نواسی سے میری دوسری شادی کروانا چاہتی ہے۔کیا یہ رشتہ جائز ہے؟،(ملک محمد بنارس،جہلم)۔

جواب:

محرماتِ نکاح کی نو اقسام میں سے ایک قسم ’’جمع بین المحارم‘‘ ہے یعنی وہ عورتیں کہ ان میں سے اگر ایک کو مرد فرض کریں تو دوسری اُس کے لئے حرام ہو،مثلاً ’’دو بہنیں‘‘ کہ ایک کو مرد فرض کریں،تو بھائی بہن کا رشتہ ہوا یا ’’پھوپھی بھتیجی‘‘ کہ پھوپھی کو مرد فرض کریں،تو ’’چچا اور بھتیجی‘‘ کا رشتہ ہوا اور بھتیجی کو مرد فرض کریں،تو ’’پھوپھی اور بھتیجے‘‘ کا رشتہ یا ’’خالہ بھانجی‘‘ کہ خالہ کو مرد فرض کریں،تو ’’ماموں اور بھانجی‘‘ کا رشتہ ہوا اور بھانجی کو مرد فرض کریں،تو بھانجے اور خالہ کا رشتہ ہوا،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:وَالْأَصْلُ أَنَّ کُلَّ

امْرَأَتَيْنِ لَوْ صَوَّرْنَا اِحْدَاهُمَا مِنْ أَيِّ جَانِبٍ ذَكَرًالَمْ يَجُزِ النِّكَاحُ بَيْنَهُمَا بِرَضَاعٍ أَوْ نَسَبٍ لَمْ يَجُزِ الْجَمْعُ بَيْنَهُمَا هٰكَذَا فِي الْمُحِيطِ۔

ترجمہ: ''اور قاعدہ یہ ہے کہ ایسی دو عورتیں جن میں سے ایک کو مرد فرض کریں تو ان کا آپس میں نکاح جائز نہ ہو، نسب کے رشتے سے ہی خاص نہیں بلکہ رضائی رشتے میں بھی دونوں کا جمع کرنا حرام ہے، ''محیط'' میں بھی اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 277، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

اللہ جل شانہٗ نے محرمات نکاح کے تفصیلی احکام میں ارشاد فرمایا: وَأَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ۔ (ترجمہ) ''اور کسی شخص کا (بیک وقت) اپنے نکاح میں دو بہنوں کا جمع کرنا بھی حرام ہے، (النساء)''۔ آیت میں اگرچہ صراحت کے ساتھ دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا گیا ہے، لیکن مفسرین کرام اور فقہاءِ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ ایسی ہر دو عورتوں کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، جن میں سے ہر ایک کو مرد فرض کریں تو ان دونوں میں حرمت کا رشتہ قائم ہو جائے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "لَايُجْمَعُ بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَعَمَّتِهَا، وَلَا بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَخَالَتِهَا"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بھتیجی اور اس کی پھوپھی'' کو اور ''بھانجی اور اس کی خالہ'' کو نکاح میں ایک ساتھ جمع نہ کیا جائے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5109)''۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ أَرْبَعِ نِسْوَةٍ أَنْ يُجْمَعَ بَيْنَهُنَّ" الْمَرْأَةِ وَعَمَّتِهَا" "وَالْمَرْأَةِ وَخَالَتِهَا"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چار عورتوں کو نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا ہے، ''بھتیجی اور اس کی پھوپھی'' اور ''بھانجی اور اس کی خالہ''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3333)''۔

عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ : حَدَّثَنِي قَبِيصَةُ بْنُ ذُؤَيْبٍ :اَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ : نَهَى النَّبِيُّ ﷺ أَنْ تُنْكَحَ الْمَرْأَةُ عَلَى عَمَّتِهَا ، وَالْمَرْأَةُ وَخَالَتُهَا۔ فَنَرٰى خَالَةَ أَبِيهَا بِتِلْكَ الْمَنْزِلَةِ۔

ترجمہ:''زہری فرماتے ہیں کہ قبیصہ بن ذویب نے یہ حدیث بیان کی کہ انہوں نے ابو ہریرہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ''عورت اور اس کی پھوپھی'' کو ایک نکاح میں (جمع) کرنے سے منع فرمایا، اور اسی طرح ''عورت پر اس کی خالہ'' کو (جمع کرنے سے منع فرمایا)۔(زہری کہتے ہیں)ہمارا خیال یہ ہے بیوی کے باپ کی خالہ کا بھی یہی حکم ہے۔(صحیح بخاری، رقم الحدیث:5110)''۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ :"أَنَّهُ نَهَى أَنْ تُنْكَحَ الْمَرْأَةُ عَلَى عَمَّتِهَا، أَوْ خَالَتِهَا"۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ پھوپھی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بھتیجی سے نکاح کیا جائے یا بھتیجی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی پھوپھی کے ساتھ یا خالہ کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بھانجی کے ساتھ یا بھانجی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی خالہ سے نکاح کیا جائے۔(سنن نسائی، رقم الحدیث:3290)''۔

صورتِ مسئولہ میں یہ نکاح جمع بین المحارم کے سبب جائز نہیں ہے، آپ کی بیوی کی موجودگی میں آپ کا نکاح اُس کی بہن یا بہن کی بیٹی یا نواسی سے نہیں ہوسکتا، جب ماں یا نانی سے نکاح نہیں ہوسکتا تو نواسی سے بطریقِ اولیٰ جائز نہیں۔

بیوی کے انتقال کے بعد اُس کی بہن سے نکاح جائز ہے

سوال: 97

میرا نکاح کچھ سال پہلے چچا کی لڑکی سے ہوا، کچھ عرصے بعد رضائے الٰہی سے میری بیوی کا انتقال ہوگیا۔اب وہی چچا اپنی دوسری بیٹی سے میرا نکاح کرنا چاہتا ہے۔کیا

میں مرنے والی بیوی کی بہن سے نکاح کرسکتا ہوں؟۔(محمد ارشاد، وہاڑی)۔

جواب:

جی ہاں! آپ کی بیوی کے انتقال کے بعد اُس کی حقیقی بہن سے آپ کا نکاح ہوسکتا ہے۔دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا یا اپنی بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں جب تک وہ عدت میں ہے، اُس کی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے۔اللہ جلّ شانہٗ نے محرماتِ نکاح کے تفصیلی احکام میں ارشاد فرمایا:وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ، ترجمہ:''اور کسی شخص کا (بیک وقت) اپنے نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرنا بھی حرام ہے،(النساء:23)''۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے،تو جب تک وہ عدت میں ہے،اُس کی حقیقی بہن سے نکاح نہیں کرسکتا،علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

تَزَوُّجُ الْأُخْتَيْنِ مَعًا ،وَنِكَاحُ الْأُخْتِ فِيْ عِدَّةِ الْأُخْتِ،وَنِكَاحُ الْمُعْتَدَّةِ ، وَالْخَامِسَةِ فِيْ عِدَّةِ الرَّابِعَةِ۔

ترجمہ:''دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا،ایک بہن (مُطلّقہ بیوی) کی عدت میں اُس کی دوسری بہن سے نکاح کرنا،کسی عورت سے (اس کی) عدت میں نکاح کرنا اور چوتھی بیوی کی عدت میں پانچویں سے نکاح کرنا (نکاحِ فاسد ہے)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد4،ص:202،بیروت)

حُرمتِ نکاح کا ایک مسئلہ

سوال:98

مولانا علم الدین اور میر عالم حقیقی بھائی ہیں۔میر عالم کی بیٹی نے مولانا علم الدین کی بیوی کا دودھ پیا تھا۔علم الدین کی بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے دوسری شادی کی۔دوسری بیوی سے اولاد ہوئی۔میر عالم کی بیٹی کی بھی اولاد موجود ہے۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ میر عالم کی بیٹی کی بیٹی کا علم الدین کی دوسری بیوی سے موجود لڑکے سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟۔(عزیز اللہ منہاس،کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں یہ نکاح جائز نہیں کہ علم الدین کی اولاد میر عالم کی بیٹی کے رضاعی بہن بھائی ہوئے اور میر عالم کی نواسی کے رضاعی ماموں اور خالائیں، جو رشتے نسب کے سبب حرام ہیں وہی رضاعت کے سبب بھی حرام ہیں۔

عَنْ عائشة قالت : قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہ ﷺ: "یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا یَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ"۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3505، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکۃ المکرمۃ)

سوال نمبر: 94 کے جواب میں ''فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 345'' کے حوالے سے محرماتِ رضاعی کا تفصیلی بیان موجود ہے، اس موقع پر قارئین سے گزارش ہے کہ گذشتہ صفحات پر متعلقہ عبارت کو مع ترجمہ ملاحظہ فرمالیں۔

پہلے شوہر سے طلاق یا خلع لئے بغیر دوسرے نکاح کا حکم

سوال: 99

1987ء میں میری شادی نیویارک میں ہوئی۔ ہم دونوں میاں بیوی امریکن نیشنلٹی ہولڈر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا، جن کی عمریں اس وقت 17، 18 سال ہیں۔ زندگی اچھی گزر رہی تھی کہ اچانک گھر کے حالات خراب ہو گئے۔ محترمہ کے تعلقات ایک شخص سے ہو گئے اور ایک دن محترمہ اپنا سامان لے کر اُس کے گھر منتقل ہو گئیں۔ تقریباً چھ سات ماہ بعد پاکستان جا کر خلع کا مقدمہ دائر کر دیا۔ خلع یا طلاق کا فیصلہ ہوتے ہوتے قریب کوئی دو سال لگ گئے، 03 جون 2009ء میں کورٹ سے فیصلہ (Marriage Dessolve) ہوا۔ لیکن فیصلہ ہونے سے پہلے اُس نے اُس شخص سے نکاح کر لیا، کیا یہ شادی جائز ہے؟۔ اور اگر کوئی اولاد ہوتی ہے تو کیا وہ جائز ہو گی؟۔

عزیز الرحمٰن، نیویارک، امریکہ

جواب:

صورت مسئولہ میں مذکورہ خاتون جب تک آپ کے نکاح میں ہیں، اُن کا نکاح کسی دوسرے شخص سے قطعاً نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ،
ترجمہ: ''اور (تم پر حرام کی گئی ہیں) وہ عورتیں پہلے سے جو دوسروں کے نکاح میں ہیں، (النساء:24)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:
لَایَجُوْزُ لِلرَّجُلِ اَنْ یَتَزَوَّجَ زَوْجَةَ غَیْرِہٖ وَکَذَالِکَ الْمُعْتَدَّةُ کَذَا فِی السِّرَاجِ الْوَھَّاجِ
ترجمہ: ''کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی سے نکاح کرے اور اسی طرح ایامِ عدت میں مطلقہ عورت سے نکاح جائز نہیں ہے، ''سراج الوہاج'' میں اسی طرح لکھا ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص:280، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

شادی شدہ عورت کا جان بوجھ کر دوسری جگہ نکاح کرنا ہرگز جائز نہیں، باطل وحرام ہے۔ جن لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ عورت منکوحہ ہے اور یہ جاننے کے باوجود وہ لوگ نکاح کے گواہ بنے یا نکاح پڑھایا، یا یہ نکاح کروایا، اگر اسے حرام جانتے ہوئے کسی بھی حیثیت میں اس میں شرکت کی، تو اُن سب پر توبہ لازم ہے اور اگر اس فعل کو جائز اور حلال سمجھتے ہوئے انہوں نے اس میں شرکت کی، نکاح پڑھایا یا وکیل اور گواہ بنے، تو اس صورت اُن پر توبہ اور تجدیدِ ایمان لازم ہے اور شادی شدہ ہونے کی صورت میں تجدید نکاح بھی لازم ہے۔

جب تک عورت کسی کے نکاح میں ہے اس کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوگا، اس کا نسب اسی شخص کی طرف منسوب ہوگا، جس کے نکاح میں وہ عورت ہے اور وہ بچہ اس کا وارث بھی بنے گا، حدیث پاک میں ہے: اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاھِرِ الْحَجَرُ۔
ترجمہ: '' بچے کا نسب اسی کی طرف منسوب ہوگا، جس کے نکاح میں اس کی ماں ہے اور زانی کے لئے پتھر ہے، (زانی محروم رہے گا)، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:2053، 6749)''۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کی بیوی کا دوسرا نکاح قطعاً منعقد نہیں ہوا اور آپ کی بیوی پر لازم

ہے کہ اُس شخص سے فوری علیحدگی اختیار کرے۔اگر بیوی ہٹ دھرم ہے، قبولِ حق کے لئے تیار نہیں ہے اور حکومت کا عدالتی نظام بھی حق کی حمایت نہیں کرتا تو آپ اسے رضا کارانہ طور پر طلاق دے دیں اور عدت گزرنے کے بعد وہ جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے۔اس طرح آپ اسے گناہ میں مبتلا ہونے سے بچاسکیں گے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر پائیں گے۔

عیسائی عورت سے نکاح کا حکم

سوال:100

میرے شوہر نے کچھ عرصہ قبل ایک عیسائی عورت سے اس کے اسلام قبول کرنے کے دوسرے دن ہی نکاح کرلیا، جبکہ وہ پہلے سے شادی شدہ اور چار بچوں کی ماں ہے اور اُس کے شوہر نے اُسے طلاق بھی نہیں دی، قاضی صاحب سے بھی یہ بات چھپائی گئی کہ وہ عورت پہلے سے شادی شدہ ہے، اب ان دونوں کی ایک بچی بھی ہے۔ایک مفتی صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ ''اسلام صدقِ دل سے قبول کرنے کا نام ہے، دنیاوی غرض سے اسلام قبول کرنا قطعاً معتبر نہیں ،ایسے شخص کو مسلمان نہیں بلکہ منافق تصور کیا جائے گا، لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق مذکورہ عورت کا اسلام قبول نہیں ہے''۔معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا ان کا نکاح درست ہے؟۔اس عورت کے بارے میں کیا حکم ہے؟،اور عدت کے بارے میں کیا حکم ہے؟۔

میرے شوہر دوسری شادی سے قبل کئی مرتبہ اور اب مورخہ: 18 مئی 2009ء بروز پیر اپنی زبان سے کہہ چکے ہیں کہ ''میں قادیانی ہوجاؤں، لڑکی بھی ملتی ہے اور 10 لاکھ روپے بھی''۔ جب میں نے شرم دلائی کہ ایمان سے بڑھ کر کچھ نہیں تو بات کو مذاق میں ٹال گئے کہ میں ویسے ہی کہہ رہا ہوں۔میں نے جب بھی اُس عیسائی عورت سے علیحدگی اور اُس کے مسلمان ہونے کے بارے میں بات کی تو میرے شوہر نے کہا کہ: ''اگر وہ عورت مسلمان نہیں تو میں خود عیسائی ہوجاتا ہوں''۔کفر کی باتیں کرتا ہے اور کبھی کہتا ہے کہ میں کسی کو نہیں مانتا۔میرے شوہر کا یہ عمل کفر میں تو شامل نہیں؟،(ناصرہ جبیں،سرگودھا،پنجاب)۔

جواب:

ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے، جو شخص دل سے ضروریاتِ دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے، اور جس کا دل تصدیق سے خالی ہو وہ کافر ہے۔ ایمان محض زبان سے کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ دل کی سچائی سے تمام ضروریاتِ دین جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت، کتب الٰہی، آخرت اور دیگر تمام ضروریاتِ دین پر، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں، کامل یقین رکھنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے، جو شخص دل سے ضروریات دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے۔

اس طرح کے واقعات میں عام مشاہدہ ہے کہ اکثر و بیشتر نکاح کے لئے ہی اسلام قبول کیا جاتا ہے، لیکن ہم کسی کے دل کی صداقت کو کسی ظاہری پیمانے سے نہیں جانچ سکتے، امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں:

عَنْ أَبِي فِرَاسٍ قَالَ خَطَبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَقَالَ: يَاأَيُّهَاالنَّاسُ أَلَا إِنَّا إِنَّمَا كُنَّانَعْرِفُكُمْ إِذْبَيْنَ ظَهْرَيْنَاالنَّبِيُّ ﷺ وَإِذْيَنْزِلُ الْوَحْيُ وَإِذْيُنَبِّئُنَا اللّٰهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ، أَلَا وَإِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَدِانْطَلَقَ وَقَدِ انْقَطَعَ الْوَحْيُ وَإِنَّمَا نَعْرِفُكُمْ بِمَا نَقُولُ لَكُمْ ،مَنْ أَظْهَرَ مِنْكُمْ خَيْرًا ظَنَنَّا بِهِ خَيْرًا وَأَحْبَبْنَاهُ عَلَيْهِ، وَمَنْ أَظْهَرَ مِنْكُمْ لَنَاشَرًّا ظَنَنَّا بِهِ شَرًّاوَّأَبْغَضْنَاهُ عَلَيْهِ سَرَائِرُكُمْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ رَبِّكُمْ،

ترجمہ: ''ابوفراس بیان کرتے ہیں کہ (ایک بار) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے لوگو! سنو! (عہدِ رسالت میں) ہم تمہاری (حقیقتِ حال) کو جان لیتے تھے کیونکہ نبی ﷺ ہمارے درمیان موجود تھے اور نزولِ وحی کا سلسلہ جاری تھا اور اللہ تعالیٰ (رسول اللہ ﷺ پر وحی کے ذریعے) ہمیں تمہاری (پوشیدہ) خبریں بھی بتادیتا تھا، (مگر) سنو! (اب) نبی ﷺ (دنیا سے) تشریف لے جاچکے ہیں اور وحی (ربانی) کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے، (اب ہم) تمہارے بارے میں وہی کہتے ہیں جو (ظاہری طور

پر) جانتے ہیں ۔ سو تم میں سے جس سے خیر ظاہر ہوتی ہے، تو ہم اس کے بارے میں اچھا گمان کرتے ہیں اور اس بناء پر اس سے محبت کرتے ہیں ۔ اور تم میں سے جس سے شر کا ظہور ہوتا ہے، اس کے بارے میں ہم بُرا گمان کرتے ہیں اور اس پر ناراض ہوتے ہیں ۔ تمہارے پوشیدہ امور کا فیصلہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ہوگا (کیونکہ وہی نیتوں اور سب کے پوشیدہ احوال کا جاننے والا ہے)''۔

(مسند امام احمد بن حنبل، جلد 1، ص: 384، مطبوعہ: دارالفکر، بیروت)

لہٰذا کسی غیر مسلم کے قبولِ اسلام کے بعد کسی کو یہ کہنے کا اختیار نہیں کہ '' اُس کا قبولِ اسلام معتبر نہیں''۔ کسی مفتی یا مذہبی پیشوا کو عنداللہ قبولیت یا عدمِ قبولیت کے سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے، آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فیصلہ اخلاصِ عمل اور نیت پر ہوگا اور نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

ہاں مذکورہ صورت میں اُس عیسائی عورت کے قبولِ اسلام کے بعد (چونکہ دونوں ہی دارالاسلام میں ہیں) لازم یہ تھا کہ اُس کے عیسائی شوہر کو بھی اسلام کی دعوت دی جاتی، اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کرتا تو عدالت اس کے انکار کو ملحوظ رکھتے ہوئے فسخِ نکاح کا حکم جاری کرے گی، جو ایک طلاق شمار ہوگی ۔ اور عدت کے بعد وہ عورت نکاحِ ثانی کے لئے آزاد ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَلَوْ أَسْلَمَ أَحَدُ الزَّوْجَيْنِ، عُرِضَ الْإِسْلَامُ عَلَى الْآخَرِ، فَإِنْ أَسْلَمَ فَبِهَا، وَإِلَّا فُرِّقَ بَيْنَهُمَا كَذَا فِي الْكَنْزِ، وَإِنْ سَكَتَ وَلَمْ يَقُلْ شَيْئًا فَالْقَاضِي يَعْرِضُ الْإِسْلَامَ عَلَيْهِ مَرَّةً بَعْدَ أُخْرَى حَتَّى يَتِمَّ الثَّلَاثُ احْتِيَاطًا كَذَا فِي الذَّخِيرَةِ ۔

ترجمہ: '' اور اگر مرد و عورت میں سے کسی ایک نے اسلام قبول کیا تو دوسرے پر اسلام پیش کیا جائے گا، اگر اُس نے اسلام قبول کرلیا تو ٹھیک، ورنہ دونوں کے درمیان (قاضیِ مُجاز کے ذریعے) تفریق کردی جائے گی،'' کنز الدقائق'' میں اسی طرح ہے ۔ اور اگر شوہر خاموش رہا اور اُس نے کچھ نہ کہا تو قاضی دوسری مرتبہ اُس کو اسلام کی دعوت دے گا یہاں

تک کہ احتیاطاً تین مرتبہ اُس پر اسلام پیش کرے گا ،"ذخیرہ" میں بھی اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:338، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:(وَاِذَا أَسْلَمَ أَحَدُ الزَّوْجَيْنِ الْمَجُوْسِيَّيْنِ أَوِ امْرَأَةُ الْكِتَابِيِّ عَرَضَ الْإِسْلَامَ عَلَى الْآخَرِ،فَإِنْ أَسْلَمَ) فَبِهَا (وَإِلَّا) بِأَنْ أَبَى أَوْ سَكَتَ (فَرَّقَ بَيْنَهُمَا)

ترجمہ:"اور جب مجوسی مرد وعورت میں سے کسی ایک نے یا کتابی عورت نے اسلام قبول کرلیا تو قاضی دوسرے (یعنی اگر شوہر نے اسلام قبول کیا تو بیوی پر اور بیوی نے اسلام قبول کیا تو شوہر)پر اسلام پیش کرے (یعنی اُسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دے)، پھر اگر اُس نے اسلام قبول کرلیا تو نکاح باقی رہے گا اور اگر اُس نے انکار کردیا یا خاموش رہا تو دونوں کے درمیان قاضی تفریق کردے گا"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص:267، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

قاضی (جج) کا دونوں کے درمیان تفریق کرنا طلاق قرار دی جائے گی اور بغیر تفریق عورت کا کسی دوسرے شخص سے نکاح درست نہیں ہوگا اور اُسی کافر شوہر کے نکاح میں شمار کی جائے گی ،شادی شدہ عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے قطعاً نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ

ترجمہ:"اور (تم پر حرام کی گئی ہیں)وہ عورتیں پہلے سے جو دوسروں کے نکاح میں ہیں،(النساء:24)"۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:لَايَجُوْزُ لِلرَّجُلِ أَنْ يَتَزَوَّجَ زَوْجَةَ غَيْرِهٖ وَكَذٰلِكَ الْمُعْتَدَّةُ كَذَا فِي السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ۔

ترجمہ:"کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی سے نکاح کرے اور اسی طرح ایامِ عدت میں عورت سے نکاح جائز نہیں ہے،"سراج الوہاج" میں اسی طرح لکھا ہے،(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:280، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

یہ نکاح ،نکاحِ فاسد ہوگا ،بچی کا نسب اس دوسرے شخص سے ثابت ہوگا اور وہ باپ کی وارث

بنے گی۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: اولاد کہ نکاحِ فاسد میں وقت وطی سے چھ مہینے بعد پیدا ہوئی، بالاجماع ثابت النسب و مستحق الارث ہے:

فِی الدُّرِّ الْمُخْتَارِ وَیَثْبُتُ النَّسَبُ اِحْتِیَاطًا بِلَا دَعْوَةٍ وَّتُعْتَبَرُ مُدَّتُہٗ وَھِیَ سِتَّةُ اَشْھُرٍ مِنَ الْوَطْیِ وَاِلَّا لَایَثْبُتُ وَھٰذَا قَوْلُ مُحَمَّدٍ وَّبِہٖ یُفْتٰی، وقالا اِبْتِدَاءُ الْمُدَّةِ مِنْ وَقْتِ الْعَقْدِ کَالصَّحِیْحِ وَرَجَّحَہٗ فِی النَّھْرِ بِاَنَّہٗ اَحْوَطُ۔

ترجمہ: ”درمختار میں ہے: نکاح فاسد میں بغیر دعویٰ احتیاطاً نسب ثابت ہوگا، اور اس کی مدت کا اعتبار ہوگا جو کہ وطی سے چھ ماہ تک ہے ورنہ نہیں (یعنی اگر وطی کے بعد چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ پیدا ہوا تو نسب ثابت نہیں ہے)، یہ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اور امام اعظم و امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول پر مدت کا اعتبار وقتِ نکاح سے چھ ماہ ہے جیسا کہ نکاحِ صحیح میں ہوتا ہے، ”نہر“ میں اس کو ترجیح دی ہے کیونکہ اس میں زیادہ احتیاط ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص: 341، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)“۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے شوہر دو متفرق موقعوں پر اپنے قادیانی اور عیسائی ہونے کا ارادہ ظاہر کر چکے ہیں، شرعاً اپنے کفر کا اقرار کفر ہے، لہٰذا جو شخص خود کو کسی غیر مسلم فرقے سے ظاہر کرے یا اُس میں شمولیت کا ارادہ کرے، وہ کافر ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِہٖۤ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ وَلٰکِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْکُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْھِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰہِ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۝

ترجمہ: ”جس نے اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کیا سوا، اس کے جس کو کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو بلکہ وہ لوگ جو کھلے دل کے ساتھ کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے، (النحل: 106)“۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ کَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ ترجمہ: ”اب عذر نہ پیش کرو، بے شک تم اپنے ایمان کے اظہار کے بعد کفر کر چکے ہو، (التوبہ: 66)“۔

علامہ علی بن سلطان محمد القاری متوفی 1014ھ لکھتے ہیں:

وَفِي الْمُحِيطِ مَنْ قَالَ فَاِنَّا كَافِرٌ اَوْ سَوْفَ اُكْفِرُ قَالَ اَبُوالْقَاسِمِ هُوَ كَافِرٌ مِّنْ سَاعَتِهٖ۔

ترجمہ: ''اور''محیط''میں ہے: کہ جو کہتا ہے کہ میں کافر ہوں یا میں عنقریب کفر اختیار کروں گا، ابوالقاسم نے کہا: وہ اسی وقت کافر ہو گیا، (شرح فقہ اکبر، ص:183)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَمَنْ يَّرْضٰى بِكُفْرِ نَفْسِهٖ فَقَدْ كَفَرَ

ترجمہ: ''اور جو شخص اپنے کفر پر راضی ہو جائے تو وہ کافر ہو جائے گا''۔

(فتاوٰی عالمگیری، جلد: دوم، ص: 257، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَيُكَفَّرُ فِيْهِمَا) لِرِضَاهُ بِالْكُفْرِ۔

ترجمہ: ''کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار جلد 5 ص: 393، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

مذکورہ بالا حوالہ جات کی رو سے اقرارِ کفر بھی کفر ہے، اگر واقعی آپ کے شوہر نے مذکورہ باتیں کہی ہیں، تو اُس نے کفر کا ارتکاب کیا ہے، لہٰذا اُس پر لازم ہے کہ فوراً توبہ کرے، تجدیدِ ایمان کرے اور تجدیدِ نکاح کرے، جب تک وہ توبہ اور تجدیدِ ایمان و نکاح نہ کرے، عورت پر لازم ہے کہ اُس سے علیحدگی اختیار رکھے۔

ہبہ اور خلع کا مسئلہ

سوال: 101

میری شادی محمد اقبال سے 2000ء میں ہوئی، مہر کی رقم ایک لاکھ روپے مقرر کی جواب تک ادا نہیں کی۔ شادی کے وقت گلستانِ جوہر میں ایک فلیٹ خریدا جو اُس نے مجھے تحفہ دیا، میں شادی کے وقت سے اب تک اُسی فلیٹ میں قیام پذیر ہوں۔ شادی کے وقت اقبال نے مجھے بتایا کہ اُس نے مجھ سے قبل ایک شادی کی تھی اور اُس کو طلاق دے چکا ہے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اُس کی ایک بیوی اور موجود ہے۔ شادی کے بعد اُس نے مجھ سے تین ماہ تعلق قائم رکھا اور اُس کے بعد آنا جانا چھوڑ دیا، ماہانہ اخراجات بھی پوری طرح ادا نہیں کیے، کبھی تین چار ماہ کے بعد کچھ رقم بھیج دیتا تھا یہ سلسلہ بھی 2004ء میں موقوف

ہوگیا۔فلیٹ کے کاغذات اُسی کے پاس ہیں اور میرے نام کرنے کی کوئی کاغذی کاروائی بھی نہیں کی گئی، کیا یہ فلیٹ وہ واپس لے سکتا ہے؟۔

(2)۔میں نے اُس سے ساتھ رہنے کا مطالبہ کیا تو اُس نے رَد کردیا اور طلاق مانگی تو کہا کہ فلیٹ خالی کردو اور خلع مانگو تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔طلاق دینے میں وہ ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے تاکہ مہر کی رقم ادا نہ کرنا پڑے، شریعت عورت کے تحفظ کے لئے کیا کہتی ہے؟۔

ناہید سلطانہ، گلستانِ جوہر، کراچی

جواب:

مذکورہ فلیٹ جو آپ کو بطور تحفہ دیا، اور اُس فلیٹ پر آپ کا قبضہ پائے جانے کے سبب ہبہ (گفٹ) مکمل ہوگیا، لہٰذا اب یہ فلیٹ شرعاً آپ کی ملکیت ہے، کاغذی کاروائی قانونی تقاضا ہے۔ ہبہ کے ارکان ایجاب وقبول ہیں، لیکن ایجاب وقبول کے کلمات زبانی کہنا شرط نہیں ہے۔علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: فَقَدْ أَفَادَ اَنَّ التَّلَفُّظَ بِالْاِیْجَابِ وَالْقَبُوْلِ لَایُشْتَرَطُ،بَلْ تَکْفِي الْقَرَائِنُ الدَّالَّةُ عَلَی التَّمْلِیْكِ۔

ترجمہ:''گذشتہ عبارت سے معلوم ہوا کہ ہبہ میں ایجاب وقبول کے کلمات (یعنی ایک فریق یہ کہے کہ میں نے یہ پلاٹ یا فلیٹ تمہیں ہبہ کیا اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا) ضروری نہیں ہے، بلکہ ایسے قرینوں کا پایا جانا کافی ہے، جو تملیک (مالک بنائے جانے) پر دلالت کرتے ہوں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 8،ص:425)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں: وَالْقَبُوْلُ تَارَةً یَکُوْنُ بِالْقَوْلِ وَتَارَةً بِالْفِعْلِ۔

ترجمہ:''ہبہ کا قبول کبھی قول سے ہوتا ہے اور کبھی فعل سے (مثلاً ایک نے ایجاب کیا یعنی یہ کہا: میں نے یہ چیز تمہیں ہبہ کردی، دوسرے نے لے لی، تو ہبہ مکمل ہوگیا)''۔

(البحرالرائق، جلد 7،ص:485)

زوجیت رجوع سے مانع ہے یعنی ہبہ کرتے وقت اگر عورت اُس ہبہ کرنے والے کے نکاح میں تھی، تو واہب (ہبہ کرنے والا) ہبہ سے رجوع نہیں کرسکتا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی ہبہ سے رجوع کرنے کی ممانعت کے باب میں لکھتے ہیں:

اَلزَّوْجِیَّۃُ وَقْتَ الْھِبَۃِ،فَلَوْ وَھَبَ لِامْرَأَۃٍ ثُمَّ نَکَحَھَا رَجَعَ وَلَوْ وَھَبَ لِامْرَأَتِہٖ لَا

ترجمہ:''ہبہ کے وقت زوجیت (یعنی نکاح میں ہونا رجوع سے) مانع ہے،لہٰذا اگر کسی عورت کو ہبہ کرکے بعد میں اس سے نکاح کیا،تو ہبہ میں رجوع کرسکتا ہے،اور اگر اپنی بیوی کو ہبہ کیا تو رجوع نہیں کرسکتا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 8،ص:443،داراحیاء التراث العربی،بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:''فی الواقع بعد نکاح جو کچھ تملیکاً دیا،اُس سے رجوع نہیں کرسکتا اور قبل نکاح جو کچھ دیا اُسے بیوی کی مرضی کے بغیر واپس لینا گناہ ہے اور خود چھین لینے کا ہرگز اختیار نہیں،بلکہ عورت نہ دے تو نالش کرکے قاضی کے حکم سے لے سکتا ہے اور گنہگار اس میں بھی ہوگا کہ صحیح حدیث میں فرمایا:اَلْعَائِدُ فِیْ ھِبَتِہٖ کَالْکَلْبِ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِہٖ لَیْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ۔

ترجمہ:''یعنی بری مثال مسلمان کے شایاں نہیں،دے کر لینے والا کتے کی طرح ہے کہ قے کرکے پھر چاٹ لیتا ہے۔

درمختار میں دربارۂ موانع رجوع ہے:اَلزَّوْجِیَّۃُ وَقْتُ الْھِبَۃِ،فَلَوْ وَھَبَ لِامْرَأَۃٍ ثُمَّ نَکَحَھَا رَجَعَ وَلَوْ وَھَبَ لِامْرَأَتِہٖ لَا۔

ترجمہ:''(یعنی ہبہ کرکے رجوع کرنے سے جو امور مانع ہیں،ان میں سے ایک ''موہوب لہا'' کا) ہبہ کے وقت منکوحہ بیوی ہونا،لہٰذا اگر کسی عورت کو ہبہ کرکے بعد میں اس سے نکاح کیا تو اُس ہبہ میں رجوع کرسکے گا اور اگر منکوحہ بیوی کو ہبہ کیا،تو رجوع نہ کرسکے گا''۔اسی میں ہے:لَایَصِحُّ الرُّجُوْعُ اِلَّا بِتَرَاضِیْھِمَا اَوْ بِحُکْمِ الْحَاکِمِ۔

ترجمہ:''باہمی رضامندی سے یا حاکم کے حکم سے ہی رجوع صحیح ہوگا۔

(فتاویٰ رضویہ،جلد 19،ص:388،رضا فاؤنڈیشن،لاہور)

ہبہ (گفٹ) کرکے اس سے رجوع کرنے کو حدیثِ پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ

فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْعَائِدُ فِیْ هِبَتِهٖ کَالْعَائِدِ فِیْ قَیْئِهٖ۔

ترجمہ: ''ہبہ کر کے اس سے رجوع کرنے والا اُس شخص کی طرح ہے جو قے کر کے دوبارہ اسے چاٹ لے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4062)''۔

مَثَلُ الَّذِیْ یَرْجِعُ فِیْ صَدَقَتِهٖ کَمَثَلِ الْکَلْبِ یَقِیْئُ ثُمَّ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِهٖ فَیَأْکُلُهٗ۔

ترجمہ: ''جو شخص صدقہ کر کے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اُس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4058)''۔

(2) سوال میں جو صورتِ مسئلہ آپ نے بیان کی ہے، اگر یہ درست ہے تو نکاح کے بعد آپ کے شوہر نے آپ کو جو فلیٹ ہبہ کیا تھا، وہ آپ کی ملکیت ہے، یہ شرعی حکم ہے، قانونی پوزیشن کیا ہے، یہ کسی وکیل سے دریافت کرلیں۔

آپ کے بیان کے مطابق شوہر آپ کو خلع دینے کے لئے تیار ہے، تو آپ اپنے حق مہر سے دستبردار ہو کر ان سے خلع لے سکتی ہیں، باہمی رضامندی سے خلع طلاقِ بائن کے حکم میں ہوتا ہے، اس کے لئے عدالت جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ دونوں باہمی رضامندی سے اسے تحریری دستاویز کی صورت میں بھی کر سکتے ہیں۔

غیر مدخولہ عورت کا مہر

سوال: 102

میرا نکاح ہوا، رخصتی نہیں ہوئی لیکن وجوہات کی بنا پر یہ رشتہ ختم کرنا پڑ رہا ہے۔ طلاق کی صورت میں حق مہر ادا کرنا ہوگا یا نہیں؟۔

محمد جمال جیلانی، سیکٹر 5-M نارتھ کراچی

جواب:

غیرِ مدخولہ کو طلاق دینے کی صورت میں شوہر پر واجب ہے کہ نصف مہر عورت کو ادا کرے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُم۔

ترجمہ:''اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرۃ:237)''۔

زیور اور مہر کا فرق

سوال:103

اسلام میں عورت کی شادی میں زیور کتنا ہونا چاہئے اور مہر اور زیور میں کیا فرق ہے؟، (ولی الرحمٰن، کراچی)۔

جواب:

نکاح کے لئے شرعاً کسی کثیر رقم کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ نکاح کی استطاعت ہونا ضروری ہے، استطاعت سے مراد یہ ہے کہ نکاح کرنے والا مہر اور نان نفقہ (عورت کا خرچہ) ادا کرسکتا ہو۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنِ اسْتَطَاعَ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ۔

ترجمہ:''تم میں سے جو شخص گھر بسانے کی طاقت رکھتا ہو، وہ نکاح کرلے کیونکہ نکاح نگاہ کو ہوس سے محفوظ رکھتا ہے اور شرم گاہ کی حفاظت کرتا ہے اور جو نکاح کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ لازماً روزے رکھے کیونکہ روزہ (کسی حد تک) شہوتِ نفسانیہ کو کم کرتا ہے''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1905)

شادی کے لئے زیور کوئی ضروری شے نہیں، شریعت میں شادی کا مقصد یہ نہیں جو آج ہمارے معاشرے میں رائج ہے، مثلاً آرائش و زیبائش، جہیز، کپڑے اور زیورات۔ رسول اللہ ﷺ نے خود شادیاں کیں اور اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں اور سادگی کو اپنایا، مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے ہی میں نجات ہے۔

اسلام نے مہر عورت کی تکریم کی علامت کے طور پر مشروع کیا ہے، مہر عورت کا شرعی حق ہے، جو فریقین کی باہمی رضامندی سے طے کیا جاتا ہے۔

مہر کے تعین میں مختلف امور کو دیکھا جاتا ہے، دونوں کی مالی حیثیت، دونوں کی خاندانی حیثیت (Status)۔اپنی حیثیت کے مطابق مہر مقرر کیا جا سکتا ہے اور مہر کی ادائیگی زیور کی صورت میں بھی کی جاسکتی ہے۔

عورت کو رقم دے کر خریدنا

سوال: 104

جو عورت پیسے کے عوض خریدی جائے، اسلام میں اُس کی کیا حیثیت ہے؟۔

ولی الرحمن، کراچی

جواب:

کسی بھی آزاد مرد یا عورت کی خرید و فروخت جائز نہیں، اب چونکہ دورِ غلامی بھی ختم ہو چکا ہے تو کنیزوں اور باندیوں کا تصور بھی موجود نہیں ہے۔اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ کسی عورت کے اولیاء کو رقم دے کر اُس سے نکاح کیا جائے، تو اُن کے لئے اس رقم کا لینا قطعاً جائز نہیں ہے، علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں: لَوْ خَطَبَ امْرَأَةً فِي بَيْتِ أَخِيهَا فَأَبَى الْأَخُ إِلَّا أَنْ يَدْفَعَ إِلَيْهِ دَرَاهِمَ فَدَفَعَ ثُمَّ تَزَوَّجَهَا كَانَ لِلزَّوْجِ أَنْ يَسْتَرِدَّ مَا دَفَعَ لَهُ۔

ترجمہ: ''اگر کسی خاتون کو اس کے بھائی کے گھر نکاح کا پیغام دیا گیا، تو اُس کے بھائی نے رقم کے بغیر رشتہ دینے سے انکار کر دیا، پھر اُس شخص نے اس کے بھائی کو (مطلوبہ) رقم دی، تو اُس کے عوض اس کے بھائی نے اُس شخص کے ساتھ اپنی بہن کا نکاح کر دیا، تو شادی کے بعد شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی بیوی کے بھائی سے وہ رقم واپس لے''۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: أي قائما أو هالكا لأنه رشوة كذا في البزازية۔

ترجمہ: ''یعنی وہ رقم اس کے پاس موجود ہو یا ضائع ہو گئی ہو کیونکہ وہ رشوت ہے (ہر صورت میں اسے اپنی دی ہوئی رقم کے مطالبے کا حق ہے) جیسا کہ ''فتاویٰ بزازیہ'' میں ہے''۔

(البحر الرائق، جلد 3، ص: 324، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

البتہ نکاح کے وقت لڑکی کے لئے مہر مقرر کرنا ضروری ہے، خواہ اس کی ادائیگی فوری طور پر نقد کردی جائے یا یہ طے ہو کہ جب بھی بیوی مطالبہ کرے گی، وہ ادا کردے گا (اس مہر کو عندالطلب بھی کہتے ہیں) یا بیوی نے مہر کے مطالبہ کو مؤجل (Defered) کردیا ہے، تب بھی (بصورتِ طلاق) طلاق کے موقع پر یا موت سے پہلے اُس کی ادائیگی ضروری ہے، اگر زندگی میں ادا نہ کیا ہو اور شوہر نے وصیت بھی نہ کی ہو، تو شوہر کے ترکے سے عورت قرض کے طور پر ترکے کی تقسیم سے پہلے اپنا مہر وصول کرے گی، مگر مہر کی یہ رقم عورت کا حق ہے، اُس کے بھائی یا والد کا نہیں ہے۔

بیوی کا علیحدگی کا مطالبہ کرنا

سوال:105

اگر کوئی عورت شادی کے بعد پہلی شب ہی اپنے شوہر سے علیحدہ گھر کا مطالبہ کرے جبکہ ابھی گھر کے کسی بھی فرد سے کوئی معاملہ ہوا ہی نہیں، تو اس صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟، (ارمان نوشاد، محمد آباد 36/G لانڈھی، کراچی)۔

جواب:

''بیوی کا نفقہ اور رہائش یعنی مصارفِ ضروریہ کی فراہمی شوہر کی ذمہ داری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لِيُنفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنفِقْ مِمَّا اٰتٰهُ اللّٰهُ ط لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰهَا ط

ترجمہ: کشادہ روزگار والا اپنی حیثیت کے مطابق (اپنی بیوی کو) نفقہ دے اور جس پر روزی تنگ کردی گئی ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال میں سے (اپنی حیثیت کے مطابق بیوی کو) نفقہ دے، اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی بساط سے بڑھ کر کسی بات کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا، (الطلاق:7)''۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ط

ترجمہ: ''(اپنی حیثیت کے مطابق) عورتوں کو وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہو اور ان پر تنگی کرنے کے لئے انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ''، (الطلاق:6)۔

علامہ برہان الدین المرغینانی ''الھدایہ'' میں لکھتے ہیں: (وَعَلَى الزَّوْجِ اَنْ يُسْكِنَهَا فِي دَارٍ مُفْرَدَةٍ لَيْسَ فِيهَا أَحَدٌ مِنْ أَهْلِهِ اِلَّا أَنْ تَخْتَارَ ذَالِكَ) لِأَنَّ السُّكْنٰى مِنْ كِفَايَتِهَا فَتَجِبُ لَهَا كَالنَّفَقَةِ وَقَدْ أَوْجَبَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى مَقْرُوْنًا بِالنَّفَقَةِ وَإِذَا وَجَبَ حَقًّا لَّهَا لَيْسَ لَهُ اَنْ يَتْرُكَ غَيْرَهَا فِيهِ لِأَنَّهَا تَتَضَرَّرُ فِيهِ فَإِنَّهَا لَا تَأْمَنُ عَلٰى مَتَاعِهَا وَيَمْنَعُهَا ذَالِكَ مِنَ الْمُعَاشَرَةِ مَعَ زَوْجِهَا وَمِنَ الْاِسْتِمْتَاعِ اِلَّا أَنْ تَخْتَارَ لِأَنَّهَا رَضِيَتْ بِانْتِقَاصِ حَقِّهَا۔

ترجمہ: ''شوہر پر لازم ہے کہ وہ اپنی بیوی کو الگ گھر میں رکھے، جہاں اس کے گھر والوں میں سے کوئی نہ رہتا ہو، ہاں اگر بیوی کو ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض نہیں تو پھر دوسروں کے ساتھ رکھنا بھی درست ہے، کیونکہ ''جائے رہائش'' بیوی کی ضروریات میں سے ہے تو اس کا یہ حق اس طرح واجب ہے جیسے نفقہ، اللہ تعالیٰ نے اس کے وجوب کا حکم نفقہ کے وجوب کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور جب الگ ''جائے رہائش'' بیوی کے حق کے طور پر واجب ہے تو اس پر دوسروں کو اپنے ساتھ ٹھہرانا لازم نہیں ہے، کیونکہ یہ اس کے لئے باعث تکلیف ہو سکتا ہے اور اس کا سامان بھی اس طرح محفوظ نہیں رہے گا، اور شوہر کے ساتھ بلا تکلف میل جول میں بھی (مشترکہ رہائش) رکاوٹ بنے گی اور وہ آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے لطف نہیں اٹھا سکیں گے، ہاں اگر وہ خود ایسی صورت حال پر راضی ہے تو درست ہے کیونکہ اس نے خود ہی اپنا حق کم کر دیا، (ہدایہ، جلد ثالث، ص:327 مکتبۃ البشریٰ، کراچی)''۔

علیحدہ رہائش آپ کی بیوی کا حق ہے، لہٰذا اگر آپ استطاعت رکھتے ہوں تو اُنہیں علیحدہ رہائش کا انتظام کر دیں، ورنہ کم از کم اُسی گھر میں اُن کے لئے علیحدہ کسی حصے یا کمرے کا انتظام کر دیں۔

عورت کے لئے کھانا پکانا اُن کے حالات پر موقوف ہے

سوال: 106

رشتہ طے ہوتے وقت امورِ خانہ داری کے بارے میں والدین کے سوال پر میری

ساس نے کہا تھا کہ میری بیٹی ماسٹر ہے۔شادی کے بعد 14 دن میرے یہاں رہیں اور ان دنوں میں جو کچھ پکایا، وہ کھانے کے لائق ہی نہیں تھا۔ میرے گھر والوں نے اُن کے بھائی اور والدہ سے شکایت کی تو بجائے اصلاح کے کہا کہ یہ نوکرانی نہیں ہے، شریعت کا حکم یہ ہے کہ بیوی کا کام کھانا پکانا نہیں بلکہ شوہر کی ذمہ داری ہے کہ بیوی کو ہوٹل سے لا کر کھانا کھلائے یا پکا کر دے، (ارمان نوشاد، محمد آباد 36/G لانڈھی، کراچی)۔

جواب:

عورت اگر ایسے گھرانے کی ہے کہ اُس گھر کی عورتیں کام نہیں کرتیں اور گھر کا کام کاج ملازمین سے لیا جاتا ہے، تو اب شوہر اُس عورت پر گھر کے کام کاج کے لئے جبر نہیں کر سکتا بلکہ اُس پر لازم ہے کہ اُس کے لئے خادمہ رکھ دے۔ علامہ علاؤالدین ابوبکر مسعود کاسانی متوفی 587ھ لکھتے ہیں: وَذَكَرَ الْفَقِيهُ أَبُو اللَّيْثِ أَنَّ هٰذَا إِذَا كَانَ بِهَا عِلَّةٌ لَا تَقْدِرُ عَلَى الطَّبْخِ وَالْخَبْزِ أَوْ كَانَتْ مِنْ بَنَاتِ الْأَشْرَافِ، فَأَمَّا إِذَا كَانَتْ تَقْدِرُ عَلَى ذَالِكَ وَهِيَ مِمَّنْ تَخْدِمُ بِنَفْسِهَا تُجْبَرُ عَلَى ذَالِكَ۔

ترجمہ: ''اور فقیہ ابو اللیث نے بیان کیا کہ یہ (یعنی عورت کو کھانا پکانے پر مجبور نہ کرنا) اُس وقت ہے، جب اُسے کوئی ایسی بیماری ہو جس کی وجہ سے کھانا پکانے پر قدرت نہ رکھتی ہو یا کسی مُعزز گھرانے کی بیٹی ہو (جہاں عورتیں گھر کے کام کاج نہیں کرتیں) لیکن جب وہ کھانا پکانے پر قدرت رکھتی ہو اور ایسی عورتوں میں سے ہو جو عموماً اپنا کام کاج خود کیا کرتی ہیں، تو اسے کھانا پکانے پر مجبور کیا جائے گا، (بدائع الصنائع، جلد رابع، ص: 34)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَإِنْ قَالَتْ لَا أَطْبُخُ وَلَا أَخْبِزُ، قَالَ فِي الْكِتَابِ لَا تُجْبَرُ عَلَى الطَّبْخِ وَالْخَبْزِ، وَعَلَى الزَّوْجِ أَنْ يَأْتِيَهَا بِطَعَامٍ مُهَيَّأً أَوْ يَأْتِيَهَا بِمَنْ يَكْفِيهَا عَمَلَ الطَّبْخِ وَالْخَبْزِ، قَالَ الْفَقِيهُ أَبُو اللَّيْثِ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى: إِنِ امْتَنَعَتِ الْمَرْأَةُ عَنِ الطَّبْخِ وَالْخَبْزِ إِنَّمَا يَجِبُ عَلَى الزَّوْجِ أَنْ يَأْتِيَهَا بِطَعَامٍ مُهَيَّأً إِذَا كَانَتْ مِنْ بَنَاتِ الْأَشْرَافِ لَا تَخْدِمُ بِنَفْسِهَا فِي أَهْلِهَا، أَوْ لَمْ تَكُنْ مِنْ بَنَاتِ الْأَشْرَافِ

لٰكِنْ بِهَا عِلَّةٌ تَمْنَعُهَا مِنَ الطَّبْخِ وَالْخُبْزِ أَمَّا إِذَا لَمْ تَكُنْ كَذَالِكَ فَلَا يَجِبُ عَلَى الزَّوْجِ أَنْ يَأْتِيَهَا بِطَعَامٍ مُهَيَّأً كَذَا فِي "الظَّهِيرِيَّةِ"۔

ترجمہ: ''اگر عورت کہتی ہے کہ وہ سالن اور روٹی نہیں پکائے گی، تو کتاب میں ہے کہ اُسے روٹی اور سالن پکانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور شوہر پر لازم ہے کہ اُسے تیار کھانا دے یا کسی (خادم یا خادمہ) کا انتظام کرے جو کھانا تیار کردے، فقیہ ابواللیث رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: عورت اگر کھانا پکانے سے انکار کرتی ہے، اگر وہ ایسے گھرانے سے ہے کہ اُس گھرانے کی عورتیں اپنے گھریلو کام خود نہیں کرتیں، یا وہ ایسے گھرانے کی نہیں ہے لیکن اسے کوئی ایسی بیماری یا تکلیف ہے جس کے سبب وہ روٹی، سالن پکا سکتی ہے، تو شوہر پر لازم ہے کہ اُسے تیار کھانا دے اور اگر ان میں سے کوئی صورت نہیں ہے تو شوہر پر بیوی کو تیار کھانا دینا لازم نہیں ہے، ''ظہیریہ'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 548، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

فقہاءِ کرام کے ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ بیوی پر ہر صورت میں گھریلو کام کاج اور کھانا پکانا لازم نہیں ہے، یہ ان کے خاندانی پس منظر اور حالات پر موقوف ہے۔ اگر آپ کی بیوی کے خاندان میں عورتیں گھریلو کام کاج اور کھانا پکانے کے کام کرتی ہیں، تو آپ کی بیوی کو بھی یہ کام کرنے ہوں گے، اگر اُنہیں کھانا پکانا نہیں آتا تو آپ کے گھر کی خواتین کو پیار و محبت سے اسے سکھانا چاہئے۔ اور اگر اُن کے خاندان میں خادم یا خادمہ کام کرتی ہیں، تو آپ انہیں ان کاموں پر مجبور نہیں کرسکتے بلکہ آپ کو کوئی انتظام کرنا ہوگا کیونکہ نان نفقہ کی فراہمی شوہر کی ذمہ داری ہے۔ اسلام نے خوش گوار عائلی زندگی کا مدار زوجین کے ایک دوسرے کے ساتھ فضل و احسان، مروّت اور حسنِ سلوک پر رکھا ہے۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی حقوق الزوجین سے متعلق لکھتے ہیں:

مسئلہ: کھانا پکانے کے تمام برتن اور سامان شوہر پر واجب ہے، مثلاً چکی، ہانڈی، توا، چمٹا، رکابی، پیالہ، چمچہ وغیرہا جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے حسبِ حیثیت اعلیٰ، ادنیٰ متوسط۔

یوہیں حسب حیثیت اثاث البیت دینا واجب، مثلاً چٹائی، دری، قالین، چارپائی، لحاف، توشک، تکیہ، چادروغیرہا۔ یوہیں کنگھا، تیل، سر دھونے کے لئے کھلی وغیرہ اور صابن یا بیسن میل دور کرنے کے لئے اور سرمہ، مسی، مہندی دینا شوہر پر واجب نہیں، اگر لائے تو عورت کو استعمال ضروری ہے۔ عطر وغیرہ خوشبو کی اتنی ضرورت ہے جس سے بغل اور پسینہ کی بو دفع کر سکے۔

مسئلہ: غسل و وضو کا پانی شوہر کے ذمہ ہے عورت غنی ہو یا فقیر۔

مسئلہ: عورت اگر چائے یا حقہ پیتی ہے تو ان کے مصارف شوہر پر واجب نہیں اگرچہ نہ پینے سے اُس کو ضرر پہنچے گا، یوہیں پان، چھالیا، تمبا کو شوہر پر واجب نہیں۔

مسئلہ: عورت بیمار ہو تو اُس کی دوا کی قیمت اور طبیب کی فیس شوہر پر واجب نہیں۔ فصد یا پچھنے کی ضرورت ہو تو یہ بھی شوہر پر نہیں۔

مسئلہ: بچہ پیدا ہو تو جنائی کی اُجرت شوہر پر ہے اگر اس نے بُلایا۔ اور عورت پر ہے اگر عورت نے بلوایا۔ اور اگر وہ خود بغیر ان دونوں میں کسی کے بلائے آجائے تو ظاہر یہ ہے کہ شوہر پر ہے۔

مسئلہ: سال میں دو جوڑے کپڑے دینا واجب ہے ہر ششماہی پر ایک جوڑا جب ایک جوڑا کپڑا دیدیا تو جب تک مدت پوری نہ ہو دینا واجب نہیں اور اگر مدت کے اندر پھاڑ ڈالا اور عادۃً جس طرح پہنا جاتا ہے اُس طرح پہنتی تو نہیں پھٹتا تو دوسرے کپڑے اس ششماہی واجب نہیں ورنہ واجب ہیں اور اگر مدت پوری ہوگئی اور جوڑا باقی ہے تو اگر پہنا ہی نہیں یا کبھی اس کو پہنتی تھی اور کبھی اور کپڑے اس سے باقی ہے تو اب دوسرا جوڑا دینا واجب ہے اور اگر یہ وجہ نہیں بلکہ کپڑا مضبوط تھا اس وجہ سے نہیں پھٹا تو دوسرا جوڑا واجب نہیں۔

(بہار شریعت، جلد:02، ص:266-67، مطبوعہ: مکتبۃ المدینہ)

خاتون کے پہلے شوہر سے اولاد کی کفالت دوسرے شوہر کی ذمہ داری نہیں ہے

سوال: 107

ایک عورت جس کے پہلے شوہر سے 3 بچے موجود ہیں۔ ایک شخص نے اُس

عورت کے بچوں کی دیکھ بھال کا وعدہ کر کے اُس سے نکاح کیا۔عورت کے پہلے شوہر کا مکان اور پلاٹ بھی ہے،اب وہ دوسرا شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت اپنے پہلے شوہر کا مال اُس کے سپرد کر دے،جبکہ عورت اُس سے اپنے بچوں کی پرورش اور اخراجات پورے کرتی ہے۔ دوسرا شوہر عورت سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ بچوں کو خود سے الگ کر کے اکیلے مرد کے ساتھ رہے،کیا یہ صحیح ہے؟۔

اُس شخص کی دو بیویاں ہیں،پہلی سے اولاد ہے اور دوسری بیوی کے پہلے شوہر سے تین بچے ہیں۔اُس شخص نے پہلی بیوی،بچوں کو گھر،خرچہ،نان نفقہ ہر چیز دے رکھی ہے اور دوسری بیوی پر کچھ خرچ نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ تم اپنے سابقہ شوہر کی جائیداد سے اپنا خرچہ پورا کرو۔ مرد کے ذمے عورت کے کیا حقوق ہیں؟،کیا دوسری بیوی کا اپنے شوہر کی کمائی پر کوئی حق نہیں ہے؟۔

کیا شوہر اسے گھر اور نان نفقہ نہیں دے گا اور اگر گھر دے گا تو اس میں پہلے شوہر کے بچے نہیں رہیں گے؟۔حالانکہ رہنے کے علاوہ سب خرچہ پہلے شوہر کا ہی ہو رہا ہے۔مرد کی کمائی ایک لاکھ پچاس ہزار روپے ماہانہ ہے دوسری بیوی کے حصے میں اندازاً کتنا آئے گا؟۔

مرد نے نکاح کے وقت دس لاکھ روپیہ اور 25 تولے سونا حق مہر عندالطلب لکھا ہے،کیا عورت وہ لینے کا حق رکھتی ہے؟،(مسز نورین،بلاک 3 گلستان جوہر،کراچی)۔

جواب:

نکاح کے نتیجے میں مرد پر عورت کے جو حقوق واجب ہوتے ہیں،اُن میں بیوی کا نان نفقہ،بنیادی ضروریات اور رہائش کا انتظام کرنا شوہر کے ذمے ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ ط لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰهَا ط

ترجمہ:"گنجائش والے کو چاہیے کہ وہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچہ دے اور جس پر رزق کی تنگی ہو تو وہ اسی میں سے (حسب حیثیت) خرچہ دے جو اللہ نے اسے دیا ہے،اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کے مطابق جو اس نے اسے عطا کر رکھا ہے"،(الطلاق:7)۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ محمود آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ مالدار اور تنگدست میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق اپنی بیوی کو نفقہ دے، (روح المعانی ج 15 ص 207)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ ۚ

ترجمہ: ''اپنی بیویوں کو وہاں رکھو، جہاں اپنی حیثیت کے مطابق تم خود رہتے ہو، اور ان پر تنگی کرنے کے لئے انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ، (الطلاق:6)''۔

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں: ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے یوں پڑھا ہے کہ جہاں تم خود رہتے ہو وہاں اپنی بیویوں کو رکھو اور اپنی مالی حیثیت کے مطابق انہیں نفقہ دو، (روح المعانی جلد:15 صفحہ:206)''۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث خطبۂ حجۃ الوداع کی بابت مذکور ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ''عورتوں کا شوہروں پر یہ حق ہے کہ دستور کے مطابق انہیں نفقہ دیں''۔

علامہ محمود آلوسی روح المعانی جلد نمبر 15 صفحات 206,205 پر " أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم " کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

من تبعیض کے لئے ہے، یعنی اپنے رہائشی مکان کے کسی حصے میں اپنی بیوی کو رہائش دو''۔

اور " وَلَا تُضَارُّوهُنَّ " کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''کہ رہائش میں انہیں تکلیف نہ دو''۔

اور " لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ " کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''یوں کہ مکان یا مکان میں بیوی کے لئے مخصوص رہائشی حصے کو کسی دوسرے استعمال میں لا کر، یا اس کے ساتھ ایسے افراد کو ٹھہرا کر، جن کے ساتھ وہ رہنا نہیں چاہتی (ایسے طریقوں سے)، اسے تکلیف پہنچا کر گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا جائے قرآن کی رو سے منع ہے''۔ شریعت کی رو سے شوہر پر اپنی حیثیت کے مطابق بیوی کو جائے رہائش دینا لازم ہے، اگر وہ اتنی مالی استطاعت رکھتا ہے کہ اسے علیحدہ مکان میں رکھ سکے تو ایسا ہی کرے اور اگر اس کی مالی حیثیت بیوی کو علیحدہ مکان دینے

کی متحمل نہیں ہے تو پھر بھی بیوی کا یہ حق ہے کہ مشترکہ فیملی مکان میں اس کے لئے علیحدہ کمرہ یا حصہ مختص ہونا چاہیے، جس میں دوسروں کا عمل دخل نہ ہو، اور اس علیحدہ حصے یا کمرے کے ساتھ باورچی خانہ، بیت الخلاء اور لازمی ضروریات کا اہتمام بھی ہو اور ایسی سہولت ہو کہ وہ اپنے علیحدہ حصے یا کمرے کو بند کر سکے۔

مذکورہ سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس شخص نے دوسرا نکاح محض عورت کے مال کے سبب کیا ہے، کسی عورت سے اُس کے مال و دولت کی خاطر نکاح کرنا ناپسندیدہ ہے اور حدیث مبارک میں ممانعت وارد ہوئی ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تَزَوَّجُوا النِّسَاءَ لِحُسْنِهِنَّ، فَعَسٰی حُسْنُهُنَّ أَنْ يُرْدِيَهُنَّ، وَلَا تَزَوَّجُوْهُنَّ لِأَمْوَالِهِنَّ فَعَسٰی أَمْوَالُهُنَّ أَنْ تُطْغِيَهُنَّ وَلٰكِنْ تَزَوَّجُوْهُنَّ عَلَى الدِّيْنِ،

ترجمہ: ''عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورتوں سے اُن کے حسن کے سبب نکاح نہ کرو، ممکن ہے اُن کا حسن اُنہیں (پستی میں گرادے) اور نہ ہی عورتوں سے اُن کے مال کے سبب نکاح کرو، ممکن ہے کہ ان کا مال انہیں سرکشی پر آمادہ کرے، عورتوں سے اُن کے دین (یعنی دینداری) کے سبب نکاح کرو''۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1859)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً لِعِزِّهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ اِلَّا ذُلًّا وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِمَالِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ اِلَّا فَقْرًا۔

ترجمہ: ''جو شخص کسی عورت سے اُس کی عزت (Social Status) کے سبب نکاح کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس کی ذلت میں اضافہ فرمادے گا اور جو شخص کسی عورت سے اُس کے مال کے سبب نکاح کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے فقر و تنگ دستی میں اضافہ فرمادے گا''۔

(المعجم الاوسط للطبرانی، رقم الحدیث: 2363)

مرد کے دوسرا نکاح کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ وہ دونوں ازواج کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، دونوں کے درمیان عدل قائم کرے، یعنی دونوں کو ایک معیار کی

رہائش، ایک ہی معیار کی خوراک اور مصارف زندگی فراہم کرے اور دونوں میں ایام کی تقسیم بھی برابر برابر کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً .

ترجمہ: ''یعنی اگر تمہیں خدشہ ہو کہ ایک سے زیادہ ازواج کے درمیان تم عدل قائم نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو، (النساء:3)''۔

اس آیت میں دلیل ہے کہ جو شخص مالی اور جسمانی طور پر متعدد بیویاں رکھ سکتا ہو، وہ بشرط عدل وانصاف ایک سے زیادہ نکاح کر سکتا ہے یعنی ایک وقت میں چار تک، اور اگر وہ عدل وانصاف کے تقاضے پورے نہ کر سکے، تو وہ صرف ایک بیوی کو نکاح میں رکھے۔ شرعاً قیامِ عدل کی شرط کا لحاظ کرتے ہوئے ایک سے زائد نکاح کی اجازت ہے بشرطیکہ تمام ازواج کے درمیان ایام کی تقسیم برابر برابر کرے اور رہائش، لباس اور طعام (یعنی نان نفقہ) کا معیار بھی یکساں رکھے۔ احادیث مبارکہ میں ہے: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ، عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ كَانَتْ لَهُ امْرَأَتَانِ فَمَالَ اِلٰى اِحْدَاهُمَا: جَآءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَشِقُّهٗ مَائِلٌ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ اُن میں (عدل قائم نہ کرتا ہو بلکہ) صرف ایک کی طرف میلان رکھتا ہو تو قیامت کے دن اِس طرح حاضر ہوگا کہ اُس کا آدھا دھڑ مائل (جھکا ہوا) ہوگا، (سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2126)''۔

ترمذی کی روایت میں ہے: اِذَا كَانَ عِنْدَ الرَّجُلِ امْرَأَتَانِ فَلَمْ یَعْدِلْ بَیْنَهُمَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَشِقُّهٗ سَاقِطٌ۔

ترجمہ: ''جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ اُن کے درمیان عدل نہیں کرتا، تو قیامت کے دن اِس طرح حاضر ہوگا کہ اُس کا آدھا دھڑ ساقط (بے کار) ہوگا''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1141)

مہر عورت کا شرعی حق ہے جسے وصول کرنے کا اختیار عورت کو حاصل ہے، مہر کسی بھی قسم کا ہو بہر کیف اُس کی ادائیگی لازم ہے۔

جیسا کہ سوال میں درج ہے کہ شوہر نے دس لاکھ روپے اور پچیس تولے سونا مہر عندالطلب

مقرر کیا تھا، تو بیوی کے مطالبہ پر شوہر کے ذمے ادائیگی لازم ہے۔شریعت کی رُو سے شوہر پر لازم ہے کہ دونوں بیویوں کو ایک معیار کا نان نفقہ (یعنی یکساں معیار کی رہائش گاہ اور مصارف زندگی) فراہم کرے اور دونوں کے درمیان ایام کی تقسیم بھی برابر کرے۔سوال میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں، اگر درست ہیں تو شوہر کا برتاؤ دوسری بیوی کے ساتھ عادلانہ نہیں ہے اور یہ شریعت کی صریح خلاف ورزی ہے۔پہلی بیوی کے پاس جو اپنا موروثی اور سابق شوہر کے ترکے سے مال ہے اس پر دوسرے شوہر کا کوئی حق نہیں ہے، البتہ دوسری بیوی کی پہلے شوہر سے اولاد کا نان نفقہ اور کفالت ونگہداشت دوسرے شوہر کے ذمے نہیں ہے، البتہ وہ اپنے باپ کے ترکے سے اپنے حصے کے حق دار ہیں اور اسی سے ان پر خرچ کیا جائے۔

اپنی بیوی کی پہلے شوہر سے اولاد کو دوسرا شوہر اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کرسکتا ہے، لیکن بیوی کو اپنی اولاد سے میل ملاپ اور حسن سلوک سے منع کرنا قطعِ رحمی ہے اور قاطع رحم کے لئے حدیث پاک میں شدید وعید آئی ہے۔اس کا ایک متوازن حل یہ ہے کہ شوہر اپنی دوسری بیوی کو ایک ایسا مکان دلا دے جس کے دو حصے ہوں، ایک حصہ جس میں میاں بیوی رہیں، اتنے حصے کا کرایہ اور بیوی کا خرچہ وہ شوہر ادا کرے اور دوسرے حصہ کا کرایہ اور بچوں کا خرچہ بیوی اپنے مال اور پہلے شوہر کے ترکے سے پورا کرے، یہ شوہر کی طرف سے تبرُّع، فضل واحسان اور حسنِ سلوک ہوگا، جس پر وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ماجور ہوگا۔

حقِ پرورش کا استحقاق کسے حاصل ہے؟

سوال: 108

میرے داماد سید منصور حسین کے والد سید حامد حسین نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی سے ایک بیٹی آپا بیگم (مرحومہ) اور ایک بیٹا اقبال حسین (مقیم امریکا) ہیں۔دوسری بیوی سعادت بیگم اپنے پہلے شوہر کی بیٹی شہناز بیگم کے ساتھ منصور کے والد کے نکاح میں آئیں اور بعد میں اُن سے سید منصور حسین تولد ہوئے، جو میرے داماد ہیں۔میری بیٹی رفعت قریشی کے انتقال کے بعد میرے داماد سید منصور حامد نے میری بھتیجی رخشندہ سے دوسرا

نکاح کیا، لیکن چار ماہ بعد ہی داماد کا انتقال ہوگیا۔ سید مصطفیٰ منصور عمر 9 سال (رفعت کا بیٹا) میرا حقیقی نواسا ہے۔ میرے داماد سید منصور حسین کی سوتیلی بہن شہناز بیگم میرے نواسے مصطفیٰ منصور کو لے کر اپنی بیٹی کے گھر رہ رہی ہیں۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ میرے نواسے مصطفیٰ منصور کے والدین کے انتقال کے بعد اُس کی پرورش کا حق کسے حاصل ہے؟۔

(1) سگی نانی (راحت النساء) کو، (2) سگے ماموں (فرید محمد) کو، (3) سگی خالہ (قدسیہ قریشی) کو، (4) سوتیلی ماں (رخشندہ کو) یا (5) شہناز بیگم جو سید مصطفیٰ منصور کی سوتیلی پھوپھی ہے؟۔ (راحت النساء، النور سوسائٹی F.B ایریا، کراچی)۔

جواب:

آپ نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے اس کی رُو سے مصطفیٰ منصور کی چونکہ والدہ وفات پا چکی ہے، اس لئے اس کی پرورش و نگہداشت کا حق اس کی ماں کی عدم موجودگی میں اس کی سگی نانی راحت النساء کا ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

"اَلْحِضَانَةُ" تَثْبُتُ لِلْاُمِّ ـــــــــــــــــ (ثُمَّ) اَیْ بَعْدَ الْاُمِّ بِاَنْ مَاتَتْ اَوْ لَمْ تَقْبَلْ اَوْ اَسْقَطَتْ حَقَّهَا اَوْ تَزَوَّجَتْ بِاَجْنَبِیِّ (اُمُّ الْاُمِّ)

ترجمہ: ''بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے ـــــــــــــــــ آگے چل کر لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''ماں فوت ہو جائے یا بچے کو قبول نہ کرے یا اپنا حقِ حضانت (پرورش) ساقط کر دے، یا کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح کر لے جو بچے کے لئے اجنبی ہے، تو پھر ماں کے بعد نانی کو پرورش کا حق ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5 ص: 203، 211، 212 مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی)

تاہم حقِ حضانت لڑکے کے لئے فقہاء کرام نے اس کی مدت سات سال بتائی ہے اور مصطفیٰ منصور ماشاءاللہ نو سال کے ہو چکے ہیں، اب اس کی تربیت کا زیادہ حق اس کے چچا کو ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: ثُمَّ الْعَصَبَاتُ بِتَرْتِیْبِ الْاِرْثِ، فَیُقَدَّمُ الْاَبُ ثُمَّ الْجَدُّ ثُمَّ الْاَخُ الشَّقِیْقُ، ثُمَّ لِاَبٍ ثُمَّ بَنُوْهُ کَذَالِکَ، ثُمَّ الْعَمُّ

ترجمہ: ''پھر عصبہ مرد حضرات وارث ہونے کی ترتیب پر یعنی پہلے باپ، پھر دادا، پھر حقیقی

بھائی، پھر باپ کی طرف سے علاتی بھائی، پھر بھائی کے بیٹے اسی ترتیب پر، پھر چچا''۔
(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 5، ص: 213، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

قطعِ رحمی حرام ہے

سوال: 109

میری بیوی پانچ ماہ سے میکے گئی ہوئی ہیں۔ وہ حاملہ تھیں، اس دوران بیٹے کی ولادت بھی ہوگئی۔ ہماری کوئی ناراضی نہیں تھی، مگر سسرال والے بیوی اور بچے کو مجھ سے نہیں ملنے دیتے اور نہ کوئی رابطہ کرتے ہیں۔ شریعت کی رو سے ان کا یہ عمل کیسا ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟۔ (عبداللہ، نارتھ کراچی)۔

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے تو اس کی روشنی میں آپ کے سسرال والوں کا طرزِ عمل شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ بیوی کو شوہر یا بیٹے کو باپ سے ملنے نہ دینا، قطعِ رحمی، سنگ دلی اور شقاوت ہے۔ رسولِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ
ترجمہ: ''قطع رحمی (یعنی قرابت کے رشتے کو توڑنے والا) کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5984)''۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ، وَيُنْسَأَلَهُ فِي أَثَرِهِ، فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ۔
ترجمہ: ''جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اُس کے رزق میں کشادگی ہو اور اُس کی عمر دراز ہو تو اُسے چاہیے کہ صِلۂ رحمی کیا کرے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5986)''۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: اَلرَّحِمُ شُجْنَةٌ، فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَهَا قَطَعْتُهُ۔
ترجمہ: ''رحم ایک شاخ کی مانند ہے جو اُس سے ملے گا تو میں اُس سے ملوں گا اور جو اُس سے تعلق ختم کرے گا تو میں اُس سے قطع تعلق کرلوں گا''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5989)

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔رسول پاک ﷺ نے فرمایا:
اَلرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ:مَنْ وَصَلَنِیْ وَصَلَهُ اللّٰهُ،وَمَنْ قَطَعَنِی قَطَعَهُ اللّٰهُ۔
ترجمہ:''رحم'' عرش (الٰہی) کے ساتھ مُعلّق شاخ کی مانند ہے۔وہ کہتا ہے کہ جو مجھے ملا کر رکھے گا، اللہ تعالیٰ اسے اپنے ساتھ ملائے گا اور جو مجھے توڑے گا، اللہ تعالیٰ اس کا رشتہ اپنی ذات سے توڑے گا،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:614)''۔

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ أَعْمَالَ بَنِیْ آدَمَ تُعْرَضُ كُلَّ خَمِيْسٍ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ،فَلَا يُقْبَلُ عَمَلُ قَاطِعِ رَحِمٍ۔
ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بنی آدم کے تمام اعمال ہر جمعرات شبِ جمعہ پیش کئے جاتے ہیں، پس قطع رحمی کرنے والے کا (کوئی) عمل قبول نہیں کیا جاتا''۔
(مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث:10272)

والدین کو چاہئے کہ اپنی بیٹی کو اس کے گھر میں بسنے دیں۔قرآن مجید میں اہلِ بابل کی شقاوت اور سرکشی کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی جس صفتِ مذمومہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ میاں بیوی میں تفریق ہے:

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ:''اور انہوں نے اس (جادو کے کفریہ کلمات) کی پیروی کی جسے سلیمان کے دورِ حکومت میں شیطان پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا، البتہ شیاطین ہی کفر کرتے تھے۔وہ لوگوں کو جادو (کے کفریہ کلمات) سکھاتے تھے اور انہوں نے اس (جادو)

کی پیروی کی، جو شہر بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اتارا گیا تھا۔ اور وہ (فرشتے) اس وقت تک کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک کہ یہ نہ کہتے: ہم تو صرف آزمائش ہیں، تو تم کفر نہ کرو۔ وہ ان سے اس چیز کو سیکھتے جس کے ذریعے وہ شوہر اور اس کی بیوی کے درمیان علیحدگی کرا دیتے، اور اللہ کی منشا کے بغیر وہ اس (جادو) سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ وہ اس چیز کو سیکھتے جو انہیں نقصان پہنچائے اور انہیں نفع نہ دے، اور بے شک، وہ خوب جانتے تھے کہ جس نے اُس (جادو) کو خرید لیا، اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور وہ کیسی بری چیز ہے جس کے بدلے میں انہوں نے اپنے آپ کو فروخت کر ڈالا، کاش، وہ یہ جان لیتے، (البقرہ: 102)"۔

قرآن مجید نے نافرمان بیوی کو "ناشزہ" سے تعبیر کیا ہے۔ ناشزہ یعنی شوہر کی بلا سبب نافرمانی کرنے والی عورت کے بارے میں حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَا دَعَاالرَّجُلُ امْرَأَتَهُ اِلٰى فِرَاشِهِ فَأَبَتْ، فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَيْهَا، لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتّٰى تُصْبِحَ ۔

ترجمہ: " حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ آنے سے انکار کر دے، اور شوہر غصے میں رات گزارے تو صبح تک اس (نافرمان) عورت پر فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 3237)"۔

شوہر کی اطاعت گزار بیوی کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّةَ ۔

ترجمہ: "اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کسی عورت کا اس حال میں انتقال ہو کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہو، وہ جنت میں داخل ہو گی، (سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 1161)"۔

حقوق الزوجین کے بارے میں رسول کریم ﷺ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ نہایت

واضح ہیں۔آپ اپنی ازواج کی دل داری فرمایا کرتے تھے۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ:قَالَ لِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : اِنِّي لَأَعْلَمُ اِذَا كُنْتِ عَنِّي رَاضِيَةً ،وَاِذَا كُنْتِ عَلَيَّ غَضْبٰى ـ قَالَتْ:فَقُلْتُ:مِنْ اَيْنَ تَعْرِفُ ذَالِكَ ؟،فَقَالَ: أَمَّا اِذَا كُنْتِ عَنِّي رَاضِيَةً،فَاِنَّكِ تَقُوْلِيْنَ:لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ،وَاِذَا كُنْتِ غَضْبٰى ، قُلْتِ:لَا وَرَبِّ اِبْرَاهِيْمَ،قَالَتْ: قُلْتُ: أَجَلْ، وَاللّٰهِ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ،مَا أَهْجُرُ اِلَّا اسْمَكَ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول مکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا:''تم مجھ سے کب راضی ہوتی ہو اور کب ناراض، میں خوب جانتا ہوں،حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: آپ یہ بات کیسے جانتے ہیں؟ارشاد فرمایا: جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو تو کہتی ہو: رب محمد ﷺ کی قسم!اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتو کہتی ہو: رب ابراہیم کی قسم!''۔ یہ سن کر میں نے عرض کی:''جی ہاں۔(ایسا ہی ہے مگر)اے اللہ کے رسول!اللہ کی قسم! میں ایسے موقع پر غیر اختیاری حالت میں آپ کا نام نہیں لیتی،(ورنہ میرا دل ہر حال میں آپ کی محبت میں غرق رہتا ہے اور آپ کی محبت میرے رگ و پے میں سرایت کیے ہوتی ہے)''۔

(صحیح بخاری،رقم الحدیث:5228،مسند امام احمد بن حنبل،رقم الحدیث:24318)

آپ بھی اپنے رویے پر غور کریں،ہوسکتا ہے آپ کے نارواروپے کی وجہ سے آپ کی بیوی اور سسرال والوں کے دلوں میں آپ سے شدید نفرت پیدا ہوگئی ہو۔اگر ایسا ہے تو اس کی تلافی کریں،اپنا رویہ درست کریں،بیوی کو اس کا جائز مقام دیں اور باہمی اکرام وتکریم کی فضا پیدا کریں۔

طلاق کے مسائل

ایک طلاق دے کر تین طلاقیں مراد لینے کا حکم

سوال:110

زید نے اپنی بیوی کو کہا: ''میں نے تجھے طلاق دی''، اب اس کے بعد زید کہتا ہے کہ اس سے میری مراد تین طلاقیں تھیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایک طلاق صریح بول کر تین مراد لی جاسکتی ہیں یا نہیں؟، کتب فقہ حنفیہ سے اس مسئلے کو بیان کریں۔

محمد عبداللہ قادری، لیاقت آباد، کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں ایک طلاقِ رجعی واقع ہو جائے گی، اگر چہ زید کی نیت اُس کے خلاف ہو کیونکہ الفاظِ صریح میں نیت کی حاجت نہیں ہوتی۔

علامہ برہان الدین علی بن ابو بکر فرغانی المرغینانی لکھتے ہیں: وَلَا یَفْتَقِرُ اِلَی النِّیَّةِ، لِأَنَّهُ صَرِیْحٌ فِیْهِ، لِغَلَبَةِ الْاِسْتِعْمَالِ۔

ترجمہ: ''اور یہ (یعنی صریح الفاظ) نیت کے محتاج نہیں ہوتے، کہ کثرتِ استعمال کی وجہ سے (اپنے معنی میں) صریح ہیں، (ہدایہ، جلد 3، ص:143)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَهُوَ کَأَنْتِ طَالِقٌ وَمُطَلَّقَةٌ وَطَلَّقْتُكِ وَتَقَعُ وَاحِدَةٌ رَّجْعِیَّةٌ وَاِنْ نَوَی الْأَکْثَرَ أَوِ الْاِبَانَةَ أَوْلَمْ یَنْوِ شَیْئًا کَذَا فِی الْکَنْزِ۔

ترجمہ: ''وہ (یعنی صریح الفاظ) جیسے کہ ''تجھے طلاق ہے''، ''تو طلاق یافتہ ہے''، ''میں نے تجھے طلاق دی''، سے ایک طلاقِ رجعی واقع ہو جائے گی اگر چہ (ایک سے) زائد کی نیت ہو یا بائن کی نیت ہو یا کچھ بھی نیت نہ ہو، ''کنز'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:354، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (صَرِیْحُهٗ مَالَمْ یُسْتَعْمَلْ اِلَّا فِیْهِ کَطَلَّقْتُكِ وَأَنْتِ طَالِقٌ وَّمُطَلَّقَةٌ وَیَقَعُ بِهَا وَاحِدَةٌ رَّجْعِیَّةٌ، وَاِنْ نَوَی خِلَافَهَا) مِنَ الْبَائِنِ أَوْ أَکْثَرَ

خِلَافًا لِلشَّافِعِيِّ (أَوْلَمْ يَنْوِ شَيْئًا)

ترجمہ: ''طلاق کے صریح الفاظ جو طلاق کے سوا دوسرے معنی میں استعمال نہ ہوتے ہوں، جیسے میں نے تجھے طلاق دی، تجھے طلاق ہے، تو طلاق یافتہ ہے، اِن سب الفاظ سے ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگی، خواہ (ایک رجعی) کے خلاف کا ارادہ کیا ہو یعنی بائن کا یا ایک سے زیادہ طلاقوں کا، (اس کی یہ نیت لغو ہے)، بخلاف امام شافعی کے (یعنی اُن کے نزدیک بائن یا ایک سے زیادہ کی نیت معتبر ہوگی)، یا طلاقِ صریح بول کر کچھ ارادہ نہ کیا ہو (تو بھی ایک طلاق رجعی واقع ہوگی)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 337، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوگی اور شوہر کا تین کی نیت کرنا لغو ہے۔

نکاح کے بعد عائد کردہ شرطِ طلاق لاگو ہوتی ہے یا نہیں؟

سوال: 111

(ز) کا نکاح (ح) سے ہوا اور یہ شرط رکھی گئی کہ ''ز'' کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کرسکتا۔ اقرار نامہ میں لکھا گیا کہ: ''مسماۃ ''ح'' سے نکاح ہو جانے کے بعد اُن کے علاوہ جس عورت سے جب بھی اور جتنی بار نکاح کروں، تو مندرجہ ذیل صورتوں کے علاوہ، وہ عورت مجھ پر تین طلاق ہے۔

۱۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق مسماۃ ''ح'' عقیم (بانجھ) ہو۔ ۲۔ ''ح'' میری سازش کے بغیر طبعی موت مرجائے۔ ۳۔ مسماۃ ''ح'' کسی دائمی مرض میں مبتلا ہو جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اِس شرط کے تحت ''ز'' کسی اور عورت سے نکاح نہیں کرسکتا، اگر کرے گا، تو کیا اُس عورت کو طلاق واقع ہو جائے گی؟ (میاں محمد شفیق، بہاول گڑھ تحصیل کہروڑپکا)۔

جواب:

طلاق کو کسی شرط پر معلق کرتے وقت اگر طلاق کی نسبت مِلک یا سببِ مِلک کی طرف کی گئی ہے، تو شرط پائے جانے کی صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی، جیسے اپنی

منکوحہ بیوی سے کہے: اگر میں اپنے والد کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہوں، تو تجھے طلاق ہے یا اگر میں اپنے والد کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہوں، تو جس عورت سے بھی میں نکاح کروں، اُسے طلاق ہے، تو ان دوصورتوں میں اگر وہ والد کے ساتھ ایک مکان میں رہنے لگے، تو طلاق واقع ہوجائے گی، یعنی اگر طلاق کی نسبت مِلک (یعنی باقاعدہ منکوحہ بیوی) یا سببِ مِلک (جس خاتون سے جب بھی نکاح ہوگا یا کروں گا) پایا جائے، تو طلاق واقع ہوجائے گی، یہاں سوال میں آپ نے درج کیا ہے کہ: ''مسماۃ ''ح'' سے نکاح ہوجانے کے بعد اُن کے علاوہ جس عورت سے جب بھی اور جتنی بار نکاح کروں، تو مندرجہ ذیل صورتوں کے علاوہ وہ عورت مجھ پر تین طلاق ہے''، لہٰذا مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ، جن کا استثناء کیا گیا ہے، جب بھی ''ز'' کسی عورت سے نکاح کرے گا، تو اُس عورت کو تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَلَا تَصِحُّ اِضَافَةُ الطَّلَاقِ اِلَّا أَنْ يَّكُوْنَ الْحَالِفُ مَالِكًا أَوْ يُضِيْفَهٗ اِلٰى مِلْكٍ وَالْاِضَافَةُ اِلٰى سَبَبِ الْمِلْكِ كَالتَّزَوُّجِ كَالْاِضَافَةِ اِلَى الْمِلْكِ۔

ترجمہ: ''اور طلاق کی نسبت تب مؤثر ہوتی ہے، جب قسم کھانے والا مالک ہو یا مِلک کی طرف نسبت کرے، اور سببِ مِلک کی طرف نسبت بھی مِلک کی طرف نسبت کی مانند ہے، جیسے کہ نکاح کرنے کی نسبت (کیونکہ نکاح سببِ مِلک ہے، جیسے کہے کہ اگر میں تم سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے)، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص: 420)''۔

یہ فسخِ نکاح کی جائز بنیاد نہیں

سوال: 112

میری شادی کو 20 سال کا عرصہ ہوچکا ہے، شوہر کی غیر ذمہ داری، کبھی کبھی مارنا، کبھی کبھی خرچ میں تنگی بھی ہوجاتی تھی اور 20 سال سے ہم جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں۔ پھر یہ ہوا کہ میری بیٹی کا رشتہ میرے والدین اور میرے شوہر کی

رضامندی سے طے ہوا، نکاح کی تاریخ بھی میرے شوہر نے دی، سب کچھ اُن کی مرضی سے ہوا۔ لیکن ہم دونوں کی نا اتفاقی کے سبب وہ بیٹی کی شادی میں شریک نہیں ہوئے، اِن سب باتوں سے پریشان ہو کر اور اپنے شوہر کے رویئے کو دیکھ کر میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے کورٹ کے ذریعے خلع حاصل کرلیا، میرے شوہر نے کورٹ میں جج کے سامنے یہ کہا تھا کہ ''نہ میں اپنی بیوی کو طلاق دوں گا اور نہ ہی کبھی اپنی زندگی میں چھوڑوں گا، اگر گورنمنٹ یکطرفہ خلع دینا چاہتی ہے، تو دے دے''، یہ کہہ کر کورٹ سے چلے گئے اور کسی قسم کے کوئی دستخط بھی نہیں کیے۔ کوئی شرعی وجہ خلع یا فسخ نکاح کی نہیں تھی، خلع لینے کے 15 دِن بعد مجھے اپنی غلطی کا شدّت سے احساس ہوا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا، شوہر اور بچوں سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ میں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اپنی اِس غلطی کی معافی مانگی۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا یہ عدالتی حکم نافذ ہے، جس کی کوئی شرعی وجہ موجود نہیں ہے یا ہمارا نکاح قائم ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں۔

خالدہ، 533/51-B لانڈھی، کراچی

جواب :

خلع عدالت کے ذریعے نہیں ہوتا بلکہ زوجین کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے، جس میں بیوی اپنے مہر کے حق سے دستبردار ہو کر کہے کہ: ''تم مجھے اس کے عوض طلاق دے دو اور شوہر اس کے مطالبے کو قبول کرتے ہوئے کہے کہ میں نے تمہیں خلع دیا''، یہ خلع ہے اور طلاق بائن کے حکم میں ہے۔ بنیادی طور پر عدالت کا اختیار ''فسخِ نکاح'' (Dissolution of Marriage) کا ہوتا ہے۔ اور قاضی کو عورت کے دعوے، دلائل اور شواہد سے یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ شوہر ظالم ہے، بیوی کو نان نفقہ نہیں دیتا، مار پیٹ کرتا ہے اور اس کے حقوقِ زوجیت ادا نہیں کرتا، تو ایسے شوہر کو ''زوجِ متعنت'' کہتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں قاضی نکاح کو فسخ کر دیتا ہے اور زوجین میں تفریق کر دیتا ہے، یہ طلاقِ بائن کے حکم میں ہے۔ موجودہ پاکستانی قانون کے تحت عورت عدالت میں خلع کا دعویٰ دائر کرتی

ہے اور عدالت عورت کے نفقے اور مہر کو ساقط کر کے خلع کی ڈگری دے دیتی ہے اور بعض اوقات یہ ڈگری یک طرفہ ہوتی ہے یعنی شوہر کو نہ عدالت میں طلب کیا جاتا ہے نہ اس کا موقف معلوم کیا جاتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ عدالتی عمل نہ خلع کی تعریف میں آتا ہے اور نہ فسخِ نکاح کی، یہی وجہ ہے کہ مفتیانِ کرام ایسے عدالتی فیصلوں کی توثیق نہیں کرتے، کیونکہ ان کی توثیق کی کوئی شرعی بنیاد نہیں بنتی۔

آپ نے اپنے سوال میں جو بیان کیا ہے اگر وہ درست ہے اور حقیقت یہی ہے تو عدالت کا فیصلہ غلط ہے اور آپ کا نکاح بدستور قائم ہے اور آپ دونوں اپنی ازدواجی زندگی کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ یہ ہم نے شرعی مسئلہ بیان کیا ہے، قانونی معاملات کے لئے کسی ماہر وکیل سے مشورہ کریں۔

ہماری رائے میں اگر عدالت میاں بیوی میں خلع کے ذریعے تفریق کرانا چاہتی ہے، تو اسے شوہر کو بلا کر خلع پر آمادہ کرنا چاہئے اور عدالت ایسا کر سکتی ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری عدالتیں لکیر کا فقیر بن کر صرف قانونی تقاضوں کو پورا کرتی ہیں، شرعی تقاضوں کی پاسداری نہیں کرتیں۔

والدہ کے حکم پر بیوی کو طلاق دینا

سوال:113

میرا ایک کلاس فیلو ہندو تھا جس کے گھر میرا آنا جانا تھا۔ میرے رہن سہن اور اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر اُس گھر کی ایک لڑکی (جو کہ سیکنڈری اسکول میں ٹیچر ہے) نے اسلام قبول کرلیا اور اپنی خوشی سے میرے نکاح میں آگئی۔ میرے گھر والوں میں سے کوئی اس نکاح میں شریک نہیں تھا۔ جب میری والدہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے طوفان کھڑا کر دیا اور مجھے مجبور کرنے لگیں کہ میں اس لڑکی کو طلاق دے دوں۔ میں نے اپنا ذاتی مکان بھی والدین کو دے دیا کہ یہ سب رکھ لیں میں آپ کی ہر طرح ذمہ داری پوری کروں گا، لیکن انہوں نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے اور طلاق دلوانے پر بضد ہیں۔

اگر میں اُسے طلاق دیدوں تو اس میں مذہب کی بدنامی کا بھی خطرہ ہے اور مسلمان ہو جانے

کی وجہ سے میری اہلیہ کو اُس کے ہندو گھر والے قبول بھی نہیں کریں گے۔ ان حالات میں مجھے قرآن وسنت کی روشنی میں بتایئے کہ کیا مجھ پر اپنی اہلیہ کو طلاق دینا واجب ہے؟۔ طلاق نہ دینے کی صورت میں کیا والدہ کی نافرمانی اور اس کے نتائج مجھ پر لاگو ہوں گے؟۔

محمد مشتاق، اورنگی ٹاؤن، کراچی

جواب:

نوٹ: یہ استفتاء پہلے دار العلوم امجدیہ کے شیخ الحدیث حضرت علامہ مفتی محمد اسماعیل ضیائی صاحب کی خدمت میں پیش ہوا، تو انہوں نے اپنے دلائل کی روشنی میں فتویٰ دیا کہ والدہ کے کہنے پر طلاق دینا واجب ہے۔ کسی خاص سیاق وسباق میں اُن کا یہ جواب درست بھی قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن جب یہ سوال میرے سامنے آیا، تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے اور پھر اپنا جواب میں نے شیخ الحدیث حضرت علامہ مفتی محمد اسماعیل ضیائی صاحب کے پاس نظرِ ثانی کے لئے بھیجا تو انہوں نے ازراہِ کرم اس کی توثیق فرمائی۔

بلاشبہ اسلام میں والدین کا بڑا مقام اور مرتبہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَنِ اشْکُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْكَ ط اِلَیَّ الْمَصِیْرُ o وَاِنْ جَاھَدَاكَ عَلٰی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفاً۔

ترجمہ: ”کہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو، (تم سب کو) میری ہی طرف لوٹنا ہے، اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک ٹھہرا جس کا تجھے کچھ علم نہیں، تو (اس مطالبہ معصیت میں) ان کی اطاعت ہرگز نہ کرو، (لیکن اس کے باوجود) دنیا میں ان سے حسن سلوک کرتے رہو، (لقمان 14-15)“۔

اس آیت میں اولاد کو پابند کیا گیا ہے کہ اگر بدقسمتی سے کسی کے والدین اس پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے لئے دباؤ ڈالیں، تو معصیت الٰہی میں ان کی اطاعت لازم نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اولاد کو دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا

ہے، یعنی مشرک والدین کے ساتھ بھی دنیا میں حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔

آیا ازروئے شریعت بیٹے پر لازم ہے کہ والدین کے حکم پر اپنی بیوی کو طلاق دیدے؟، تو اولاً گزارش یہ ہے کہ طلاق اگرچہ ناگزیر صورت حال میں ایک مشروع ومباح امر ہے، لیکن یہ تمام مباح امور میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ الطَّلَاقُ"۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''(تمام) حلال امور میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ امر طلاق ہے، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 2171)''۔

(۲) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: وَلَا خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ أَبْغَضَ إِلَيْهِ مِنَ الطَّلَاقِ۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ ہو، (رواہ الدارقطنی، رقم الحدیث: 3939)''۔

(۳) عَنْ ثَوْبَانَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا طَلَاقًا مِنْ غَيْرِ بَأْسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ۔

ترجمہ: ''حضرت ثوبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو عورت بغیر کسی ناگزیر مجبوری (اور ناقابل برداشت صورت حال) کے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے''، (یہ الفاظ ترمذی شریف کے ہیں)۔

(ترمذی، رقم الحدیث: 1187، ابوداؤد، رقم الحدیث: 2221، ابن ماجہ: 2134)

نوٹ: ناگزیر صورت حال سے مراد ایسے حالات کا رونما ہوجانا جن کے تحت شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے زوجین کا آپس میں نباہ ممکن نہ رہے۔

پس ناگزیر صورت حال میں رسول اللہ ﷺ نے صرف ماں باپ کو یہ حق دیا ہے کہ اُن کے مطالبے پر بیٹا اپنی بیوی کو طلاق دیدے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: کَانَتْ تَحْتِيْ امْرَأَۃٌ وَکُنْتُ أُحِبُّھَا وَکَانَ أَبِيْ يُبْغِضُھَا، فَذَکَرَ ذَالِكَ عُمَرُ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَاَمَرَنِيْ أَنْ أُطَلِّقَھَا فَطَلَّقْتُھَا،

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک بیوی تھی جس سے میں محبت کرتا تھا، اور میرے والد اُس سے نفرت کرتے تھے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی اس نفرت کا ذکر نبی ﷺ سے کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں اُسے طلاق دے دوں، پس میں نے (نبی ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں) اُسے طلاق دے دی، (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2088)''۔

اس حدیث کی شرح میں حاشیہ مشکوٰۃ میں بحوالہ اَشِعَّۃ اللّمعات للشیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''اگر حق والدین کی جانب ہو تو اولاد کے لئے طلاق دینا واجب ہے کیونکہ ترک حقوق سے عُقوق (نافرمانی) لازم آتی ہے اور اگر حق عورت کی جانب ہے اور والد کی رضا کے لئے طلاق دیدیتا ہے تو جائز ہے''۔ یعنی اگر اس صورت میں جبکہ حق باپ کی جانب نہیں ہے اور بیٹا طلاق نہ دے تو والد کی نافرمانی کی وعید کا مصداق نہیں بنے گا۔

(۲) عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ اِنَّ رَجُلًا أَتَاہُ فَقَالَ: اِنَّ لِيْ اِمْرَأَۃً وَاِنَّ اُمِّيْ تَأْمُرُنِيْ بِطَلَاقِھَا، قَالَ أَبُو الدَّرْدَاءِ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ يَقُوْلُ: اَلْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّۃِ، فَاِنْ شِئْتَ فَأَضِعْ ذَالِكَ الْبَابَ أَوْ اِحْفَظْہُ۔ ترجمہ: ''حضرت ابودرداء بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا: ''میری ایک بیوی ہے اور میری ماں مجھے حکم دے رہی ہے کہ میں اسے طلاق دوں''، تو ابودرداء نے اس سے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: والد جنت کا درمیانی دروازہ ہے، اگر تو چاہتا ہے تو اس دروازے کی حفاظت کر یا اسے ضائع کردے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1900)''۔

اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْبَابُ الْاَوْسَطُ هُوَ مُحَافَظَةُ حُقُوْقِ الْوَالِدِ فَالْمُرَادُ بِالْوَالِدِ الْجِنْسُ اَوْ اِذَا كَانَ حُكْمُ الْوَالِدِ هٰذَا فَحُكْمُ الْوَالِدَةِ اَقْوٰى وَبِالْاِعْتِبَارِ اَوْلٰى ،

ترجمہ: ''جنت کے درمیانی دروازے سے داخل ہونے سے مراد یہ ہے کہ والد کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور والد سے جنس مراد ہے (یعنی والدہ بھی اس حکم میں داخل ہے) یا جب والد کا یہ حکم ہے تو والدہ کا حق تو اور زیادہ ہے اور بطریقِ اولیٰ وہ اس احترام کی حق دار ہے''۔

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، جلد 9، ص:200)

علامہ ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا والد سے جنس مراد لینے کا معنی یہ ہے کہ جن سے وہ پیدا ہوا، تو جس طرح والد اس کی اصل ہے تو والدہ بطریقِ اولیٰ اس کی اصل قرار پائے گی، کیونکہ والدہ پر اصل ہونے کا اطلاق اَقویٰ (قوی ترین) اور اولیٰ (اَحق یعنی زیادہ حقدار) ہے۔

علامہ مفتی احمد یار خان نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ ''مرآۃ المناجیح'' شرح مشکوٰۃ المصابیح میں لکھتے ہیں:

یعنی فرمائیے کہ میں کیا کروں، اسے طلاق دوں یا نہ دوں کہ طلاق تمام مباح چیزوں میں سے بہت ہی ناپسندیدہ چیز ہے، مقصد یہ ہے کہ یا تو اپنی بیوی سے اپنی ماں کو راضی کرادو، ساس بہو کی صلح کرادو یا طلاق دے دو، صراحتہً طلاق کا حکم نہ دیا کہ ایسی صورت میں طلاق دینا واجب نہیں، بہتر ہے، اور اگر ماں باپ بیوی پر ظلم کرنے کا حکم دیں کہ اسے خرچہ نہ دے، اسے میکے میں چھوڑ دے، تو ہرگز ظلم نہ کرے کہ ظلم حرام ہے، (ایسی صورت میں) ماں باپ کی اطاعت حکمِ شرع کے خلاف ہے، (جلد:6، ص:361)''۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت کردہ حدیث کی شرح میں امام حافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی مالکی متوفی ۵۴۳ھ لکھتے ہیں:

اِنَّ اَوَّلَ مَنْ اَمَرَ ابْنَهٗ بِطَلَاقِ امْرَأَتِهِ الْخَلِيْلُ اِبْرَاهِيْمُ، وَرُوِيَ فِي الصَّحِيْحِ اَنَّهٗ لَمَّا وَضَعَ تَرِكَتَهٗ: اِسْمَاعِيْلَ ابْنَهٗ وَاُمَّهٗ عِنْدَ دَوْحَةٍ بِاِزَاءِ زَمْزَمَ وَانْصَرَفَ ،اَقَامَ اَعْوَامًا ثُمَّ

اسْتَأْذَنَ رَبَّهُ فِیْ أَنْ يُطَالِعَ تَرِكَتَهُ،فَجَاءَ أُمَّ إِسْمَاعِيلَ فَوَجَدَهَا قَدْ مَاتَتْ وَإِسْمَاعِيلُ قَدْ تَزَوَّجَ وَلَمْ يَكُنْ حَاضِرًا بِمَنْزِلِهِ ،فَسَأَلَ زَوْجَهُ عَنْ حَالِهِمْ فَلامَتْ،فَقَالَ: إِذَاجَاءَ إِسْمَاعِيلُ فَقُولِي لَهُ يُبَدِّلُ عَتَبَةَ بَيْتِهِ، فَجَاءَ إِسْمَاعِيلُ فَأَخْبَرَتْهُ فَقَالَ: ذَالِكَ أَبِیْ وَقَدْ أَمَرَنِیْ بِفِرَاقِكِ ،الْحَقِی بِأَهْلِكِ ،وَذَكَرَ الْحَدِيثَ،وَكَفٰى بِهِ أُسْوَةً وَّقُدْوَةً۔وَمِنْ بِرِّالِابْنِ بِأَبِيهِ أَنْ يَكْرَهَ مَايَكْرَهُ أَبُوهُ وَإِنْ كَانَ لَهُ مُحِبًّا۔قِيلَ: وَيُحِبُّ مَا يُحِبُّ أَبُوهُ وَإِنْ كَانَ لَهُ كَرِهَ مِنْ قَبْلُ،بَيْدَ أَنَّ ذَالِكَ إِنْ كَانَ الْأَبُ عَلٰى بَصِيرَةٍ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ كَذَالِكَ اسْتُحِبَّ لَهُ فِرَاقُهَا لِإِرْضَائِهِ وَلَمْ يَجِبْ عَلَيْهِ فِی الْحَالَةِ الْأُولٰی ،فَإِنَّ طَاعَةِ الْأَبِ فِی الْحَقِّ مِنْ طَاعَةِ اللّٰهِ وَبِرَّهُ مِنْ بِرِّهِ ،وَلَوْ أَنَّ الزَّوْجَةَ لَاتُوَّاتِی مَعَ أَنَّ الزَّوْجَ لَايُسْتَحَبُّ لَهُ فِرَاقُهَا ،إِذْ مَعْنَى الزَّوْجِيَّةِ الْقِيَامُ عَلَى الزَّوْجِ وَبَنِيهِ ،أَلَا تَرٰی إِلٰی قَوْلِ جَابِرٍ إِذْسَأَلَهُ النَّبِیُّ ﷺ فَقَالَ لَهُ: "أَبِكْرًا تَزَوَّجْتَ أَمْ ثَيِّبًا"، فَقَالَ: بَلْ ثَيِّبًا،فَقَالَ:هَلَّا بِكْرًا تُلَاعِبُهَا وَتُلَاعِبُكَ،قَالَ: إِنَّهُ تَرَكَ لِیْ تِسْعُ أَخَوَاتٍ فَكَرِهْتُ أَنْ أُضِيفَ إِلَيْهِنَّ مِثْلَهُنَّ،وَأَرَدْتُّ أَنْ تَقُومَ عَلَيْهِنَّ۔

ترجمہ:'' پہلا شخص جس نے اپنے بیٹے کو طلاق کا حکم دیا، حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تھے، روایت صحیح میں ہے کہ جب وہ اپنے بیٹے اسماعیل اور ان کی ماں (یعنی اپنی بیوی ہاجر) کو (مکہ مکرمہ میں) زمزم کے نزدیک دوحہ کے مقام پر چھوڑ کر چلے گئے، تو چند سال تک وہ رکے رہے، پھر انہوں نے اپنے رب تبارک وتعالیٰ سے اپنے ان پسماندگان کا حال معلوم کرنے کی اجازت مانگی، وہ اپنی (بیوی) اُمِ اسماعیل کے پاس آئے تو پتا چلا کہ وہ انتقال کر چکی ہیں اور اسماعیل نے شادی کر لی ہے، لیکن وہ اس وقت اپنے مکان پر موجود نہیں تھے، تو آپ نے ان کی بیوی سے ان کا حال دریافت کیا تو اس نے ملامت کی (یعنی تنگی حالات کا شکوہ کیا)، اس پر آپ نے فرمایا: جب اسماعیل آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ اپنے گھر کی

چوکھٹ بدل دو، پھر جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو ان کی بیوی نے سارا ماجرا سنا دیا، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے (بیوی سے) فرمایا: وہ میرے باپ تھے اور انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں، لہٰذا اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ، انہوں نے ان کی گفتگو کا حوالہ دیا اور فرمایا: ان کا نمونہ عمل اتباع کیلئے کافی ہے، اور بیٹے کے اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک میں سے ایک یہ ہے جس چیز کو باپ ناپسند کرے، (چاہیے کہ) اسے بیٹا بھی ناپسند کرے، خواہ وہ اس کی پسندیدہ چیز (ہی کیوں نہ) ہو، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس چیز کو اس کا باپ پسند کرے، وہ بھی اسے پسند کرے، خواہ اس سے پہلے (طبعی طور پر) وہ اس کو ناپسند ہی (کیوں نہ) ہو، ظاہر بات یہ ہے کہ (بہر صورت باپ کی تعمیل ارشاد کا) یہ حکم اس صورت میں ہے کہ (یہ امر یقینی ہو کہ) باپ (دینی) بصیرت کا حامل ہے، لیکن اگر صورت حال اس کے برعکس ہے (یعنی باپ دینی بصیرت کا حامل نہیں ہے) تو باپ کی رضا کیلئے بیوی کو طلاق دینا (واجب نہیں بلکہ) پہلے مرحلے میں صرف مستحب ہے، کیونکہ امور حق میں باپ کی اطاعت (درحقیقت) اللہ ہی کی اطاعت ہے اور اس کی اطاعت کرنا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا ہے، اور اگر بیوی کی شوہر کے ساتھ (طبعی) موافقت ہی نہیں ہے تو (باپ کے حکم پر) اسے چھوڑ دینا مستحب ہے، کیونکہ زوجیت کے معنی ہی شوہر اور اس کی اولاد کی نگہداشت کے ہیں، کیا تو نے حضرت جابر کے اس قول پر غور نہیں کیا کہ جب نبی ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ: تو نے کنواری لڑکی سے شادی کی ہے یا ثیب سے (ثیب سے مراد ایسی مطلقہ یا بیوہ عورت جو اس سے پہلے شوہر کے تجربے سے گزر چکی ہے)؟۔ تو انہوں نے عرض کیا: ثیب سے شادی کی ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے کنواری لڑکی سے شادی کیوں نہ کی کہ تم دونوں ایک دوسرے سے (وفور محبت میں خوش طبعی ہنسی مذاق اور) چھیڑ خانی کرتے، حضرت جابر نے عرض کی: میری نو بہنیں ہیں، تو مجھے یہ مناسب نہ لگا کہ ان

جیسی نا تجربہ کار بیوی (IMMATURE) بیاہ کر لے آؤں، میں نے تو یہ سوچ کر ثیّب عورت سے نکاح کیا کہ وہ ان کی صحیح نگہداشت (اور تربیت) کر سکے"۔

(عارضۃ الاحوذی، جلد 3، ص، 132، دار الکتب علمیہ، بیروت)

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت نے باپ کے حکم پر بیٹے کو بیوی کے طلاق دینے کا جو وجوبی حکم دیا ہے،، وہ دینی مصلحت پر مبنی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ باپ کے مزاج پر دین داری کا غلبہ ہو اور دینی مصلحتوں کا صحیح ادراک رکھتا ہو، اس پر نفسانی خواہشات، ہیجانی کیفیت، انتقامی جذبے اور غیظ وغضب کا غلبہ نہ ہو بلکہ وہ متحمل مزاج ہو، اور ہمارے سامنے دو مثالیں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام تو ابو الانبیاء، اولو العزم رسول، ملت ابراہیم کے مؤسِّس، وحیِ ربانی اور فطرت سلیم کے حامل تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی "مُحَدَّثِ خیر الامم"، "مُلہَم من اللہ اور "موفَّق من اللہ" تھے، بعض اوقات منشائے وحی ربانی کو ان کی فطرتِ سلیم نزول وحی سے پہلے ہی سمجھ لیتی تھی، چنانچہ ایسی آیات قرآنی، جن کے منشاء کا انہوں نے نزول وحی پہلے ہی ادراک کر لیا تھا، کو مُوَفَّقاتِ عمر کہا جاتا ہے۔

آج کل عام طور پر ہم میں اصابتِ فکر (RIGHTIOUSNESS)، مزاج میں توازن واعتدال، منشائے شریعت معلوم ہونے پر اس کے سامنے سپر انداز (SURRENDER) ہونے کا رجحان اور مغلوب الغضب نہ ہونے کا تناسب کتنا ہے؟، ہم سب جانتے ہیں۔ لہٰذا موجودہ حالات میں اگر ماں باپ بیٹے کو حکم دیں کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو، تو بیٹے کو چاہیے کہ ٹھنڈے دل سے شرحِ صدر کے ساتھ ماں باپ کی فرمائش پر غور کرے، اگر ان کے فرمان کی وجوہِ شرعی موجود ہیں تو کھلے ذہن کے ساتھ نہ صرف ان کے حکم کی تعمیل کرے بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت عبد اللہ بن عمر کی طرح اسے اپنی سعادت

سمجھے۔لیکن اگر اس پر یہ امر واضح ہو کہ ماں باپ کا حکم شرعی مصلحت کے تابع نہیں بلکہ اس پر نفسانیت کا غلبہ ہے، ظلم اور صریح ناانصافی کا باعث ہے، تو اُس پر اِس کی تعمیل واجب نہیں ہے۔تاہم ماں باپ کا احترام قائم رکھے دیگر تمام جائز امور میں ان کی فرماں برداری جاری رکھے اور نہایت نرمی اور تواضع کے ساتھ انہیں اپنا مؤقف سمجھانے کی کوشش کرے، شاید کسی مرحلے پر اللہ تعالیٰ ان کے ذہن کو قبول حق پر آمادہ فرمالے۔کیونکہ شریعت کے جو عمومی احکام ہیں، وہ یہ ہیں کہ:

(۱) وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

ترجمہ: ''نیکی اور تقوے کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ:2)''۔

(۲) لَا طَاعَةَ فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ، اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ۔

ترجمہ: ''کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے (خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی بڑا ہو)، جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو، لازمی اطاعت تو بس صرف نیک کاموں میں ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:1840)''۔

امامِ اہلسنت اعلیحضرت عظیم البرکت امام احمد رضا قادری قدس سرھم العزیز ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ''آیت کا وہ حکم اور احادیث کے یہ ارشادات انہی وجہین حل وبغض پر ہیں، اگر عورت پر کوئی شبہ ہو یا وہ عاصیہ ہو یا نماز نہ پڑھتی ہو یا بوڑھی ہوگئی ہو اور اسے ''قسم بین النساء'' سے بچنا ہو تو ان سب صورتوں میں طلاق بلا کراہت جائز ومباح ہے، بلکہ بعض صورتوں میں مستحب۔علماء فرماتے ہیں کہ اگر عورت نماز نہ پڑھے اور یہ ادائے مہر پر قادر نہ بھی ہو جب بھی طلاق دے دینی چاہیے کہ: اللہ تعالیٰ کے ہاں پیشی میں بیوی کا مہر شوہر کے گلے میں پڑا ہو یہ اس سے بہتر ہے کہ بے نماز عورت سے معاشرت جاری رکھے، جیسا کہ

خانیہ،غنیۃ وغیرھما میں ہے، بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہوتی ہے، جیسے اس کو اس کے ماں باپ عورت کو طلاق دینے کا حکم دیں اور نہ دینے میں ان کی ایذا اور ناراضی ہو، واجب ہے کہ طلاق دے دے، اگرچہ عورت کا قصور نہ ہو:"لِأَنَّ الْعُقُوقَ حَرَامٌ وَّالْاِجْتِنَابُ عَنِ الْحَرَامِ وَاجِبٌ"۔

ترجمہ:"کیونکہ (والدین کی) نافرمانی حرام ہے اور حرام سے بچنا واجب ہے"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص: 331، 332، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

(نوٹ: اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے مندرجہ ذیل حدیث نقل فرمائی ہے:"وَإِنْ أَمَرَاكَ أَنْ تَخْرُجَ مِنْ أَهْلِكَ وَمَالِكَ فَاخْرُجْ ، ترجمہ:"اگر والدین تمہیں بیوی اور مال سے علیحدگی کا حکم دیں تو ایسا ہی کرو، بحوالہ: الترغیب والترھیب، مصطفیٰ البابی مصر 383/1، السنن الکبریٰ 304/1، اس حدیث پر تفصیلی تبصرہ منسلک ہے)۔

اعلیحضرت نے یہ فتویٰ 1336ھ میں دیا ہے اور 1339ھ میں آپ نے ایک اور فتویٰ جاری فرمایا، جو مع سوال درج ذیل ہے: حضورِ والا! بعد سلام عرض ہے کہ غلام کی بیوی اطاعت نہیں کرتی، سمجھانا اثر نہیں کرتا، والدین بھی ناخوش ہیں والدین کی خوشی ہے کہ طلاق دے دو تو حضور اُس کو کس طریقہ سے طلاق دی جائے؟، آپ نے جواب میں لکھا: اگر آپ طلاق دینا چاہیں تو عورت جب حیض سے فارغ ہو اس کے بعد قبل جماع اس سے ایک بار کہئے کہ میں نے تجھے طلاق دی، پھر اسے چھوڑے رہئے اور اس سے بالکل الگ رہئے یہاں تک کہ طلاق کے بعد تین حیض شروع ہو کر ختم ہو جائیں اُس وقت وہ نکاح سے نکل جائے گی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص: 361، 362، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

اس فتویٰ میں اعلیحضرت نے بیوی کی نافرمانی پر والدین کی ناراضگی کے باوجود شوہر پر طلاق دینے کو واجب اور لازم قرار نہیں دیا بلکہ"اگر آپ طلاق دینا چاہیں" کہہ کر شوہر کی مرضی پر

چھوڑا ہے یعنی جواز اور اباحت کے درجے میں رکھا ہے اور یہ فتویٰ آپ نے 1339ھ کو جاری فرمایا۔ بظاہر یہی سمجھا جائے گا کہ آپ نے پہلے موقف کے مقابلے میں نرمی اختیار فرمائی اور شوہر پر طلاق کو لازم قرار نہیں دیا یا ممکن ہے کہ پہلی صورتِ مسئلہ میں عورت کا عصیان ونشوز اور شوہر کے والدین کی ایذا رسانی انتہائی درجے کی ہوگی۔

علامہ مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا کہ: ''ماں بیٹے کو مجبور کرے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو تو کیا اس صورت میں جبکہ بیوی کی کوئی غلطی نہ ہو، ماں باپ کی اطاعت لازم ہوگی اور اگر ماں باپ کے کہنے پر طلاق دے دی گئی تو یہ ظلم نہیں ہوگا؟، اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں: لہٰذا علماء یہ فرماتے ہیں کہ اگر والدین حق پر ہوں تو اُن کے کہنے سے طلاق دینا واجب ہے، اگر بیوی حق پر ہے، جب بھی ماں کی رضامندی کے لئے طلاق دینا جائز ہے، (وقار الفتاویٰ، جلد سوم، ص: 252)''۔

مفتی صاحب نے اپنے اس فتوے میں جائز اسباب کے نہ ہونے کی صورت میں ماں باپ کی فرمائش پر بیٹے کے اپنی بیوی کو طلاق دینے کو جواز کے درجے میں رکھا ہے، واجب قرار نہیں دیا۔ موجودہ صورتحال میں کہ جب آپ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرتے ہیں، حدودِ شرع کی پاسداری کرتے ہیں تو محض ماں کی خواہش پر آپ کے لئے اپنی بیوی کو طلاق دینا لازم نہیں ہے۔ ہاں البتہ اگر کسی خاص مسئلے میں ماں کی رائے کی وجوہِ شرعی ہوں، تو ان پر ضرور غور کرنا چاہیے، اور جب ماں کی رائے مصلحت شرعی کے موافق ہو جائے تو ان کی تعمیل ارشاد میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر آپ کی والدہ مطالبہ کرتی ہیں کہ بیوی کو الگ رکھو، تو ان کی اس فرمائش پر ضرور عمل کریں، ان شاء اللہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ آپ کی بیوی کو خوش دلی سے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی۔ دورِ حاضر میں بہو کے بارے میں

والدین کی رائے بالعموم کسی دینی مصلحت پر مبنی نہیں ہوتی ، نہ ہی ان میں وہ شفقت پدری ہوتی ہے جس کی اولین ترجیح دینی اصلاح ہو، بلکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بالعموم بہو سے نفرت کے سارے محرکات نفسانی ہوتے ہیں الا ماشاء اللہ ،اگر کوئی بہو نماز بالکل نہ پڑھے،روزہ نہ رکھے، دین دار نہ ہوتو اس سے اس بنیاد پر کوئی گلہ شکوہ نہیں ہوتا۔ایک اور لحاظ سے بھی اس مسئلے میں آپ کی بیوی زیادہ حسنِ سلوک کی حق دار ہیں کیونکہ وہ نومسلم ہیں،اپنے خاندان سے وہ کٹ چکی ہیں اور طلاق کی صورت میں وہ کہاں جائے ،اگر والدین کے پاس یا خاندان میں جاتی ہیں تو وہ اسے شاید قبول نہ کریں یا خدانخواستہ ترکِ اسلام پر مجبور کریں۔اس لئے شوہر محمد مشتاق صاحب کے والدین اور خاندان سے ہماری گزارش یہ ہے کہ ایثار کا مظاہرہ کریں،اسلام نے تو مصارفِ زکوٰۃ میں ''مؤلّفۃ القلوب'' کا ایک مستقل مصرف رکھا ہے۔اس کے علاوہ درج ذیل حدیث مبارک ملاحظہ کیجئے:رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم نے فتح خیبر کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں فرمایا:اُنْفُذْ عَلٰی رِسْلِكَ،حَتّٰی تَنْزِلَ بِسَاحَتِهِمْ ،ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَی الْاِسْلَامِ ،وَأَخْبِرْهُمْ بِمَا يَجِبُ عَلَيْهِمْ مِنْ حَقِّ اللّٰهِ فِيْهِ،فَوَاللّٰهِ لَأَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلاً وَّاحِداً خَيْرٌ لَّكَ مِنْ أَنْ يَّكُوْنَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ۔

ترجمہ:'' آہستہ اور باوقار انداز میں چلتے رہو،جب تم ان کے علاقے میں پہنچ جاؤ تو انہیں اسلام کی دعوت دو اور (دین کے حوالے سے) جو فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں،ان کی بابت اُن کو بتاؤ،اللہ کی قسم!اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے ایک شخص کو (قبولِ اسلام کی) ہدایت نصیب فرمادے،یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں (کی قیمتی دولت) سے بہتر ہے۔

(صحیح بخاری،رقم الحدیث:3701،2942)

ہم نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث اس لئے کی ہے تاکہ یہ واضح ہو کہ اگر بیوی عاصیہ اور ناشزہ نہیں ہے تو محض والدین کی ناپسندیدگی کی بنا پر اُسے طلاق دینا شرعاً لازم نہیں ہے اور ایسی

صورت میں ماں باپ کی خواہش کے برعکس طلاق نہ دینے والا شوہر ماں باپ کا نافرمان نہیں قرار پائے گا بشرطیکہ وہ زندگی کے دیگر معاملات میں ماں باپ کا اطاعت گزار، فرمانبردار اور اُن کے ہر جائز حکم کی تعمیل کرتا ہو، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح

باسمہ تعالیٰ

والدین کے حکم پر لڑکے کے لئے اپنی بیوی کو طلاق دینا اس وقت واجب ہے جبکہ وہ حق پر ہوں ورنہ مباح۔ ہر شق کی تفصیل اس فتوے میں تحریر ہے، یہ جواب زیادہ تفصیلی ہے اور موجودہ تحریر کے تناظر میں زیادہ بہتر ہے، اسی پر عمل کیا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

شیخ الحدیث و مفتی محمد اسماعیل ضیائی

رئیس دارالافتاء دارالعلوم امجدیہ، کراچی

22 رجب المرجب 1430ھ 17 جولائی 2009ء

محترم جناب قبلہ مفتی محمد الیاس رضوی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ!

ایک فتویٰ آپ کی خدمت میں استصواب اور تائید و توثیق کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ دارالعلوم امجدیہ، کراچی کے فتوے کی نقل بھی منسلک ہے، جو اعلیحضرت امام احمد رضا قادری کے فتوے پر مبنی ہے۔ میں نے ذرا تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ آپ کے لئے علمی و فقہی دیانت کے مطابق اتفاق و اختلاف کی دونوں راہیں کھلی ہیں۔ لیکن اپنی فوری رائے سے ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ میں نظرِ ثانی کے لئے دارالعلوم امجدیہ بھیجنے کے بارے میں فیصلہ کرسکوں۔

11، جولائی 2009ء

والسلام

﴿مفتی منیب الرحمٰن﴾

رئیس دارالافتاء، دارالعلوم نعیمیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب

محتشم ومکرم جناب قبلہ مفتی محمد منیب الرحمٰن حفظہ اللہ تعالیٰ نے سائل محمد مشتاق کے استفتاء پر جو تفصیلی فتویٰ دیا ہے، راقم کے نزدیک صحیح ہے۔

حاشیۃ المشکوٰۃ میں ہے: ان کان الحق فی جانب الوالدین فطلاقها واجب للزوم العقوق فی الحقوق وان کان فی جانب المرأۃ فان طلقها لرضاء الوالدین فهو جائز. (حاشیہ علی المشکوٰۃ، ص:421)۔

امام اہلسنت اعلیٰحضرت امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمٰن نے وجوب طلاق کا جو فتویٰ دیا ہے، جسے شیخ الحدیث حضرت علامہ مفتی محمد اسماعیل رضوی ضیائی مدظلہ العالی نے نقل کیا ہے اور قبلہ محمد منیب الرحمٰن دامت برکاتہم العالیہ نے اس کا حوالہ دیا ہے، اسے اس صورت پر محمول کرنا چاہئے، جس میں طلاق دینا واجب ہو کہ مُصنف کی عبارت میں معمولی کمی بیشی ہونا ممکن ہے، نیز یہ فتویٰ 1336ھ میں دیا گیا ہے، جبکہ 1339ھ میں ''ایک عورت جس سے اس کے شوہر کے والدین ناخوش اور والدین کی خوشی اس میں کہ اسے طلاق دے دو''، کے جواب میں لکھتے ہیں: ''اگر آپ طلاق دینا چاہیں تو عورت جب حیض سے فارغ ہو اسکے بعد قبل جماع اس سے ایک بار کہہ دے کہ: ''میں نے تجھے طلاق دی''۔

(فتاویٰ رضویہ جدید، جلد 12، ص:362)

اس فتوی کے الفاظ واضح طور پر جوازِ طلاق پر دلالت کر رہے ہیں نہ کہ وجوبِ طلاق پر۔۔۔۔۔ نیز یہ فتویٰ مؤخر ہے، لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی آخری تحقیق یہی ہے اور پہلی تحقیق وہ ہے جسے شیخ الحدیث جامعہ امجدیہ نے نقل کیا ہے کہ وہ فتویٰ مُقدم ہے۔

ھذا ما عندی والعلم بالحق عند ربی

کتبہٗ

محمد الیاس الرضوی الاشرفی

11، جولائی 2009ء

نشے کی حالت میں دی جانے والی طلاق کا حکم

سوال:114

16اپریل 2005ء کو مجھے میرے شوہر نے شراب کے نشے میں میرا نام لے کر تین مرتبہ کہا: ''رفعت سلطانہ میں تم کو طلاق دیتا ہوں''، میں اُس وقت اپنے بیٹے کے پاس امریکہ میں تھی اور میں دو ماہ سے وہاں مقیم تھی، اس دوران E-Mail بھی بھیجی کہ میں تم کو گھر والوں سے بات کر کے طلاق بھجواتا ہوں۔ مجھے طلاق دینے کے بعد اپنے ایک دوست کو لاہور سے کراچی فون کر کے بتایا۔ آپ مجھے بتائیں کہ کیا میری طلاق واقع ہوگئی ہے یا نہیں؟۔

میرے سابق شوہر جاوید اختر نے ادارہ ''المورد'' لاہور سے اس مسئلے میں استفسار کیا، تو ان کے اسکالر ساجد حمید صاحب نے جو تحریلی جواب دیا، اُس کے مندرجات یہ ہیں:

''آپ نے جس حالت میں طلاق دی اس حالت میں شریعت کی رُو سے طلاق نہیں ہوتی، اس لئے ایسے سنجیدہ امور میں ہوش وحواس کا قائم ہونا از روئے شریعت ضروری ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب آدمی بالغ نہ ہو یا ذہنی توازن درست نہ ہو، تو ایسی حالت میں اس پر شرعی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَۃٍ، عَنِ النَّائِمِ حَتّٰی یَسْتَیْقِظَ وَعَنِ الصَّبِیِّ حَتّٰی یَحْتَلِمَ وَعَنْ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰی یَعْقِلَ۔

ترجمہ: ''تین لوگوں سے شریعت کا قلم اٹھالیا گیا ہے: ایک سویا ہوا شخص جب تک جاگ نہ جائے، بچہ جب تک بالغ نہ ہوجائے اور پاگل جب تک کہ اس کی عقل واپس نہ آجائے، (سنن ابی داؤد)''۔ ایسی ہی حالت اس شخص کی ہے جو کسی وجہ سے نشے میں دھت ہوگیا ہو، وہ نشے کی حالت میں مجنون آدمی کے حکم کے تحت ہوگا۔ اس لئے قیاس یہی کہتا ہے کہ وہ یقیناً نشہ کرنے کی وجہ سے شراب نوشی کی سزا کا تو مستحق ہے، لیکن اس حالت میں اس کے کئے ہوئے کام نافذ (Executed) نہیں مانے جائیں گے، چنانچہ نشے کی حالت میں آپ نے جو طلاق دی، اُسے نافذ نہیں مانا جائے گا، یعنی یہ طلاق واقع نہیں ہوئی

ہے، آپ دونوں تا حال میاں بیوی ہیں''۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں طلاق واقع نہیں ہوئی، کیا یہ موقف درست ہے؟، کیا نشہ کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی ؟، (رفعت سلطانہ، بلاک ل، نارتھ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

شریعت کی رُو سے نشے کی حالت میں دی جانے والی طلاق واقع ہوجاتی ہے،

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

أَوْ سَكْرَانَ وَلَوْ بَنَبِيْذٍ أَوْ حَشِيْشٍ أَوْ أَفْيُوْنٍ أَوْ بَنْجٍ زَجْرًا بِهٖ يُفْتٰى ـ تَصْحِيْحُ الْقُدُوْرِيِّ ـ

ترجمہ: ''اور طلاق واقع ہوجاتی ہے ہر نشہ کرنے والے کی خواہ اس نے شراب پی ہو یا حشیش یا افیون یا بھنگ پی ہو اسی پر فتویٰ ہے اور قدوری نے بھی اس کی تصحیح کی ہے''۔

(ردالمختار علی الدر المختار جلد 4 ص: 328 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَطَلَاقُ السَّكْرَانِ وَاقِعٌ إِذَا سَكِرَ مِنَ الْخَمْرِ أَوِ النَّبِيْذِ وَهُوَ مَذْهَبُ أَصْحَابِنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى كَذَا فِي الْمُحِيْطِ ـ

ترجمہ: ''اور نشہ کرنے والے کی طلاق بھی واقع ہوجاتی ہے خواہ وہ نشہ شراب سے آیا ہو یا نبیذ سے، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص: 353 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

وَأَمَّا السَّكْرَانُ إِذَا طَلَّقَ امْرَأَتَهٗ فَإِنْ كَانَ سُكْرُهٗ بِسَبَبٍ مَحْظُوْرٍ بِأَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ وَالنَّبِيْذَ طَوْعًا حَتّٰى سَكِرَ وَزَالَ عَقْلُهٗ فَطَلَاقُهٗ وَاقِعٌ عِنْدَ عَامَّةِ الْعُلَمَاءِ، وَعَامَّةِ الصَّحَابَةِ ـ

ترجمہ: ''نشے والا شخص جب اپنی بیوی کو طلاق دیدے، تو اگر اس کا یہ نشہ کسی ممنوع سبب کی بنا پر ہے، تو عام علماء اور عام صحابۂ کرام کے نزدیک اس کی طلاق واقع ہوجائے گی، (اس کی

صورت یہ ہے کہ جیسے اس نے اپنی مرضی سے شراب پی یا بنیذ پی ہو، حتیٰ کہ اسے نشہ آ گیا ہو)
۔۔۔۔۔۔۔آ گے چل کر مزید لکھتے ہیں: وَلَنَا :عُمُومُ قَوْلِهٖ عَزَّوَجَلَّ :(اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ)
اِلٰی قَوْلِهٖ سُبْحَانَهٗ تَعَالٰی : فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَاتَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا
غَيْرَهٗ(البقرة : 230)مِنْ غَيْرِ فَصْلٍ بَيْنَ السَّكْرَانِ وَغَيْرِهٖ اِلَّا مَنْ خَصَّ بِدَلِيْلٍ وَقَوْلُهٗ
عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ :"كُلُّ طَلَاقٍ جَائِزٌ اِلَّا طَلَاقَ الصَّبِيِّ وَالْمَعْتُوْهِ" وَلِاَنَّ عَقْلَهٗ
زَالَ بِسَبَبٍ هُوَ مَعْصِيَةٌ فَيُنْزَلُ قَائِمًا عُقُوْبَةً عَلَيْهِ وَزَجْرًا لَهٗ عَنِ ارْتِكَابِ الْمَعْصِيَةِ،
وَلِهٰذَا لَوْ قَذَفَ اِنْسَانًا اَوْ قَتَلَ يَجِبُ عَلَيْهِ الْحَدُّ وَالْقِصَاصُ،وَاَنَّهُمَا لَا يَجِبَانِ عَلٰى
غَيْرِ الْعَاقِلِ دَلَّ اَنَّ عَقْلَهٗ جُعِلَ قَائِمًا۔

ترجمہ:"(نشہ کرنے والے کی طلاق واقع ہونے کے بارے میں) ہم اللہ عزوجل کے اس ارشاد کے عموم سے استدلال کرتے ہیں کہ:"(الطلاق مرتان)......اور(فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَاتَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ(البقرة :230)"(قرآن کی اس آیت میں طلاق کے واقع ہونے کا ذکر) حالتِ نشہ یا حالتِ ہوش میں کسی تفریق کے بغیر ہے، سوائے اس صورت کے کہ جسے کسی دلیل کی بنا پر خاص کر دیا گیا ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:"ہر طلاق جائز ہے، سوائے بچے اور فاتر العقل کی طلاق کے"، (یعنی ان دونوں کی طلاق کا مؤثر نہ ہونا، اس حدیث کی بنا پر قرآن کے عموم سے مستثنیٰ ہے) اور نشہ کرنے والے کی طلاق اس سبب سے بھی واقع ہو جائے گی کہ اُس کی عقل ایسے سبب سے زائل ہوئی، جس کا ارتکاب گناہ تھا، تو (نشے کی حالت میں طلاق دینے والے کو) معصیت کے ارتکاب کی وجہ سے سزا اور زجر (روک ٹوک، ڈانٹ ڈپٹ) کے طور پر عاقل کے درجہ میں قرار دیا جائے گا۔ اسی بنا پر اگر نشہ کرنے والا شخص کسی انسان پر تہمت لگائے یا قتل کرے، تو اس پر (اس کے جرم کے مطابق) حد اور قصاص واجب ہوگا، حالانکہ حد اور قصاص غیرِ عاقل پر واجب نہیں ہوتے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نشہ کرنے والا عاقل کے حکم میں ہے، (بدائع الصنائع، جلد 3، ص:145، مطبوعہ: مرکز اہلسنت برکاتِ رضا، گجرات، انڈیا)"۔

نشہ کرنے والا شخص حالتِ نشہ میں بھی از روئے قرآن مُکلّف بالشرع (یعنی شریعت کی رُو سے ذمہ دار اور جواب دہ) ہے، چنانچہ علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں: هُوَ مُكَلَّفٌ لِقَوْلِهِ تَعَالىٰ (لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى)خَاطَبَهُمْ تَعَالىٰ وَنَهَاهُمْ حَالَ سُكْرِهِمْ ،فَاِنْ كَانَ السُّكْرُ مِنْ مُحَرَّمٍ فَالسَّكْرَانُ مِنْهُ هُوَالْمُكَلَّفُ وَاِنْ كَانَ مِنْ مُبَاحٍ فَلَا فَهُوَ كَالْمُغْمٰى عَلَيْهِ،لَايَقَعُ طَلَاقُهٗ۔

ترجمہ:'' اللہ تعالیٰ کے ارشاد کہ (تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ،النساء:43) کے سبب نشہ کرنے والا احکامِ شرعیہ کا مُکلّف ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے امرِ شرعی کا مخاطَب بنایا اور نشے کی حالت میں نماز کی ادائیگی سے منع فرمایا، پس اگر یہ نشہ کسی حرام چیز کا ہے، تو اِس نشے میں مبتلا شخص احکامِ شرعیہ کا مُکلّف ہے اور اگر یہ نشہ کسی مباح چیز کا ہے، تو (وہ احکامِ شرعیہ کا مُکلّف)نہیں ہے، اس کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس پر غشی طاری ہوگئی ہو، تو اس کی طلاق واقع نہیں ہوگی۔۔۔۔۔۔۔پھر مزید لکھتے ہیں:

وَالْفَتْوٰى عَلىٰ اَنَّهٗ اِنْ سَكِرَ مِنْ مُحَرَّمٍ فَيَقَعُ طَلَاقُهٗ۔

ترجمہ:'' اور فتویٰ اسی پر ہے اگر کسی شخص نے حرام چیز کا نشہ کیا ہو، تو اس شخص کی دی ہوئی طلاق واقع ہو جائے گی، (الاشباہ والنظائر، ص:304)''۔

''المورد'' کے اسکالر نے جس حدیث کی بنیاد پر نشے کی حالت میں طلاق کو غیر مؤثر قرار دیا ہے، ان کا اس حدیث سے قیاس کی بنیاد پر یہ استدلال کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ جنون غیر اختیاری چیز ہے اور محض اللہ تعالیٰ کا تکوینی امر ہے، اس میں بندے کی کسی تقصیر کا کوئی دخل نہیں ہے، جبکہ اس کے برعکس حرام چیز کا نشہ کرنا بندے کا اختیاری فعل ہے اور یہ تشریعی معاملہ ہے، لہٰذا یہ قیاس مع الفارق ہے۔''المورد'' کے فاضل اسکالر نے طلاق کو اپنے اجتہاد کی بنا پر سنجیدہ امر قرار دیا ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے مذاق اور غیر سنجیدگی میں دی گئی طلاق کو بھی مؤثر قرار دیا ہے، آپ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے: عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ : ثَلٰثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَّهَزْلُهُنَّ جِدٌّ: اَلنِّكَاحُ، وَالطَّلَاقُ،وَالرَّجْعَةُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں (کہ وہ بہر طور نافذ اور مؤثر ہوتی ہیں) سنجیدگی سے کہی جائیں تب بھی اور مذاق میں کہی جائیں تب بھی یعنی نکاح، طلاق اور رجعت''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 1184)

''المورد'' کے اسکالر نے نشے کی کیفیت میں مبتلا شخص کو مطلقاً مرفوع القلم (یعنی ناقابلِ مؤاخذہ اور ہر شرعی حکم کی جواب دہی سے بری الذمہ) قرار دیا ہے، اس کے تصرفات پر اُسے کھلی چھوٹ دے دی ہے اور اسے نائم (سوئے ہوئے شخص) کے درجہ میں قرار دیا ہے، حالانکہ 25 مقامات ایسے ہیں، جہاں سویا ہوا شخص بھی مُستیقِظ (جاگے ہوئے شخص) کے حکم میں ہے، علامہ زین الدین ابن نجیم نے ''ولوالجی'' کے حوالے سے یہ مقامات بیان کیے ہیں، جن میں سے چند ملاحظہ ہوں:

(الف) إِذَا جَامَعَهَا زَوْجُهَا وَهِيَ نَائِمَةٌ يَفْسُدُ صَوْمُهَا (ب) لَوْ كَانَتْ مُحْرِمَةً فَجَامَعَهَا زَوْجُهَا وَهِيَ نَائِمَةٌ فَعَلَيْهَا الْكَفَّارَةُ (ج) اَلْمُحْرِمُ إِذَا نَامَ فَجَاءَ رَجُلٌ فَحَلَقَ رَأْسَهُ وَجَبَ الْجَزَاءُ عَلَيْهِ (د) اَلْمُحْرِمُ إِذَا نَامَ فَانْقَلَبَ عَلَى صَيْدٍ فَقَتَلَهُ وَجَبَ عَلَيْهِ الْجَزَاءُ (ہ) اَلْمُصَلِّيْ إِذَا نَامَ وَتَكَلَّمَ فِيْ حَالَةِ النَّوْمِ تَفْسُدُ صَلَاتُهُ (و) رَجُلٌ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ طَلَاقًا رَّجْعِيًا فَجَاءَ الرَّجُلُ وَمَسَّهَا بِشَهْوَةٍ وَّهِيَ نَائِمَةٌ صَارَ مُرَاجِعًا (ز) لَوْ كَانَ الزَّوْجُ نَائِمًا فَجَاءَتِ الْمَرْأَةُ وَقَبَّلَتْهُ بِشَهْوَةٍ يَصِيْرُ مُرَاجِعًا أَبِيْ يُوْسُفَ۔

ترجمہ: ''(الف) جب کسی شخص نے اپنی (روزہ دار) بیوی سے اُس کے سوتے ہوئے مباشرت کرلی ہو، تو اس کا روزہ فاسد ہوجائے گا، (حالانکہ بیوی تو سوئی ہوئی ہے اور وہ ارادتاً اس عمل میں شریک نہیں ہے)۔ (ب) اگر عورت احرام کی حالت میں تھی اور اس کے شوہر نے اس سے مباشرت کرلی، تو اس عورت پر کفارہ لازم ہوگا۔ (ج) ایک شخص حالتِ احرام میں سو رہا تھا، کسی دوسرے شخص نے اس کا سر مونڈ دیا، تو مُحرِم پر کفارہ واجب ہوگا۔

(د) حالتِ احرام میں سوتے ہوئے شخص کے نیچے کوئی شکار آ کر دب گیا اور ہلاک ہو گیا، تو مُحرِم پر کفارہ واجب ہوگا۔ (ہ) نمازی دورانِ نماز (چند لمحوں کے لئے) سو گیا اور نیند کی حالت میں اُس نے بات کر لی تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ (و) کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی دی اور پھر اس کے پاس آیا اور اسے نیند کی حالت میں شہوت کے ساتھ چُھوا، تو اس کا رجوع ثابت ہو گیا۔ (ز) اگر شوہر سو رہا تھا اور بیوی اس کے پاس آئی اور اُس نے اُسے شہوت کے ساتھ بوسہ دیا، امام ابو یوسف کے نزدیک رجوع ثابت ہو گیا''۔

(الاشباہ والنظائر، ص: 312 تا 314)

اسی طرح قتلِ قائم مقام خطا میں قاتل کے عصبات پر دیت اور کفارہ واجب ہے، اگر چہ اُس کا قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس کی خطا کے سبب کسی شخص کی جان گئی، تو اس کے عصبات پر دیت واجب ہوگی، علامہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں: ''علامہ ابوبکر رازی کی تعریف قتلِ قائم مقام خطا یہ ہے کہ مثلاً نیند میں کوئی شخص کسی پر گر پڑے اور اس سے اس کی موت واقع ہو جائے، تو یہ قتلِ عمد ہے نہ قتلِ خطا، کیونکہ سونے والے شخص کا قصد (ارادہ) متصور ہی نہیں ہے، لیکن اس کا کروٹ بدل کر کسی شخص پر گرنا اس شخص کی ہلاکت کا موجب بنا، لہٰذا اس کے عصبات پر دیت اور کفارہ واجب ہوگا اور اگر وہ مقتول کا وارث تھا، تو اس کی وراثت سے بھی محروم ہوگا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس نے کوئی کوتاہی کی ہو یا وہ نیند میں نہ ہو اور اس نے جلد میراث حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا ہو''۔

(المبسوط، جلد 26، ص: 68، بیروت، بحوالہ: شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، جلد 4، ص: 676)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَأَمَّا مَا جَرَى مَجْرَى الْخَطَأِ فَهُوَ مِثْلُ النَّائِمِ يَنْقَلِبُ عَلَى رَجُلٍ فَيَقْتُلُهُ فَلَيْسَ هٰذَا بِعَمْدٍ وَلَا خَطَأٍ كَذَا فِي الْكَافِي ۔ وَكَمَنْ سَقَطَ مِنْ سَطْحٍ عَلَى إِنْسَانٍ فَقَتَلَهُ أَوْ سَقَطَ مِنْ يَدِهِ لَبِنَةٌ أَوْ خَشَبَةٌ وَأَصَابَتْ إِنْسَانًا وَقَتَلَتْهُ أَوْ كَانَ عَلَى دَابَّةٍ فَوَطِئَتْ دَابَّتُهُ

إنسانًا هكذا في المُحِيطِ۔ وَحُكْمُهُ حُكْمُ الخطأ مِنْ سُقُوطِ القِصَاصِ وَوُجُوبِ الدِّيَةِ وَالكَفَّارَةِ وَحِرْمَانِ المِيرَاثِ كذا في الجوهرة النَّيِّرَة۔

ترجمہ: ''اور''قتلِ قائم مقام خطا'' کی مثال یہ ہے کہ کسی سونے والے شخص پر کوئی گرا، جس سے وہ (سونے والا شخص) ہلاک ہوگیا، پس نہ یہ قتلِ عمد ہے اور نہ ہی قتلِ خطا،'' کافی'' میں بھی اسی طرح ہے۔ایک اور مثال یہ ہے کہ چھت سے کوئی شخص کسی انسان پر گرا اور اس طرح اسے ہلاک کردیا یا ایک انسان کے ہاتھ سے اینٹ یالکڑی گرگئی اور وہ دوسرے شخص پر آ گئی اور اس کی ہلاکت واقع ہوگئی یا وہ سواری پر تھا اور اس کے جانور نے کسی شخص کو روند ڈالا،''محیط''میں بھی اسی طرح ہے اور اس (قتل قائم مقام خطا) کا حکم بھی قتل خطا کے حکم کی طرح ہے کہ قصاص ساقط ہوجائے گا اور دیت اور کفارہ واجب ہوگا اور قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوگا،''جوہرۃ النیر ہ''میں اسی طرح مذکور ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص:3، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

نشہ کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

اَلسُّكْرُ: حَالَةٌ تَعْرِضُ لِلإنسانِ مِنْ امتِلاءِ دماغِهِ مِنَ الأبخرةِ المُتصاعِدةِ إليهِ، فَيَتعطَّلُ مَعَهُ عَقْلُهُ المُمَيِّزُ بَيْنَ الأُمُورِ الحسنةِ وَالقَبِيحَةِ۔

ترجمہ:''دماغ کی طرف چڑھنے والے بخارات سے جو کیفیت انسان کو لاحق ہوتی ہے، اُسے''سکر'' کہتے ہیں، اس کے نتیجے میں انسان کے ذہن میں اچھی اور بری چیزوں میں تمیز کی جو اہلیت ہے، وہ معطل ہو جاتی ہے''۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ، جز الرابع، ص:129، دار الفکر، دمشق)

ہمارے اس جواب کے رَد میں مفتی خلیل الرحمٰن لکھوی صاحب نے درج ذیل تحریر ہمیں بھیجی۔جس کو من وعن شائع کر کے ہم آخر میں اس کا جواب تحریر کریں گے۔

نشے کی حالت میں طلاق

روزنامہ ایکسپریس بروز جمعۃ المبارک 25 جنوری 2008ء صفحہ دین ودانش

میں معروف عالم دین جناب مفتی منیب الرحمٰن صاحب کا فتویٰ نشے کی حالت میں طلاق کے قابل اعتبار ہونے کے حوالے سے شائع ہوا۔ جس میں فقہ حنفی کی چند معروف کتابوں کے حوالے سے بعض ائمہ احناف کے اقوال ذکر فرمائے گئے ہیں۔ ایک حدیث پاک: ''ہر طلاق جائز ہے سوائے بچے اور فاتر العقل کے'' کے عموم سے استدلال فرمایا گیا ہے۔ (حالانکہ نشے کی حالت میں انسان فاتر العقل ہی ہوتا ہے)۔ آگے فرماتے ہیں کہ نشہ کرنے والا شخص نشے کی حالت میں بھی از روئے قرآن یعنی آیت (یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ، (النساء:43) مکلّف بالشرع ہے۔

نوٹ: یہ آیت قبل از حرمت خمر (شرب حرام ہونے سے پہلے) نازل ہوئی تھی۔

جواباً عرض ہے کہ یہ رائے درست نہیں۔ امام المفسرین ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس نہی میں سکران (نشئی) مخاطب نہیں ہے کیونکہ وہ خطاب کو نہیں سمجھتا، اور نشئی مجنون کے حکم میں ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے علاوہ بھی کئی ائمہ اصولیین رحمہم اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔ یعنی یہ خطاب اس کی طرف ہے جو کلام کو سمجھتا ہے نہ کہ اس نشئی (سکران) کی طرف جو یہ نہیں جانتا کہ اسے کیا حکم دیا جا رہا ہے۔ جبکہ مکلّف ہونے کے لئے فہم خطاب شرط ہے۔ محترم مفتی صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں: ''جو لوگ مذکورہ روایت یعنی (ہر طلاق جائز ہے سوائے بچے اور فاتر العقل کے) سے استدلال کرتے ہیں وہ نشئی کو فاتر العقل پر قیاس کرتے ہیں حالانکہ یہ قیاس درست نہیں کیونکہ جنون غیر اختیاری ہے اور نشہ اختیاری''۔

جواباً عرض ہے کہ یہ صرف قیاس ہی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں صریح اور صحیح ترین احادیث موجود ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم (واللفظ لہ) میں قصہ حضرت ماعز بن مالک الاسلمی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب انہوں نے جناب رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں آکر زنا کا اقرار کیا تو آپ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا کیا یہ مجنون تو نہیں؟ ان کے قبیلے و دیگر لوگوں

نے بتایا کہ نہیں یہ تندرست اور سلیم العقل ہے۔آپ ﷺ نے مزید پوچھا کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟ ایک شخص نے اٹھ کر اس کا منہ سونگھا اور بتایا کہ اس نے شراب نہیں پی۔(الیٰ آخر القصہ) اس روایت میں جناب رسول اللہ ﷺ نے مجنون اور نشی کو ایک ہی حکم میں رکھا ہے۔روایت ہذا کے بعد بھی کوئی صاحب قیاس کی بات کریں تو سمجھ سے بالاتر ہے۔

2۔ صحیح بخاری میں حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصہ میں جب انہوں نے حالت نشہ میں (شراب کی حرمت سے پہلے کا قصہ ہے) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر ڈالے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی، آپ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیکر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے جا کر انہیں ملامت کی، نشہ کی وجہ سے حمزہ رضی اللہ عنہ کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا ''تم تو میرے باپ کے غلام ہو'' یہ سن کر آپ ﷺ جان گئے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نشے میں ہیں (اور ان کے ہوش ٹھکانے نہیں)، لہٰذا آپ ﷺ انکا مواخذہ کیے بغیر پچھلے پاؤں واپس تشریف لے گئے۔اگر مذکورہ توہین آمیز قول: ''تم تو میرے باپ کے غلام ہو'' کوئی غیر نشی کہے گا تو اس کا یہ قول کفر اور ارتداد کے زمرے میں آئیگا۔

3۔ اگر کوئی شخص حالت نشہ میں شرکیہ یا کفریہ کلمہ کہہ دے تو معلوم نہیں کہ محترم مفتی صاحب اس کے بارے میں حد ارتداد کا فتویٰ صادر فرمائیں گے یا نہیں!۔

موصوف آگے ایک دوسری روایت ''تین چیزیں ایسی ہی کہ بہر طور نافذ اور مؤثر ہوتی ہیں سنجیدگی سے کہی جائیں تب بھی اور مذاق میں کہی جائیں تب بھی یعنی: نکاح، طلاق، رجعت'' کے عموم سے استدلال فرماتے ہیں، اسکا مفصل جواب تو امام ابن القیم رحمہ اللہ کی معروف تصنیف ''زاد المعاد'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔مختصراً عرض یہ ہے کہ نشے کی حالت میں انسان نہ سنجیدہ ہوتا ہے اور نہ ہی مذاق میں۔معلوم نہیں مفتی صاحب اسے ''ھازل'' سمجھتے ہیں یا ''جاذ''!۔

دیگر دلائل:

1۔ امام زہری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک شرابی شخص حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی عدالت میں لایا گیا اس نے کہا کہ ''حضرت میں حالت نشہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہوں'' یہ سن کر بشمول حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تمام حاضرین کی رائے یہی تھی کہ اسے کوڑے لگائے جائیں اور شوہر بیوی کے درمیان علیحدگی کروادی جائے (یعنی طلاق کا اعتبار کیا جائے)۔لیکن ایسے میں حضرت ابان بن عثمان رحمہ اللہ نے اپنے والد محترم خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ نقل فرمایا کہ ''لیس للمجنون ولا للسکران طلاق ''یعنی مجنون اور نشی کی طلاق غیر معتبر ہے۔یہ سن کر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حاضرین سے کہا کہ ''تم مجھے کیسے کوڑوں اور تنفیذ طلاق کا مشورہ دے رہے تھے؟ جبکہ یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے یہ بات بیان کر رہے ہیں۔پھر شرابی کو صرف کوڑے مارے گئے اور بیوی لوٹا دی گئی،(بحوالہ سنن البیہقی و مصنف ابن ابی شیبہ)۔

مذکورہ روایت شیخین (بخاری ومسلم) کی شرط پر ہے۔امام بخاری رحمہ اللہ نے معلقاً بصیغہ جزم ذکر فرمائی ہے۔اسی طرح امام احمد رحمہ اللہ نے المسائل لابنہ میں جازماً ذکر کرنے کے بعد فرمایا اس باب میں یہ روایت ارفع ترین معیار کی ہے۔

2۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: "لیس لسکران ولا لمضطهد طلاق"(بحوالہ سنن سعیدبن منصور و مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ)۔

نیز اسی طرح کی روایت امام بخاری رحمہ اللہ نے بصیغہ جزم معلقاً ذکر کی ہے۔اور تمام اہل علم جانتے ہیں کہ صحیح بخاری میں وہ تمام معلقات جو صیغہ جزم کے ساتھ نقل کی گئی ہیں سب کی سب صحیح ہیں۔

لہٰذا قوی ترین مؤقف یہ ہے کہ حالت نشہ میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔واللہ اعلم بالصواب

منجانب:

مفتی خلیل الرحمٰن لکھوی

فاضل مدینہ یونیورسٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون الوہاب

نشے کی حالت میں وقوع طلاق پر ہم نے قرآن مجید کی سورۃ النساء کی آیت نمبر:43 سے استدلال کرتے ہوئے فقہ حنفی کی مشہور ومعروف کتاب بدائع الصنائع کے حوالے سے لکھا تھا کہ نشے کی حالت میں انسان مکلّف بالشرع ہوتا ہے۔

معہد القرآن کے رئیس مفتی خلیل الرحمٰن صاحب نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے علامہ ابن جریر طبری کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ''سکران'' اس نہی میں شامل نہیں ہے، کیونکہ وہ خطاب کو نہیں سمجھتا اور نشی مجنون کے حکم میں ہے۔

جواباً عرض ہے کہ نشے کی حالت میں طلاق کا واقع ہونا اور نشی کا مکلّف بالشرع ہونا اور نشی کا مجنون کے حکم میں نہ ہونا، یہ صرف ہمارا موقف نہیں بلکہ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی یہی موقف ہے۔

امام ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی متوفی 450ھ لکھتے ہیں:

وَدَلِیْلُنَا مِنْ طَرِیْقَیْنِ: أَحَدُهُمَا ثُبُوْتُ تَکْلِیْفِهٖ: وَالثَّانِیُ وُقُوْعُ الطَّلَاقِ، فَأَمَّا ثُبُوْتُ التَّکْلِیْفِ فَبِقَوْلِهٖ تَعَالٰی'' یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ''فَدَلَّتْ عَلٰی تَکْلِیْفِهِمْ مِنْ وَّجْهَیْنِ: أَحَدُهُمَا تَسْمِیَتُهُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ: وَنِدَائُهُمْ بِالْإِیْمَانِ: وَلَا یُنَادٰی بِهٖ إِلَّا لَهٗ: وَالثَّانِیُ نَهْیُهُمْ فِیْ حَالِ السُّکْرِ أَنْ یَّقْرَبُوا الصَّلٰوةَ، وَلَا یُنْهٰی إِلَّا مُکَلَّفٌ وَلِأَنَّهٗ إِجْمَاعُ الصَّحَابَةِ، لِأَنَّ عُمَرَ شَاوَرَهُمْ فِیْ حَدِّ الْخَمْرِ، وَقَالَ: أَرَی النَّاسَ قَدْ بَالَغُوْا فِیْ شُرْبِهٖ وَاسْتَهَانُوْا بِحَدِّهٖ، فَمَاذَا تَرَوْنَ؟ فَقَالَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ إِنَّهٗ إِذَا شَرِبَ سَکِرَ، وَإِذَا سَکِرَ هَذٰی، وَإِذَا هَذٰی افْتَرٰی، فَأَرٰی أَنْ یُّحَدَّ حَدَّ الْمُفْتَرِیْ ثَمَانِیْنَ، فَحَدَّهٗ عُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِیٌّ ثَمَانِیْنَ، فَکَانَ الدَّلِیْلُ مِنْهُ أَنَّ الزِّیَادَةَ عَلَی الْأَرْبَعِیْنَ عِلَّةٌ لِإِفْتِرَائِهٖ فِیْ سُکْرِهٖ، وَلَوْ کَانَ غَیْرَ مُکَلَّفٍ لَمَا حُدَّ بِمَا أَتَاهُ، وَلَا کَانَ مُؤَاخَذًا بِهٖ، وَفِیْ مُؤَاخَذَتِهٖ بِهٖ دَلِیْلٌ

عَلٰی تَکْلِیْفِہٖ۔ فَاِذَا ثَبَتَ اَنَّہٗ مُکَلَّفٌ، وَجَبَ اَنْ یَّقَعَ الطَّلَاقُ کَالصَّاحِیْ وَاَمَّا الدَّلِیْلُ عَلٰی وُقُوْعِ طَلَاقِہٖ فِی الْاَصْلِ: فَمَا رَوَاہُ الزُّھْرِیُّ، عَنْ سَعِیْدِ ابْنِ الْمُسَیَّبِ وَرَوَاہُ عَبْدُاللّٰہِ بْنُ الزُّبَیْرِ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَمَّا خَطَبَ خَدِیْجَۃَ بِنْتَ خُوَیْلِدٍ تَزَوَّجَھَا مِنْ اَبِیْھَا خُوَیْلِدٍ وَھُوَ سُکْرَانُ وَدَخَلَ بِھَا، فَلَمَّا جَآءَ الْاِسْلَامُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ "لَایُزَوِّجُ نَشْوَانُ وَلَا یُطَلِّقُ الا اجزائتہ" وَھٰذَا نَصٌّ وَلِاَنَّہٗ مُؤَاخَذًا بِشَرِّہٖ فَوَجَبَ اَنْ یَّکُوْنَ مُؤَاخَذًا بِمَا حَدَثَ عَنْ سُکْرِہٖ۔ ترجمہ:"اور ہماری دلیل دوطرح سے ہے،(1) یہ کہ نشی کا مکلّف ہونا ثابت ہے(2) اس کی طلاق کا نافذ ہونا۔

نشی کا مکلّف ہونا اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ثابت ہے "اے ایمان والو! تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ یہاں تک کہ تم کو معلوم ہو کہ کیا کہہ رہے ہو،(النساء:43)"۔ یہ آیت ان کے مکلّف ہونے پر دوطرح سے دلالت کرتی ہے،(الف) ان کو مومنین کے ساتھ موسوم کرنا اور صفتِ ایمان کے ساتھ پکارنا اور ایمان کے ساتھ صرف مکلّف ہی کو پکارا جاتا ہے(ب) نشے کی حالت میں ان کو نماز کے قریب جانے سے روکنا صرف مکلّف ہی کو روکا جاتا ہے۔ اور اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے شراب پینے والوں کی حد کے بارے میں مشورہ کیا اور فرمایا میں لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ شراب پینے میں مبالغہ کرتے ہیں اور اس کی حد کو انہوں نے معمولی سمجھ رکھا ہے، پس تمہارا کیا خیال ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: جب آدمی شراب پیتا ہے تو نشے میں مبتلا ہوتا ہے اور جب نشے میں مبتلا ہوتا ہے تو اول فول باتیں کرتا ہے اور جب اول فول باتیں کرتا ہے تو جھوٹی تہمت لگاتا ہے، پس میرا خیال ہے کہ اسے قذف کی حد لگائی جائے جو اسی کوڑے ہیں۔ تو حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنھم نے اسی کوڑے حد لگائی، پس یہ اس امر کی دلیل ہے کہ نشے میں تہمت لگانے کی وجہ سے چالیس کوڑے زیادہ کئے ہیں، اگر وہ مکلّف نہ ہوتا تو اس کو اس پر حد نہ لگائی جاتی اور نہ ہی اس کا مواخذہ ہوتا۔ اور اس کا مواخذہ اس کے مکلّف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ پس جب

یہ ثابت ہوا کہ وہ مکلف ہے تو لازم ہے کہ اس کی طلاق ایسے ہی واقع ہو جیسے کے ہوش مند آدمی کی طلاق واقع ہوتی ہے۔ اور اصل میں نشی کی طلاق کے واقع ہونے پر دلیل وہ حدیث ہے جو امام زہری نے سعید بن مسیب سے اور انہوں نے عبداللہ بن زبیر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت خدیجہ بن خویلد کو نکاح کا پیغام بھیجا اوران کے والد خویلد کی اجازت سے نکاح کیا،" حالانکہ وہ اس وقت نشے میں تھے" اور آپ ﷺ نے ان سے مباشرت بھی فرمائی، تو جب اسلام آیا تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: نشی نکاح نہ کرے اور نہ طلاق دے ورنہ اگر (اس نے دیدی تو) میں اسے قائم رکھوں گا، اور یہ نص ہے اور اس لئے بھی کہ نشے کی بنا پر نشی کا مواخذہ ہوتا ہے، تو ضروری ہوا کہ اس سے نشے کی حالت میں جو فعل صادر ہو اس پر بھی اس کا مواخذہ ہو"۔

(الحاوی الکبیر، جلد:3 ص:106)

شیخ ابی بکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی لکھتے ہیں: قَالَ الشَّافِعِيُّ وَيَجُوزُ طَلاقُ السُّكْرَانِ مِنَ الشَّرَابِ الْمُسْكِرِ وَعِتْقُهُ وَقَالَ: وَأَكْثَرُ مَنْ لَقِيتُ مِنَ الْمُفْتِيْنَ عَلَى أَنَّ طَلَاقَهُ يَجُوزُ، قَالَ ﷺ: رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ، عَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتَّى يَحْتَلِمَ، وَعَنِ الْمَجْنُونِ حَتَّى يُفِيقَ۔ وَالسَّكْرَانُ لَيْسَ وَاحِدًا مِّنْ هٰؤُلَاءِ وَلَا فِي مَعْنَاهُ۔

ترجمہ:" امام شافعی نے فرمایا کہ نشی کی طلاق اور عتاق جائز ہے جب کہ اس کو شراب پینے سے نشہ ہوا ہو اور فرماتے ہیں میری اکثر مفتیوں سے ملاقات ہوئی ہے جو نشی کی طلاق کو جائز سمجھتے ہیں، اور حضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ: تین آدمیوں سے قلم اٹھا دیا گیا ہے، سوئے ہوئے سے یہاں تک کہ بیدار ہو جائے، بچے سے تاوقتیکہ بالغ ہو جائے مجنون سے تاوقتیکہ اسے افاقہ ہو جائے، اور نشی ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے اور نہ ان میں سے معنیٰ کسی ایک کے حکم میں ہے، (معارفۃ السنن والآثار، جلد:5 ص:497)"۔

امام محی الدین ابی زکریا یحیٰ بن شرف النووی متوفی 676ھ لکھتے ہیں: وَإِنْ لَمْ يَعْقِلْ

بسببٍ لَّا یعذرُ فیہِ، کمَنْ شربَ الخمرَ بغیرِ عُذرٍ فسکِرَ، أوْ شربَ دوَاءً لِغیرِ حاجۃٍ فزَال عقلُہٗ، فالمنصُوصُ فِی السّکرَانِ أنْ یّصِحَّ طلَاقُہٗ۔

ترجمہ:''اور اگر اس کی عقل کسی ایسے سبب سے زائل ہوئی ہے کہ جس میں شرعاً معذور نہ قرار دیا گیا ہو۔ جیسے اس نے بغیر عذر کے شراب پی لی ہو اور نشے میں آیا یا حاجت کے بغیر دوا پی لی اور اس کی عقل زائل ہوگئی، تو نشئی کے بارے میں یہ نص (صریح حکم) ہے کہ اس کی طلاق صحیح یعنی نافذ ہوگی۔۔۔۔۔ چند سطور آگے وقوعِ طلاق کی علت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وَفِی عَلَّتِہٖ ثَلَاثَۃُ أوْجُہٍ: أحَدُھَا وَھُوَ قَوْلُ أبِی الْعَبَّاسِ: اِنَّ سُکْرَہٗ لَا یَعْلَمُ اِلَّا مِنْہُ، وَھُوَ مُتَّھَمٌ فِیْ دَعْوَی السُّکْرِ لِفِسْقِہٖ، فَعَلٰی ھٰذَا یَقَعُ الطَّلَاقُ فِی الظَّاھِرِ، ویَدِیْنُ فِیْمَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَالثَّانِیُ: اَنَّہٗ یَقَعُ طَلَاقُہٗ: تَغْلِیْظًا عَلَیْہِ لِمَعْصِیَتِہٖ، فَعَلٰی ھٰذَا یَصِحُّ مَافِیْہِ تَغْلِیْظٌ عَلَیْہِ، فَالطَّلَاقُ، وَالْعِتْقُ، وَالرِّدَّۃُ، وَمَایُوْجِبُ الْحَدَّ وَالثَّالِثُ: اَنَّہٗ لَمَّا کَانَ سُکْرُہٗ بِمَعْصِیَتِہٖ، اُسْقِطَ حُکْمُہٗ، فَجُعِلَ کَالصَّاحِ، فَعَلٰی ھٰذَا یَصِحُّ مِنْہُ الْجَمِیْعُ، وَھٰذَا ھُوَ الصَّحِیْحُ، لِاَنَّ الشَّافِعِیَّ نَصَّ عَلٰی صِحَّۃِ رَجْعَتِہٖ۔

ترجمہ:''اور اس کی طلاق کے واقع ہونے کی تین وجوہات ہیں: (1) یہ ابی العباس کا قول ہے کہ اس کے نشے کا پتہ اسی سے چلتا ہے اور وہ نشہ کے دعویٰ میں اپنے فسق کی بناء پر تہمت زدہ ہے، لہٰذا اس کی طلاق ظاہر میں واقع ہوجائے اور اس کا معاملہ اس کے اور اللہ کے درمیان چھوڑ دیا جائے گا، (2) یہ کہ اس کی معصیت کی بنا پر اس پر سختی کرتے ہوئے اس پر طلاق واقع ہونے کا حکم لگایا جائے گا، لہٰذا زجر کے طور پر نشے کی حالت میں اس سے جو کچھ صادر ہوگا وہ صحیح (طور پر نافذ) ہوگا جیسے طلاق، عتق، رِدّت (مرتد ہونا) اور ہر وہ فعل جس پر حد واجب ہوتی ہے، (3) جب اس کا نشہ اس کے معصیت کے سبب سے ہے تو نشے کا حکم ساقط ہوجائے گا اور وہ غیر نشئی کے حکم میں قرار دیا جائے، لہٰذا اس کے جمیع افعال صحیح یعنی نافذ ہونگے۔ اور یہی قول صحیح ہے، اس لئے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے رجوع

کے صحیح ہونے کی تصریح کی ہے، (مجموع شرح المھذب، جلد: 20، ص: 388، دارالکتب)''۔

امام ابی محمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ لکھتے ہیں:

وَلَنَا: أَنَّ الصَّحَابَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ قَالُوْا فِي السَّكْرَانِ: إِذَا سَكِرَ هَذٰى وَإِذَا هَذٰى افْتَرٰى فَحُدُّوْهُ حَدَّ الْمُفْتَرِيْ، فَأَوْجَبُوْا عَلَيْهِ حَدَّ الْفِرْيَةِ الَّتِيْ يَأْتِيْ بِهَا فِيْ سُكْرِهِ، وَأَقَامُوْا مَظِنَّتَهَا مَقَامَهَا وَلِأَنَّهُ يَصِحُّ طَلَاقُهُ فَصَحَّتْ رِدَّتُهُ كَالصَّاحِيْ، وَقَوْلُهُمْ لَيْسَ بِمُكَلَّفٍ مَمْنُوْعٌ فَإِنَّ الصَّلَاةَ وَاجِبَةٌ عَلَيْهِ، وَكَذٰلِكَ سَائِرُ أَرْكَانِ الْإِسْلَامِ وَيَأْثَمُ بِفِعْلِ الْمُحَرَّمَاتِ، وَهٰذَا مَعْنَى التَّكْلِيْفِ وَلِأَنَّ السَّكْرَانَ لَا يَزُوْلُ عَقْلُهُ بِالْكُلِّيَّةِ۔

ترجمہ: ''اور ہماری دلیل یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنھم نے نشے میں مبتلا شخص کے بارے میں کہا: جب کوئی شخص نشے میں ہو تو وہ اول فول بکے گا اور جب ہذیانی کیفیت میں ہوگا تو افترا پردازی کرے گا، تو انہوں نے اس پر تہمت (قذف) کی حد (اسی کوڑے) لگائی، تو اس پر جھوٹی تہمت کی حد واجب کی، جس کا ارتکاب وہ نشے کی حالت میں کرتا ہے، تو انہوں نے مقامِ امکان تہمت کو تہمت کے قائم مقام کر دیا اور چونکہ اس کی طلاق صحیح ہے تو باہوش شخص کی طرح اس کا مرتد ہونا بھی مؤثر ہے اور (مخالفین) کا یہ کہنا کہ نشے میں مبتلا شخص احکامِ شرعیہ کا مکلف نہیں ہے، تو یہ قول ممنوع ہے کیونکہ اس پر نماز واجب ہے، اسی طرح باقی ارکانِ اسلام اور محرماتِ شرعیہ کے ارتکاب پر گناہ گار ہوگا، تکلیف شرعی کے یہی معنی ہیں کیونکہ (مجنون کی طرح) اس کی عقل مکمل طور پر زائل نہیں ہوتی، (المغنی، جلد: 9، ص: 32)''۔

امام ابی منصور محمد بن محمود الماتریدی متوفی 333ھ لکھتے ہیں:

وفي الآية دلالة أنّ السكران مخاطب بقوله (يا أيّها الّذين امنوا لا تقربوا الصّلاة وَأَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ) نُهِيَ عَنْ قُرْبَانِ الصَّلٰوةِ فِيْ حَالِ السُّكْرِ، فَالنَّهْيُ إِنَّمَا وَقَعَ فِيْ حَالِ السُّكْرِ، فَإِذَا كَانَ مُخَاطَبًا عمل طلاقه وَنَفَذَتْ عُقُوْدُهُ، أَلَا تَرٰى أَنَّهُ قَالَ فِيْ آيَةِ الْأُخْرٰى: "إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ

وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِاللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ، فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ" فَلَوْلَمْ يَكُنْ عَلَيْهِمْ ذِكْرٌ فِيْ حَالِ السُّكْرِ لَمْ يَكُنْ لِيَصُدَّهُمْ عَنْ ذِكْرِاللّٰهِ مَعْنًى وَلَا ذِكْرَ عَلَيْهِمْ دَلَّ أَنَّهٗ مُخَاطَبٌ، وَلِهٰذَا قَالَ اَبُوْيُوْسُفَ اِنَّهٗ اِذَا ارْتَدَّ عَنِ الْاِسْلَامِ يَقُوْلُ ارْتِدَادُهٗ اِرْتِدَادًا، وَلَمَّا نَفَذَ طَلَاقُهٗ وَسَائِرُ عُقُوْدِهٖ وَفُسُوْخِهٖ، فَعَلٰى ذَالِكَ الْاِرْتِدَادُ۔

ترجمہ:''اور قرآن کی آیت:''یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ''میں اس امر پر دلالت ہے کہ نشی احکامِ الٰہی کا مخاطب ہے، نشے کی حالت میں نماز کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے، پس نہی حالتِ نشہ میں واقع ہوئی ہے۔پس جب وہ مخاطب ہے تو اس کی طلاق واقع ہو جائے گی اور (دیگر) تمام عقود بھی نافذ ہوں گے۔کیا تم نہیں دیکھتے کہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ (تمہیں) شراب اور جوئے میں (مبتلا کر کے) تمہارے درمیان عداوت اور بغض پیدا کرے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے''،پس اگر نشے کی حالت میں ان پر ذکر واجب نہ ہوتا، تو (اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کہ وہ چاہتا ہے)''انہیں اللہ کے ذکر سے روکے'' کا کوئی مقصد نہ ہوتا، اگر ان پر نشے کی حالت میں ذکر واجب نہیں ہے، یہ دلالت کرتا ہے کہ نشی (احکامِ شرعی کا) مخاطَب ہے،لہٰذا امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:اگر نشی اسلام سے مرتد ہو جائے تو وہ مرتد ہی کہلائے گا اور جب اس کی طلاق اور تمام عقود اور فسوخ نافذ ہوتے ہیں، تو اس کا ارتداد بھی نافذ ہوگا''۔

(تاویلات اہل السنہ تفسیر لماتریدی، جلد:3،ص:188-89)

علامہ ابن عبدالبر مالکی لکھتے ہیں:عَنْ اَبِیْ لَبِیْدٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ أَجَازَ طَلَاقَ السَّکْرَانِ بِشَهَادَةِ النِّسْوَةِ۔

ترجمہ:''ابی لبید روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے نشی کی طلاق کو عورتوں کی گواہی سے جائز قرار دیا ہے''۔

(الاستذکار، جلد:18،ص:163،مصنف ابن ابی شیبہ، جلد:9،ص:554)

علامہ ابن عبدالبر مالکی لکھتے ہیں: امام مالک نے فرمایا کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ سعید بن مسیب اور سلیمان بن یسار سے نشی کے طلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو دونوں نے جواب میں فرمایا: اذا طَلَّقَ السَّكْرَانُ جَازَ طَلَاقُهُ وَإِنْ قَتَلَ قُتِلَ بِهِ، قَالَ مَالِكٌ: وَعَلَى ذَالِكَ الْأَمْرُ عِنْدَنَا۔

ترجمہ: ''کہ جب نشی نے طلاق دی تو اس کی طلاق جائز ہے اور اگر وہ قتل کرے تو اس کے بدلے میں اُس کو (قصاص میں) قتل کیا جائے گا، امام مالک نے فرمایا: یہی ہمارا موقف ہے، (الاستذکار، جلد: 18، ص: 160)''۔

علامہ موصوف مزید لکھتے ہیں: اِلٰی هٰذَا ذَهَبَ مَالِكٌ وَأَبُو حَنِيفَةَ (وَأَصْحَابُهُمَا) وَالثَّوْرِيُّ، وَالْأَوْزَاعِيُّ، وَأَبُو عُبَيْدٍ، وَعَنِ الشَّافِعِيِّ فِي ذَالِكَ رِوَايَتَانِ، إِحْدَاهُمَا مِثْلُ قَوْلِ مَالِكٍ فِي أَنَّ طَلَاقَهُ لَازِمٌ فِي حَالِ سُكْرِهِ، وَهُوَ الْأَشْهَرُ عَنْهُ۔

ترجمہ: ''کہ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، امام ثوری، امام اوزاعی، امام ابوعبید اسی طرف گئے ہیں کہ نشے کی حالت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے، امام شافعی سے اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں، اور ان میں پہلی روایت امام مالک کے قول کی طرح ہے کہ اس کی طلاق نشے کی حالت میں لازم ہے اور ان کی یہی روایت زیادہ مشہور ہے، (الاستذکار، جلد: 18، ص: 161)''۔

علامہ عینی لکھتے ہیں: وَذَهَبَ مُجَاهِدٌ إِلَى أَنَّ طَلَاقَهُ يَقَعُ، وَكَذَا قَالَهُ مُحَمَّدٌ وَالْحَسَنُ وَسَعِيدُ بْنُ الْمُسَيِّبِ وَإِبْرَاهِيمُ بْنُ يَزِيدَ النَّخَعِيُّ وَمَيْمُونُ بْنُ مِهْرَانَ وَحُمَيْدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَانِ وَسُلَيْمَانُ بْنُ يَسَارٍ وَالزُّهْرِيُّ وَالشَّعْبِيُّ وَسَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ وَالْأَوْزَاعِيُّ وَالثَّوْرِيُّ وَهُوَ قَوْلُ مَالِكٍ وَأَبِي حَنِيفَةَ۔

ترجمہ: ''مجاہد کے نزدیک نشی کی طلاق واقع ہو جاتی ہے، محمد، حسن، سعید بن مسیب، ابراہیم بن یزید نخعی، میمون بن مہران، حمید بن عبدالرحمٰن، سلیمان بن یسار، زہری، شعبی، سالم بن عبداللہ، اوزاعی، ثوری، امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا یہی قول ہے''۔

(عمدۃ القاری، جلد: 20، ص: 356)

علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: وَقَالَ بِوُقُوعِهِ طَائِفَةٌ مِّنَ التَّابِعِيْنَ كَسَعِيْدِ بْنِ مُسَيَّبٍ وَالْحَسَنِ وَاِبْرَاهِيْمَ وَالزُّهْرِيِّ وَالشَّعْبِيِّ وَبِهِ قَالَ الْاَوْزَاعِيُّ وَالثَّوْرِيُّ وَمَالِكٌ وَاَبُوْ حَنِيْفَةَ، وَاِمَامٌ شَافِعِيٌّ قَوْلَانِ الْمُصَحَّحُ مِنْهُمَا وُقُوْعُهُ۔

ترجمہ: ''تابعین کی ایک جماعت سعید بن میتب، حسن، ابراہیم، زہری، شعبی، اوزاعی، ثوری، امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے اور امام شافعی کے دو قول ہیں، ان کا صحیح قول یہ ہے کہ طلاق واقع ہو جاتی ہے، (فتح الباری، جلد: 6، ص: 463)''۔

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ نشئی مکلّف بالشرع ہے اور اس کی دی ہوئی طلاق نافذ ہوگی، نیز نشئی کو مجنون کے حکم میں قرار دینا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ حدیث میں صرف تین افراد کو ''مرفوع القلم'' (یعنی احکامِ شرعی کا غیر مکلّف) قرار دیا گیا ہے کہ جن پر نہ تو دیانتاً مواخذہ ہے اور نہ قضاءً، جب کہ نشئی کا دیانتاً اور قضاءً ہر طرح سے مواخذہ ہوتا ہے اور علامہ ماوردی کی عبارت میں یہ تصریح ہوگئی ہے کہ شراب پینے والوں کے لئے صحابۂ کرام کی مشاورت سے اسی کوڑے مقرر کئے گئے ہیں، اگر نشئی بھی مجنون کے حکم میں ہوتا تو صحابہ بھی اس کو مرفوع القلم قرار دیتے اور اس کے لئے یہ حد مقرر نہ کرتے، نیز صحابہ کرام کی اس مشاورت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، جس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک بھی نشئی مجنون کے حکم میں نہیں ہے۔

مفتی صاحب آگے چل کر حضرت ماعز اسلمی والی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں [illegible] اور صحیح ترین احادیث موجود ہیں، جب کہ ماعز اسلمی نے زنا کا اقرار کیا تو آپ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ مجنون تو نہیں؟، ان کے قبیلے اور دیگر لوگوں نے بتایا نہیں، یہ تندرست اور سلیم العقل ہے، تو آپ ﷺ نے مزید پوچھا کہ کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟، ایک شخص نے اٹھ کر اس کا منہ سونگھا اور بتایا کہ اس نے شراب نہیں پی ہے (الی آخر قصتہ)، اس روایت میں جناب رسول اللہ ﷺ نے مجنون اور نشئی کو ایک حکم میں رکھا، روایت ہذا کے بعد بھی کوئی صاحب قیاس کی بات کریں تو سمجھ سے بالاتر ہے۔

جواباً عرض ہے کہ مفتی صاحب قیاس کرتے ہوئے بھی قیاس کا انکار کر کے فرماتے ہیں کہ اب بھی قیاس سمجھنا، سمجھ سے بالاتر ہے، جب کہ خود مفتی صاحب اس حدیث پر طلاق کو قیاس کرتے ہیں جو کہ حدود سے متعلق ہے اور طلاق حدود میں شامل نہیں ہے، حدود کے الگ احکامات ہیں اور طلاق کے کچھ اور احکامات ہیں، ہمیں تو مفتی صاحب کے اس قیاس کرنے پر حیرت ہے اور مفتی صاحب کا یہ قیاس کرنا ہی سمجھ سے بالاتر ہے کہ اس کا طلاق سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اور مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ مجنون اور نشی دونوں کو ایک حکم میں رکھا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ دو چیزوں کو ایک ساتھ بیان کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں کا حکم بھی ایک ہو (جیسا کہ مفتی صاحب نے سمجھا)، بلکہ ایک روایت میں تو ''ابلک جنون'' کے بجائے ''هَلْ أَحْصَنْتَ'' الفاظ بھی موجود ہیں، تو کیا شادی شدہ بھی مجنون کے حکم میں آ گیا؟ نہیں، بلکہ حدیث میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر یہ مجنون ہے تو مجنون مرفوع القلم ہوتا ہے لہٰذا، اس پر حد جاری نہیں ہوگی، اور اگر نشے میں ہے تو نشی کا حدود میں اقرار معتبر نہیں ہے، جیسا کہ فقہاءِ کرام نے تصریح کی ہے، وَلَا يَصِحُّ إِقْرَارُ السَّكْرَانِ بِالْحُدُوْدِ الْخَالِصَةِ، (الاشباہ والنظائر، ص:128)۔ اور خود آپ ﷺ کا فرمان: اِدْفَعُوا الْحُدُوْدَ مَا اسْتَطَعْتُمْ، (الاشباہ والنظائر، ص:127)۔ نیز حدیث میں یہ بھی احتمال ہے کہ نشے کی حالت میں چونکہ حد جاری نہیں ہوتی، لہٰذا اس لئے حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے پوچھا کہ اس نے شراب تو نہیں پی رکھی، حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ نشی بھی مجنون کی طرح مرفوع القلم ہے، اور مفتی صاحب کا حضرتِ امیر حمزہ والی حدیث پر قیاس کرنے پر بھی حیرت ہے کہ ابتداءِ اسلام کا واقعہ ہے جب کہ اس وقت خمر کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی، اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ تارِ عنکبوت کی مثل کمزور ہے، حرمت کے نازل ہونے کے بعد والے دلائل سے استدلال کریں تاکہ بات میں جان پیدا ہو۔ علامہ حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں: زَادَ ابْنُ جُرَيْجٍ: "وَذَالِكَ قَبْلَ تَحْرِيْمِ الْخَمْرِ" أَيْ وَلِذَالِكَ لَمْ يُؤَاخِذِ النَّبِيُّ ﷺ حَمْزَةَ بِقَوْلِهٖ: وَفِيْ هٰذِهِ الزِّيَادَةِ رَدٌّ عَلٰى

مَنِ احْتَجَّ بِهٰذِهِ الْقِصَّةِ عَلٰی أَنَّ طَلَاقَ السَّکْرَانِ لَایَقَعُ۔

ترجمہ: ''ابن جریج نے فرمایا کہ: ''یہ تحریمِ خمر سے پہلے کا واقع ہے''، یعنی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ان کلمات پر ان کا مواخذہ نہیں فرمایا، اور اس میں ان لوگوں کا بھی رد ہے جو اس حدیث سے نشئی کی طلاق کے عدمِ وقوع پر استدلال کرتے ہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: فَلَیْسَ فِیْ ھٰذَاالْحَدِیْثِ حُجَّةٌ لِإِثْبَاتِ ذَالِكَ وَلَانَفْیِهٖ۔

ترجمہ: ''پس اس حدیث میں نہ وقوعِ طلاق کی دلیل ہے اور نہ عدمِ طلاق کی''۔

(فتح الباری، جلد: 4، ص: 384، دار المعارف، بیروت)

علامہ ابن بطال البکری القرطبی لکھتے ہیں: قَالَ الْمُھَلَّبُ: ذَھَبَ الْخَطَّابِیُّ إِلٰی أَنَّهٗ لَمَّا کَانَتِ الْخَمْرُ مُبَاحَةً وَقْتَ شُرْبِھَا کَانَ مَاتَوَلَّدَ مِنْھَا بِسُکْرٍ مِّنَ الْجَفَاءِ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ لَا تَلْزَمُ فِیْهِ عُقُوْبَةٌ، فَعَذَرَهٗ، ﷺ لِتَحْلِیْلِ الْخَمْرِ مَعَ أَنَّهٗ کَانَ شَدِیْدَ التَّوْقِیْرِ لِعَمِّهٖ وَالتَّعْظِیْمِ لَهٗ الْبِرِّ بِهٖ۔ فَأَمَّا الْیَوْمَ الْخَمْرُ مُحَرَّمَةٌ فَیَلْزَمُ السَّکْرَانَ حَدُّالْفِرِیَّةِ، وَجَمِیْعُ الْحُدُوْدِ، لِأَنَّهٗ سَبَبُ زَوَالِ عَقْلِهٖ مِنْ فِعْلٍ مُّحَرَّمٍ عَلَیْهِ۔

ترجمہ: ''مہلب نے کہا: خطابی نے یہ رائے قائم کی ہے کہ (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے) شراب پینے کے وقت شراب کا پینا مباح تھا (یعنی اب تک اس کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا)، تو نشے کی حالت میں ان سے نبی ﷺ کے بارے میں جو سخت کلمات سرزد ہوئے، آپ ﷺ نے انہیں (اس وقت تک شراب کے حلال ہونے کی وجہ سے شرعاً) معذور قرار دیا، حالانکہ آپ ﷺ چچا ہونے کی بنا پر ان کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے اور تعظیم فرماتے تھے اور ان کے ساتھ بہت زیادہ حسنِ سلوک فرماتے تھے، لیکن اب جب کہ شراب حرام قرار دی گئی ہے، تو شراب کے نشئی پر حد قذف اور (دیگر) تمام حدود نافذ ہوں گی، کیونکہ اس کی عقل ایک ایسے فعل کی وجہ سے زائل ہوئی جو اس پر حرام قرار دیا گیا ہے''۔

(شرح ابن بطال، جلد: 5، ص: 265، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

جبکہ نشے کی حالت میں طلاق کے واقع ہونے پر نص صریح موجود ہے: لَایُزَوِّجُ نَشْوَانُ وَلَا

يُطَلِّقُ الا اجزائته ،(الحاوی الکبیر:107)۔

مفتی صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں:''اس حدیث سے استدلال کرنا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو بہر طور پر نافذ اور مؤثر ہوتی ہیں، سنجیدگی سے کہی جائیں تب بھی اور مذاق سے کہی جائیں تب بھی، یعنی نکاح ،طلاق ، رجعت ،صحیح نہیں ہے،اس لئے کہ نشے کی حالت میں انسان نہ سنجیدہ ہوتا ہے اور نہ ہی مذاق میں، معلوم نہیں مفتی صاحب اسے''ھازل'' سمجھتے ہیں یا ''جادّ''۔

جواباً عرض ہے کہ ہم نشے کی حالت میں انسان کو نہ''ھازل''(مذاق کے طور پر بات کرنے والا) سمجھتے ہیں اور نہ''جادّ''(سنجیدگی سے بات کرنے والا) اور نہ ہم نے اس کو''ھازل''یا ''جادّ'' کہا ہے، بلکہ ہم نے تو صرف حدیث سے استدلال کیا ہے کہ طلاق خواہ مذاق میں ہو یا سنجیدگی میں یا نشے میں ، بہر حال نافذ ہو جائے گی، کیونکہ ان حالتوں میں انسان مکلّف بالشرع ہوتا ہے۔

آگے مفتی صاحب لکھتے ہیں: اگر نشے کی حالت میں کلمۂ کفریہ یا شرکیہ کہہ دے تو معلوم نہیں کہ مفتی صاحب ارتداد کا فتویٰ صادر فرمائیں گے یا نہیں؟۔

جواباً عرض ہے کہ نشے کی حالت میں کلمات کفریہ یا شرکیہ کہہ دینے پر ہم پہلے امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام ابو یوسف کے اقوال بیان کر دیتے ہیں تا کہ یہ بات مزید واضح ہو جائے کہ شوافع، حنابلہ کے نزدیک بھی نشے کی حالت میں انسان مکلّف بالشرع ہوتا ہے اور اس کے اقوال اور افعال پر شریعت کا حکم لاگو ہوگا۔

چنانچہ علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں: وَقَالَ الشَّافِعِيُّ اِنْ اِرْتَدَّ سَكْرَانُ فَمَاتَ كَانَ مَالُهٗ فَيْئًا وَلَا نَقْتُلُهٗ فِيْ سُكْرِهٖ، وَلَا نَسْتَلُ التَّوْبَةَ مِنْهُ۔

ترجمہ:''امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: اگر نشئی مرتد ہوا اور مر گیا تو اس کا مال، مالِ فيئ ہوگا اور ہم اس کو نشے کی حالت میں قتل نہیں کریں گے اور نہ ہی اس سے توبہ طلب کریں گے،(الاستذکار،جلد:18،ص:162)''۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: فَصَحَّتْ رِدَّتُهُ كَالصَّاحِيْ ، ترجمہ (امام احمد بن حنبل کے نزدیک) اس کی رِدّت (یعنی مرتد ہونے کا حکم لگانا) صحیح ہوگی جیسے کہ ہوش مند کی ردّت صحیح ہوتی ہے، (المغنی: جلد: 9،ص: 32)''۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں: اِنَّهٗ اِذَا ارْتَدَّ عَنِ الْاِسْلَامِ يَكُوْنُ اِرْتِدَادُهٗ اِرْتِدَادًا وَلَمَّا نَفَذَ طَلَاقُهٗ وَسَائِرُ عُقُوْدِهٖ وَفُسُوْخِهٖ فَعَلٰى ذَالِكَ الْاِرْتِدَادُ۔

ترجمہ: ''کہ جب نشئی اسلام سے مرتد ہوا تو اس کا حکم مرتد ہی کا ہوگا، جب اس کی طلاق اور تمام عقود اور فسوخ (یعنی معاملات ومعاہدات کا کرنا یا توڑنا) نافذ ہوتے ہیں، تو اسی اصول پر اس کا ارتداد بھی مؤثر ہوگا، (تاویلات اہل السنۃ، جلد: 32،ص: 189)''۔

امام اعظم کے نزدیک استحساناً مرتد نہیں ہوگا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر اور ایمان کا تعلق دل سے ہوتا ہے اگرچہ ظاہری معیارِ شریعت کے مطابق اقرار باللّسان شرط ہے، اور نشے کی وجہ سے چونکہ ارادۂ قلب نہیں پایا جاتا ہے، لہٰذا استحساناً اس پر مرتد کا حکم نہیں لگایا جائے گا، برخلاف دوسرے معاملات کے کہ ان کا تعلق زبان اور ظاہری حال سے ہوتا ہے، لہٰذا صحیح ترین موقف یہ ہے کہ نشے کی حالت میں طلاق واقع ہو جائے گی، واللہ اعلم بالصواب۔

حُرمت کا شرعی مسئلہ

سوال: 115

میری عمر 55 سال ہے اور میری بیوی کی عمر 50 سال ہے، چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ چند روز قبل میرا میری بیوی سے جھگڑا ہوا، نوبت گالی گلوچ تک پہنچ گئی، میں نے بیوی کو بالوں سے پکڑ کر تھپڑ مارا، بیوی نے بچنے کے لئے مجھے دھکا دیا اور میں کرسی پر گر گیا۔ اس سارے جھگڑے میں میری خالہ اور بچے جمع ہو گئے۔ ہم دونوں کے درمیان جھگڑا جاری تھا نہ وہ چپ ہو رہی تھی اور نہ میں چپ ہو رہا تھا، بد دعائیں اور طنزیہ جملے کہتی رہی، مجھے مزید غصہ آیا لیکن میری خالہ اور بیٹے نے مارنے سے روک لیا۔ مگر میری بیوی نے کہا: میں نے 35 سال میں یہاں کوئی سکھ نہیں دیکھا، وہ مجھے برابر غصہ دلاتی رہی، پھر نہ جانے میرے منہ

سے ”میں نے تمہیں طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی“ کے الفاظ نکل گئے۔ وہ بھی خاموش ہوگئی اور میں بھی حیران رہ گیا۔ اب ہم اس کا حل چاہتے ہیں، میرے سسرال والے کہتے ہیں ہم بیٹی کا حلالہ نہیں ہونے دیں گے اور میرا اپنا بھی یہی موقف ہے، اس کا کوئی دوسرا متبادل حل جو شریعت کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہو۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں حل فرمائیں، (محمد خان، بلدیہ ٹاؤن کراچی، معرفت حاجی احمد مجاہد روزنامہ نوائے وقت کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر حرام ہوچکے ہیں، دونوں کے درمیان رشتۂ ازدواج باقی نہیں رہا، نیز تحلیلِ شرعی کے بغیر رجعت کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: ”پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دے دے، تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے۔ پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کرکے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ: 230)“۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: وَذَهَبَ جُمْهُوْرُ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَمَنْ بَعْدَهُمْ مِّنْ اَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ اِلٰى اَنَّهٗ يَقَعُ ثَلَاثٌ۔

ترجمہ: ”جمہور صحابہ اور تابعین اور وہ ائمۂ دین جو ان کے بعد ہیں، ان سب حضرات کا متفقہ مذہب ہے کہ ایک مجلس میں یا ایک جملے میں تین یا تین سے زائد طلاق دے، تو تین واقع ہوجاتی ہیں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد چہارم، ص: 320)“۔ یہ حرمتِ شرعی کا مسئلہ ہے اس کا متبادل کوئی نہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

موبائل SMS کے ذریعے طلاق کا حکم

سوال: 116

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کی ذیل میں کہ میری بیوی کسی سبب ناراض ہوکر اپنے والدین کے گھر چلی گئی، جب میں اُسے لینے گیا تو اس نے آنے سے انکار کردیا، اس پر میں نے ایس۔ایم۔ایس کیا: ''میں نہیں رہ سکتا آج جو ہوا مرتے دم تک نہیں بھولوں گا، قسم خدا کی مجھے جان کی پرواہ نہیں: طلاق، طلاق، طلاق''۔آیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟۔(محمد فرحان، R-315 سیکٹر 11-C/1، نارتھ کراچی)۔

جواب:

طلاق دینے کے تین طریقے ہیں: ا۔یہ کہ لفظاً طلاق دی جائے اور یہی طلاق میں اصل ہے، یعنی کوئی شخص اپنی بیوی کو براہِ راست مخاطب کرکے یہ کہے: ''میں نے تجھے طلاق دی'' یا بیوی کا نام لے کر کہے: ''میں نے فلانہ بنت فلاں کو طلاق دی''۔یہ طلاق کا نہایت واضح طریقہ ہے اور اس میں کوئی اشکال اور ابہام نہیں رہتا۔

۲۔یہ کہ کسی کو طلاق دینے کے لئے اپنا وکیل بنائے، اسے ''توکیل بالطلاق'' کہتے ہیں۔

۳۔یہ کہ لکھ کر طلاق دے۔طلاق جس طرح لفظاً اور زبانی واقع ہوتی ہے، اسی طرح تحریری طلاق بھی مؤثر ہوتی ہے۔لیکن اگر اِکراہِ مُلجی یا اِکراہِ تامّ کے ذریعے تحریری طلاق لی جائے، تو یہ مؤثر نہیں ہوتی، کیونکہ تحریر ضرورت کے وقت لفظی اور زبانی طلاق کے قائم مقام ہوتی ہے، جب کہ حالتِ جبر میں ضرورت نہیں ہوتی۔''اِکراہِ مُلجی'' یا ''اِکراہِ تامّ'' سے مراد یہ ہے کہ جان سے مارنے کی دھمکی دے یا کسی عضو کو تلف کرنے کی دھمکی دی جائے وغیرہ۔اور بظاہر اس کے آثار بھی نظر آئیں کہ اگر ''مُکرِہ (جبر کرنے والے'' کی بات نہ مانی گئی تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کرلے گا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: رَجُلٌ اُکْرِہَ بِالضَّرْبِ وَالْحَبْسِ عَلٰی اَنْ یَّکْتُبَ طَلَاقَ اِمْرَأَتِہٖ فُلَانَۃَ بِنْتِ فُلَانٍ فَکَتَبَ: اِمْرَأَتُہٗ فُلَانَۃُ بِنْتُ فُلَانِ بِنْ فُلَانٍ طَالِقٌ: لَا تُطَلَّقُ اِمْرَأَتُہٗ،

كَذَا فِيْ فَتَاوٰى "قَاضِيْ خَانْ" ۔

ترجمہ: ''ایک شخص کو مار پیٹ کر یا قید کر کے مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق لکھ کر دے، تو اُس نے لکھا: ''میری بیوی فلانہ بنت فلاں بن فلاں کو طلاق ہے''، تو اس کی بیوی کو طلاق واقع نہیں ہوگی، جیسا کہ ''فتاوٰی قاضی خان'' میں ہے، (جلد: 01، ص: 379)''۔

تحریری طلاق کی کئی صورتیں ہیں، عالمگیری میں ہے:

اَلْكِتَابَةُ عَلىٰ نَوعَيْنِ: مَرْسُوْمَةٌ وَغَيْرُ مَرْسُوْمَةٍ، وَنَعْنِيْ بِالْمَرْسُوْمَةِ أَنْ يَكُوْنَ مُصَدَّراً وَمُعَنْوَناً، مِثْلَ مَا يُكْتَبُ إِلَى الْغَائِبِ، وَغَيْرُ الْمَرْسُوْمَةِ لَا يَكُوْنُ مُصَدَّرًا وَمُعَنْوَنًا، وَهُوَ عَلىٰ وَجْهَيْنِ: مُسْتَبِيْنَةٌ وَغَيْرُ مُسْتَبِيْنَةٍ، فَالْمُسْتَبِيْنَةُ مَا يُكْتَبُ عَلَى الصَّحِيْفَةِ وَالْحَائِطِ وَالْأَرْضِ عَلىٰ وَجْهٍ يُمْكِنُ فَهْمُهُ وَقِرَاءَتُهُ، وَغَيْرُ الْمُسْتَبِيْنَةِ مَا يُكْتَبُ عَلَى الْهَوَاءِ وَالْمَآءِ وَشَيْءٍ لَا يُمْكِنُ فَهْمُهُ وَقِرَاءَتُهُ، فَفِيْ غَيْرِ الْمُسْتَبِيْنَةِ لَا يَقَعُ الطَّلَاقُ وَإِنْ نَوىٰ، وَإِنْ كَانَتْ مُسْتَبِيْنَةً لٰكِنَّهَا غَيْرُ مَرْسُوْمَةٍ، إِنْ نَوَى الطَّلَاقَ يَقَعُ وَإِلَّا فَلَا، وَإِنْ كَانَتْ مَرْسُوْمَةً يَقَعُ الطَّلَاقُ، نَوىٰ أَوْ لَمْ يَنْوِ، ثُمَّ الْمَرْسُوْمَةُ لَا تَخْلُوْ، إِمَّا إِنْ أَرْسَلَ الطَّلَاقَ بِأَنْ كَتَبَ: "أَمَّا بَعْدُ فَأَنْتِ طَالِقٌ"، فَلَمَّا كَتَبَ هٰذَا يَقَعُ الطَّلَاقُ وَتَلْزَمُهَا الْعِدَّةُ مِنْ وَقْتِ الْكِتَابَةِ، وَإِنْ عَلَّقَ طَلَاقَهَا بِمَجِيْءِ الْكِتَابِ، بِأَنْ كَتَبَ: "إِذَا جَاءَكِ كِتَابِيْ هٰذَا فَأَنْتِ طَالِقٌ"، فَمَا لَمْ يَجِئْ إِلَيْهَا الْكِتَابُ، لَا يَقَعُ، كَذَا فِيْ فَتَاوٰى "قَاضِيْ خَانْ" ۔

ترجمہ: ''تحریری طلاق کی دو قسمیں ہیں، مرسومہ اور غیر مرسومہ:

مرسومہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ باقاعدہ مکتوب الیہ کے نام اور عنوان سے شروع کیا جائے، جیسے کسی غائب کو خط لکھا جاتا ہے (عربی میں لکھتے ہیں: الی فُلان اور اردو میں لکھتے ہیں: بنام فلاں یا فلاں کے نام، فلاں کی جگہ مکتوب الیہ کا نام لکھا جاتا ہے)۔

غیر مرسومہ سے مراد یہ ہے کہ مکتوب الیہ کا نام لکھ کر باقاعدہ اُسے مخاطب نہ کیا جائے۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں: واضح ہو یا غیر واضح۔ واضح اور نظر آنے والا وہ ہے جسے کاغذ یا دیوار یا

زمین پر اس طرح لکھا جائے کہ اُس کا سمجھنا اور پڑھنا ممکن ہو۔ اور غیر واضح سے مراد یہ ہے کہ جسے ہوا یا پانی یا کسی ایسی چیز (جیسے انگلی سے شفاف شیشے پر لکھنا) پر لکھا جائے کہ اُس کا سمجھنا اور پڑھنا ممکن نہ ہو، تو غیر واضح تحریر سے طلاق واقع نہیں ہوگی، خواہ لکھنے والے نے نیت بھی کی ہو۔ اور اگر تحریر تو واضح ہے، لیکن مکتوب الیہ کو نام کے ساتھ مخاطب کر کے نہیں لکھی گئی، تو اگر لکھنے والے نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نیت سے لکھا ہے، تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر اُس نے طلاق کی نیت سے نہیں لکھا، تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر تحریر واضح ہے اور اپنی بیوی کو نام کے ساتھ مخاطب کر کے طلاق نامہ لکھا ہے، تو نیت کی ہو یا نہ، طلاق واقع ہو جائے گی۔

پھر اگر طلاق مرسومہ ہے، یعنی اپنی بیوی کا نام لکھ کر طلاق نامہ لکھا ہے، تو اس کی دو صورتیں ہیں: (۱) یہ کہ طلاق کو کسی شرط پر مقید نہیں کیا، یعنی شوہر نے اپنی بیوی کا نام لکھا اور اُسے مخاطب کر کے یوں لکھا: ''تجھے طلاق ہے''، تو جس وقت یہ تحریر لکھی، اُسی وقت سے طلاق واقع ہو جائے گی اور عدت بھی اُسی وقت سے شمار ہوگی۔ (۲) اور اگر شوہر نے اپنی بیوی کا نام لکھا اور پھر اُسے مخاطب کر کے لکھا: ''جیسے ہی میری یہ تحریر یا خط یا طلاق نامہ آپ کو ملے، آپ پر طلاق ہے''، تو جب تک اُس کی بیوی کو تحریر نہیں ملے گی، طلاق واقع نہیں ہوگی (اور تحریر ملتے ہی طلاق واقع ہو جائے گی اور عدت بھی اُسی وقت سے شمار ہوگی)''۔

(جلد:01،ص:378)

بعض فقہاء کے نزدیک تحریری طلاق قابلِ تسلیم نہیں ہے، جیسا کہ فتاویٰ نعیمیہ میں ہے:

شروع اسلام کے زمانوں سے ماضیِ قریب کے زمانوں تک زبانی طلاق ہی مروّج رہی ہے، اُن زمانوں میں لکھی ہوئی طلاق کا اتنا رواج نہ تھا، اسی لئے بعض فقہاء نے تو طلاق بالکتابت یعنی تحریری طلاق کو بالکل تسلیم ہی نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی خاوند اپنی رضا خوشی سے بھی صرف لکھ کر طلاق دے دے گا اور زبان سے بالکل طلاق کے الفاظ ادا نہ کرے، تو بھی طلاق قطعاً نہیں ہوتی۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ طلاق، نکاح کو ختم کرنے کے

لئے ہوتی ہے اور نکاح بالکتابت متفقاً جائز نہیں ہے۔ تمام ائمۂ اربعہ کے نزدیک یہ مسئلہ واضح ہے کہ اگر کوئی مرد مُنہ سے نکاح کا ایجاب یا قبول بالکل نہ کرے صرف کاغذ پر لکھ دے کہ: "میں فلاں عورت سے نکاح کرتا ہوں یا تجھ سے نکاح کرتا ہوں"، اور عورت بھی لکھ دے کہ مجھ کو قبول ہے، مُنہ سے کچھ نہ بولے، گواہ بھی تحریر کو پڑھ لیں، دستخط بھی کردیں، مگر اس طرح کا یہ نکاح شرعاً صحیح و درست نہ ہوگا، تو اس طرح کی طلاق بھی درست نہیں ہوسکتی۔ لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ جب خاوند اپنی مرضی و ارادے سے طلاق لکھ کر دے گا، تو مُنہ سے کہے یا نہ کہے، طلاق واقع ہوجائے گا، (جلد:03 ص:179)۔

حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا:

"ایک شخص نے اپنی بیوی مسمات فاطمہ کو یہ تحریر لکھ کر بھیجی کہ: "میں نے فاطمہ بی بی کو طلاق دے دی"، نیچے اپنے دستخط کردیئے طلاق ہوگئی یا نہیں؟"۔

مفتی صاحب جواب میں لکھتے ہیں: "اگر شوہر نے بہ نیتِ طلاق یہ عبارت لکھی ہے، تو طلاقِ رجعی واقع ہوگئی، ورنہ نہیں، کیونکہ جو طلاق اَلقاب و آداب کے بغیر ویسے ہی لکھ دی جاوے، وہ نیت پر موقوف ہے۔ اس کے بعد مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتابت کی اقسام اور تعریفات کے حوالے سے وہی عبارات لکھیں، جو ہم نے اوپر درج کی ہیں، انہوں نے "مُصَدَّرًا وَمُعَنْوَنًا" کے معنی لکھے ہیں: "باقاعدہ القاب و آداب کے ساتھ"، (ص:150)"۔

موبائل فون سے اپنی بیوی کو SMS کرکے یہ لکھنا کہ: "طلاق، طلاق، طلاق"۔ مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں یہ طلاق بالکتابت ہی کی ایک قسم ہے اور یہ "طلاقِ غیر مرسوم، مُستبین، غیر معلّق بوصول الکتاب" کی ایک جدید شکل ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ تحریری طلاق میں طلاق کے واقع ہونے کا حکم اُسی وقت ہوتا ہے، جب تحریر "اِکراہِ شرعی" کے بغیر ہو، شوہر خود اپنی تحریر کا اقرار کرے یا گواہوں سے ثابت ہو کہ یہ تحریر اُسی کی ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: "لِأَنَّ الْخَطَّ يُشْبِهُ الْخَطَّ وَالْخَاتَمَ يُشْبِهُ الْخَاتَمَ، كَمَا فِي "الْهِنْدِيَّةِ" وَغَيْرِهَا اور لِأَنَّ الْكِتَابَ يُشْبِهُ الْكِتَابَ فَلَا

یَثْبُتُ"(کیونکہ خط،خط کے مشابہ ہوتا ہےاور مُہر،مُہر کے مشابہ ہوتی ہے،جیسا کہ ہندیہ میں ہے۔۔۔۔۔اور ہدایہ میں ہے:تحریر،تحریر کے مشابہ ہوتی ہے،یعنی شوہر کے اقراریا گواہوں کے بغیر بیوی کوایسی تحریر سے طلاق ثابت نہیں ہوگی،جس میں بیوی کو براہِ راست نام کے ساتھ مخاطب کر کے تحریر نہ لکھی گئی ہو)"۔

(فتاویٰ رضویہ،جلد:12،ص:415 و 448)

علامہ ابن نجیم احکام الکتابت کے تحت لکھتے ہیں:

فَقَالَ فِي الْبَزَّازِيَةِ: اَلْكِتَابَةُ مِنَ الصَّحِيحِ وَالْأَخْرَسِ عَلىٰ ثَلَاثَةِ اَوْجُهٍ:(١) اِنْ كَتَبَ عَلىٰ وَجْهِ الرِّسَالَةِ مُصَدَّرًا مُعْنوَنًا وَثَبَتَ ذَالِكَ بِاِقْرَارٍ اَوْ بِالْبَيِّنَةِ فَكَالْخِطَابِ۔

ترجمہ:"کلام پر قادر اور گونگے شخص کی تحریر کی تین صورتیں ہیں:(۱)اگر وہ اپنی بیوی کو نام کے ساتھ مخاطب کر کے طلاق لکھے اور یہ بات شوہر کے اقرار یا گواہوں سے ثابت ہو،تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اُس نے براہِ راست بیوی کو مخاطب کر کے زبانی طلاق دی"۔

(الاشباہ والنظائر،ص:293)

صورتِ مسئولہ میں شوہر نے اپنی بیوی کو مذکورہ SMS بھیجنے کا اقرار کیا ہےاور اُس میں یہ تحریر ہے:"میں نہیں رہ سکتا،آج جو ہوا مرتے دم تک نہیں بھولوں گا،قسم خدا کی مجھے جان کی پرواہ نہیں" یہ تو طلاق نہیں ہے نہ صریح نہ کنایہ،البتہ اُس کے تحریر کردہ یہ کلمات"طلاق،طلاق،طلاق"،صریح طلاق کے الفاظ ہیں،مگر یہ اضافت سے خالی وعاری ہیں اور اس پوری تحریر میں کوئی ایسے کلمات نہیں جو اضافت کا فائدہ دیں،جب کہ طلاق کے واقع ہونے کیلئے اضافت کا ہونا ضروری ہے،خواہ طلاق زبانی ہو یا تحریری،کیونکہ وقوعِ طلاق،ایقاع(واقع کرنے)کے بغیر نہیں ہوتا۔اور ایقاع اس وقت تک نہیں ہوسکتا،جب تک طلاق کا تعلق بیوی سے نہ کیا جائے اور یہ اضافت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔اس لئے اضافت ضروری ہے،خواہ لفظی ہو،عام ازیں صراحۃً ہو یا تقدیراً،خواہ قلبی۔

فتاویٰ اجملیہ میں ایک سوال کے جواب میں تحریر ہے:

''صرف لفظِ طلاق، طلاق اگر کسی مطالبہ کے جواب میں نہ ہوں اور زوجہ کی طرف اشارہ کر کے نہ ہوں اور ان الفاظ سے عورت کو طلاق دینے کی نیت بھی نہ ہو، تو ان سے طلاق واقع نہ ہوگی، اس میں بیوی کی طرف کسی کی نسبت اور اشارہ نہ پایا گیا، درمختار میں ہے: لَمْ یَقَعْ لِتَرْکِہِ الْاِضَافَۃَ اِلَیْھَا، (یعنی بیوی کی طرف نسبت نہ ہونے کی وجہ سے طلاق واقع نہ ہوئی)، (جلد:03، ص:378)''۔

مسئلۂ اضافت کی تفصیل کا اختصار فتاویٰ رضویہ سے یہ ہے:

اِنَّ الْاِضَافَۃَ لَا بُدَّ مِنْھَا، اِمَّا فِی اللَّفْظِ وَاِمَّا فِی النِّیَّۃِ، اِذْلَا طَلَاقَ اِلَّا بِالْاِیْقَاعِ وَلَا اِیْقَاعَ اِلَّا بِاِحْدَاثِ تَعَلُّقِ الطَّلَاقِ بِالْمَرْاَۃِ، وَلَیْسَ ذٰلِکَ اِلَّا بِالْاِضَافَۃِ، وَھٰذَا ضَرُوْرِیٌّ لَا شَکَّ فِیْہِ، اِذْ لَوْلَاہُ لَزِمَ الطَّلَاقُ عَلٰی کُلِّ مَنْ تَلَفَّظَ بِلَفْظِ طَلَاقٍ اَوْ طَالِقٍ وَنَحْوِھِمَا، وَاِنْ لَّمْ یُرِدْ عَلٰی ھٰذَا شَیْئًا اَوْلَمْ یُرِدْ طَلَاقَ امْرَاَتِہٖ وَھُوَ بَاطِلٌ قَطْعًا، فَاشْتِرَاطُ الْاِضَافَۃِ حَقٌّ لَا مِرْیَۃَ فِیْہِ، نَعَمْ قَدْ تُوْجَدُ الْاِضَافَۃُ فِی اللَّفْظِ فَلَا یَحْتَاجُ فِی الْحُکْمِ اِلَی النِّیَّۃِ، وَقَدْ لَا تُوْجَدُ فِی اللَّفْظِ فَیَحْتَاجُ اِلٰی ظُھُوْرِ النِّیَّۃِ۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

اَمَّا وُجُوْدُ الْاِضَافَۃِ فِی اللَّفْظِ فَاَقُوْلُ عَلٰی ثَلَاثَۃِ اَنْحَاءٍ: اَلْاَوَّلُ تَحَقُّقُھَا صَرِیْحًا فِیْ کَلَامِ الزَّوْجِ، وَھٰذَا الَّذِیْ ذَکَرَ الْحَلَبِیُّ وَالطَّحَاوِیُّ اُمْثِلَتَہٗ کَقَوْلِہٖ: اَنْتِ طَالِقٌ اَوْ طَلَّقْتُکِ اَوْ ھٰذِہٖ اَوْ زَیْنَبُ اَوْ بِنْتُ زَیْدٍ اَوْ اُمُّ عَمْرٍو اَوْ اُخْتُ بَکْرٍ اَوْ امْرَاَتِیْ طَالِقٌ۔ اَلثَّانِیْ تَحَقُّقُھَا فِیْہِ لِاَجْلِ کَوْنِہٖ جَوَابًا لِکَلَامٍ تَحَقَّقَتْ فِیْہِ، فَتَحَقَّقَ فِی الْجَوَابِ اَیْضًا، لِاَنَّ السُّؤَالَ مُعَادٌ فِی الْجَوَابِ، وَھٰذَامَا فِی "الْھِنْدِیَّۃِ "عَنِ "الْخُلَاصَۃِ" قَالَتْ: طَلَاقِ بَدَستِ تُو اَسْت، مَرَا طَلَاق کُن، فَقَالَ الزَّوْجُ: طَلَاقِ مِی کُنَم وَکَرَّرَ ثَلٰثًا، طُلِّقَتْ ثَلٰثًا۔

ترجمہ:''طلاق کے موثر و نافذ ہونے کے لئے اضافت (یعنی بیوی کی طرف طلاق کی

نسبت) ضروری ہے، خواہ شوہر کے اپنے الفاظ میں نسبت واضح ہو یا اُس کی نیت اور ارادے میں ہو، کیوں کہ طلاق ایقاع (بیوی پر واقع کرنے) کے بغیر از خود واقع نہیں ہوتی اور بیوی پر طلاق کا اُس وقت تک ایقاع نہیں ہوتا جب تک طلاق کو عورت کے ساتھ متعلق نہ کیا جائے اور یہ بات صرف اضافت کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔ اور یہ (یعنی طلاق واقع کرنے کے لئے بیوی کی طرف نسبت) ضروری ہے، اس میں کوئی شک نہیں، ورنہ (یعنی اگر نسبت کو لازمی نہ قرار دیا جائے تو) جو شادی شدہ شخص بھی طلاق یا طالق وغیرہ الفاظ یا لفظ بولے، خواہ اُس کا اِن کلمات کے بولنے سے کوئی ارادہ ہی نہ ہو یا اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ نہ کیا ہو، پھر بھی اُس کی بیوی کو طلاق واقع ہو جائے، اور یہ بات قطعاً باطل ہے۔ پس بیوی پر طلاق کے مؤثر اور نافذ ہونے کے لئے طلاق کا بیوی کی طرف منسوب ہونا حق ہے، اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ہاں! بیوی کی طرف طلاق کی نسبت جب لفظوں میں موجود ہو تو طلاق کا حکم لگانے میں نیت معلوم کرنے کی حاجت نہیں ہوتی، مگر جب طلاق کی نسبت لفظوں میں موجود نہ ہو، تو شوہر کی نیت کو ظاہر کرنے یعنی معلوم کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔

لیکن جہاں تک لفظوں میں طلاق کی نسبت پائے جانے کا تعلق ہے، تو میں کہتا ہوں کہ اُس کی تین قسمیں ہیں:

(۱) یہ کہ طلاق کی نسبت شوہر کے کلام میں صراحت ووضاحت کے ساتھ ثابت ہو (یعنی شوہر کی نیت پوچھنے کی نوبت ہی نہ آئے)، یہ وہ قسم ہے جس کی مثالیں ''علامہ حلبی اور علامہ طحاوی'' نے ذکر کی ہیں، جیسے: اَنْتِ طَالِقٌ یا طَلَّقْتُكِ یا یہ یا زینب یا زید کی بیٹی یا عمرو کی ماں یا بکر کی بہن یا میری بیوی کو طلاق ہے، (یعنی بیوی کو خطاب کر کے کہے کہ تجھے طلاق یا میں نے تجھے دی یا اُس کی طرف براہِ راست اشارہ کر کے کہے کہ اِسے طلاق ہے یا اُس کا نام لے کر کہے کہ مثلاً زینب کو طلاق ہے یا باپ یا بیٹے یا بھائی کی نسبت سے کہے کہ زید کی بیٹی یا عمرو کی ماں یا بکر کی بہن یا میری بیوی کو طلاق ہے اور زید کی ایک ہی بیٹی ہو یا اس کی ایک ہی بیوی ہو)۔

(۲) یا یہ کہ شوہر طلاق کے الفاظ کسی ایسے سوالیہ کلام کے جواب میں کہے، جس میں بیوی کی طرف طلاق کی نسبت پہلے سے موجود ہے، تو یہ نسبت از خود جواب کے ساتھ متعلق ہو جائے اور ثابت ہو جائے گی، اس کی مثال ''فتاویٰ عالمگیری'' اور ''خلاصۃ الفتاویٰ'' کے حوالے سے یہ درج ہے: ''بیوی نے شوہر سے کہا: ''طلاق تیرے اختیار میں ہے، مجھے طلاق دے دے''، جواب میں شوہر نے کہا: ''طلاق دیتا ہوں'' اور یہ کلمہ تین بار کہا، تو اِس سے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی''، (کیوں کہ اگر چہ شوہر کے کلام میں بیوی کی طرف طلاق کی نسبت مذکور نہیں ہے، مگر بیوی کے جس کلام کے جواب میں شوہر نے یہ الفاظ کہے ہیں، ان میں پہلے سے بیوی کی طرف نسبت موجود ہے اور وہ نسبت جواب میں بھی معتبر ہوگی)۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 12، ص: 345-344)

آگے چل کر امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلثَّالِثُ اَنْ لَّا یَشْتَمِلَ کَلَامُہٗ عَلَى الْاِضَافَۃِ وَلَا یَکُوْنُ خَرَجَ مَخْرَجَ الْجَوَابِ لٰکِنْ یَکُوْنُ اللَّفْظُ خَصَّہُ الْعُرْفُ بِتَطْلِیْقِ امْرَأَۃٍ، فَحَیْثُ یُطَلِّقُ یُفْھَمُ مِنْہُ اِیْقَاعُ الطَّلَاقِ عَلَى الْمَرْأَۃِ، کَقَوْلِھِمْ: "الطَّلَاقُ یَلْزَمُنِیْ"، "وَالْحَرَامُ یَلْزَمُنِیْ"، "وَعَلَیَّ الطَّلَاقُ"، "وَعَلَیَّ الْحَرَامُ"، فَاِنَّہٗ کَمَا قَالَ فِیْ رَدِّالْمُحْتَارِ، صَارَ فَاشِیًا فِی الْعُرْفِ فِیْ اِسْتِعْمَالِہٖ فِی الطَّلَاقِ، لَا یَعْرِفُوْنَ مِنْ صِیَغِ الطَّلَاقِ غَیْرَہٗ، وَلَا یَحْلِفُ بِہٖ اِلَّا الرَّجُلُ، فَھٰھُنَا وَاِنْ لَّمْ تُذْکَرِ الْاِضَافَۃُ لَفْظًا لٰکِنَّھَا ثَابِتَۃٌ عُرْفًا، وَالْمَعْھُوْدُ عُرْفًا کَالْمَوْجُوْدِ لَفْظًا، فَمِنْ ھٰھُنَا وُجِدَتِ الْاِضَافَۃُ فِی اللَّفْظِ، وَحُکِمَ بِالْوُقُوْعِ مِنْ دُوْنِ نِیَّۃٍ، فَھٰذِہٖ صُوَرٌ تَحَقَّقَ الْاِضَافَۃُ فِی اللَّفْظِ، وَاَمَّا اِذَا خَلَا عَنْھَا بِوُجُوْھِھَا الثَّلٰثَۃِ فَحِ لَا بُدَّ مِنْ وُجُوْدِھَا فِی النِّیَّۃِ، فَاِنْ نَوٰی وَقَعَ، وَاِلَّا لَا، وَھٰذَا مَا قَالَ فِی "الْھِنْدِیَّۃِ" عَنِ "الْمُحِیْطِ": لَا یَقَعُ فِیْ جِنْسِ الْاِضَافَۃِ اِذْلَمْ یَنْوِ لِعَدَمِ الْاِضَافَۃِ اِلَیْھَا اھ ھٰذَا فِیْمَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ رَبِّہٖ تَعَالٰی۔

ترجمہ: ''(۳) لفظی نسبت کی تیسری صورت یہ ہے کہ نہ شوہر کے کلام میں اضافت ہو اور نہ

کسی ایسے کلام کے جواب میں شوہر نے طلاق دینے کا کلمہ استعمال کیا ہو، جس میں نسبت پہلے سے موجود ہے، لیکن عرف میں اِس لفظ کو بیوی کو طلاق دینے کے لئے خاص کر دیا گیا ہے، تو شوہر جب بھی ایسا لفظ بولے گا، اُس سے بیوی کو طلاق دینا ہی سمجھا جائے گا، جیسے: شوہر کہے: ''مجھ پر طلاق لازم ہے'' اور ''حرام مجھ پر لازم ہے'' یا ''مجھ پر طلاق لازم ہے'' یا ''مجھ پر حرام واجب ہے''، تو جیسے کہ ''ردالمحتار'' میں فرمایا: ان الفاظ کا استعمال عرف میں طلاق کے لئے مشہور ہے، حتی کہ اہلِ عرف (یعنی عام لوگ) طلاق کے لئے دوسرے الفاظ سے متعارف نہیں ہیں۔ اور ان الفاظ کو صرف مرد ہی کے لئے حلف کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ پس یہاں اگر چہ طلاق کی نسبت لفظاً مذکور نہیں ہے، لیکن یہ عرفاً ثابت ہے اور جو چیز عرف میں مشہور و معروف ہو، وہ ایسے ہی معتبر ہے، جیسے لفظوں میں مذکور ہو، پس یہاں لفظوں (یعنی کلام) میں اضافتِ طلاق اور نیت کا اعتبار کئے بغیر طلاق واقع ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔

پس یہ وہ صورتیں ہیں جن میں طلاق کی لفظی نسبت موجود ہوتی ہے۔ لیکن اگر شوہر کا کلام طلاق کی لفظی نسبت کی ان تین صورتوں سے خالی ہو، تو پھر اس صورت میں طلاق کی نسبت کا نیت میں پایا جانا ضروری ہے۔ پس اگر اُس نے طلاق کی نیت سے ایسے الفاظ بولے ہوں گے، تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر شوہر نے طلاق کی نیت کے بغیر الفاظ بولے ہوں گے، تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور عالمگیری میں ''المحیط'' کے حوالے سے ''نسبتِ طلاق'' کے بارے میں یہی بات کہی گئی ہے کہ طلاق کے کلمات میں (جہاں لفظی نسبت موجود نہ ہو) جب شوہر خود طلاق کی نیت نہ کرے، ایسے کلمات سے طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ ان میں عورت کی طرف طلاق کی نسبت موجود نہیں ہے (اور طلاق کے واقع کرنے کے لئے بیوی کی طرف نسبت لازمی ہے)، یہ نیت کا معاملہ بندے اور اُس کے رب کے درمیان ہے۔۔۔۔۔۔ آگے چل کر امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَمَّا قَضَاءً فَتَنْقَسِمُ هٰذِهِ الصُّوْرَةُ اِلٰى قِسْمَيْنِ: اَلْاَوَّلُ اَنْ تُوْجَدَ هٰهُنَا قَرِيْنَةٌ يُسْتَانَسُ

بِهَا عَلٰی تَحَقُّقِ النِّیَّةِ، وَیَکُوْنُ هُوَ الْأَظْهَرُ فِی الْمَقَامِ، فَحِ یُحْکَمُ بِالْوُقُوْعِ مَالَمْ یَقُلْ اِنِّیْ لَمْ أُرِدْهَا، فَإِنْ قَالَهٗ فَلَا یُصَدَّقُ اِلَّا بِالْیَمِیْنِ، فَإِنْ حَلَفَ صُدِّقَ، لِکَوْنِهٖ اَمِیْنًا فِی الْإِخْبَارِ عَمَّا فِیْ نَفْسِهٖ وَقَدْ اَتٰی بِمَا یَحْتَمِلُهٗ کَلَامُهٗ، وَهٰذَا مَا قَالَ فِی الْهِنْدِیَّةِ عَنْ خُلَاصَةِ الْفَتَاوٰی۔

ترجمہ: لیکن قضاءً نیت کی بنا پر طلاق کا حکم لگانے کا جو سوال ہے، اُس کی دو قسمیں ہیں: (۱) یہ کہ شوہر کے کلام میں ایسا قرینہ موجود ہو جس سے محسوس ہو کہ شوہر نے بیوی کی طرف طلاق کی اضافت کی نیت کی ہے اور یہ بات اُس مقام پر ظاہر و واضح ہو، تو ایسی صورت میں طلاق واقع ہونے کا حکم لگایا جائے گا، جب تک شوہر یہ نہ کہے کہ میری نیت طلاق کی نہیں تھی۔ اگر وہ یہ بات کہتا ہے تو قسم کے بغیر اُس کی تصدیق نہیں کی جائے گی اور ''شوہر قسم کھا کر کہہ دیتا ہے کہ میری بیوی کو طلاق دینے کی نیت نہیں تھی، تو قضاءً اُس کے قول کو سچا مانا جائے گا (یعنی طلاق واقع نہ ہونے کا حکم لگایا جائے گا)، کیوں کہ اپنی نیت کے بارے میں وہی امین ہے، جب کہ اُس کے کلام میں اِس معنی کا احتمال موجود ہے اور ''فتاویٰ عالمگیری'' میں ''خلاصۃ الفتاویٰ'' کے حوالے سے یہی بات کہی گئی ہے''۔

(فتاوی رضویہ، جلد: 12، ص: 51-50-349)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال ہوا:

''محمد بخش نے اپنی عورت کو اس ترکیب سے ایک خطبہ میں طلاق دیا کہ: ''طلاق، طلاق، طلاق''۔ اور مہر جو کچھ بھی تھا ادا کر دیا اور طلاق دیئے ہوئے عرصہ ایک سال کا ہوا۔ اور اب پھر دوبارہ نکاح کرنا چاہتے ہیں مطابق دوسرے پارہ کے، جیسا کہ چودہویں رکوع میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، مگر ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا، صورت بالا میں مطابق قرآن وحدیث کے جواب مرحمت فرمادیا جاوے''۔

آپ نے جواب میں لکھا:

''اگر اُس نے اتنے ہی لفظ کہے کہ: ''طلاق، طلاق، طلاق''۔ نہ یہ کہا کہ دی، نہ یہ کہا کہ: تجھ

گویا اِس عورت کو، نہ یہ الفاظ کسی ایسی بات کے جواب میں تھے، جس سے عورت کو طلاق دینا مفہوم ہو، تو طلاق اصلاً نہ ہوئی، وہ بدستور اُس کی عورت ہے، دوبارہ نکاح کی حاجت نہیں۔ اور اگر اُس کے ساتھ یا اُس بات میں جس کے جواب میں یہ الفاظ تھے، وہ لفظ موجود تھے، جن سے یہ مفہوم ہو کہ اُس نے اپنی عورت کو طلاق دی یا وہ اقرار کرے کہ میں نے یہ الفاظ عورت کو طلاق دینے کی نیت سے کہے تھے، تو تین طلاقیں ہو گئیں، بے حلالہ اُس کے نکاح میں نہیں آسکتی، (فتاویٰ رضویہ، جلد:12، ص:92-391)''۔

ایک اور موقع پر امام احمد رضا قادری قُدِّس سرُّہٗ العزیز سے سوال ہوا:

زن وشو میں باہمی نزاعِ لفظی واقع ہوا، اُس پر شوہر نے کہا: ''تو میری چیز کھائے تو طلاق ہے''۔الخ

آپ نے جواب میں لکھا:

اگر الفاظ اسی قدر تھے جو مذکور ہوئے، جن میں کچھ ذکر نہیں کہ کون طلاق ہے، کس پر طلاق ہے؟۔اور ایسی حالت میں شوہر کا بہ قسم بیان کہ اِن الفاظ سے میں نے طلاقِ زوجہ کی نیت نہ کی، تو صورتِ مذکورہ میں بموجب روایاتِ کثیرہ ''فتاویٰ قاضی خان وخلاصۃ الفتاویٰ وفتاویٰ بزازیہ وفتاویٰ ہندیہ وفتاویٰ ذخیرہ ومحیط امام برہان الدین وقُنیہ والبحر الرائق ودرمختار'' وغیرُھا، اِن الفاظ پر کوئی اثر نہ اب ہے، نہ آئندہ کسی چیز کے کھانے سے پیدا ہو، الخ

(فتاویٰ رضویہ، جلد:13، ص:116-115)

اسی طرح امام احمد رضا قادری قُدِّس سرُّہٗ العزیز سے ایک طویل سوال میں بیوی کے گھر والوں نے شوہر سے متعلق کہا کہ اُس نے اپنی بیوی سے کہا: ''اگر عصر تک آپ اپنے گھر نہ آئیں تو میری طرف سے جواب ہے''۔

آپ نے جواب دیا:

''بالفرض لفظِ جواب'' معنی ردو انکار کا صالح نہ ہوتا، بلکہ جانے دیجیے، یوں فرض کیجیے کہ وہ سرے سے کنایہ ہی نہ ہوتا بلکہ خاص صریح ہوتا، جب بھی صورتِ مُستفسرہ میں بعد اِس کے

کہ فصلِ کریم نے حلفاً انکارِ نیت کیا، حکمِ طلاق زنہار (تب بھی) ممکن نہ تھا کہ یہاں عورت کی طرف اضافت نہیں، صرف اتنا کہا کہ: ''میری طرف سے جواب ہے''، یہ کچھ نہ کہا کہ کس کو جواب ہے اور ترکِ اضافت ہمیشہ مانعِ حکمِ طلاق ہے، جب کہ شوہر بہ حلف انکارِ نیت کرے۔

ثانیاً: اُسے نہ سوجھا کہ لفظ اضافت سے خالی ہے، تو بحالِ انکارِ نیت حکمِ طلاق ناممکن ہے، اگر چہ خود لفظِ طلاق ہوتا، جیسا کہ مسائل مذکورہ میں گزرا، نہ کہ لفظِ ''جواب'' نہ کنایہ ہے اور متحمل ردوانکار، محیط میں ہے:

لَا یَقَعُ فِیْ جِنْسِ الْاِضَافَةِ اِذَا لَمْ یَنْوِ لِعَدَمِ الْاِضَافَةِ اِلَیْهَا، ترجمہ: ''جنسِ اضافت میں عورت کی طرف طلاق کی نسبت نہ ہونے کی وجہ سے طلاق واقع نہ ہوگی، جب تک شوہر خود نیت نہ کرے، (فتاوٰی رضویہ، جلد: 13، ص: 115-116-120-123)''۔

آج کل انٹرنیٹ اور موبائل کا استعمال عام ہے۔ انٹرنیٹ سے E-mail اور موبائل سے SMS نے ایک وبائی شکل اختیار کر لی ہے۔ آئی ۔ ٹی کمپنیوں اور اُن کے توسط سے پرائیویٹ ٹی ۔ وی چینلز کی آمدنی کا یہ ایک بڑا ذریعہ ہے۔ انٹرنیٹ ID یا موبائل سیٹ تک کسی کی بھی رسائی (Reach) ہوسکتی ہے اور وہ کسی قسم کی دست درازی یا فنکاری (Manipulation) کے ذریعے اُس کا ایسا استعمال بھی کرسکتا ہے، جو اُس کے لئے نقصان دہ ہو، کیوں کہ لوگ باہمی اعتماد کی بنا پر یا Good Faith میں دوستوں کو اپنی ای میل کا Password بتادیتے ہیں۔ اس لئے جس کی آئی ڈی سے میل یا موبائل فون سے ایس ایم ایس بھیجا گیا ہے، اُس کے اقراری بیان سے ہی اِس کی تصدیق ہوسکتی ہے کہ یہ اُس نے بھیجا ہے۔ اگر اُس کے بیان کی صداقت پر کسی کو اعتماد نہ ہو اور گواہ بھی نہ ہوں تو اُس کے حلفیہ بیان پر فیصلہ ہوگا۔ اگر وہ جھوٹی قسم کھاتا ہے، تو سارا وبال اُس پر ہوگا۔

سائل محمد فرحان نے دریافت کہ وہ اپنی بیوی کو اُس کے میکے لینے گیا تو اس نے ساتھ آنے سے انکار کردیا۔ اُس پر محمد فرحان نے اپنی بیوی کو SMS کیا اور اس میں لکھا: ''میں نہیں رہ

سکتا، آج جو ہوا مرتے دم تک نہیں بھولوں گا، قسم خدا کی مجھے جان کی پرواہ نہیں، طلاق، طلاق، طلاق''۔ آیا ان الفاظ سے طلاق ہوئی یا نہیں؟۔ اس SMS میں بیوی کا نام لئے بغیر اور اُس کو براہِ راست مخاطب کیے بغیر صرف تین دفعہ لفظِ طلاق لکھا ہے۔

ابتدا میں ہم نے جو تحریری طلاق کی مختلف صورتیں یا قسمیں تحریر کی ہیں، اُن میں سے یہ ''طلاق غیر مرسوم مستبین غیر مُعلّق بوصول الکتاب'' ہے۔ یعنی اس تحریر میں مندرجہ ذیل امور ہیں:

(۱) بیوی کا نام لے کر نہیں لکھا گیا کہ فلانہ بنت فلاں کو طلاق (۲) بیوی کو براہِ راست مخاطَب کر کے بھی نہیں لکھا گیا کہ تجھے طلاق ہے۔ لہٰذا یہ ''طلاق مرسومہ'' نہیں ہے کہ خط کتابت کے معروف و مروّج طریقے کے مطابق شوہر نے اپنی بیوی کو براہِ راست مخاطَب کر کے خطاب کے صیغے کے ساتھ یا اُس کا نام لکھ کر طلاق لکھی ہو، یعنی یہ ایسی تحریر نہیں ہے جسے فتاویٰ کی کتابوں میں ''مَرْسُوْمًا مُصَدَّرًا مُعَنْوَنًا'' سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) یہ بھی نہیں لکھا کہ میری بیوی کو یا فلاں کی بیٹی کو طلاق ہو وغیرہ

(۴) اسی طرح بیوی کا نام لے کر یہ بھی نہیں لکھا کہ جب میرا یہ SMS تمہیں پہنچے تو تمہیں ایک یا دو یا تین طلاق۔

اس لئے اوپر ہم نے لکھا کہ یہ طلاق ''غیر مرسوم مستبین غیر مُعلّق بوصول الکتاب'' ہے۔

البتہ یہ تحریر مستبین ہے، یعنی واضح طور پر تحریر ہے، پڑھی جا رہی ہے اور سمجھ میں آ رہی ہے۔ شوہر خود اپنے ارسال کیے ہوئے SMS کا اقرار بھی کر رہا ہے۔ لیکن اِس میں اُس کو بیوی طرف طلاق کی اضافت (نسبت) نہیں ہے۔ اضافتِ طلاق کی تین ممکنہ صورتیں جو ہم نے گذشتہ سطور میں بیان کی ہیں، اُن میں سے ایک صورت میں بھی اِس تحریر میں نہیں پائی جاتی۔ صریح نسبت بھی نہیں جو عرف میں صرف اور صرف بیوی کو طلاق دینے کے لئے معروف، مشہور، معہود اور معتاد ہوں جن کی تفصیل گذشتہ سطور میں بیان کی جا چکی ہے۔

چونکہ SMS کی تحریر بہر حال مستبین ہے یعنی واضح اور پڑھی جا رہی ہے، لہٰذا یہ شوہر کی نیت

پر موقوف ہے۔

یہاں ایسا قرینہ بھی نہیں ہے کہ اسے ''ایقاعِ طلاق'' پر محمول کیا جائے۔ لہٰذا SMS کی اس تحریر کے بارے میں شوہر سے پوچھا جائے گا، اگر وہ کہے کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نیت سے تین مرتبہ ''طلاق، طلاق، طلاق'' لکھ کر اسے SMS ارسال (SEND) کیا ہے۔ تو اس سے طلاق ثلاثہ واقع ہو جائیں گی۔ اور اگر وہ کہتا ہے کہ میری نیت بیوی کو طلاق دینے کی نہیں تھی، تو پھر وقوعِ طلاق کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

فرض کیجئے کہ شوہر اور بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہوتا ہے (مطالبۂ طلاق کی صورت نہیں ہے) اور شوہر بیوی کے سامنے بغیر اضافت کے ''طلاق، طلاق، طلاق'' کہتا ہے۔ تو زبانی کلماتِ طلاق بولنے کے باوجود یہ علی الاطلاق وقوعِ طلاق کا قرینہ نہیں ہے، حالانکہ زبانی طلاق دینا ہی اصل ہے، تحریری طلاق خلاف قیاس ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی پر ''اکراہِ شرعی'' کر کے طلاق پر مجبور کیا جائے تو اُس کی زبانی طلاق تو مؤثر ہو جائے گی، لیکن تحریری نہیں، کیونکہ تحریری طلاق ضرورت کے وقت زبانی طلاق کے قائم مقام ہوتی ہے اور یہاں ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر شوہر اپنے ہاتھ سے تین مرتبہ ''طلاق، طلاق، طلاق'' لکھ کر بھی اپنی بیوی کو ڈاک کے ذریعے بھیج دے، تب بھی یہ مطلقاً قصد و انشاءِ طلاق کا قرینہ نہیں ہے، جب تک شوہر یہ اقرار نہ کرے کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کے ارادے سے ہی یہ تحریر بھیجی ہے۔

صراحۃً اضافتِ طلاق کی چند صورتیں یہ ہیں:

جیسے شوہر کہے: ''میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی'' یا اپنی بیوی کا نام لے کر کہے: ''میں نے فلانہ کو طلاق دی'' یا اپنی بیوی سے براہِ راست مخاطِب ہو کر کہے: ''میں نے تجھے طلاق دی'' یا شوہر اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہے: ''میں نے اِسے طلاق دی'' یا بیوی کی طرف طلاق کی نسبت تقدیراً ہو، جیسے: بیوی نے شوہر سے سوال کیا یا مطالبہ کیا کہ: ''مجھے طلاق دے دے''، اِس کے جواب میں شوہر کہے: ''میں نے طلاق دے دی'' یا کسی نے شوہر سے کہا: ''اپنی بیوی کو طلاق دے دے'' یا اُس کا نام لے کر کہا: ''فلانہ کو طلاق دے

دے''، تو اس کے جواب میں شوہر کہے: ''میں نے طلاق دی'' یا ''میں طلاق دیتا ہوں''، کیونکہ سوال جواب میں معتبر ہوتا ہے یا جواب سوال ہی پر موقوف ہوتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ کوئی دوسرے فریق سے عدالت میں قسم کا مطالبہ کرے تو اَلْیَمِیْنُ عَلٰی نِیَّۃِ الْمُسْتَحْلِفِ یعنی قسم کی توجیہ قسم کا مطالبہ کرنے والی کی مراد پر ہوگی''۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شوہر نے کہا: ''میں نے طلاق دی''۔ اور پوچھنے پر اُس نے اقرار کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے، کیونکہ عامۃ الناس اچھی طرح جانتے ہیں کہ طلاق بیوی ہی کو دی جاتی ہے۔ شاذ و نادر ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ نیت میں نسبت موجود نہ ہو۔ البتہ یہ اُس صورت میں ہوسکتا ہے کہ شوہر عالم ہو اور اضافتِ طلاق کے مسئلے سے بخوبی واقف ہو۔ ورنہ عام حالات میں اگر اضافت صراحۃً اور تقدیراً نہ ہو مگر نیت میں اضافت ہوتی ہے۔ لیکن یہاں SMS کے مسئلے میں اضافتِ طلاق نہ صراحۃً ہے: نہ تقدیراً اور نہ نیت پر کوئی قرینہ ہے۔ پس اگر شوہر کہتا ہے کہ SMS میں ''طلاق، طلاق، طلاق'' لکھنے میں میری نیت بیوی کو طلاق دینے کی نہیں تھی، تو حکم دیا جائے گا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی اور اس صورت میں حلف کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے اس سوال کے جواب میں مختصر جواب لکھا تھا اور فتوے کا حتمی نتیجہ وہی تھا جو سطور بالا میں درج ہے، لیکن میں نے اس فتوے کو نظرِ ثانی کے لئے محترم مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی زید مجدہم کے پاس بھیجا، انہوں نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے معرکۃ الاراء فتاویٰ اور دیگر کتبِ فتاویٰ سے اس پر تفصیلی حوالہ جات لکھے، نفسِ مسئلہ کی بڑی فقیہانہ وضاحت کی، میں نے اُن سب کو اس جواب کا حصہ بنا دیا ہے تاکہ ہمارے نوجوان علماء اس سے استفادہ کریں اور پھر اصل مصادر اور مآخذ کا بھی مطالعہ کریں اور اس مسئلے پر عبور حاصل کریں، کیونکہ یہ روزمرہ پیش آنے والے مسائل میں سے ہے۔ میں ایک بار پھر حضرت مفتی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُن کے علم اور تفقہ فی الدین میں مزید اضافے اور مہارتِ تامہ کاملہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہوں۔

طلاقِ کنایہ

سوال: 117

میری بیٹی کا نکاح ہوا، رخصتی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہونا قرار پائی، نکاح کے بعد نہ ہی خلوت پائی گئی اور دونوں کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ لڑکے نے فون پر لڑکی سے مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ فوراً رخصتی کر دی جائے۔ لڑکی نے ناراضگی کا اظہار کیا کہ یہ فیصلہ میرے گھر والے کریں گے، لڑکے نے بار بار فون پر یہی سوال کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ ''یہ نکاح تمہاری مجبوری ہے، میں تمہیں اس مجبوری سے آزاد کرتا ہوں''، پھر اُسی وقت کہا کہ: ''جاؤ میں نے تمہیں آزاد کیا جو جی چاہے کرو''۔ اب لڑکے کا کہنا یہ ہے کہ اُس نے یہ الفاظ غصے کی حالت میں کہے تھے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اُس نے کئی مولویوں سے فتویٰ لیا ہے کہ غصے میں ایسے الفاظ کہنے سے طلاق نہیں ہوتی۔ شریعت اس بارے میں کیا کہتی ہے، فقہ حنفی کے مطابق جواب عنایت فرمائیں۔

کشور سلطانہ، سیکٹر 9، نارتھ کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں شوہر کا یہ قول ''یہ نکاح تمہاری مجبوری ہے، میں تمہیں اس مجبوری سے آزاد کرتا ہوں'' طلاقِ صریح کا کلمہ نہیں بلکہ کنایات میں سے ہے اور بحالتِ غصہ اس سے ''طلاقِ بائن'' مراد لی جائے گی، چونکہ شوہر اقرار کرتا ہے کہ اُس نے غصے میں یہ الفاظ کہے، واضح رہے کہ طلاق غصے ہی میں دی جاتی ہے، نیز اُس کا قول: ''یہ نکاح تمہاری مجبوری ہے، میں تمہیں اس مجبوری سے آزاد کرتا ہوں'' اس بات پر قرینہ ہے کہ اُس کی مراد طلاق ہے، لہٰذا ایک طلاق بائن واقع ہوگئی اور چونکہ لڑکی غیر مدخولہ ہے لہٰذا نکاح ختم ہوگیا، اب وہ دونوں چاہیں تو باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں اور لڑکی کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے لئے بھی آزاد ہے، اگر سابق شوہر سے نکاح کیا تو آئندہ اُسے صرف دو طلاق کا حق حاصل رہے گا، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: وَلَوْ قَالَ

أُعْتِقُتُكِ طُلِّقَتْ بِالنِّيَّةِ كَذَا فِيْ مِعْرَاجِ الدِّرَايَةِ۔

ترجمہ: ''اور اگر (خاوند) نے اپنی بیوی سے کہا: ''میں نے تجھے آزاد کیا''، اگر (یہ کلمات ادا کرتے وقت) ان کی نیت طلاق کی تھی، تو ایک طلاق واقع ہو جائیگی، جیسا کہ معراج الدرایہ میں ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 376 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

مختلف الفاظِ طلاق کا حکم

سوال: 118

میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کے دوران شوہر نے اشتعال میں آکر دو بار ایک سانس میں کہا ''میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی''۔ بیوی کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنے پورے ہوش وحواس میں تین بار سنا ہے اور وہ حلف کے لئے بھی تیار ہے، مگر شوہر کا کہنا ہے کہ صرف دو مرتبہ کہا ہے۔ ساتھ ہی بیوی کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ تقریباً 14 سال قبل شوہر نے اُس سے کہا تھا کہ ''اگر اس نے اپنی ماں سے بات کی یا ملنے گئی تو وہ خود کو طلاق سمجھے مگر خاتون تسلیم کرتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی مرضی کی بنا نہ تو کبھی اپنی ماں سے ملنے گئی اور نہ ہی کبھی بات کی۔ ایک نیا دعویٰ اور بھی ہے کہ شوہر نے اسے ایک مدت قبل یہ کہہ کر گھر میں پابند کیا تھا کہ اگر تم شوہر کی مرضی کی بنا گھر سے باہر گئیں تو تمہیں طلاق دے دوں گا، مگر یہاں بھی وہ تسلیم کرتی ہیں کہ انہوں نے شوہر کی مرضی کے بغیر کبھی گھر سے قدم باہر نہیں نکالا۔ شوہر اِن دونوں واقعات کا سرے سے انکار کرتا ہے کہ ذہن پر پورا زور دیئے کے باوجود مجھے ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں۔ خاتون خود کو مذہبی کہتی ہیں لیکن حال اُن کا یہ ہے کہ اپنے تین بچوں سے کہا کہ انہیں طلاق ہوگئی ہے اور وہ عدت میں ہیں گھر سے نہیں نکل سکتیں، لیکن ایک گھنٹہ بعد ہی بچوں کو لے کر شہر سے 100 میل دور کسی عبادت کے لئے چلی گئیں، باپ نے بچوں سے کہا کہ عدت میں ہیں تو پھر 100 میل دور کیسے چلی گئیں؟، جواب ملا: اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟۔

محمد آفاق فاروقی، نیو یارک

جواب:

صورتِ مسئولہ میں شوہر دو طلاق کا اقرار کر رہا ہے، لہٰذا دو طلاقِ رجعی واقع ہوگئیں، مگر عدت کے اندر اُسے رجوع کا حق حاصل ہے، خواہ رجوع قولی ہو یا فعلی۔ قولی سے مراد یہ ہے کہ زبانی کہے کہ: میں نے رجوع کیا یا میں رجوع کرتا ہوں، فعلی سے مراد یہ ہے کہ ازدواجی تعلق قائم کرلے۔ تاہم رجوع کی صورت میں آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور یہ دو طلاق مستقبل میں خدانخواستہ دی جانے والی طلاق کے ساتھ جمع ہونے کے لئے مؤثر رہیں گی۔ اگر شوہر نے رجوع نہیں کیا تو عدت گزرنے کے بعد عورت کسی بھی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے آزاد ہوگی جبکہ کوئی مانع شرعی نہ ہو، عدّت تین حیض کا گزرنا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عورت تین طلاق دینے کا دعویٰ کرتی ہے اور شوہر صرف دو طلاق کا اقرار کرتا ہے تو چونکہ عورت کے پاس تیسری طلاق کے ثبوت کے لئے گواہ نہیں ہیں، لہٰذا شوہر کو قسم دی جائے گی اور قضاءً قسم کے ساتھ اس کا قول معتبر ہوگا۔

امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز لکھتے ہیں:

''اگر گواہ نہ ہوں اور عورت کے سامنے طلاق نہ دی ہو تو عورت اس سے حلف لے، اگر وہ حلف دے کہ میں نے طلاق نہ دی تو عورت اپنے آپ کو اس کی زوجہ سمجھے، اگر شوہر نے حلف جھوٹا کیا تو وبال اس پر ہے اور اگر خود زوجہ کے سامنے اسے تین طلاقیں دیں اور منکر ہوگیا اور گواہ عادل نہیں ملتے تو عورت جس طرح جانے اس سے رہائی لے اگرچہ اپنا مہر چھوڑ کر یا اور مال دے کر، اور اگر وہ یوں بھی نہ چھوڑے تو جس طرح بن پڑے اس کے پاس سے بھاگے اور اسے اپنے اوپر قابو نہ دے، اور اگر یہ بھی نہ ممکن ہو تو کبھی اپنی خواہش سے اس کے ساتھ زن وشو کا برتاؤ نہ کرے نہ اُس کے مجبور کرنے پر اس سے راضی ہو پھر وبال اس پر ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد:12، ص:424، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

عورت پر لازم ہے کہ عدت شوہر کے گھر میں گزارے، عدت میں اس کا چلے جانا خلافِ

شرع ہے اور وہ اس پر گناہ گار ہے۔
یہ حکم ہم نے قضا کا بیان کیا ہے، جو ظاہری ثبوت وشواہد پر مبنی ہوتا ہے، لیکن اگر کسی عورت نے پورے یقین کے ساتھ اپنے شوہر کی زبان سے تین طلاق کے کلمات سنے ہیں، تو اسے چاہئے کہ اپنے شوہر سے آزادی کے لئے جو بھی طریقہ ممکن ہو اختیار کرے۔ خواہ وہ شخص رضا کارانہ طور پر طلاق دے دے یا مہر کی معافی یا مال کے بدلے میں خلع دے دے، ورنہ ازدواجی تعلقات سے مکمل اجتناب کرے۔

''خود کو طلاق سمجھ'' سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، فتاویٰ قاضی خان میں ہے: اِمْرَأَةٌ قَالَتْ لِزَوْجِهَا: ''مرا طلاق دہ''، فَقَالَ الزَّوْجُ: ''دادہ انگار''، اَوْ قَالَ: ''کردہ انگار''، لَا يَقَعُ الطَّلَاقُ وَاِنْ نَوٰى كَاَنَّهُ قَالَ لَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ اِحْسِبِيْ اَنَّكِ طَالِقٌ وَاِنْ قَالَ ذَالِكَ لَا يَقَعُ الطَّلَاقُ وَاِنْ نَوٰى.

ترجمہ: ''بیوی نے شوہر سے کہا: ''مجھے طلاق دے''، خاوند نے جواب دیا: ''تو دی ہوئی یا کی ہوئی خیال کر (سمجھ) لے''، تو طلاق واقع نہیں ہوگی اگر چہ طلاق کی نیت ہو کیونکہ عربی زبان میں اس کا معنی یوں ہے: ''تو گمان کر لے کہ تو طلاق والی ہے''، اور اگر یوں بالفاظِ عربی کہا تو طلاق نہ ہوگی چاہے طلاق کی نیت کی ہو۔۔۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: لَوْقِيْلَ لِرَجُلٍ أَطَلَّقْتَ امْرَأَتَكَ فَقَالَ: عُدَّهَا مُطَلَّقَةً اَوِاحْسِبْهَا مُطَلَّقَةً لَا تُطَلَّقُ امْرَأَتُهُ،

ترجمہ: ''ایک شخص نے دوسرے سے کہا: کیا تو نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی''، دوسرے شخص نے جواب میں کہا: ''تو اس کو طلاق دی ہوئی شمار (سمجھ) لے، تو مُطلقہ سمجھ لے''، تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی، (فتاویٰ قاضی خان علی ہامش فتاویٰ ہندیہ، جلد 1، ص: 463،457، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

شوہر کا دوسرا قول ''کہ اگر تم شوہر کی مرضی کی بنا گھر سے باہر گئیں تو تمہیں طلاق دے دوں گا''، سے بھی کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، کہ یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے اور شرعاً ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ طلاق انشاء میں سے ہے یعنی شوہر واضح طور پر

کہے: میں تمہیں طلاق دیتا ہوں (بصیغۂ حال) یا میں نے تمہیں طلاق دی (بصیغۂ ماضی)۔

شوہر نے ایک طلاق لکھنے کا کہا، زائد طلاقیں موثر نہیں

سوال:119

میں محمد شاہد ولد نور جمال اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے یہ تحریر لکھ رہا ہوں کہ میں نے گھریلو جھگڑوں کی بنا پر اپنے دوست رئیس سے کہا کہ تم ایک طلاق نامہ میرے نام سے میری بیوی کو اس کے میکے پہنچا دو اور میرے دوست نے طلاق نامہ مجھے دکھائے بغیر اس کے گھر ارسال کر دیا۔ اس طلاق نامے کو میں نے پڑھا بھی نہیں اور نہ ہی اس طلاق نامے پر میرے دستخط موجود ہیں بلکہ میرے دوست نے میرے دستخط کیے تھے۔ مذکورہ بالا رونما صورت میں طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟۔

محمد شاہد جمال، A-550 بلاک L، نارتھ ناظم آباد، کراچی

جواب:

اگر صورتِ مسئولہ میں سائل کا بیان درست اور حقیقت پر مبنی ہے، تو چونکہ شوہر نے عددِ طلاق ذکر نہیں کیا اور یہ وضاحت بھی نہیں ہے کہ اُس کا ارادہ کتنی طلاق دینے کا تھا، مطلقاً اتنا کہا کہ: ''تم ایک طلاق نامہ میرے نام سے میری بیوی کو اس کے میکے پہنچا دو''، لہٰذا ان الفاظ سے ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی ہے اور شوہر کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق حاصل ہے، مفتی محمد عبداللہ نعیمی فتاویٰ انقرویہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

قَالَ لِلصَّكَّاكِ اُكْتُبْ طَلَاقَ اِمْرَأَتِي تُطَلَّقُ كَتَبَ اَوْلَمْ يَكْتُبْ وَصَحَّ فِي ''الْقُنْيَةِ'' اَنَّهٗ لَايَقَعُ مَالَمْ يَكْتُبْ۔

ترجمہ: ''وثیقہ نویس سے کہا کہ میری بیوی کو طلاق لکھ دے، طلاق واقع ہو جائے گی، خواہ کاتب لکھے یا نہ لکھے اور ''قنیہ'' میں ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر کاتب نے نہ لکھا تو طلاق واقع نہیں ہوگی''۔ مزید لکھتے ہیں:

لیکن کاتب حکم میں وکیل کے ہے، کاتب کو آمر کے حکم کے بغیر ایک طلاق سے زائد لکھنے کا کوئی حق نہیں ہے، (فتاویٰ مجددیہ نعیمیہ، ج1 ص:254-253)۔

شوہر نے جس شخص کو طلاق نامہ اپنی بیوی کو پہنچانے کا وکیل بنایا تھا، اس نے تین طلاقیں لکھ کر اپنے اختیارات سے تجاوز کیا، لہٰذا صرف ایک طلاق واقع ہوئی، بقیہ طلاقیں مؤثر نہیں ہیں۔

خبر دینے کی نیت سے کہے گئے الفاظ سے جدید طلاق واقع نہ ہوگی

سوال:120

میرے شوہر نور حسین نے آج سے 5 سال قبل مجھے ایک مرتبہ کہا: ''غزالہ سحر بنت شریف محمد میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔ پھر رجوع کرلیا۔ 09، اگست 2009ء کو یہ کہا کہ: ''میں تجھے طلاق دے چکا ہوں، اب میرا تجھ سے کوئی رشتہ نہیں''، پھر 06 اگست 2009ء کو دوبارہ میری بہنوں، ماں اور بھائی کی موجودگی میں غصے میں کہا: ''میں تجھے طلاق دے چکا ہوں، میرا تجھ سے کوئی رشتہ نہیں ہے، میں تجھے فارغ کر چکا ہوں''۔ اب وہ کہہ رہے ہیں کہ ایسے کوئی طلاق نہیں ہوتی اور نہ میری نیت تھی وہ تو ایسے ہی غصے میں منہ سے نکل گیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، (غزالہ سحر ناگن چورنگی، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں پانچ سال قبل آپ کے شوہر نے جو ایک طلاقِ رجعی دی تھی آپ کے بیان کے مطابق انہوں نے اُس سے رجوع بھی کرلیا تھا، آئندہ اُنہیں دو طلاق کا اختیار حاصل تھا۔ بعد میں کہے جانے والے الفاظ اردو میں خبر کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، لہٰذا اگر اُن الفاظ سے شوہر کی نیت طلاق کی خبر دینے کی تھی، تو قسم کے ساتھ اس کا قول مان لیا جائے گا اور اگر دونوں مرتبہ اُس کی نیت جدید طلاق کی تھی تو طلاقِ مغلظ واقع ہوگئی اور تحلیلِ شرعی کے بغیر رجوع کی قطعاً گنجائش باقی نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: ''پھر اگر اُس (شوہر) نے اسے (تیسری) طلاق دے دی، تو وہ (عورت) اِس (تیسری طلاق کے بعد) اُس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس

کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے، پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کر کے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ:230)''۔
علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: شوہر کا یہ کہنا کہ میں اس کو طلاق دے چکا، ظاہر یہ ہے کہ اس سے تیسری طلاق واقع نہ ہوگی، یہ لفظ اردو میں خبر دینے کے لئے بولا جاتا ہے، لہٰذا اگر اس تیسرے لفظ سے اس کی نیت خبر دینے کی ہے یعنی پہلے جو طلاقیں دے دی ہیں، ان کی خبر دیتا ہے تو اس کا قول مان لیا جائے گا، (فتاویٰ امجدیہ، جلد دوم، ص:215)''۔
لیکن اگر ''میں تجھے طلاق دے چکا ہوں'' سے شوہر کی مراد سابق طلاق کی خبر دینا نہیں ہے بلکہ انشاءِ طلاق ہے یعنی قصداً طلاق دینے کے لئے یہ الفاظ بولے تھے، تو پھر تین طلاق واقع ہوچکی ہیں۔ چونکہ یہ حلال وحرام کا مسئلہ ہے، اس لئے شوہر کو اپنی نیت کا دیانت داری سے اظہار کرنا چاہئے اور قطعی فیصلہ اس کی نیت پر ہی موقوف ہوگا۔ اور اگر وہ جھوٹ بولتا ہے اور اپنی نیت کے اظہار میں دیانت سے کام نہیں لیتا، تو آخرت کی جوابدہی دنیا کی چندروزہ راحت کے مقابلے میں بہت مشکل ہے۔

طلاقِ تعلیق

سوال:121

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید نے اپنی زوجہ زینب سے بطور اصلاح کہا: ''ٹھیک ہوجا (یعنی ساس سسر سے زبان درازی نہ کرنا) اگر نہیں ہوئی تو تجھے طلاق، طلاق، طلاق ہے۔ ازروئے شرع کیا حکم ہے؟۔
نوٹ: اس کے بعد بیوی کے رویّے میں تبدیلی آئی اور دوبارہ اُس سے مذکورہ شکایت نہیں رہی، (عبدالمتین، یوٹیلٹی اسٹور، اوگی، مانسہرہ)۔

جواب:

سوال میں مذکور کلمات طلاقِ تعلیق کی قبیل سے ہیں اور ان الفاظ میں طلاق خاتون کا رویّہ درست ہونے پر مشروط ہے، چنانچہ اگر مذکورہ خاتون کے رویّے میں تبدیلی واقع ہوئی اور دوبارہ جس بات پر اُسے سرزنش کی گئی، نہ ہوئی تو طلاق واقع نہیں ہوئی۔ اس شرط سے

چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ زید اپنی بیوی کو ایک طلاق دے دے اور دورانِ عدت عملاً یا قولاً رجوع نہ کرے، عدت گزرتے ہی یہ طلاق بائن ہو جائے گی، اگر مہر ادا نہیں کیا تو مہر بھی ادا کرے، اس کے بعد وہ سابقہ ساس اور سسر سے زبان درازی کرے۔ عدت گزرنے کے بعد چونکہ زید کی بیوی اُس کے نکاح سے خارج ہو جائے گی، اس لئے یہ شرط غیر موثر ہو جائے گی۔ بعد ازاں دونوں باہمی رضامندی سے عقدِ ثانی کر سکتے ہیں، اس عقد کے لئے نیا مہر مقرر کرنا ہوگا، لیکن اب آئندہ کے لئے زید کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا۔ عقدِ ثانی کے لئے دونوں گواہوں کی موجودگی میں مہر مقرر کر کے براہِ راست ایجاب وقبول کر لیں، تو شرعاً نکاح منعقد ہو جائے گا۔

طلاق واقع نہیں ہوئی

سوال: 122

دو سال قبل جھگڑے کے دوران میں نے اپنی بیوی سے کہا: ''میں تمہیں طلاق دے دوں گا، میں تمہیں طلاق دے دوں گا''، پھر تھوڑی دیر بعد کہا: ''میں نے تمہیں ایک طلاق دی''، لیکن بعد میں ہم نے رجوع کر لیا تھا۔ میرے مالی حالات ابتر ہونے کے سبب مئی 2009 میں میری اہلیہ اپنے والدین کے گھر رہنے چلی گئیں، کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ ایک دن مجھے فون کر کے بلایا کہ بچوں سے مل لو، میں وہاں گیا تو میری بیوی اور سالا وہاں موجود تھے، میری بیوی نے ایک اسٹامپ پیپر پر مجھے دستخط کرنے کے لئے کہا، میں فوری طور پر ایسی کسی صورتِ حال کے لئے تیار نہ تھا، بدحواسی میں، میں نے اُسے دیکھے اور پڑھے بغیر دستخط کر دیئے اور وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ میں نے اب تک طلاق نامے کو نہیں پڑھا ہے۔ دستخط کرتے وقت مجھے صرف یہ اندازہ تھا کہ دو سال قبل جو ایک طلاق میں نے دی تھی، یہ اُسی کی تحریر ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس تمام صورتِ حال میں کتنی طلاقیں واقع ہوئیں اور کیا رجوع کی گنجائش باقی ہے؟، (عبدالرحمٰن، D-133 سیکٹر 10 اورنگی ٹاؤن، کراچی)۔

☆ میں اپنے شوہر کے مذکورہ بیان سے اتفاق کرتی ہوں، تمام واقعہ اسی طرح ہوا۔

عرشی بنت وزیر احمد، اورنگی ٹاؤن، کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں شوہر کا قول: ''میں تمہیں طلاق دے دوں گا''، سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، کہ یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے اور شرعاً ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ طلاق انشاء میں سے ہے یعنی شوہر واضح طور پر کہے: میں تمہیں طلاق دیتا ہوں (بصیغۂ حال) یا میں نے تمہیں طلاق دی (بصیغۂ ماضی)۔ ''میں نے تمہیں ایک طلاق دی'' سے ایک طلاق واقع ہوگئی اور چونکہ رجوع بھی کرلیا تھا اس لئے نکاح بدستور قائم ہے۔ بشرطیکہ شوہر نے عدت کے دوران رجوع کیا ہو، عدت ختم ہونے کے بعد تجدید نکاح کے بغیر رجوع نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر شوہر کا بیان درست ہے اور واقعی اُس نے مذکورہ طلاق نامہ دیکھے اور سمجھے بغیر دستخط کر دیئے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَكَذَالِكَ كُلُّ كِتَابٍ لَمْ يَكْتُبْهُ بِخَطِّهِ وَلَمْ يُمِلَّهُ بِنَفْسِهِ لَايَقَعُ بِهِ الطَّلَاقُ اِذَا لَمْ يُقِرَّ اَنَّهُ كِتَابُهُ۔

ترجمہ: ''اسی طرح ہر وہ خط، جسے اس نے خود نہ لکھا ہو اور نہ اسے لکھوایا ہو اور وہ اسے خود لکھنے، لکھوانے یا کسی کے لکھے ہوئے کو برضامندی قبول کرنے کا اقرار بھی نہیں کرتا، تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 379، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

مفتی محمد نوراللہ نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ سے ایک طویل سوال کیا گیا: ''ایک آدمی نے بغیر نیاز احمد کے کہنے کے طلاق نامہ لکھنا شروع کیا اور نیاز احمد کو زبردستی دستخط کرنے پر مجبور کیا، پڑھ کر بھی نہیں سنایا گیا، نہ طلاق نامے کو پڑھا ہے اور نہ لکھنے والے کو کہا کہ لکھ''۔ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، آپ نے طویل جواب لکھا جس میں مذکورہ مسئلے سے متعلق یہ عبارت قابلِ غور ہے: ''اگر نیاز احمد مکرَہ تھا تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اور اگر مکرَہ (یعنی جسے جبر کر کے طلاق دلائی گئی ہو) نہیں تھا تو پھر بھی ظاہر یہی ہے کہ واقع نہیں ہوئی کہ تحریر خود اس کی نہیں اور نہ ہی اس نے لکھائی ہے اور نہ پڑھی ہے نہ سنی ہے، صرف دستخط کئے جو خوشی سے ہرگز نہیں تو وہ بھی طلاق نہیں بن سکتے قلم زبان کا ترجمان ہے تو جس طرح الفاظِ طلاق وہی ہیں جو

اپنی زبان سے کہے جائیں یا دوسرے کو وکیل بنا کر کہلائے جائیں اور بلا وجہ دوسرے کی زبان سے کوئی لفظ بھی طلاق نہیں بن سکتا یونہی دوسرے کے قلم سے بھی نہیں اور جس طرح اپنا نام بول دینا طلاق نہیں، یونہی دستخط کر دینا بھی طلاق نہیں، بہر حال بادلِ نخواستہ ایسی حالت میں صرف دستخط کر دیئے جبکہ قرائنِ ظاہرہ سے واضح ہو رہا کہ عبارتِ مندرجہ بالا کی تصدیق مطلوب و مراد نہیں، کسی صورت بھی طلاق نہیں بن سکتی"۔

(فتاویٰ نوریہ، جلد 3، ص: 212، 213)

صورتِ مسئول میں شوہر پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے اور عام طور پر پڑھا لکھا آدمی تحریر پڑھ کر ہی دستخط کرتا ہے اور اسے اپناتا ہے اور سائل کے یہ الفاظ کہ "دستخط کرتے وقت مجھے اندازہ تھا کہ دو سال قبل جو ایک طلاق میں نے دی تھی یہ اُسی کی تحریر ہے" اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ شوہر اس امر سے باخبر تھا کہ یہ طلاق ہی کی دستاویز ہے۔ لہٰذا اب اگر شوہر اس تحریر میں درج طلاقوں کے قصد اور انشاء سے منکر ہے اور اپنے آپ کو اس سے لاعلم ظاہر کرتا ہے تو اسے باقاعدہ حلف دیا جائے گا، اگر وہ حلف اٹھا کر انشاءِ طلاق و علمِ طلاق سے انکار کرتا ہے تو قضاءً ان طلاقوں کے غیر نافذ ہونے کا حکم دیا جائے گا، لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فیصلہ حقیقتِ حال پر ہوگا اور اگر اُس نے جھوٹی قسم کھائی ہے تو اس کی ساری زندگی حرام کی گزرے گی۔ تاہم آئندہ شوہر کو صرف دو طلاق کا اختیار حاصل ہے، خدانخواستہ جب بھی مزید دو طلاقیں دے گا، گذشتہ ایک طلاق کے ساتھ مل کر مؤثر ہو جائیں گی اور دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو جائیں گے۔

اضافتِ طلاق

سوال: 123

میری بیٹی کی شادی نو سال قبل محمد حنیف قریشی سے ہوئی، دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ میرے داماد جب سے انجمن سرفروشانِ اسلام میں شامل ہوئے ہیں، تب سے بیوی بچوں کے ساتھ رویہ درست نہیں، برا بھلا کہنا، مار پیٹ کرنا معمول بن گیا ہے۔ ایک دن صبح کے وقت میرے داماد نے اپنے دو سال کے بچے کے منہ پر بہت زور سے تھپڑ مارا، بچے

کا پیشاب نکل گیا اور گال سوج گیا۔ میں اپنے داماد سے پوچھنے گیا کہ اس طرح بچے کو کیوں مارا؟، تو مجھ سے لڑنے لگا اور کہا میری اولاد ہے میں جو چاہے کروں اور غصے میں کہا: ''اس قصے کو ختم کر دیتا ہوں، میں طلاق دیتا ہوں، میں طلاق دیتا ہوں، میں طلاق دیتا ہوں''۔ اب وہ کہتا ہے کہ میرے منہ سے غصے میں یہ الفاظ نکل گئے اور مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اب وہ صلح کرنا چاہتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ طلاق ہوئی یا نہیں؟۔

عبدالکریم شیخ، B-283 سیکٹر 11-E نارتھ کراچی

جواب:

طلاق میں اضافت کا پایا جانا ضروری ہے خواہ وہ اضافت لفظی ہو یا معنوی ہو یا کسی ایسے کلام کے جواب میں ہو جس میں اضافت مذکور تھی، صورتِ مسئولہ میں شوہر کے کلام میں اضافتِ لفظی تو موجود نہیں لیکن اگر شوہر نے ان الفاظِ طلاق سے بیوی کو طلاق دینے کی نیت کی ہو تو اضافت معنویہ کی وجہ سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ لیکن مذکورہ صورت میں معنوی اضافت موجود ہے، جو وقوعِ طلاق کے لئے کافی ہے۔ شوہر کا یہ کہنا کہ: ''میرے منہ سے غصے میں یہ الفاظ نکل گئے اور مجھ سے غلطی ہوگئی''، گویا اس بات کا اقرار ہے کہ اُس کی مراد بیوی کو طلاق دینا تھی۔

علامہ زین الدین بن ابراہیم بن محمد المعروف ابن نجیم متوفی 970ھ لکھتے ہیں: فَلَوْ قَالَ طَالِقٌ فَقِيلَ لَهُ مَنْ عَنَيْتَ ؟ فَقَالَ: امْرَأَتِي ، طُلِّقَتْ امْرَأَتُهُ۔

ترجمہ: ''اگر شوہر نے کہا ''طالق'' (طلاق یافتہ)، اُس سے پوچھا گیا کہ تیری کیا مراد ہے؟، جواب دیا کہ میری بیوی مراد ہے، تو اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی''۔

(البحرالرائق، جلد 3، ص: 442، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں اور تحلیلِ شرعی کے بغیر رجوع کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: ''پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دے دے، تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کر لے۔ پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کر کے) آپس میں رجوع کر لیں، (البقرۃ:230)''۔

طلاقِ سُنّی

سوال:124

ایک شخص اپنی منکوحہ کو باہمی اختلافات اور بداعتمادی کی وجہ سے طلاق دینا چاہتا ہے، طلاق کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟۔ نکاح کے وقت جو مہر مقرر ہوا تھا، طلاق کی صورت میں وہ پورا نقد ادا کرنا ہوگا؟۔ عبدالعزیز، کراچی

جواب:

اسلامی تعلیمات کا منشا اور مزاج یہی ہے کہ شوہر و بیوی کے مابین ''رشتۂ نکاح'' تاحیات قائم رہے، مگر بعض حالات میں طلاق اور خلع کا راستہ کھلا ہے۔ طلاق کی وہ صورت جسے فقہاء نے ''احسن'' قرار دیا ہے اور اسے ''طلاقِ سُنّی'' سے تعبیر کیا ہے، درجِ ذیل ہے:

یہاں یہ بات یاد رہے کہ ''طلاقِ سُنّی'' سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ طلاق دینا رسول اللہ ﷺ کی سنّت ہے۔ البتہ آپ ﷺ نے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی تھی، لیکن بعد میں رجوع کر لیا تھا۔

طلاقِ سُنّی کا مطلب یہ ہے کہ یہ طلاق کا وہ طریقہ ہے جو خود رسول اللہ ﷺ نے تعلیم فرمایا، شوہر نے جن ایامِ طہر (پاکیزگی) میں اپنی بیوی سے ہمبستری نہ کی ہو، ان میں اپنی بیوی کو ایک طلاق رجعی دے دے یعنی یوں کہے کہ میں نے تمہیں ایک طلاق دی یا میں تمہیں ایک طلاق دیتا ہوں۔ اس کے بعد تین حیض گزرنے پر عدت مکمل ہو جاتی ہے۔ طلاقِ رجعی کا یہ فائدہ ہے کہ عدت کے دوران شوہر جب چاہے، رجوع کر سکتا ہے، اس میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے، یہ رجوع عمل سے بھی ہو سکتا ہے اور محض زبان سے یہ کہہ کر بھی

کہ ”میں رجوع کرتا ہوں“، عمل سے رجوع یہ ہے کہ شوہر بیوی سے جماع کرے یا بوس و کنار کرے۔ اگر شوہر نے عدت کے دوران رجوع نہ کیا ہو تو عدت گزرنے کے بعد یہی طلاقِ رجعی، ایک طلاقِ بائن ہو جاتی ہے اور زوجین جب چاہیں بغیر تحلیل شرعی کے باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں، لیکن آئندہ صرف دو طلاقوں کا حق شوہر کو حاصل رہے گا اور اگر آئندہ کسی موقع پر شوہر نے دو طلاقیں (ایک ساتھ یا الگ الگ وقفوں میں) دیں تو طلاقِ مغلّظ ہو جائے گی۔

بیوی کے قسم کھانے سے ایلاء نہیں ہوتا

سوال: 125

میں (Mental Disorder) یعنی وہم کی مریضہ ہوں اور مختلف قسم کے وہم مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔ ایک دن قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے آیت پڑھی:

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآؤُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O

ترجمہ: ”جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، اُن کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے، اگر انہوں نے رجوع کر لیا تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے، (البقرہ:226)“۔

مجھے یہ خیال آیا کہ جو لوگ یہ قسمیں کھاتے ہوں گے وہ اِس طرح کہتے ہوں گے کہ: میں قسم کھاتی ہوں کہ میں چار مہینے تک اپنے شوہر سے رجوع نہیں کروں گی۔ مجھے یہ وہم ہے کہ میں نے بھی یہ قسم کھائی ہے اور یہ یاد نہیں کہ میں نے اس قسم کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہیں۔ مجھے یہ وہم بھی ہو رہا ہے کہ اس کا کفّارہ ہوگا یا نکاح پر بھی کوئی اثر پڑے گا۔ میری رہنمائی فرمایئے، (مسز آصف، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

مذکورہ آیت کو ”آیتِ ایلاء“ کہتے ہیں اور یہ مردوں سے متعلق ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے متعلق قربت نہ کرنے کی قسم کھا لیتے ہیں۔ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا یہ معمول تھا کہ اپنی عورتوں سے مال طلب کرتے، اگر وہ دینے سے انکار کرتیں تو ایک سال، دو یا تین سال یا اس سے زائد عرصہ اُن کے پاس نہ جانے اور

صحبت ترک کرنے کی قسم کھالیتے اور انہیں پریشان چھوڑ دیتے، اسلام نے اس ظلم کو مٹایا اور ایسی قسم کھانے والوں کے لئے مدت متعین فرمادی۔

مرد یہ قسم کھائے تو ایلاء کہلاتا ہے اور مذکورہ آیت میں اُس کا حکم موجود ہے۔ لیکن اگر عورت یہ الفاظ کہے تو یہ ایلاء نہیں بلکہ "یمین" ہے اور اگر یہ قسم وہ خود توڑے یا شوہر اُس کی مرضی سے یا زبردستی قربت کرے، تو عورت پر کفارہ لازم ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ أَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِيْنَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ أَهْلِيْكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ذَالِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ۔

ترجمہ: "بلا قصد کھائی ہوئی قسموں پر اللہ تم سے مواخذہ نہیں فرمائے گا، لیکن تمہاری بالقصد کھائی ہوئی قسموں (یمینِ منعقدہ) پر تم سے مواخذہ فرمائے گا، تو اس قسم کا کفارہ تمہارے درمیانی قسم کے کھانوں میں سے دس مسکینوں کا کھانا دینا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا دس مسکینوں کو کپڑے دینا ہے یا ایک غلام آزاد کرنا ہے اور جس کو اس پر قدرت نہ ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھے، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسم کھا کر (توڑ دو)، (المائدہ:89)"۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: حَلَفَتْ بِهِ الْمَرْأَةُ كَانَ يَمِيْنًا۔

ترجمہ: "اگر عورت نے قسم کے ساتھ شوہر سے کہا (تو مجھ پر حرام ہے) تو یہ قول یمین (قسم) ہوگا۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لِأَنَّ الزَّوْجَةَ لَوْ قَالَتْ لِزَوْجِهَا: أَنَا عَلَيْكَ حَرَامٌ أَوْ حَرَّمْتُكَ صَارَ يَمِيْنًا، حَتّٰى لَوْ جَامَعَهَا طَائِعَةً أَوْ مُكْرَهَةً تَحْنَثُ۔

ترجمہ: "اس لئے کہ بیوی اگر اپنے شوہر سے کہے کہ "میں تجھ پر حرام ہوں" یا یہ کہے کہ "تو مجھ پر حرام ہے"، یہ یمین (قسم نافذ) ہو جائے گی، یہاں تک کہ اگر شوہر اُس سے زبردستی یا اُس کی رضامندی سے جماع کرے، تو وہ (عورت) حانث ہو جائے گی"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5، ص:64، داراحیاء التراث العربي، بیروت)

لہٰذا آپ پر کفارہ لازم ہے اور کفارہ قسم توڑنے کے بعد ادا کیا جائے گا جو کہ اپنے اوسط معیار

کے مطابق دس مساکین کو دو وقت کھانا کھلانا یا اُنہیں لباس فراہم کرنا اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھنا ہے، اس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑا، نکاح بدستور قائم ہے۔ لیکن قسم وہم یا خیال سے منعقد نہیں ہوتی اور اس سے کفارہ بھی لازم نہیں آتا۔ کفارہ تب لازم آئے گا کہ آپ کو قسم کا یقین ہو، ویسے احتیاطاً آپ دس مساکین کو دو وقت کھانا کھلا دیں تو یقیناً اجر ملے گا۔

زنا کی مرتکب عورت کے لئے شرعی حکم

سوال: 126

ایک شادی شدہ عورت بار بار زنا کا ارتکاب کرتے ہوئے اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ چار مرتبہ بازیاب کروائی گئی۔ آخر کار پنچایت ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا: (1) لڑکے والے (زانی) اپنے خاندان کی لڑکی کا رشتہ عورت کے خاندان کو دیں گے۔ (2) خاوند عورت کو طلاق دے گا، عورت کا نکاح آشنا کے ساتھ کرایا جائے گا۔ اب لڑکے والے ان شرائط پر عمل کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ عورت (زانیہ) نے قرآن پر عہد کیا تھا کہ اس کے بعد فعلِ بد نہیں کرے گی جبکہ وہ اب بھی زنا کی مرتکب ہو رہی ہے اور چھ سات ماہ کی حاملہ بھی ہے۔ قرآن و حدیث اور شریعتِ مطہرہ میں مرد و عورت کا کیا حکم ہے؟۔

ایک شہری، ڈرگ روڈ کراچی

جواب:

قرآن و سنّت کی رُو سے زنا ایک سنگین جرم ہے، یہ جرم اگر شرعی معیار (یعنی چار عینی گواہ یا مجرم کے اقرار و اعترافِ جرم) کے مطابق ثابت ہو جائے تو "موجبِ حد" ہے اور اس پر حد شرعی نافذ ہوگی، جو غیر شادی شدہ کے لئے سو کوڑے (سورۃ النور، آیت: 2) اور شادی شدہ کے لئے رَجم (یعنی سنگسار کرنا) ہے۔ رَجم کی حد رسول اللہ ﷺ کے اپنے فیصلوں اور بکثرت احادیث مبارکہ اور آثارِ صحابہ سے ثابت ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْاَنْصَارِيِّ: اَنَّ رَجُلًا مِنْ أَسْلَمَ، أَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَحَدَّثَهُ أَنَّهُ قَدْ زَنٰى، فَشَهِدَ عَلٰى نَفْسِهِ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ، فَأَمَرَ بِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَرُجِمَ،

وَ كَانَ قَدْ أُحْصِنَ۔

ترجمہ:''حضرت جابر بن عبداللہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ قبیلہَ بنی اسلم کا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہاں پر اس نے اعترافی بیان دیا کہ اس نے زِنا کیا ہے، پھر اس نے چار مرتبہ اپنے اوپر اقرارِ جرم کیا تو رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اسے رجم (سنگسار) کردیا جائے، وہ شخص شادی شدہ تھا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6814)''۔

حدود قائم کرنا حاکمِ اسلام یا اُس کے مقررہ ومُجاز قاضی کا کام ہے، محلے بستی یا برادری کے لوگ اتنا کرسکتے ہیں کہ اُنہیں خوفِ خدا دلائیں اور اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں تو اُن کا سماجی مقاطعہ (Social Boycott) کردیں۔ شرعاً اُس (زانیہ) عورت کے شوہر کو اُسے طلاق دینا واجب نہیں ہے، ہاں! اگر اُس کے اِس فعل کی وجہ سے شوہر کو نفرت ہوگئی ہے اور وہ حدودِ شرع کی پاسداری کے ساتھ اسے اپنے نکاح میں رکھنا نہیں چاہتا تو اُسے طلاق دیدے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: بَلْ يُسْتَحَبُّ لَوْ مُؤْذِيَةً أَوْ تَارِكَةَ صَلَاةٍ۔

ترجمہ:''اگر بیوی اپنے قول یا فعل سے (شوہر کو) ایذا پہنچائے یا تارکِ نماز ہو تو اسے طلاق دینا مستحب ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 4، ص:315)''۔

کسی دوسری بے قصور لڑکی کو اس کی رضامندی کے خلاف اس کے بھائی کی سزا کے طور پر کسی کے نکاح میں دینا درست نہیں ہے، البتہ اگر وہ اس نکاح پر راضی ہے تو نکاح جائز ہوگا۔

جب تک عورت کسی کے نکاح میں ہے اس کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوگا، اس کا نسب اسی شخص کی طرف منسوب ہوگا، جس کے نکاح میں وہ عورت ہے اور وہ بچہ اس کا وارث بھی بنے گا، حدیث پاک میں ہے: اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ۔

ترجمہ:'' بچے کا نسب اسی کی طرف منسوب ہوگا، جس کے نکاح میں اس کی ماں ہے اور زانی کے لئے پتھر (رجم کی سزا) ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:2053)''۔

فقہ حنفی کی رُو سے کسی عورت کی رضامندی کے بغیر اُس کا کسی شخص کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ زانیہ عورت کا بار بار بدکاری کا ارتکاب کرنا بدنصیبی ہے، اُس پر توبہ لازم ہے اور قسم کھا کر اس کو توڑنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔ بغیر ثبوتِ شرعی کے کسی پر بدکاری کی تہمت

لگانا بھی ناجائز ہے اور اگر بغیر ثبوتِ شرعی کے کوئی کسی پر زنا کی تہمت لگائے اور جس پر تہمت لگائی گئی ہے، وہ شرعی عدالت سے رجوع کرے اور عدالت میں جرم ثابت نہ ہو سکے تو تہمت لگانے والوں کو 80 کوڑے حد قذف کے لگائے جائیں گے۔

بوجہ مرض حیض نہ آنے والی عورت کی عدّت

سوال: 127

جس عورت کے طہر کی مدت ایک سال یا دو سال یا اس سے زائد ہوتی ہے یعنی اسے کافی عرصے تک حیض نہیں آتا تو ایسی عورت طلاق کی صورت میں اپنی عدت کس طرح گزارے گی۔ اگر تین حیض گزارے تو یہ تین یا چھ سال بن جاتے ہیں اور اگر تین ماہ گزارے، تو ''ثلثة قروء'' پر کیسے عمل ہوگا؟۔ (منور احمد، ملیر)۔

جواب:

حیض اور طہر (پاکی کے ایام) کا دورانیہ ہر عورت کا اپنا اپنا ہوتا ہے۔ اور اگر عورت کو حیض نہیں آتا، خواہ کسی طبعی یا طبّی سبب سے ہو یا کم عمر ہے اور حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا یا وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہوگئی ہیں، جب فطری طور پر حیض کا سلسلہ موقوف ہو جاتا ہے، ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ترجمہ: ''اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہو چکی ہیں اور تمہیں اس امر میں شبہ ہو (کہ ان کی عدت کیا ہے؟) تو ان کی عدت تین ماہ ہے، اور وہ عورتیں جن کو حیض نہیں آتا (ان عدت بھی تین ماہ ہے)، (الطلاق: 4)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَالْعِدَّةُ فِيْ حَقِّ مَنْ لَّمْ تَحِضْ لِصِغَرٍ بِأَنْ لَّمْ تَبْلُغْ تِسْعًا أَوْ كِبَرٍ بِأَنْ بَلَغَتْ سِنَّ الْإِيَاسِ أَوْ بَلَغَتْ بِالسِّنِّ وَلَمْ تَحِضْ۔۔۔۔۔ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ بِالْأَهِلَّةِ لَوْ فِي الْغُرَّةِ وَإِلَّا فَبِالْأَيَّامِ۔

ترجمہ: ''اور جس عورت کو کم عمری کے سبب حیض نہ آتا ہو (یعنی اس کی عمر نو سال بھی نہ ہوئی ہو) یا عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو اور وہ عمر کے اعتبار سے بالغ ہوگئی ہو (لیکن اس کے باوجود اسے حیض نہ آتا ہو)، تو اس کی عدت تین ماہ ہے، اگر طلاق قمری مہینے کی پہلی تاریخ کو دے دی گئی ہو تو تین قمری مہینے مکمل ہونے پر عدت پوری ہو جائے، ورنہ 90 دن

مکمل ہونے پرعدت پوری ہوگی''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 5، ص:146، 149، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ جلال الدین خوارزمی لکھتے ہیں:

وَاِذَا کَانَتِ الْمَرْأَۃُ لَاتَحِیْضُ مِنْ صِغَرٍ أَوْ کِبَرٍ فَأَرَادَأَنْ یُطَلِّقَھَا ثَلَاثاً لِلسُّنَّۃِ طَلَّقَھَا وَاحِدَۃً فَاِذَا مَضٰی شَھْرٌ طَلَّقَھَا أُخْرٰی، فَاِذَا مَضٰی شَھْرٌ طَلَّقَھَا أُخْرٰی لِأَنَّ الشَّھْرَ فِیْ حَقِّھَا قَائِمٌ مَّقَامَ الْحَیْضِ۔

ترجمہ:''جب عورت کو کم عمری یا سن ایاس کو پہنچنے کے سبب حیض نہ آتا ہو، اور اسے (اس کا شوہر) سنت میں تعلیم فرمائے ہوئے طریقے کے مطابق تین طلاق دینے کا ارادہ رکھتا ہو، تو وہ اس کو ایک طلاق دے پھر ایک مہینہ گزرنے کے بعد دوسری طلاق دے کیونکہ مہینہ (گزرنا) اس کے حق میں حیض کے قائم مقام ہے''۔

(فتح القدیر جلد 3، ص:58-457، مطبوعہ: مرکز اہل السنۃ برکات رضا)

سوال میں جس خاتون کا ذکر ہے، ایسی عورت کو "مُمْتَدَّۃُ الطُّھْر" (یعنی لمبے طہر والی) کہتے ہیں اور اس کی عدت فقہاءِ احناف کے نزدیک تین حیض ہی ہیں، خواہ کتنے سال میں آئیں۔امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسی عورت کی عدت نو ماہ ہے اور ضرورت کے تحت امام مالک کے قول پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: نَعَمْ لَوْ قَضٰی مَالِکِیٌّ بِذَالِکَ نَفَذَ کَمَا فِی الْبَحْرِ وَالنَّھْرِ،

ترجمہ:''ہاں! اگر فقہِ مالکی کے قاضی نے (نو ماہ کی عدت کا) فیصلہ دیا، تو نافذ ہوجائے گا جیسا کہ البحر الرائق اور النہر الفائق میں ہے۔۔۔۔۔علامہ ابن عابدین شامی علامہ حصکفی کی عبارت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (نَعَمْ لَوْ قَضٰی مَالِکِیٌّ بِذٰلِکَ نَفَذَ) لِأَنَّہٗ مُجْتَھَدٌ فِیْہِ، وَھٰذَا کُلُّہٗ رَدٌّ عَلٰی مَا فِی "الْبَزَّازِیَّۃِ"، قَالَ الْعَلَّامَۃُ: وَالْفَتْوٰی فِیْ زَمَانِنَا عَلٰی قَوْلِ مَالِکٍ وَعَلٰی مَا فِیْ "جَامِعِ الْفُصُوْلَیْنِ": لَوْ قَضٰی قَاضٍ بِانْقِضَاءِ عِدَّتِھَا بَعْدَ مَضِیِّ تِسْعَۃِ اَشْھُرٍ، نَفَذَ اھ، لِاَنَّ الْمُعْتَمَدَ اَنَّ الْقَاضِیَ لَا یَصِحُّ قَضَاءُہٗ بِغَیْرِ مَذْھَبِہٖ خُصُوْصًا قُضَاۃُ زَمَانِنَا۔۔۔۔۔۔قُلْتُ: لٰکِنْ ھٰذَا ظَاھِرٌ اِذَا اَمْکَنَ

قَضَاءُ مَالِكِيٍّ بِهٖ أَوْ تَحْكِيْمُهُ، أَمَّا فِيْ بِلَادٍ لَا يُوْجَدُ فِيْهَا مَالِكِيٌّ يَحْكُمُ بِهٖ، فَالضَّرُوْرَةُ مُتَحَقِّقَةٌ،وَ كَأَنَّ هٰذَا وَجْهُ مَا مَرَّ عَنِ (الْبَزَّازِيَّةِ) وَ (الْفُصُوْلَيْنِ) فَلَا يَرِدُ قَوْلُهُ فِيْ (النَّهْرِ): أَنَّهُ لَا دَاعِيَ إِلَى الْإِفْتَاءِ بِقَوْلٍ نَعْتَقِدُ أَنَّهُ خَطَأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ مَعَ إِمْكَانِ التَّرَافُعِ إِلَى مَالِكِيٍّ يَحْكُمُ بِهٖ اھ ،تَأَمَّلْ ، وَلِهٰذَا قَالَ الزَّاهِدِيُّ: وَقَدْ كَانَ بَعْضُ أَصْحَابِنَا يُفْتُوْنَ بِقَوْلِ مَالِكٍ فِيْ هٰذِهِ الْمَسْأَلَةِ لِلضَّرُوْرَةِ اھ۔

ترجمہ:''ہاں !اگر کوئی مالکی قاضی یا مفتی "مُمْتَدَّةُ الطُّهْر" کے لئے نو ماہ گزرنے پر عدت ختم ہونے کا فیصلہ کرلے تو یہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا، کیونکہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے، یہ (علامہ حصکفی کا مالکی کی قضاء کے نفاذ کا قول)''بزازیہ'' کی اس عبارت کا رد ہے، علامہ نے کہا: ہمارے زمانے میں فتویٰ امام مالک کے قول پر ہے اور اُس کا رد ہے جو''جامع الفصولین'' میں ہے: ''اگر کسی قاضی نے نو ماہ گزر جانے کے بعد "مُمْتَدَّةُ الطُّهْر "(مطلقہ) عورت کی عدت ختم ہونے کا فتویٰ دیا، تو یہ فتویٰ نافذ ہوگا (یعنی حنفی قاضی فتویٰ دے سکتا ہے)، کیونکہ قاضی خصوصاً ہمارے زمانے کے قاضیوں کا اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے امام کے مذہب پر فتویٰ دینا صحیح نہیں ہے''۔۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں:''میں کہتا ہوں: لیکن یہ (یعنی مالکی قاضی یا مفتی سے فیصلہ لینا) ظاہر ہے کہ اس صورت میں ممکن ہوگا، جب کسی مالکی مفتی یا قاضی سے فیصلہ کرانا ممکن ہو۔لیکن ایسے ملک میں جہاں کوئی ایسا مالکی قاضی نہیں پایا جاتا جس سے فیصلہ کرایا جائے، پس ضرورت تو موجود ہے اور گویا یہی اُس قول کی توجیہ ہے جو''بزازیہ''اور ''جامع الفصولین''میں گزرا (کہ ان کے نزدیک مالکی قاضی نہ ہونے کی وجہ سے ضرورت متحقق تھی)، تو اِس قول پر''النہرالفائق'' کی اس عبارت سے اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ: ''ایسے کسی قول پر فتویٰ دینے کا کوئی داعی نہیں ہے، جس کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہو کہ وہ خطا ہے مگر صواب (درست ہونے) کا احتمال رکھتا ہے، جبکہ کسی مالکی قاضی سے مرافعہ ممکن ہو کہ وہ فیصلہ کرے، پس غور کیجئے (یعنی''بزازیہ'' کا قول ضرورت کے متحقق ہونے کی بنا پر ہے اور''صاحبِ نہر'' کا قول ضرورت متحقق نہ ہونے کی صورت میں ہے)، اسی لئے ''زاہدی'' نے کہا: ہمارے بعض اصحاب اس مسئلے میں ضرورت کی بنا پر امام مالک کے قول پر

فتویٰ دیتے تھے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 5، ص:149)''۔

فقیہ العصر علامہ مفتی نوراللہ بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''بہر حال مذہب وہی ہے اور ضرورتِ شدیدہ کے وقت یہ بھی فرمایا گیا ہے جو اوپر مذکور ہوا، یہ فتویٰ نہیں دیا جارہا ہے مگر ضرورتِ شدیدہ کے وقت اس پر کوئی عمل کرے تو امید کہ گناہگار نہ ہوگا کہ ''فتاویٰ خیریہ''، جلد:01، ص:61 میں ہے: لَا شَکَّ اَنَّہٗ اِذَا قَضٰی مَالِکِیُّ الْمَذْھَبِ فِیْ مُمْتَدَّۃِ الطُّھْرِ بِانْقِضَاءِ الْعِدَّۃِ بِتِسْعَۃِ اَشْھُرٍ یَنْفُذُ، وَلَا یَجُوْزُ نَقْضُہٗ لِاَنَّہٗ لَمْ یُخَالِفِ الْکِتٰبَ وَالسُّنَّۃَ الْمَشْھُوْرَۃَ وَلَا الْاِجْمَاعَ۔

ترجمہ: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی مالکی المذہب قاضی نو ماہ گزرنے پر مُمْتَدَّۃُ الطُّھر کی عدت گزرنے کا فیصلہ کرلے تو وہ نافذ ہو جائے گا اور اس کا توڑنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ کتاب، سنتِ مشہورہ اور اجماع کے مخالف نہیں ہے''۔

(فتاویٰ نوریہ، جلد:03، ص:79-278)

جب بقول علامہ مفتی نوراللہ بصیر پوری نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا کہ کوئی مُمْتَدَّۃُ الطُّھر مالکی مذہب پر عمل کرلے تو جائز ہے، اب ظاہر ہے کہ عام لوگوں کو تو مذاہب کی اتنی تفصیل معلوم نہیں ہے، تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ مالکی قاضی دستیاب نہ ہونے کی صورت میں حنفی قاضی یا مفتی قولِ امام مالک پر فیصلہ کرے یا فتویٰ دے۔

خرید و فروخت کے مسائل

کاروبار میں شراکت

سوال:128

زید اپنے جانور مثلاً گائے کو کسی شخص کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کرتا ہے کہ آدھی قیمت مجھے دے دو (یہ اُس صورت میں ہے کہ جب مشتری کے پاس پوری قیمت ادا کرنے کی ہمت نہ ہو) لیکن جب اس گائے کا بچہ فروخت کروگے تو اس کی آدھی قیمت مجھے دے دینا اور جب اس گائے کے بچے فروخت کروگے اُس کی آدھی قیمت مجھے دینا ہوگی، کیا یہ بیع جائز ہے یا نہیں؟۔ ہمارے گاؤں میں مذکورہ طریقے پر جانوروں کی خرید وفروخت عام ہے، اگر یہ ناجائز ہے تو شریعت کی روشنی میں کوئی ایسا حل بیان فرمائیں کہ لوگوں کے معاملات میں بڑی تبدیلی لائے بغیر انہیں مذکورہ منفعت حاصل ہوجائے۔

محمد ساجد، ضلع مظفر گڑھ

جواب:

شرعاً بیع کے صحیح طور پر منعقد ہونے کی شرط یہ ہے کہ مبیع موجود ہو اور مبیع وثمن دونوں معلوم ہوں اور اُن کے بارے میں کوئی ایسی لاعلمی نہ ہو جو آگے چل کر فریقین میں تنازعے کا سبب بنے۔ حدیثِ پاک میں ہے:

(1) ''لَاتَبِعْ مَالَيْسَ عِنْدَكَ'' ترجمہ: ''ایسی چیز فروخت نہ کرو، جو تمہارے پاس موجود نہ ہو، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:3497)''۔

(2) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَنَّهُ نَهٰى عَنْ بَيْعِ حَبَلِ الْحَبَلَةِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حاملہ (جانور) کے حمل کی بیع (یعنی اُس کے بطن میں جو جنین ہے) سے منع فرمایا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:3807)''۔ اس ممانعت کا سبب یہ ہے کہ کسی کو پتا نہیں کہ حاملہ جانور کے پیٹ میں کیا ہے؟، آیا وہ پیدا ہوگا یا نہیں؟، اگر پیدا ہوگا تو زندہ بھی ہوگا یا نہیں؟۔

بیع درست ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ثمن مجہول نہ ہو اور اس کی مقدار متعین اور واضح ہو۔ مذکورہ صورت میں چونکہ ثمن مجہول ہے، اس لئے بیع فاسد ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ بیع کے صحیح ہونے کی شرائط کی بابت لکھتے ہیں:

وَمِنْهَا اَنْ يَّكُوْنَ الْمَبِيْعُ مَعْلُوْمًا وَّالثَّمَنُ مَعْلُوْمًا عِلْمًا يَمْنَعُ مِنَ الْمُنَازَعَةِ فَبَيْعُ الْمَجْهُوْلِ جَهَالَةٌ تُفْضِيْ اِلَيْهَا غَيْرُ صَحِيْحٍ كَبَيْعِ شَاةٍ مِّنْ هٰذَاالْقَطِيْعِ وَبَيْعُ شَيْءٍ بِقِيْمَتِهٖ وَبِحُكْمِ فُلَانٍ۔

ترجمہ: ''بیع کے صحیح ہونے کی شرطوں میں سے ایک یہ ہے کہ مبیع اور ثمن اس طرح واضح طور پر معلوم ہوں کہ (آگے چل کر) جھگڑا پیدا نہ ہو، چنانچہ ایسی مجہول چیز کی بیع صحیح نہیں ہے جو آگے چل کر تنازعے کا سبب بنے، جیسے کہا جائے کہ: میں نے اس گلّے میں سے ایک بکری آپ پر فروخت کی (کیونکہ سب بکریاں ایک جیسی نہیں ہوتیں اور قیمتوں میں بہت فرق پڑتا ہے) یہ چیز میں نے آپ پر اس کی قیمت (Market Value) پر فروخت کی یا فلاں شخص اس کی جو بھی قیمت مقرر کرے، وہ لازم ہوگی''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 3، ص:3، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

اس بیع میں جواز کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ بائع آدھی گائے فروخت کرے، مشتری اور بائع دونوں گائے میں شریک ہوجائیں اور اس صورت میں گائے کی رکھوالی پر جو اخراجات آئیں گے، دونوں فریق اُس میں برابر شریک ہوں گے اور اُس گائے سے حاصل ہونے والے منافع میں بھی دونوں برابر شریک ہوں گے۔ یا دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مویشی کا مالک ایک شخص ہو اور مویشیوں کے منافع اسی کو حاصل ہوں اور دوسرے شخص کو وہ اجرت پر رکھ لے اور اس کی خدمات کے عوض اسے مقررہ اجرت ادا کرے۔

بیع کے فسخ کرنے کا حق

سوال:129

میں نے اپنا ایک فلیٹ اپنے ایک واقف کار محمد عابد کو =/75,000 روپے میں

فروخت کیا، محمد عابد نے بیعانہ کے طور پر =/38,000 روپے دے کر چابی وصول کرلی۔ میں نے یہ معاہدہ کیا کہ جب وہ بقیہ رقم ادا کرے گا، میں اُسے فلیٹ کے کاغذات بھی دے دوں گا اور پھر Sale Deed کا معاہدہ کروں گا۔ اب تقریباً 24 سال گزرنے کے باوجود محمد عابد نے بقیہ رقم ادا نہیں کی اور 24 سال سے اُسی فلیٹ میں رہ رہا ہے، اس دوران میں نے بار بار رقم کا تقاضا کیا، لیکن نہ تو اُس نے رقم دی اور نہ ہی میں نے رقم کی واپسی کے لئے سختی کی۔ میں گذشتہ ماہ اُس کے پاس گیا تو کہنے لگا کہ اب میں صرف بقیہ رقم =/37,000 روپے ادا کرسکتا ہوں۔ جبکہ میرا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے =/38,000 روپے لے کر مجھے فلیٹ واپس کردے، فلیٹ کے کاغذات میرے پاس ہیں۔ معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ میرے مطالبے کی کیا شرعی حیثیت ہے؟۔ نوٹ: معاہدے کی نقل (اردو ترجمہ) منسلک ہے، (خطیب اللہ قریشی، مارٹن کوارٹر، نیو ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

نفسِ مسئلہ سے قبل یہ بات مدّنظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق تجارت و معاملات میں دیانت، امانت، صداقت اور عہد و پیمان کی پابندی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور یہ خوبیاں اسلامی تعلیمات کا طرۂ امتیاز ہیں۔

ایجاب و قبول سے بیع منعقد ہوجاتی ہے اور چیز بائع کی مِلک سے نکل کر مشتری کی مِلک میں داخل ہوجاتی ہے۔ بیع منعقد ہونے کے بعد اُسے کوئی ایک فریق یک طرفہ طور پر فسخ نہیں کرسکتا، لہٰذا آپ کا مطالبہ شرعاً درست نہیں ہے۔ مذکورہ صورت میں مشتری، بائع کا مقروض ہے اور اُس سے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے، علامہ ابوبکر فرغانی مرغینانی لکھتے ہیں: وَاِذَا حَصَلَ الْاِیْجَابُ وَالْقَبُوْلُ لَزِمَ الْبَیْعُ وَلَا خِیَارَ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمَا اِلَّا مِنْ عَیْبٍ اَوْعَدَمِ رُؤْیَةٍ۔

ترجمہ: ’’اور جب ایجاب و قبول دونوں ہوجائیں تو بیع لازم اور تمام ہوجاتی ہے اور بائع و مشتری میں سے کسی کو فسخ کا اختیار حاصل نہیں رہتا، سوائے اس کے کہ مبیع (فروخت شدہ چیز) میں

کوئی عیب ظاہر ہو جائے یا مشتری نے بیع کے وقت مبیع کو نہ دیکھا ہو (تو خیارِ عیب اور خیارِ رویت حاصل ہوتا ہے)، (ہدایہ، جلد:5، ص:7-6، مطبوعہ: مکتبۃ البشریٰ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:
''بیع ایجاب وقبول سے تمام ہو جاتی ہے اور جب بیع صحیح شرعی واقع ہولے تو اس کے بعد بائع یا مشتری کسی کو بے رضامندی دوسرے کے اس سے یوں پھر جانا روا نہیں، نہ اس کے پھرنے سے وہ معاہدہ جو مکمل ہو چکا ہے، ٹوٹ سکتا ہے۔ زید پر لازم ہے کہ مال فروخت شدہ تمام وکمال خریدار کو دے، ہدایہ میں ہے: اِذَا حَصَلَ الْاِیْجَابُ وَالْقَبُوْلُ لَزِمَ الْبَیْعُ وَلَا خِیَارَ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمَا اِلَّا مِنْ عَیْبٍ اَوْ عَدَمِ رُؤْیَةٍ۔ ترجمہ: ''اور جب ایجاب وقبول حاصل ہو جائے تو بیع لازم ہو جاتی ہے اور بائع ومشتری میں سے کسی کو فسخ کا خیار حاصل نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ مبیع میں کوئی عیب ظاہر ہو جائے یا مشتری نے بیع کے وقت اس کو دیکھا نہ ہو، (فتاویٰ رضویہ، جلد 17، ص: 87، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

ایجاب وقبول کے بعد مبیع کا نرخ اگر بڑھ جائے تو بائع کو زائد رقم لینے کا اختیار نہیں ہے، بلکہ طے شدہ قیمت پر ہی مُشتری کو دے گا۔

محمد عابد صاحب کو چونکہ آپ مکان کا قبضہ اپنی رضا ورغبت سے دے چکے تھے، تو شرعاً بیع اسی وقت مکمل ہوگئی اور بقایا =/37,000 روپے آپ کے اُس کے ذمے واجب الادا ءرہ گئے، Sale Deed یا بیع نامہ کی تکمیل محض قانونی تقاضا ہے۔ آپ نے خود تحریر کیا ہے کہ آپ نے اپنی رقم کا تقاضا کرنے میں نرمی برتی، ایک روایت کی رُو سے کسی شخص کا دوسرے شخص پر قرض ہو اور وہ اس کا تقاضا نہ کرے تو اسے ہر روز اتنی رقم کے برابر صدقے کا ثواب ملتا ہے: عَنْ بُرَیْدَةَ الْاَسْلَمِیِّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا کَانَ لَهٗ بِکُلِّ یَوْمٍ صَدَقَةٌ، وَمَنْ اَنْظَرَهٗ بَعْدَ حِلِّهٖ کَانَ لَهٗ مِثْلُهٗ، فِیْ کُلِّ یَوْمٍ صَدَقَةٌ۔

ترجمہ: ''حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے تنگ دست (مقروض) کو قرض کی ادائیگی میں مہلت دی، تو اُس کو ہر دن اُس قرض کی رقم کے

برابر صدقہ کرنے کا اجر ملے گا، اور جس نے قرض کی ادائیگی کا وقت پورا ہونے کے بعد مقروض کو مہلت دی تو اُس قرض خواہ کو ہر روز قرض کی کل رقم کے برابر صدقہ کرنے کا اجر ملے گا''۔

(سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2418، مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث: 22970)

اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کا شِعار تو یہ رہا ہے کہ محض دل میں ارادہ کرلیا ہو، ابھی عقد تمام نہ ہوا ہو، تب بھی اُس پر قائم رہتے ہیں:

''ابوسعید بکر بن منیر بیان کرتے ہیں کہ امام بخاری کے پاس فروخت کے لیئے کچھ سامان آیا، شام کو ان کے پاس بعض تاجر آئے اور پانچ ہزار درہم کے نفع پر وہ سامان خریدنا چاہا، امام بخاری نے کہا: میں تمہیں کل بتاؤں گا۔ دوسرے دن تاجروں کا دوسرا گروہ آیا، انہوں نے دس ہزار درہم کے نفع سے خریدنے کی پیشکش کی، امام بخاری نے کہا: کل جو تاجر آئے تھے، میں نے دل میں ان کو فروخت کرنے کی نیت کرلی تھی، اب میں پانچ ہزار درہم کے نفع کی خاطر اپنی نیت بدلنا نہیں چاہتا''۔

(تاریخ بغداد، جلد 2 ص: 12، تاریخِ دمشق، جلد 55، ص: 60-59)

محمد عابد صاحب نے اتنے طویل عرصے میں اگر استطاعت کے باوجود رقم ادا نہیں کی تو اسے حدیث پاک میں ظلم قرار دیا گیا ہے، اسے آپ سے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ ترجمہ: ''قرض کی ادائیگی میں مالدار کا تاخیر کرنا ظلم ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3999)''۔ اسے آج کل کاروباری اصطلاح میں WILL FULL DEFAULT کہا جاتا ہے۔ البتہ اگر محمد عابد آپ کے مطالبے یا پیشگی شرط کے بغیر اصل واجب الادا رقم سے کچھ زائد تبرُّعاً دیدیں تو وہ جائز اور مستحسن ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مِسعر نے کہا: وَكَانَ لِي عَلَيْهِ دَيْنٌ، فَقَضَانِي وَزَادَنِي۔

ترجمہ: ''میرا رسول اللہ ﷺ پر قرض تھا، آپ نے وہ قرض ادا کر دیا اور (قرض سے) زیادہ عطا فرمایا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 2394)''۔

رہن رکھی ہوئی چیز سے نفع

سوال:130

ایک شخص نے اپنا مکان کرائے پر دیا۔ مالک مکان کو رقم کی ضرورت پڑی تو اُس نے کرایہ دار سے پچاس ہزار روپے بطور قرض مانگے۔ کرائے دار نے کہا کہ آپ مجھ سے ایک لاکھ روپے لے لیں اور اپنا مکان (جس میں وہ کرایہ دار ہے) میرے پاس گروی رکھ دیں۔ جب آپ مجھے رقم لوٹائیں گے، میں اُسی وقت سے آپ کو کرایہ ادا کروں گا اور جتنے عرصے تک میری رقم آپ کے پاس رہے گی، میں کرایہ ادا نہیں کروں گا۔ کیا یہ عمل درست ہے؟، کیا اتنی مدت تک کرایہ ادا نہ کرنا سود کے زمرے میں آئے گا؟۔

(محمد صدیق نورانی، ناظم آباد، کراچی)

جواب:

اس مسئلے کے جاننے سے پہلے ضروری اصطلاحات کا مفہوم سمجھ لیں:

(۱) جو چیز کسی کے پاس رہن رکھی جائے، اُسے "مرہون" کہتے ہیں۔

(۲) رہن رکھنے والے کو "راہن" کہتے ہیں۔

(۳) جس کے پاس وہ شے رہن رکھوائی جارہی ہے، اُسے "مُرتہن" کہتے ہیں۔

شریعتِ مطہرہ میں "عقدِ رہن" کو صرف اس لئے مشروع کیا گیا ہے کہ قرض دہندہ کو اپنی رقم سے متعلق اطمینان ہوجائے اور رقم ڈوبنے کا خدشہ نہ رہے۔ اس کی مالیت سے ایک حق مرتہن کے متعلق ہوجاتا ہے اور مرتہن کو اس شے کی حفاظت اور اپنے پاس بطور ضمانت روکے رکھنے کے علاوہ تصرُّف کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ شے اس کی ملکیت نہیں ہے، بلکہ اس نے اپنے پاس اس طرح روکی ہوئی ہے کہ مالک اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (لَا الْاِنْتِفَاعُ بِهٖ مُطْلَقاً) لَا بِاسْتِخْدَامٍ وَلَا سُكْنٰى وَلَا لُبْسٍ وَلَا اِجَارَةٍ وَلَا اِعَارَةٍ، سَوَاءٌ كَانَ مِنْ مُرْتَهِنٍ أَوْ رَاهِنٍ (اِلَّا بِاِذْنِ) كُلٍّ لِلْآخَرِ، وَقِيْلَ: لَا يَحِلُّ لِلْمُرْتَهِنِ لِأَنَّهٗ رِبًا، وَقِيْلَ: اِنْ شَرَطَهٗ كَانَ رِبًا، وَاِلَّا، لَا

ترجمہ: ''مرتہن کو مرہون سے کسی قسم کا نفع حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہے، مثلاً اگر غلام یا باندی ہے تو اُس سے خدمت لینے کی اجازت نہیں، مکان رہن رکھا ہوا ہے تو مرتہن کے لئے اس میں رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ لباس ہے تو پہننے کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی رہن رکھی ہوئی چیز کو اُجرت پر دینے یا عاریتاً دینے کی اجازت ہے۔ یہ انتفاع راہن یا مرتہن دونوں میں سے کسی کے لئے جائز نہیں، مگر یہ کہ ایک دوسرے کو یعنی راہن، مرتہن کو یا مرتہن، راہن کو انتفاع کی اجازت دے دے (تو درست ہے)۔ بعض علماء نے کہا کہ اگر چہ راہن اجازت دے دے تب بھی مرتہن کو نفع حاصل کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ یہ سود ہے اور بعض نے کہا کہ: عقدِ رہن میں استیفاء منافع شرط کرلیا ہے تو، سود ہے اور اگر شرط نہیں کیا تو سود نہیں''۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِبْنِ اَسْلَمَ السَّمَرْقَنْدِيِّ ،وَكَانَ مِنْ كِبَارِ عُلَمَاءِ سَمَرْقَنْدَ :اَنَّهٗ لَايَحِلُّ لَهٗ أَنْ يَّنْتَفِعَ بِشَيْئٍ مِنْهُ بِوَجْهٍ مِّنَ الْوُجُوهِ وَاِنْ أَذِنَ لَهُ الرَّاهِنُ ،لِأَنَّهٗ أَذِنَ لَهٗ فِي الرِّبَا، لِأَنَّهٗ يَسْتَوْفِي دَيْنَهٗ كَامِلاً فَتَبْقٰى لَهُ الْمَنْفَعَةُ فَضْلاً فَيَكُوْنُ رِبًا۔

ترجمہ: ''عبداللہ محمد بن اسلم سمرقندی جو سمرقند کے بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں، بیان کرتے ہیں: مرتہن کو مرہون سے کچھ بھی نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے اگر چہ راہن نے اجازت دے دی ہو کیونکہ یہ سود کی اجازت ہے، اس لئے مرتہن نے اپنا دین (قرض) پورا پالیا، تو جو منفعت حاصل کی، وہ اصل رقم پر زیادتی ہے اور یہی تو سود ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 10، ص:70، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

نوٹ: فتاوٰی رضویہ، جلد:25، ص:242 اور غمز عیون البصائر، جلد:3، ص:**244** پر عبداللہ بن محمد بن اسلم ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: شے مرہون کو اپنے استعمال میں لانا یا اُس میں سکونت کرنا کسی طور جائز ہے یا نہیں؟، آپ نے جواب میں فرمایا: کسی طرح جائز نہیں ہے۔ حدیث پاک میں ہے: كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبٰوا،اَخْرَجَهُ الْحَارِثُ

عَنْ سَیِّدِنَا عَلِیٍّ کَرَّمَ اللّٰہُ تَعَالیٰ وَجْھَہٗ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ ، ترجمہ:''وہ قرض جس کے ذریعے سے کوئی منفعت حاصل کی جائے ،وہ سود ہے''۔(بحوالہ کنزالعمال)اس کی تخریج حارث نے حضرت علی سے کی اور حضرت علی نے اسے نبی کریم ﷺ سے روایات کیا)۔علامہ طحطاوی پھر علامہ شامی خود شرح درمختار میں فرماتے ہیں:اَلْغَالِبُ مِنْ اَحْوَالِ النَّاسِ اَنَّھُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُوْنَ عِنْدَالدَّفْعِ الْاِنْتِفَاعَ وَلَوْ لَاہُ لَمَا اُعْطَاہُ الدَّرَاھِمَ وَھٰذَا بِمَنْزِلَۃِ الشَّرْطِ لِاَنَّ الْمَعْرُوْفَ کَالْمَشْرُوْطِ وَھُوَ مِمَّا یُعَیِّنُ الْمَنْعَ ۔ اَقُوْلُ وَلَاشَکَّ اَنَّ ھٰذَا بِعَیْنِہٖ حَالُ اَھْلِ الزَّمَانِ یَعْرِفُہٗ مِنْھُمْ کُلُّ مَنِ اخْتَبَرَ وَمَعْلُوْمٌ اَنَّ اَحْکَامَ الْفِقْہِ اِنَّمَا تَبْنِیْ عَلَی الْکَثِیْرِ الشَّائِعِ ولاتذکر حال شذت و ندرت فیہ الجواز کَمَانَصَّ عَلَیْہِ الْمُحَقِّقُ حَیْثُ اَطْلَقَ فِیْ فَتْحِ الْقَدِیْرِ وَغَیْرُہٗ مِنَ الْعُلَمَاءِ الْکِرَامِ فَالْحُکْمُ فِیْ زَمَانِنَا ھُوَاِطْلَاقُ الْمَنْعِ لَایَرْتَابُ فِیْہِ مَنْ لَّہٗ اِلْمَامٌ بِالْعِلْمِ.

ترجمہ:''لوگوں کا غالب حال یہ ہے کہ وہ مرہون شے دیتے وقت نفع اٹھانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اگر نفع اٹھانا مطلوب نہ ہوتو وہ قرض کے لئے رقم ہی نہ دیں اور یہ شرط کے درجے میں ہے،اس لئے کہ جو چیز معروف ہو،وہ مشروط ہی کی طرح ہوتی ہے اور یہی بات شے مرہون سے نفع اٹھانے کی ممانعت میں معین ہے۔میں (امام احمد رضا قادری) کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے زمانے کے لوگوں کا یہی حال ہے جسے ہر باخبر شخص جانتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ فقہی احکام کی بنیاد کثیر الوقوع امور پر ہوتی ہے اور شاذ و نادر احوال کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔جیسا کہ اس پر محقق علی الاطلاق علامہ کمال الدین بن ہُمام نے ''فتح القدیر''میں اور دیگر علماء کرام نے بھی صراحت فرمائی ہے۔چنانچہ ہمارے زمانے میں مرہون شے سے مطلقاً نفع اٹھانے کی ممانعت کا حکم ہے،جس کا دینی علم سے معمولی تعلق بھی ہوگا،اُسے اس مسئلے میں کوئی شک نہیں ہوگا''۔

(فتاویٰ رضویہ،جلد25،ص:217،218)

قسطوں پر قیمت طے کر کے کاروبار جائز ہے

سوال: 131

ایک شخص ایک پرائیویٹ بینک سے پچاس ہزار روپے بطور قرض لیتا ہے اور اِس رقم کو تین سال کے عرصے میں ہر ماہ قسط وار گیارہ ہزار روپے اضافی اصل رقم کے علاوہ واپس لوٹاتا ہے۔اس سلسلے میں اُس کے ایک دوست کا کہنا ہے کہ یہ اضافی رقم سود کے زمرے میں آتی ہے ،جبکہ خالد کا کہنا ہے کہ یہ اضافی رقم سود نہیں بلکہ بطور اجرت یا بینک کے اخراجات کی مَد میں ہوتی ہے۔درست کیا ہے؟۔

نیز قسطوں پر سامان خریدنے پر جو اضافی رقم ادا کی جاتی ہے کیا وہ بھی سود کے زمرے میں آتی ہے؟،(محمد صدیق نورانی،ناظم آباد،کراچی)۔

جواب:

بینک کا قسط وار اصل رقم کو وصول کرنا،اپنے دیئے ہوئے قرض کو وصول کرنا ہے اور اُس پر جو اضافی رقم وصول کی جارہی ہے،وہ سود کہلائے گی۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز (فتاویٰ رضویہ،جلد 25،ص: 217،رضا فاؤنڈیشن، لاہور پر) کنز العمال کے حوالے سے حدیث نقل فرماتے ہیں: كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبٰوا،اَخْرَجَهُ الْحَارِثُ عَنْ سَيِّدِنَا عَلِيٍّ كَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالىٰ وَجْهَهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ

ترجمہ:"یعنی قرض کے ذریعے سے جو منفعت حاصل کی جائے وہ سود ہے،(اس کی تخریج حارث نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے کی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اس کو نبی کریم ﷺ سے روایت کیا)۔فقہی اصول ہے کہ "جس قرض کی وجہ سے کوئی نفع اٹھایا جائے،وہ سود ہے"۔

مختلف افراد،کمپنیاں اور ادارے ادھار پر سامان فروخت کرتے ہیں اور قیمت اقساط میں وصول کی جاتی ہے قیمت باہمی رضامندی سے طے کرلی جاتی ہے،عام طور پر یہ موجودہ بازاری قیمت سے زیادہ ہوتی ہے،اسی طرح قسط کی رقم اور ادائیگی کی کل مدت پہلے سے طے ہوتی ہے،مبیع (SOLD ITEM) خریدار کے حوالے کرکے اس کی ملک میں دے

دی جاتی ہے، تو یہ عقد شرعاً صحیح ہے، بشرطیکہ اس میں یہ شرط شامل نہ ہو کہ اگر خدانخواستہ مقررہ مدت میں اقساط کی ادائیگی میں تاخیر ہوگئی تو ادائیگی کی اضافی مدت کے عوض قیمت میں کسی خاص شرح سے کوئی اضافہ ہوگا۔ اور اگر تاخیری مدت کی عوض قیمت میں اضافہ کردیا تو یہ سود ہے اور حرام ہے۔ فی نفسہ حدودِ شرع کے اندر اقساط کی بیع جائز ہے۔

قسطوں پر سامان لینے پر جو اضافی رقم ادا کی جاتی ہے، وہ سود میں شمار نہیں، مفتی وقار الدین قادری علیہ الرحمۃ'' سے سوال کیا گیا کہ: (''قسطوں پر سامان لینا کیسا ہے؟ مثلاً ایک چیز کی قیمت نقد =/17,000 روپے ہے اور قسطوں پر ہم اُس چیز کو لیتے ہیں، تو اس کی قیمت =/21,000 روپے ہو جاتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ نقد رقم سے جو زیادہ روپے دینے پڑتے ہیں، یہ سود ہے یا نہیں؟ مالک بتا دیتا ہے کہ آپ قسطوں پر لیں گے تو آپ کو اتنے روپے زیادہ دینے پڑیں گے''؟) آپ نے جواب میں لکھا: ''فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمتوں میں فرق کرنا جائز ہے اور اس طرح بیع کرنا کہ یہ چیز نقد دس روپے کی ہے اور ادھار پندرہ روپے کی، یہ جائز ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں قسطوں پر سامان لینا جائز ہے اور قسطوں کی صورت میں جو زیادہ پیسہ دیا جاتا ہے، یہ سود نہیں ہے۔ اس میں ناجائز ہونے کی صورت مندرجہ ذیل ہوگی کہ اگر مالک سے قیمت متعین کر کے کوئی چیز خریدی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اتنے روپے مالک کے خریدار کے ذمے واجب ہیں اور خریدار اُس چیز کا مالک ہو گیا اب خریدار مالک کو یہ روپیہ نقد نہ دے بلکہ یہ کہے کہ میں قسطوں میں اِس سے زیادہ ادا کروں گا، تو اِس صورت میں یہ زیادتی سود ہے اور حرام ہے، (وقار الفتاویٰ، جلد سوم ص: 271)''۔

طے شدہ اجرت سے وضع کرنا

سوال: 132

زید ایک وقف کے مال سے چلنے والے ادارے میں اجیر ہے، جہاں ہر سال اجارہ ہوتا ہے۔ قمری سال 1430ھ کا اجارہ اس سال کے آٹھ ماہ اور اگلے سال کے مزید چار ماہ ملا کر بارہ ماہ کا کیا اور زبانی و تحریری محفوظ کرلیا گیا۔ اجارہ میں جو اُجرت مقرر ہوئی، وہ

ادارے نے نہیں دی، بلکہ اُس سے کم رقم دی۔کیا زید اپنی مقرر کی ہوئی رقم ادارے سے لینے کا حق رکھتا ہےاور ادارے نے جو رقم مقرر کی وہ نہ دی،تو کیا حکم ہے؟۔
اگر ادارہ زید کی مقرر کی ہوئی رقم دینے سے انکار کرے اور کہے یہ وقف کا مال ہے،ہم سے غلطی سے تحریری اور زبانی طور پر اجارہ ہوگیا تو اب کیا حکم ہے؟۔اگر ادارہ زید کو مقرر رقم دینے کے بجائے اجارہ فسخ کرنا چاہے تو کیا حکم ہے؟،(عبداللہ عطاری،لیاقت آباد،کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ وقف ادارے کے ذمہ داران کو چاہئے کہ اجارہ کے وقت جو اجرت طے کی، مہینے کے اختتام پر اجیر کو طے شدہ پوری رقم دیں، جو اجیر کا حق ہے اور اُسے لینے کا حق رکھتا ہے۔اجیر کو اس کی اجرت نہ دینے پر حدیث پاک میں وعید آئی ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ ،عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالیٰ : ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ :رَجُلٌ أُعْطَى بِی ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اِسْتَأْجَرَ أَجِيْرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهِ أَجْرَهُ ۔

ترجمہ:’’حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن میں تین شخصوں سے جھگڑا کروں گا،ایک وہ جس نے میرے نام پر عہد کیا اور اس عہد کو توڑ دیا،دوسرا وہ جس نے آزاد آدمی کو فروخت کیا اور اُس کی قیمت کھائی،تیسرا وہ جس نے کسی کو (اجرت پر) مزدور رکھا اور پورا کام لے کر اُسے (پوری) مزدوری نہ دی،(صحیح بخاری،رقم الحدیث:2270)‘‘۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ:’’اگر کوئی شخص کسی مزدور کو برائے مزدوری سو(100) کوس یا پچاس کے فاصلے پر لے جائے،بعدازاں اس سے چار یا پانچ ماہ تک کام کرالے اور حساب کے وقت اُس کو تیس روپے کے کام کے بیس روپے دے اور اس پر سختی کرے اور اسے پریشان کرے،جائز ہے یا نہیں؟‘‘۔آپ نے جواب میں لکھا:’’حرام،حرام،حرام،کبیرہ،کبیرہ،کبیرہ،کبیرہ۔رسول اللہ ﷺ فرماتے

ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ كُنْتُ خَصْمَهُ خَصَمْتُهُ رَجُلٌ أُعْطَى بِيْ ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اِسْتَأْجَرَ أَجِيْرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُوْفِهِ أَجْرَهُ ـ رَوَاهُ الْأَئِمَّةُ اَحْمَدُ وَالْبُخَارِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَاَبُوْ يَعْلٰى وَغَيْرُهُمْ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَذَكَرَهُ ـ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ وَعِلْمُهُ جَلَّ مَجْدُهُ اَتَمُّ وَاَحْكَمُ ـ

ترجمہ: ''میں قیامت کے دن تین شخصوں کا مخالف ہوں گا اور جس کا میں مخالف ہو جاؤں، میں ہی اس پر غلبہ پاتا ہوں، ایک وہ جس نے میرے نام پر عہد کیا، پھر اس عہد کو توڑ دیا، دوسرا وہ جس نے کسی آزاد کو غلام بنا کر بیچ ڈالا اور اس کی قیمت کھائی، تیسرا وہ جس نے کسی شخص کو مزدوری میں لے کر اپنا کام تو اس سے پورا کرالیا اور مزدوری اُسے پوری نہ دی (اسے امام احمد، بخاری، ابن ماجہ، ابویعلیٰ وغیرہم ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، پھر آپ نے یہی حدیث ارشاد فرمائی)''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 19، ص: 454، 455، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

فریقین پر لازم ہے کہ عقدِ اجارہ کی پابندی کریں، ظاہر ہے کہ متاجر نے اجارہ وقف کے متولی یا اس کے نمائندۂ مُجاز ہی کی حیثیت میں کیا ہوگا نہ کہ شخصی اور ذاتی حیثیت میں۔ اگر وقف کے متولّی کا گمان یہ ہے کہ اس نے اجیر کی اجرت، اجرتِ مثلی سے زیادہ مقرر کی ہے، تو اس کا بار متولی کی ذات پر آئے گا اور یہ بار اُسے اپنے ذمے لینا پڑے گا، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: لَوْ زَادَ الْمُتَوَلِّيْ دَانِقًا عَلٰى أَجْرِ الْمِثْلِ ضَمِنَ الْكُلَّ،

ترجمہ: ''اگر متولی نے مزدوری کا چھٹا حصہ بڑھا کر (مزدور کو) دیا تو متولی کل مزدوری کا ضامن ہوگا''۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

صُوْرَتُهُ: اِسْتَأْجَرَ الْمُتَوَلِّيْ رَجُلًا فِيْ عِمَارَةِ الْمَسْجِدِ بِدِرْهَمٍ وَدَانِقٍ، وَأُجْرَةُ مِثْلِهِ

دِرْهَـمٌ ضَمِنَ جَمِيْعَ الْأُجْرَةِ مِنْ مَّالِهٖ لِأَنَّهٗ زَادَ فِي الْأَجْرِ أَكْثَرَ مِمَّا يَتَغَابَنُ فِيْهِ النَّاسُ، فَيَصِيْرُ مُسْتَأْجِرًا لِنَفْسِهٖ ،فَإِذَا نَقَضَ الْأَجْرَ مِنْ مَّالِ الْمَسْجِدِ كَانَ ضَامِنًا.

ترجمہ:"متولی نے کسی شخص کو مسجد کا کام کرنے کے لئے ایک درہم اور درہم کے چھٹے حصے (یعنی 11/6 درہم) کی اجرت پر اجیر رکھا، حالانکہ اس جیسے کام کی اجرت معمول کے مطابق ایک درہم بنتی ہے تو ساری اجرت متولی کو اپنے پاس سے دینا پڑے گی، اس لئے کہ متولی نے واجبی اجرت سے اتنا بڑھا کر دیا کہ لوگ دھوکا کھا کر بھی اتنی زیادہ اجرت نہیں دیتے، تو یہ قرار پائے گا کہ اُس نے اپنے لئے مزدور رکھا ہو، پھر جب متولی نے مسجد کے مال سے مزدوری ادا کی تو متولی اس کا ضامن ہوگا"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6، ص:443، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

لیکن جہاں تک امامت وخطابت اور تدریس کے شعبے سے وابستہ اشخاص کا تعلق ہے، اس میں ہر فرد کی اپنی اپنی صلاحیت وقابلیت ہوتی ہے، سب کو ایک ترازو سے نہیں تولا جا سکتا، لہٰذا ہر ایک کے ساتھ جو اجرت طے پائے گی، وہ اس کا حق دار ہوگا اور مستاجر کی طرف سے اس میں کمی کرنا عہد شکنی ہوگی۔ مذکورہ صورت میں ذمہ داران پر تاوان لازم ہے اور کسی ایک فریق کو تنہا فسخِ اجارہ کا حق حاصل نہیں۔

جھوٹی قسم کے ذریعے کسی کا مال غصب کرنا

سوال:133

میں نے کاروبار کے سلسلے میں ایک شخص کو تین گواہوں کی موجودگی میں جواہرات دیئے اور تحریر بھی لکھی گئی۔ اس کے بیٹے بھی کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں کہ آپ کی ہمارے والد پر رقم ہے، لیکن کتنی ہے یہ نہیں معلوم۔ جرگے میں فیصلہ ہوا، جرگے نے بھی اُس شخص کو ملامت کی۔ اب وہ جھوٹی قسم کھا رہا ہے اور میری رقم دینے سے انکاری ہے۔ شرعی لحاظ سے اُس کی قسم کا کیا حکم ہے اور کس پر قسم جائز ہے؟۔

(حاجی نور حسین، فیڈرل بی ایریا، کراچی، معرفت: مولانا مقبول الرحمٰن)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں چونکہ آپ کے کاروباری معاہدے کی تحریر اور گواہ موجود ہیں، گواہ اگر عادل ہیں تو اُن کی گواہی مانی جائے گی اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ شرعاً قسم اُس وقت لی جاتی ہے جب کوئی گواہ موجود نہ ہوں اور مُدعیٰ علیہ انکار کرتا ہو، حدیث پاک میں ہے: عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي خُطْبَتِهِ: "اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي وَالْيَمِيْنُ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ"۔

ترجمہ: ''عمرو بن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ (اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو) اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1339)''۔

الغرض مُدَّعیٰ علیہ کے دعوے سے انکار اور مدعی کے پاس گواہ نہ ہونے کی صورت میں مُدعیٰ علیہ کو قسم دینے کی نوبت آتی ہے۔ درپیش صورتِ حال میں آپ کے پاس گواہ موجود ہیں تو گواہی پر ہی فیصلہ ہوگا اور مُدّعیٰ علیہ کو قسم دینے کی نوبت نہیں آئے گی۔ تاہم جھوٹی گواہی شریعت کی نظر میں کتنا بڑا گناہ ہے، اس پر قرآن وحدیث میں وعیدیں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيْلاً أُولٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ○

ترجمہ: '' بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی قیمت خریدتے ہیں (یعنی دنیوی مفاد اور مالی منفعت کے عوض جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں)، اُن لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ آخرت میں اللہ ان سے کوئی کلام فرمائے

گا اور نہ ہی قیامت کے دن ان کی طرف نظر کرم فرمائے گا اور نہ اُن کو(گناہوں کے میل سے) پاک فرمائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، (سورۂ آل عمران: 77)''۔

حدیث پاک میں ہے: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جس شخص نے جھوٹی قسم کھا کر مال حاصل کیا، تو وہ (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس پر غضب فرمائے گا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے طور پر یہ آیت نازل فرمائی: إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيلًا أُولَئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ(ترجمہ: ''بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی (جھوٹی) قسموں کے عوض تھوڑی قیمت خریدتے ہیں (یعنی دنیوی مفاد اور مالی منفعت کے عوض جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں)، اُن لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ آخرت میں اللہ ان سے کوئی کلام فرمائے گا اور نہ ہی قیامت کے دن ان کی طرف نظر کرم فرمائے گا اور نہ اُن کو(گناہوں کے میل سے) پاک فرمائے گا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے)(سورۂ آل عمران :77)۔ پھر حضرت اشعث بن قیس آئے اور کہا کہ ابوعبدالرحمٰن نے تم سے کیا حدیث بیان کی ہے؟، انہوں نے بتایا: اس اس طرح حدیث بیان کی ہے، تو انہوں نے کہا: کہ انہوں نے سچ بیان کیا، یہ آیت میرے متعلق ہی نازل ہوئی ہے، میرا ایک شخص کے ساتھ ایک کنویں کے معاملے میں نزاع تھا، تو ہم یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لے کر گئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یا تو تمہارے پاس (اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے) دو گواہ ہوں اور یا وہ شخص (مُدعٰی علیہ) قسم کھائے''، میں نے عرض کی: وہ تو جھوٹی قسم کھا لے گا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرے، تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس پر غضب ناک ہوگا''،

تو اللہ تعالیٰ نے (نبی ﷺ کے اس فرمان کی) تصدیق کے طور پر یہ آیت نازل فرمائی، پھر رسول اللہ ﷺ نے سورۂ آل عمران کی آیت نمبر: 77 تلاوت فرمائی جو اوپر مذکور ہے۔(صحیح بخاری، رقم الحدیث:16-2515)''۔

سودی لین دین کا معاہدہ حرام ہے

سوال:134

مارکیٹ یونین میں اکثر سود کے متعلق کیس آتے ہیں۔ایسا ہی ایک کیس آیا ہے، دکان دار نے کاریگر سے دولاکھ کا سونا لیا باہمی رضامندی سے سود (منافع) طے کرلیا۔چند ماہ میں ہی دونوں کے درمیان تنازع ہوگیا کہ میں اب منافع نہیں دے سکتا۔دکان دار اب تک تیس ہزار روپے منافع یعنی سود میں دے چکا ہے اور دس ہزار باقی ہیں۔اب معلوم یہ کرنا ہے: جو منافع (سود) کاریگر کھاچکا ہے، وہ رقم واپس ہوگی؟ یا جو رقم (سود) باقی ہے، وہ ختم ہوگی اور کاریگر کی اصل رقم کتنی واپس کی جائے گی؟، (محمد ظہور، لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

سودی لین دین کا معاہدہ اصلاً ہی گناہ وحرام تھا اور اس کے لئے سود لینے اور دینے کا معاہدہ کرنے والے دونوں گناہ گار ہیں اور یہ گناہِ کبیرہ ہے، لہٰذا دونوں کو اپنے اپنے گناہ کا صدقِ دل سے اعتراف کر کے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے، جو رقم سودی قرض لینے والے شخص نے بطور سود ادا کی ہے، اسے قرض کی کُل رقم سے وضع کر کے باقی اصل رقم قرض خواہ کو ادا کردی جائے۔سود کے نام پر جو رقم قرض خواہ نے لی ہے، وہ اس کے لئے حرام ہے۔

ایڈوانس کی رقم پر زیادہ لینا ناجائز ہے

سوال: 135

میں نے کاروبار کے سلسلے میں ایک مکان کا کچھ حصہ گودام اور لیبر کی رہائش کے لئے 1980ء میں کرایہ پر لیا تھا، جس کا کرایہ باقاعدگی سے ادا کرتا رہا۔مالک مکان کا

انتقال ہوگیا ہے،اُن کی اولاد (وارث) اس مکان کو بیچنا چاہتے ہیں۔1980ء سے آج تک کوئی تحریری اقرارنامہ میرے اور مالک مکان کے درمیان نہیں ہوا تھا میں نے زبانی وعدہ کیا تھا کہ حسبِ ضرورت میں یہ مکان خالی کردوں گا اور میں اپنے وعدہ پر قائم ہوں، بطور سیکورٹی ایڈوانس کی رقم =/5100 روپے جمع کرائی تھی،جمع شدہ رقم آج کل کے سونے کی قیمت کے فرق سے واپس لی جائے گی یا وہی جمع شدہ رقم وصول کی جائے گی؟۔

حاجی محمد یونس، بلاک 14 ،فیڈرل بی ایریا،کراچی

جواب:

مذکورہ صورت شریعت کی اصطلاح میں ''اجارہ'' کہلاتی ہےاور یہ زبانی بھی منعقد ہوجاتا ہے،تحریری دستاویز مفید بھی ہےاور فریقین کے حقوق کے تحفظ کیلئے قانونی ضرورت بھی،لیکن شرعاًلازم نہیں ہے۔جورقم آپ نے ایڈوانس جمع کرائی تھی،وہ بطورزرِضمانت تھی اور شرعاً متاجر کے لئے اُس کی حیثیت قرض کی تھی،اور جتنی رقم آپ نے جمع کروائی تھی، متاجر پراُس کی واپسی لازم ہےاور آپ کا اُس سے زائدرقم کا مطالبہ کرنا درست نہیں، چونکہ آپ نے وہ رقم بطورضمانت جمع کروائی تھی،جس کی حیثیت قرض کی سی ہے،اگراس رقم پر بڑھاکروصول کریں گے،تو یہ سود ہوگا،رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبٰو۔

ترجمہ:''ہروہ قرض جو(اصل رقم پر زائد) کسی منفعت کا باعث ہو،تو ایسی منفعت سود ہے،(کنزالعمال،رقم الحدیث:15516)''۔

البتہ اگر عقدِاجارہ کے وقت نقدرقم کے بجائے سونادیدیا کریں تو پھر سونا ہی واپس لینے کا حق ہوگا،اس صورت میں افراطِ زَر یعنی روپے کی قدر میں غیر معمولی کمی کے اثرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ایسے میں کسی بھی ایسی چیز کو معیار بنا سکتے ہیں جس کی قدر عام طور پر قائم رہتی ہو۔

کسی چیز کے بیچنے کے لئے دوسرے کو ایجنٹ بنانا

سوال: 136

زید نے عابد کو اپنا موبائل فون مثلاً 100 روپے میں فروخت کرنے کیلئے دیا، مگر عابد نے 110 روپے میں فروخت کردیا اور زید کو نہیں بتایا۔ آیا یہ نفع عابد کو رکھنا کیسا ہے؟۔ دوسری صورت میں عابد نے زید کو نفع بتا کر رکھا، لہٰذا اب عابد کے لئے یہ نفع جائز ہے یا نہیں؟۔

تیسری صورت میں زید نے عابد سے کہا کہ مجھے 100 روپے دے دینا، اس سے اوپر جتنا منافع ہو، وہ تمہارا ہے، آیا اس صورت میں عابد کے لئے اُس نفع کا کیا حکم ہے؟۔

حافظ محمد آصف، صدر کراچی

جواب:

پہلی صورت ناجائز ہے کہ زید کے علم میں لائے بغیر زائد رقم اپنے پاس رکھ لینا غبن ہے۔ اس صورت میں دوسری قباحت یہ ہے کہ زید نے عابد پر واضح نہیں کیا کہ اس عمل (موبائل فروخت کرنے) پر عابد کو کتنی اجرت دے گا؟۔

دوسری صورت میں جو نفع حاصل ہوا چونکہ عابد نے زید کو بتا کر رکھا اور زید نے اس پر رضامندی بھی ظاہر کردی، تو عابد کے لئے یہ منافع جائز ہے۔

تیسری صورت میں اگرچہ منافع مجہول ہے، لیکن اثر ابن عباس کی وجہ سے بطور استحسان جائز ہے، اثر ابن عباس کا بیان آگے آرہا ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ ''اجارۂ فاسدہ'' کے بیان میں لکھتے ہیں: اَلْفَسَادُ قَدْيَكُوْنُ لِجَهَالَةِ قَدْرِ الْعَمَلِ بِاَنْ لَّايُعَيِّنَ مَحَلَّ الْعَمَلِ وَقَدْ يَكُوْنُ لِجَهَالَةِ قَدْرِ الْمَنْفَعَةِ بِاَنْ لَّا يُبَيِّنَ الْمُدَّةَ وَقَدْ يَكُوْنُ لِجَهَالَةِ الْبَدَلِ۔

ترجمہ: ''اور کبھی اجارہ کام کی مقدار کے مجہول ہونے کے سبب فاسد ہوجاتا ہے جب یہ معین

نہ کیا گیا ہو کہ کیا کام لیا جائے گا اور کبھی منفعت کی مقدار مجہول ہونے کے سبب فاسد ہو جاتا ہے یعنی مدت بیان نہیں کی گئی ہو اور کبھی بدل یعنی قیمت کے مجہول ہونے کے سبب فاسد ہو جاتا ہے۔(فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص:439)''

اس کے برعکس بہتر صورت یہ ہے کہ عابد زید سے 100 روپے پر وہ موبائل خرید لے، پھر وہ اسے حسب منشا قیمت پر بیچ سکتا ہے یا زید عابد سے یہ کہے کہ یہ موبائل مجھے اتنے میں پڑا ہے، آپ اسے نفع پر بیچ دیں اور منافع کی رقم ہم نصف نصف یا جو بھی تناسب طے ہو اس کے مطابق تقسیم کرلیں گے۔صحیح بخاری میں سمسار (کمیشن ایجنٹ) کے ساتھ عقد کے جواز کی ایک صورت اثر عبداللہ بن عباس کے حوالے سے ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے کہے کہ ''یہ کپڑا اتنے میں بیچ دو، اس سے زیادہ جو رقم تمہیں ملے وہ تمہاری ہے۔تابعی ابن سیرین نے کہا کہ: ایک شخص نے (کمیشن ایجنٹ) سے یہ کہا کہ یہ چیز اتنے میں بیچ دو، اس سے زیادہ جو نفع ملے، وہ تمہارا ہے یا ہم دونوں نصف نصف کے حق دار ہوں گے۔(جلد 2، ص:670)''۔تو جہاں یہ عرف رائج ہو تو بطور استحسان یہ جائز ہے۔

قرعہ اندازی پر موٹر سائیکل

سوال: 137

ایک کمپنی کے تیس ممبران ہر ماہ دو دو ہزار روپے جمع کرتے ہیں، پھر قرعہ اندازی کی جاتی ہے، جس کا نمبر نکلتا ہے، اس کو ایک عدد موٹر سائیکل دے دیتے ہیں اور پھر اُس سے مزید کوئی رقم نہیں لی جاتی، ایسا کرنا سود میں تو شمار نہیں ہوتا؟

حافظ عابد حسین مہروی، نیو کراچی

جواب:

آپ کے بیان کیے ہوئے طریقۂ کار میں یہ وضاحت موجود نہیں کہ اگر کوئی شخص درمیان میں چھوڑنا چاہے تو اس کی رقم واپس ملے گی یا ڈوب جائے گی، اگر رقم ڈوب جاتی

ہے تو یہ ''قمار'' (Gambling) ہے اور حرام ہے، قمار (جوئے) کے معنی یہی ہیں کہ مال کو اس طرح داؤ پر لگایا جائے کہ یا تو زائد مل جائے گا یا مکمل طور پر مال ڈوب جائے گا۔ قرعہ اندازی میں نام آنے کے بعد اُس ممبر کو موٹر سائیکل تو مل جائے گا، مگر اس سے پوری قیمت وصول نہیں کی جائے گی، کسی کو دو ہزار میں مل جائے گا، کسی کو بالترتیب، چار، چھ، آٹھ اور دس ہزار میں ملے گا، حتیٰ کہ آخر تک یہ صورت چلے گی اور کسی کو ساٹھ ہزار میں ملے گا۔ یہ بھی قمار ہی کی صورت ہے اور قمار حرام ہے۔

اِس میں مزید قباحت یہ ہے کہ موٹر سائیکل کی قیمت مجہول (Unknown) ہے، جس کے سبب یہ بیع فاسد ہے۔ بیع درست ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ثمن (قیمت) مجہول نہ ہو اور اس کی مقدار متعیّن اور واضح ہو۔ مذکورہ صورت میں چونکہ ثمن مجہول ہے، اس لئے بیع فاسد ہے۔

سوال نمبر: 128 کے جواب کے ضمن میں ''فتاویٰ عالمگیری، جلد: 03، ص: 03'' کا حوالہ موجود ہے کہ بیع کے صحیح ہونے کے لئے مبیع اور ثمن کا اس طرح واضح طور پر معلوم ہونا ضروری ہے کہ جس کی وجہ سے بعد میں فریقین میں کوئی تنازعہ پیدا نہ ہو۔

وراثت کے مسائل

نوٹ: ہر مفتی وراثت سے متعلق فتویٰ میں یہ لکھتا ہے کہ ''اُمُورْ مُتَقَدَّمَۃٌ عَلَی الْاِرْث '' کے بعد یعنی ان امور کے نفاذ کے بعد، جو تقسیم وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ترکہ حسبِ ذیل تناسب سے تقسیم ہوگا۔ بجائے اِس کے کہ ہر فتوے کے شروع میں اس کا اعادہ کیا جائے، ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک ضابطے کے طور پر انہیں یہاں بیان کر دیا جائے اور ہر قاری یہ سمجھ لے کہ اس کا اطلاق وراثت کے ہر فتوے پر ہوتا ہے۔

ترکہ کی تعریف:

مرتے وقت میت کی مِلک میں جو مال ہو (خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، منقولہ ہو یا غیر منقولہ)، وہ ''ترکہ'' یا مال متروکہ (پیچھے چھوڑا ہوا مال) یا وِرثہ یا مَورُوث یا وِراثت کہلاتا ہے۔

مُورِث وہ شخص ہے جو مال چھوڑ کر وفات پاتا ہے اور وارث وہ ہے جسے شریعت کی رو سے کسی کے ترکے میں سے حصہ ملے۔

وصیت: کوئی شخص اپنے مرنے سے پہلے یہ کہے کہ میرے ترکے میں سے اتنا حصہ فلاں شخص یا اشخاص کو دینا یا فلاں کارِ خیر میں صَرف کرنا، اسے ''وصیت'' کہتے ہیں۔

مقدارِ وصیت: کوئی شخص اپنے مال متروکہ میں سے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی وصیت کر سکتا ہے۔ اگر ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کی، تو وہ صرف ترکے کے ایک تہائی حد تک ہی نافذ ہوگی، تہائی ترکے سے زیادہ کی وصیت کالعدم ہو جائے گی۔ تہائی سے زائد مقدار کا نفاذ اُس صورت میں ہو سکتا ہے جب تمام بالغ وُرثاء یا کوئی ایک بالغ وارث اپنے حصے سے رضاکارانہ طور پر اِسے پورا کرنے کے لئے تیار ہو، ورنہ نہیں۔ البتہ تہائی ترکے کی حد تک بہر حال نافذ ہوگی۔

وارث کے حق میں وصیت: اگر مرنے والے نے اپنے ورثاء میں سے کسی ایک کے حق میں وصیت کی ہے تو شرعاً وہ نافذ نہیں ہوگی، کیونکہ اس سے شریعت کے مقرر کئے ہوئے وراثت کے حصوں کا تناسب وتوازن (Ratio,Proportionate) بدل جائے گا، جس کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ اور رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''فَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ ''

یعنی ''وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے، (سنن ابی داؤد: 2862)''۔

ہاں اگر تمام ورثاء عاقل بالغ ہوں مورث کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کا احترام کرتے ہوئے اسے نافذ کرنے پر راضی ہوں تو صرف اِس صورت میں وہ وصیت وارث کے حق میں نافذ ہوگی۔

ترکہ کی تقسیم کے شرعی اصول: کسی بھی میت کے ترکے کی تقسیم حسب ذیل اصول شرع کے مطابق ہوگی:

(۱) مصارف تجہیز و تکفین: سب سے پہلے میت کے ترکے میں سے اُس کی تجہیز و تکفین کے مصارف وضع کیے جائیں گے۔

(۲) ادائے قرض: اس کے بعد اگر اُس کے ذمے کسی کا کچھ قرض ہے، تو اس کی ادائیگی ترکے میں سے کی جائے گی۔ امام شافعی کے نزدیک اگر اس کے ذمے شرعی واجبات بھی ہیں، جیسے زکوٰۃ وغیرہ، تو وہ بھی قرض کے طور پر وضع کیے جائیں گے۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک ''دَینِ شرع'' کا نفاذ وصیت پر موقوف ہے۔

(۳) نفاذ وصیت: اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو اُسے شریعت کے ضابطے کے مطابق نافذ کیا جائے گا، جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

مخلوط مال کی صورت میں ترکے کی تقسیم

سوال: 138

میرے والد کا انتقال 1980 اور والدہ کا 1984 میں ہوا۔ ورثاء میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑیں، سب کم عمر تھے، پرورش، تربیت اور شادیاں چچا تایا اور پھوپھیوں نے کی۔ والد کی ایک دکان تھی، جس کی مالیت پانچ لاکھ روپے تھی، والد کے انتقال کے بعد اُسے کرائے پر دے دیا، ماہانہ =/3800 روپے 1986 تا 1992 کرایہ آتا رہا، اس کرائے کی رقم سے سوا دو لاکھ روپے کا پگڑی پر فلیٹ لے لیا۔ 1993 میں مزمل اور منصور دونوں بھائیوں نے دکان کی ذمہ داری سنبھالی، کرائے کی رقم سے سوا دو لاکھ کا مکان پگڑی پر

خریدا اور 70 ہزار کا مال دکان میں ڈالا۔اسی دوران مزمل اور منصور نے ایک جائیداد اور بنالی اور پگڑی پر دکان خریدی۔پانچ سال قبل سب سے چھوٹے بھائی مدثر کی شادی پر 13 لاکھ روپے کا ایک مکان خریدا، جس کی مالیت آج 22 لاکھ روپے ہے۔جس وقت مزمل اور منصور نے دکان سنبھالی ایک لاکھ ستر ہزار روپے مدثر نے انشورنس کے لئے تھے، تینوں بہنوں کو بھی انشورنس کی رقم ادا کردی گئی ہے، مگر مزمل اور منصور نے ایک لاکھ دس ہزار روپے اپنی دکان میں لگا دیئے، جس کا ابھی تک حساب نہیں ہوا، ان دونوں نے پیسے نہیں لئے۔ چھوٹے بیٹے مدثر نے دکان پر کوئی مالی اور محنت طلب کام نہیں کیا۔کیا اس کا حصہ دوسری دکان اور مکان میں بنتا ہے؟۔اب اس جائیداد میں 3 بہنوں اور 3 بھائیوں کا کیا حصہ بنتا ہے؟۔(مزمل،کراچی)۔

جواب:

وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں، اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا: ترکے کے 9 حصے کئے جائیں گے، ان میں سے ہر بیٹے کو فی کس دو دو حصے (کل چھ حصے) اور ہر بیٹی کو فی کس ایک ایک حصہ (کل تین حصے) ملے گا۔چونکہ ترکہ والد کے انتقال کے فوراً بعد تقسیم نہیں ہوا، اس لئے دوکان سے حاصل ہونے والی آمدنی ترکے میں شامل ہوگی اور اگر اس سے مزید کوئی چیز خریدی ہے، تو اسے بھی ترکے میں شامل کیا جائے گا۔جن بھائیوں اور بہنوں نے انشورنس کی رقم ترکے میں سے لی ہے، وہ قرض ہے، اس کو مجموعی ترکے میں شامل کرکے ترکے کی تقسیم کے وقت ان کے حصے میں سے وضع کرلیا جائے، اسی طرح جن بھائیوں نے ترکے کے مال میں سے رقم لے کر اپنے کاروبار میں لگائی ہے، اس کا بھی یہی حکم ہے۔واضح رہے کہ ترکے کی تقسیم کے وقت ہر چیز کی تقسیم کا حکم الگ الگ نہیں بیان کیا جاتا، ترکے (مثلاً مکان، دوکان، پلاٹ، زیورات، بینک اکاؤنٹ، ڈیپازٹ سرٹیفکیٹس وغیرہ) میں سے ہر چیز کو فروخت کرکے یا اس کی موجودہ قیمت لگا کر مجموعی مالیت نکالی جاتی ہے اور پھر اس سب مال کی شریعت کے مطابق

تقسیم ہوتی ہے۔ترکے کی آمدنی میں سے اگر کسی وارث نے کوئی دوکان خریدی ہے،تو یہ طے کرنا ورثاء کا کام ہے کہ آیا وہ رقم اُس نے بطور قرض لے کر اپنے ذاتی کاروبار کے لئے دوکان خریدی تھی اور ذاتی کاروبار کر رہا تھا؟،اگر جواب ہاں میں ہے،تو یہ رقم قرض ہے اور اسے کل ترکے میں جمع کر کے ترکے کی تقسیم کے وقت اس کے حصے میں سے وضع کی جاتی ہے،دوکان کا نفع ونقصان اسی کا ہوگا۔اگر دوکان اس نے مشترکہ جائیداد کے طور پر لی تھی،تو اس کا نفع ونقصان مشترکہ ہے،البتہ جو عامل بھی (Working Partner) ہے،وہ اپنی محنت کی اجرت لے سکتا ہے۔یہ فیصلہ کرنا تمام وارثوں کا کام ہے یا اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان کی برادری میں عرف کیا ہے،یا کمیونٹی کے بزرگوں کی ایک ثالثی کمیٹی بنا کر اس سے فیصلہ کرالیں اور اسے سب قبول کریں اور فیصلہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے منصفانہ فیصلہ کریں۔

زندگی میں وراثت تقسیم نہیں ہوتی

سوال: 139

ھند کے والد نے تین شادیاں کی ،ھند کی والدہ سے ھند سمیت چار لڑکیاں پیدا ہوئیں ،ھند کی پہلی سوتیلی والدہ سے ایک بہن اور دوسری سوتیلی والدہ سے ایک بھائی اور ایک بہن ہیں۔ھند کی کوئی اولاد نہیں ہے اور شوہر کا بھی انتقال ہوگیا ہے۔معلوم یہ کرنا ہے کہ ھند کے مرنے کے بعد یا اُس کی حیات میں تین سگی بہنوں ،دو سوتیلی بہنوں اور ایک سوتیلے بھائی کا کیا حصہ بنتا ہے؟،(محمد قمر علی،عبداللہ ہارون روڈ،صدر،کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں ھند اپنی جائیداد کی مالک ومختار ہیں،وہ اس میں جس طرح چاہیں تصرُّف کرسکتی ہیں۔اپنی زندگی میں وہ اگر چاہیں تو اپنی جائیداد کا کچھ حصہ یا کل جائیداد کسی ایک فرد یا افراد کو ھبہ کرسکتی ہیں،اپنی کل جائیداد کے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی حصہ تک کسی فرد یا افراد یا اداروں کے نام وصیت کرسکتی ہیں،البتہ وارث کے حق میں وصیت

شرعاً مؤثر نہیں ہوتی ۔ھند کی وفات کے وقت جو شرعی وارث موجود ہوں گے ،وہ اسلامی احکامِ وراثت کے مطابق ترکے میں سے اپنا حصہ پانے کے حق دار ہوں گے ۔ ہمیں غیب کا علم نہیں ہے کہ کس کی موت پہلے واقع ہوگی اور کس کی بعد میں ،کون وارث بنے گا اور کون مورث (جس کی وراثت دوسروں کو ملے گی)۔

حج فارم میں نامزد شخص کی حیثیت

سوال:140

زید ،بکر کے پاس ملازم ہے ۔بکر جب حج کے لئے گیا تو حج کے فارم میں بکر نے زید کو جائیداد کا وارث مقرر کیا جبکہ بکر کے بیٹے بھی ہیں ۔بکر کا حج کے دوران انتقال ہو گیا ،کیا زید بکر کی وراثت کا حق دار ہے یا نہیں ؟ ۔جبکہ بکر کا Death Certificate بھی زید کے نام آیا ہے ،(محمد قمر علی ،عبداللہ ہارون روڈ ،صدر ،کراچی)۔

جواب:

حج کے فارم میں کسی شخص کو نامزد کرنے کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاجی کی وفات کی صورت میں اُس سے رابطہ قائم کیا جائے یا اسے اطلاع دی جائے اور اس کے کچھ بقایا جات یا انشورنس کی رقم کا چیک اس کے نام پر بنایا جائے ،ایسی صورت میں اس شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس رقم کو امانت سمجھے اور اس کے وارثوں تک پہنچادے اور اگر وزارتِ حج والوں کے نزدیک یہ نامزدگی اس لئے ہے کہ متوفّی حاجی کے تمام بقایا جات کا وہ حق دار ہے تو اس کی نامزدگی کی حیثیت زیادہ سے زیادہ وصیت کی ہوگی اور یہ رقم اگر متوفی کے کل ترکے کا ایک تہائی حصہ یا اس سے کم ہے تو یہ اسے مل جائے گی بشرطیکہ وہ شخص وفات یافتہ حاجی کا شرعی وارث نہ ہو ،اور اگر ایک تہائی ترکہ سے زیادہ ہے تو جتنی رقم زیادہ ہے اس کے حق دار وارث ہوں گے ۔بہتر یہ ہے کہ وزارتِ حج اس امر کی وضاحت کردے کہ اس نامزد کردہ شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ یہ رقم وہ اصل وارثوں تک پہنچادے تاکہ کوئی نزاع پیدا نہ ہو۔

مقروض پر لازم ہے کہ قرض خواہ کے وارثوں کو قرض ادا کرے

سوال: 141

زید بکر کے پاس نوکری کرتا ہے۔ زید بکر سے کچھ رقم ادھار لیتا تھا اور کہتا تھا کہ میری تنخواہ سے کاٹ لینا، مگر بکر تنخواہ میں سے کچھ رقم نہیں لیتا تھا، زید رقم دیتا تھا مگر بکر کہتا تھا کہ رہنے دو، اس طرح کئی مرتبہ ہوا اب بکر کا انتقال ہو گیا ہے۔ کیا زید نے جو رقم ادھار لی تھی، وہ رقم بکر کے ورثاء کو دینے کا پابند ہے یا نہیں جبکہ زید نے بکر کی زندگی میں کئی مرتبہ رقم دینے کی کوشش کی تھی، مگر بکر نے نہیں لی اور اب بھی زید ساری رقم بکر کے وارثوں کو دینے کو تیار ہے۔

محمد قمر علی، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی

جواب: 142

آپ نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے، اُس سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ بکر نے زید کا قرض معاف کر دیا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُسے مہلت دے رہے تھے، شریعت کے احکام کا اطلاق ظاہر پر ہوتا ہے، ہم کسی کی نیت کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا زید کو چاہئے کہ اُس کے ذمے بکر کا جو بھی قرض تھا، وہ اُس کے وارثوں کو ادا کر دے۔ مقروض کو مہلت دینا ایک پسندیدہ امر ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۔

ترجمہ: ''اور اگر (مقروض) تنگ دست ہے تو اسے اس کی فراخ دستی تک مہلت دو، (البقرۃ:280)''۔

احادیثِ مبارکہ میں اپنے مقروض کو مہلت دینے والے قرض خواہ کے لئے بہت بڑا اجر بیان کیا گیا ہے، اِس سلسلے میں چند احادیثِ مبارکہ پیشِ خدمت ہیں:

(1) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : مَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس

شخص نے تنگ دست (مقروض) پر آسانی کی، اللہ تعالیٰ اُس پر دنیا اور آخرت میں آسانی فرمائے گا، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2417)"۔

(2) عَنْ بُرَيْدَةَ الْأَسْلَمِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا كَانَ لَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ، وَمَنْ أَنْظَرَهُ بَعْدَ حِلِّهِ كَانَ لَهُ مِثْلُهُ، فِي كُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ۔

ترجمہ: "حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے تنگ دست (مقروض) کو قرض کی ادائیگی میں مہلت دی، تو اُس کو ہر دن اُس قرض کی رقم کے برابر صدقہ کرنے کا اجر ملے گا، اور جس نے قرض کی ادائیگی کا وقت پورا ہونے کے بعد مقروض کو مہلت دی تو اُس قرض خواہ کو ہر روز قرض کی کل رقم کے برابر صدقہ کرنے کا اجر ملے گا"۔

(سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2418، مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث: 22970)

(3) امام احمد بن حنبل نے اپنی سند کے ساتھ یہی حدیث حضرت سلیمان بن بریدہ سے روایت کی ہے، اُس میں اِن الفاظ کا اضافہ ہے:

فَإِذَا حَلَّ الدَّيْنُ فَأَنْظَرَهُ فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلَيْهِ صَدَقَةٌ ۔

ترجمہ: "جب قرض کی ادائیگی کا مقررہ وقت آجائے اور پھر بھی قرض خواہ مقروض کو مہلت دے تو اُسے ہر دن اُس قرض کی رقم کی دُگنی مقدار کے برابر صدقہ کرنے کا اجر ملے گا، (مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث: 23046)"۔

(4) عَنْ أَبِي الْيَسَرِ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا أَوْ وَضَعَ عَنْهُ، أَظَلَّهُ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ، قَالَ: قَالَ مُعَاوِيَةُ: يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ۔

ترجمہ: "حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے تنگ دست کو مہلت دی یا اُس کو معاف کر دیا، اللہ تعالیٰ اُس کو اپنے سایۂ (رحمت) میں رکھے گا، فرماتے ہیں کہ معاویہ نے کہا کہ: جس دن اللہ کے سایۂ (رحمت) کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا، (مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث: 15521)"۔

مقروض کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:اِنَّ خِیَارَکُمْ اَحْسَنُکُمْ قَضَآءً۔
ترجمہ:''تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرض ادا کرنے میں اچھا ہو''۔
(صحیح بخاری،رقم الحدیث:2305)

ان احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں بکر کے تمام یا بعض ورثا اُس کے ایصالِ ثواب کے لئے زید کا قرض معاف کرنا چاہیں تو انہیں بھی اجر ملے گا اور بکر کو بھی اِس کا ثواب پہنچے گا،لیکن یہ قرض اُن ہی ورثا کے حصے میں سے منہا ہوگا جو رضا کارانہ طور پر معاف کرنا چاہیں۔

تقسیمِ ترکہ

سوال: 143

میرے ماموں عباس میاں کا 6 سال پہلے 2002ء میں انتقال ہوا،وہ غیر شادی شدہ تھے۔اُن کے تین بھائی (ممتاز میاں،الیاس میاں،محمد میاں) اور ایک بہن (میری والدہ ذکیہ خانم) ہیں،محمد میاں اور اُن کی اہلیہ (رحمت جان) کا انتقال 2003ء میں ہوا،اُن کی بھی کوئی اولاد نہیں،بیوی کا صرف ایک بھائی (ضیاء) ہے،باقی کوئی وارث نہیں۔ترکے میں ایک مکان راولپنڈی میں ہے۔اب اُس کی تقسیم کی جارہی ہے،معلوم یہ کرنا ہے کہ تقسیم کس طرح ہوگی؟۔ورثاء میں دو بھائی اور ایک بہن حیات ہیں۔

شاہد احمد انصاری،L-122 بلاک 13/G،گلشن اقبال،کراچی

جواب:

وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں،اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسبِ ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ترکہ 70 حصوں میں تقسیم ہوگا،جس میں متوفّی کے بھائی ممتاز میاں کو 26 حصے،الیاس میاں کو 26 حصے،بہن ذکیہ خانم کو 13 حصے اور محمد میاں کی بیوہ رحمت جان کو 5 حصے ملیں گے،جبکہ محمد میاں کی بیوہ رحمت جان کا کُل ترکہ اُس کے بھائی ضیاء کو ملے گا،بشرطیکہ اس کا کوئی اور وارث نہ ہو،جیسا کہ سائل نے بیان کیا ہے،واللہ اعلم بالصواب

عقدِ ثانی کی صورت میں بیوہ کا حصہ متاثر نہیں ہوتا

سوال: 144

میری شادی کے ڈیڑھ سال بعد میرے شوہر کا انتقال ہوگیا، اُن کی پہلی بیوی (جسے وہ طلاق دے چکے تھے) سے 2 بیٹے اور ایک بیٹی ہے اور مجھ سے بھی ایک بیٹا ہے۔ میرے شوہر کی 11 لاکھ مالیت کی ذاتی دکان تھی، جسے شادی کے بعد فروخت کر کے رقم والد کے کاروبار میں لگادی، سہراب گوٹھ پر ایک کارخانہ تھا، جس کی مالیت اِس وقت تقریباً 20 لاکھ روپے ہے۔ میرے شوہر اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں شراکت دار تھے اور تمام کاروبار میرے سُسر کے نام ہے۔ مکان کا اوپر والا حصہ میرے شوہر نے بنوایا، مگر پورا مکان سسر کے نام ہے۔ اب میرے سُسرال والے کہتے ہیں کہ تمہارا صرف مہر بنتا ہے، تمہارا حصہ تب بنتا جب تمہارے شوہر کی الگ جائیداد ہوتی، جبکہ میرے شوہر اور اُن کے بھائی سُسر کے کاروبار میں شراکت دار تھے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ: میرا اور میرے بیٹے کا میرے شوہر کی جائیداد میں کتنا حصہ ہے؟۔ میرے بیٹے کا خرچہ اُس کے جوان ہونے تک کس کے ذمے ہے؟ مہر اور حصہ طلب کرنے کے بعد میں سُسر کے گھر رہ سکتی ہوں، یا فوراً مکان خالی کرنا ہوگا؟، اگر میں ساری زندگی سسرال میں گزارنا چاہوں تو گزار سکتی ہوں یا نہیں؟، اگر میں دوسرا نکاح کرلوں تو میرا حصہ ختم تو نہیں ہوگا؟۔

بیوہ شرف الدین، فیڈرل بی ایریا، کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل آپ کے شوہر اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں جس قدر حصے کے شریک تھے، وہ حصہ مرحوم کا ترکہ قرار دیا جائے گا اور حسبِ تناسب ورثاء کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔ وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں، اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسب ذیل شرع سے تقسیم ہوگا۔ کل ترکے کے 168 حصے ہوں گے، متوفی کے والد کو 28 حصے، والدہ کو 28 حصے، بیوہ کو 21 حصے، تین بیٹوں کو 78 حصے (فی

کُل 26 حصے)اور ایک بیٹی کو 13 حصے ملیں گے۔
بچوں کے اخراجات اُن کے بالغ ہونے تک ان کے حصوں سے اُس مال سے پورے کئے جائیں گے، جو اُن کے والد نے بطور ترکہ چھوڑا ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:
وَإِنْ كَانَ الْأَبُ قَدْمَاتَ وَتَرَكَ أَمْوَالًا وَّتَرَكَ أَوْلَادًا صِغَارًا كَانَتْ نَفَقَةُ الْأَوْلَادِ مِنْ أَنْصِبَائِهِمْ وَكَذَا كُلُّ مَنْ يَّكُوْنُ وَارِثًا فَنَفَقَتُهُ فِيْ نَصِيْبِهٖ۔
ترجمہ:'' باپ کا انتقال ہوگیا اور اُس نے مال چھوڑا ہے اور نابالغ بچے بھی ورثاء میں چھوڑے ہیں تو بچوں کا نفقہ اُن کے حصوں میں سے دیا جائے گا، یونہی ہر وارث کا نفقہ اُس کے حصہ میں سے دیا جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 564، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔
اگر آپ کے سُسر آپ کا حصہ دینے کے بعد بھی آپ کو اپنے گھر میں اپنے پوتے کی ماں ہونے کی حیثیت سے رہنے کی اجازت دے دیں تو آپ وہاں رہ سکتی ہیں۔ بیوہ عورت کے عقدِ (نکاحِ) ثانی کرنے کی صورت میں سابق شوہر کے ترکے میں حقِ وراثت متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ بدستور قائم رہتا ہے جب تک کہ اُسے ادا نہ کر دیا جائے، اگر خدانخواستہ اپنے مرحوم شوہر کے ترکے سے حصہ پائے بغیر کسی بیوہ کا انتقال ہو جائے تو یہ حقِ وراثت عورت کے ورثاء کو منتقل ہو جائے گا اور وہ اس کے جائز دعویدار ہوں گے۔ دوسرا نکاح کرنے کی صورت میں بھی متوفی شوہر کے ترکے سے آپ کو حصہ ملے گا۔

زندگی میں کسی کو حصہ دے کر وراثت سے دستبردار کرنا

سوال: 145

زید کا انتقال ہوا، ورثاء میں (دو زوجہ سے) چھ بیٹے (الف، ب، ج، د، ہ اور و) اور آٹھ بیٹیاں (ز، ح، ط، ی، ک، ل، م اور ن) ہیں۔ ازواج کا انتقال ہو چکا ہے، زید نے اپنی وراثت میں بتیس لاکھ روپے چھوڑے ہیں۔ زید نے اپنی زندگی میں اپنے ایک بیٹے (الف) کو دیگر تین بیٹوں (ب، ج اور د) کی موجودگی میں ایک دوکان دی تھی اور کہا تھا کہ اس کو اب میری وراثت سے کچھ نہیں ملے گا۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بقیہ وارثوں

نے ترکہ کے مکان کو اپنے نام کروالیا، جس پر ایک لاکھ پینسٹھ ہزار روپے خرچ آئے جو کہ ترکہ کی رقم سے ہی کیے گئے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ:

(۱) کیا واقعی الف کو والد کے ترکے سے کچھ نہیں ملے گا یا اُس کا بھی حصہ ہوگا؟۔

(۲) الف کے علاوہ بقیہ وارثوں نے ترکہ کے مکان کو اپنے نام کرانے میں جو اخراجات کیے، اس کا کیا حکم ہے؟۔

(۳) ورثاء کے درمیان ترکے کی تقسیم کس تناسب سے ہوگی؟، اور یہ بھی ارشاد فرمائیں باقی ورثاء زید کی بات پر عمل کرتے ہوئے الف کو اگر کچھ نہ دینا چاہیں اور تمام ترکہ آپس میں تقسیم کرلیں تو ان پر کیا حکمِ شرعی لاگو ہوگا؟، نیز اس صورت میں زید کا ترکہ الف کے بغیر ہی تقسیم کرلیا گیا تو کوئی بھائی یا بہن یہ سمجھے کہ الف کو بھی حصہ ملنا چاہئے تھا مگر نہیں دیا گیا تو وہ اپنے حصے میں آنے والی زائد رقم کی کتنی مقدار الف کو دیدے تا کہ اس پر کوئی وبالِ شرعی نہ آئے؟، (ڈاکٹر عامر صدیقی، ابوالحسن اصفہانی روڈ، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں جو مسئلہ سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص اپنی زندگی میں کسی ایک ممکنہ وارث کو اپنے مال میں سے کچھ دے کر یک طرفہ طور پر یہ فیصلہ کردیتا ہے کہ اُس شخص کی وفات کے بعد اس وارث کو اس کے ترکے میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، کیونکہ کسی کو علم نہیں کہ کون وارث بنے گا اور کون مُورِث، کس کا انتقال پہلے ہوگا اور کس کا بعد میں۔ وارث بننا اختیاری امر نہیں ہے بلکہ شریعت کے تحت ایک جبری امر ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، اس میں کافی اضطراب ہے، اقوالِ فقہاء دونوں طرف ہیں، جواز کا قول بھی مل جاتا ہے اور عدمِ جواز کا بھی۔ الاشباہ والنظائر میں ایک قول اس کے جواز اور مؤثر ہونے کا ہے، اسے علامہ جلال الدین امجدی نے اپنے فتاویٰ ''فیض الرسول'' میں اختیار کیا ہے اور اسے اعلیحضرت کا بھی مختار قرار دیا ہے، چنانچہ اُن کا جواب مع سوال درجِ ذیل ہے:

مسئلہ:''باپ نے اپنی زندگی میں اپنے ایک بیٹے کو کچھ جائیداد دے کر الگ کر دیا اور بیٹے نے یہ منظور کرلیا کہ باپ کے انتقال پر اب ہم کو اس کے ترکے میں کچھ حق نہ رہے گا، تو اس صورت میں باپ کے فوت ہونے پر اس کی جائیداد میں اس کے بیٹے کا حق ہے یا نہیں؟۔

جواب:''صورتِ مسئولہ میں باپ کے انتقال کے بعد اس کا ترکے میں کچھ حق نہیں، اعلیحضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان تحریر فرماتے ہیں: بزرگ موصوف نے اپنی حیات میں صاحبزادی صاحبہ کو کچھ عطا فرما کر میراث سے علیحدہ کر دیا اور وہ بھی راضی ہوگئیں کہ میں نے اپنا حصہ پالیا اور بعد انتقال مورث کے ترکہ میں میرا حق نہیں، اشباہ میں طبقات علامہ شیخ عبدالقادر سے اس صورت کا جواز نقل کیا اور اسے علامہ ابوالعباس ناطفی پھر جرجانی صاحب خزانہ، پھر شیخ عبدالقادر، پھر فاضل زین الدین صاحب اشباہ، پھر علامہ سید احمد حموی نے مقرر ومسلم رکھا اور فقیہ ابوجعفر محمد بن یمانی نے اس پر فتویٰ دیا اور ایسا ہی فقیہ محدث ابوعمر وطبری اور اصحاب احمد بن ابی الحارث نے روایت کیا، (فتاویٰ رضویہ، جلد یازدہم، ص:95)، (فتاویٰ فیض الرسول، حصہ سوم، ص:492)''۔

علامہ زین الدین بن ابراہیم بن نجیم کی جس عبارت کا حوالہ مفتی جلال الدین امجدی نے دیا ہے، وہ یہ ہے:

قَـالَ الشَّيْخُ عَبْدُالْقَادِرِ فِي الطَّبَقَاتِ فِيْ بَابِ الْهَمْزِ فِيْ أَحْمَدَ :قَالَ الْجُرْجَانِيُّ فِي الْخزانَةِ قَالَ الْعَبَّاسُ النَّاطِفِيُّ :رَأَيْتُ بِخَطِّ بَعْضِ مَشَايِخِنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ ـفِيْ رَجُلٍ جَـعَـلَ لِأَحَـدِ بَـنِيْـهِ دَارًا بِـنَصِيْبِهِ عَلَى أَنْ لَّايَكُوْنَ لَهُ بَعْدَ مَوْتِ الْأَبِ مِيْرَاثٌ،جَازَ وَأُفْتَـى بِـهِ الْـفَـقِيْهُ أَبُوْ جَعْفَرٍ مُحَمَّدُ بْنُ الْيَمَانِيُّ أَحَدُ أَصْحَابِ مُحَمَّدِ بْنِ شُجَاعٍ الْبَلْخِيِّ ،وَحَكَىٰ ذَالِكَ أَصْحَابُ أَحْمَدَ بْنِ أَبِي الْحَارِثِ وَأَبُوْ عَمْرٍ وَالطَّبَرِيُّ ـ

ترجمہ:''شیخ عبدالقادر نے طبقات کے باب الھمز فی احمد میں فرمایا، جرجانی نے خزانہ میں کہا کہ ابوالعباس ناطفی نے فرمایا: میں نے اپنے بعض مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ کی وہ تحریر دیکھی جو اس شخص کے بارے میں جس نے اپنے بیٹوں میں سے ایک کو اُس کے حصے کا مکان اس

شرط پر دیا کہ باپ کی موت کے بعد اس کے لئے ترکے سے حصہ نہیں ہوگا، تو یہ جائز ہے،
اسی پر فقیہ ابوجعفر محمد بن الیمانی نے فتویٰ دیا جو کہ محمد بن شجاع بلخی کے تلامذہ میں سے ہیں۔
احمد بن ابوحارث اور ابوعمر وطبری کے شاگردوں نے اس کو نقل کیا ہے''۔
(الاشباہ والنظائر، ص: 294، قدیمی کتب خانہ، کراچی)
لیکن امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے طویل بحث سے قبل اپنا مختار موقف بیان کیا ہے، وہ یہ ہے:

وارث سے اس کے حصہ میراث کے بابت جو صلح حیاتِ مورث (وراثت چھوڑ کر وفات پانے والے شخص کی زندگی) میں کی جائے تحقیق یہ ہے کہ باطل و بے اثر ہے اس سے وارث کا حقِ ارث اصلاً زائل نہیں ہوتا، ہاں! اگر بعد موتِ مُورِث اس صلح پر رضامند رہے تو اب صحیح ہو جائے گی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 26، ص: 232، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

پس اس صورت حال میں اگر مُورِث کا بیٹا ''الف'' اس پر رضامند ہے کہ اسے باپ نے جو دیا تھا، وہ اس پر قانع ہے، وہ موجودہ ممکنہ حصۂ ترکہ سے کم ہو یا زیادہ، اور تمام ورثاء بھی اس پر متفق ہوں تو اسے چھوڑ کر باقی ورثاء میں ترکہ تقسیم کر دیا جائے ورنہ اس کے حصے کو مجموعی ترکہ میں شامل کر کے تقسیم کی جائے۔ پہلی صورت میں جبکہ ''الف'' اور دوسرے ورثاء اس پر راضی اور متفق ہیں کہ جو حصہ باپ نے اپنی زندگی میں ''الف'' کو دیا تھا وہ اسی کے پاس رہے اور بقیہ ترکے میں وہ اپنے حصے کے مطالبے سے دستبردار ہو جائے، تو ترکے کی تقسیم حسبِ ذیل ہوگی:

کل ترکہ 18 حصوں میں منقسم ہوگا، ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ'' (ایک لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت 5 بیٹوں کو 10 حصے (فی کس 2 حصے) اور 8 بیٹیوں کو 8 حصے (ہر ایک کو ایک حصہ) ملیں گے۔

دوسری صورت میں جبکہ ''الف'' اور دیگر ورثاء پہلی صورت پر مطمئن اور متفق نہ ہوں تو ''الف'' کو جو کچھ دیا جا چکا ہے، اسے مجموعی ترکے میں شامل کر لیا جائے گا اور ''الف'' بھی دیگر

ورثاء کے ساتھ تقسیمِ ترکہ میں شامل ہوکر اپنا حصہ پائے گا، تو ترکے کی تقسیم حسبِ ذیل ہوگی:
کل ترکہ 20 حصوں میں منقسم ہوگا، "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" (ایک لڑکے کے لئے دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء:11) کے تحت 6 بیٹوں کو 12 حصے (فی کس دو، دو حصے) اور 8 بیٹیوں کو 8 حصے (فی کس ایک، ایک حصہ) ملیں گے۔
مکان نام کروانے میں جو اخراجات ہوئے چونکہ وہ تقسیم سے قبل ترکے ہی کی رقم سے کئے گئے لہٰذا جب ترکہ تقسیم ہوگا تو از خود ہی وہ اخراجات تمام ورثاء کے حصص سے منہا ہوجائیں گے۔

ترکہ کسے ملے گا؟

سوال: 146

ایک شخص کا انتقال ہوا، ورثاء میں ایک بیوہ، متوفی کی ایک خالہ، ایک پھوپھی، ایک چچازاد بھائی، چار ماں شریک بھائی اور دو ماں شریک بہنیں موجود ہیں۔
ترکہ کی تقسیم کس طرح ہوگی اور مذکورہ ورثاء میں سے کون کون حق دار ہوگا؟۔
(پروفیسر رضی الدین، A-3 گلبرگ بلاک 16، کراچی)

جواب:

وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں، اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسبِ ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ متوفی کا ترکہ 36 حصوں میں منقسم ہوگا، کُل ترکے کا چوتھائی یعنی 9 حصے بیوہ کو ملیں گے۔ اخیافی (ماں شریک) بھائی بہن ثلث کے حق دار ہیں، سراجی میں ہے: اَمَّـا لِأَوْلَادِ الْأُمِّ فَأَحْوَالٌ ثَلٰثٌ: اَلسُّدُسُ لِلْوَاحِدِ وَالثُّلُثُ لِلْاِثْنَيْنِ فَصَاعِدًا ذُكُوْرُهُمْ وَاِنَاثُهُمْ فِي الْقِسْمَةِ وَالْاِسْتِحْقَاقِ سَوَاءٌ۔
ترجمہ: "اخیافی (ماں شریک) بھائی بہن کی تین حالتیں ہیں، ایک اخیافی بہن یا اخیافی بھائی کو ترکہ کا چھٹا حصہ ملتا ہے، دو یا دو سے زائد اخیافی بھائی بہن کو ترکہ کا تہائی حصہ ملتا ہے۔ اخیافی بھائی بہن تقسیم فرائض میں اور فرائض کا حق دار ہونے میں برابر ہیں (یعنی دونوں کو

مساوی حصہ ملے گا)،(سراجی،ص:13)''۔اس اصول کے تحت 4اخیافی بھائی اور 2اخیافی بہنوں کو مساوی طور پر 12 حصے (ہر ایک کو 2 حصے) ملیں گے،بقیہ 15 حصے بطور عصبہ چچازاد بھائی کو ملیں گے۔خالہ اور پھوپھی محروم رہیں گی۔

تقسیمِ ترکہ

سوال: 147

میرا مکان جس میں، میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہوں، میرے سسر (بکر) نے بنوایا تھا اور اُن ہی کے نام تھا۔اُن کا انتقال 1972ء میں ہوا ورثاء میں اُن کی بیوہ (ہند)،ایک بیٹی (زینب) اور ایک بیٹا (زید میرے شوہر) چھوڑے۔1999ء میں بیٹی (زینب) کا اور پانچویں روز بیوہ (ہند) کا بھی انتقال ہوگیا،اب صرف میرے شوہر (زید) موجود ہیں۔اس مکان میں تعمیراتی مد میں میں نے اور میرے شوہر نے ضرورت کے تحت وقتاً فوقتاً ڈیڑھ لاکھ روپے کے لگ بھگ لگایا۔اب صورتِ حال یہ ہے کہ میری مرحومہ نند (زینب) کے بچے اس مکان میں حصہ مانگ رہے ہیں،میری نند کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔تینوں شادی شدہ اور اپنے ذاتی مکان کے مالک ہیں۔مکان اب تک میرے سسر مرحوم (بکر) کے نام ہے۔ازروئے شریعت اس میں میری نند (زینب) کے بچوں کا حصہ ہے،اگر ہے تو کتنا اور کیسے تقسیم کیا جانا چاہیے؟،(عذرا سلطانہ،فیڈرل بی ایریا،کراچی)۔

جواب:

وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں،اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا:متوفی (بکر) کا ترکہ مجموعی طور پر 576 حصوں میں تقسیم ہوگا،زید کو 436 حصے ملیں گے جبکہ زینب کے ایک بیٹے عمرو کو 70 حصے اور دو بیٹیوں کو 70 حصے (فی کس 35 حصے) ملیں گے۔

چونکہ متوفیہ(بیٹی زینب) کے انتقال کے وقت اُس کی والدہ (ہند) حیات تھیں،لہٰذا متوفیہ(زینب) کے ترکے سے چھٹا حصہ والدہ(ہند) کو ملے گا۔چونکہ پانچ روز بعد

والدہ (ہند) کا بھی انتقال ہو گیا ہے، تو اُن کا حصہ اُن کے بیٹے (زید) کو ملے گا۔
آپ نے اور آپ کے شوہر نے جو ایک لاکھ روپے مکان پر وقتاً فوقتاً صرف کیے، تو اس مکان میں تقریباً 75 فیصد کے خود آپ کے شوہر مالک ہیں، لہٰذا اس رقم کا 75 فیصد حصہ تو آپ نے اپنی مملوکہ مکان پر صرف، اگر اتنا عرصہ آپ اس مکان میں اکیلے رہے ہیں، تو آپ نے دوسروں کا حصہ بھی استعمال کیا اور اس عرصے میں اُن کو ان کا حصہ بھی نہیں دیا، تو بقیہ 25 فیصد رقم کو ان کے کرائے کے عوض بھی آپ سمجھ لیں۔

پینشن ترکہ نہیں

سوال: 148

میرے شوہر کا انتقال 20 جولائی 2009ء کو ہوا، میں اپنے شوہر کی دوسری بیوی ہوں، پہلی بیوی نے خلع لے لیا تھا اور اُس سے ان کے تین بچے، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں، جو پہلی بیوی ساتھ لے گئی تھی اور بچوں کا باپ سے کوئی تعلق نہیں تھا، مجھ سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ میرے شوہر کی گورنمنٹ جاب تھی اور ایک پلاٹ، ایک فلیٹ اور کچھ فنڈ چھوڑا ہے، پینشن بھی ملتی ہے۔ میرے شوہر نے انتقال سے پہلے میری اور اپنی جانب سے حج کے لئے درخواست دی تھی اور حج قرعہ اندازی میں دونوں کا نام بھی آ گیا تھا، لیکن ان کے انتقال کے سبب ہم حج پر نہیں جا سکے، دونوں کی جانب سے جمع شدہ حج کی رقم واپس مل گئی ہے لیکن میری نند نے تمام رقم اپنے پاس رکھ لی ہے اور مجھے نہیں دے رہی۔ اس تمام صورتِ حال میں تقسیم کس طرح ہوگی؟۔ بیوہ محسن اختر، کراچی

جواب:

اگر آپ کی بیان کردہ صورتِ حال درست ہے، تو متوفّٰی کے ترکہ سے آپ کو آٹھواں حصہ ملے گا اور بقیہ ترکہ متوفّٰی کے (سابقہ بیوی سے موجود) ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کے درمیان تقسیم ہوگا، اُن کا اپنے والد سے لاتعلق رہنا وارث بننے سے مانع نہیں ہے، والد کے ترکے سے وہ اپنا حصہ پائیں گے، ہاں! سابقہ (خلع یافتہ) بیوی کو ترکے سے کچھ نہیں

ملے گا۔ متوفی کا ترکہ 32 حصوں میں تقسیم ہوگا اور بیوہ کو 4 حصے (آٹھواں حصہ) اور بقیہ ترکہ سے "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ" (ترجمہ: ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت ایک بیٹے کو 14 حصے اور دونوں بیٹیوں کو 14 حصے (ہر ایک کو 7 حصے) ملیں گے۔

حج کے لئے جمع شدہ رقم بھی ترکے میں شامل ہوگی، البتہ اگر مرحوم اپنا فرض حج ادا کرنے والے تھے، تو تمام ورثاء باہمی رضامندی سے اس رقم سے ان کا حجِ بدل ادا کرادیں، تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے فرض کو ساقط فرمادے اور سب کو اجر سے بھی نوازے۔ پنشن چونکہ حکومت کی طرف سے تبرُّع اور فضل واحسان ہے اور حکومت اپنے قانون کے مطابق بیوہ کو دیتی ہے، لہٰذا اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔

بیوی کو کوئی شے ہبہ کرنے کے بعد رجوع کا حق حاصل نہیں

سوال: 149

ایک شخص نے اپنی تمام پراپرٹی اپنی بیوی اور بچوں کے نام کردی اور اسے کاغذی طور پر رجسٹرڈ بھی کروادیا اور بیوی کو بچوں کا سربراہ بنادیا۔ پراپرٹی رجسٹر کرانے میں اُس کی بیوی کی بھی نصف رقم صرف ہوئی۔ شوہر کا کہنا یہ ہے کہ میں نے یہ جائیداد گفٹ کی تھی اس لئے میں اسے واپس لے سکتا ہوں جبکہ باقاعدہ کاغذی طور پر رجسٹر بھی کرواچکا ہے۔ کیا اس صورت میں شوہر اپنی جائیداد واپس لے سکتا ہے؟، (معرفت: مولانا خالد محمود)۔

جواب:

مذکورہ صورت میں اگر شوہر کے گفٹ (ہبہ) کیے جانے کے بعد اُس پراپرٹی پر بیوی اور بچوں کا قبضہ بھی پایا گیا تو یہ ہبہ (گفٹ) مکمل ہوگیا، اب اس کی واپسی کا شرعاً شوہر کو حق حاصل نہیں ہے۔ زوجیت رجوع سے مانع ہے یعنی ہبہ کرتے وقت اگر عورت اُس ہبہ کرنے والے کے نکاح میں تھی، تو واہب (ہبہ کرنے والا) ہبہ سے رجوع نہیں کرسکتا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی ہبہ سے رجوع کرنے کی ممانعت کے باب میں لکھتے ہیں: اَلزَّوْجِيَّةُ وَقْتَ الْهِبَةِ ،فَلَوْ وَهَبَ لِامْرَأَةٍ ثُمَّ نَكَحَهَا رَجَعَ وَلَوْ وَهَبَ لِامْرَأَتِهِ لَا۔

ترجمہ:''ہبہ کے وقت زوجیت (یعنی نکاح میں ہونا رجوع سے) مانع ہے،لہٰذا اگر کسی عورت کو ہبہ کرکے بعد میں اس سے نکاح کیا،تو ہبہ میں رجوع کرسکتا ہے،اور اگر اپنی بیوی کو ہبہ کیا تو رجوع نہیں کرسکتا،(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 8،ص:443)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:''فی الواقع بعد نکاح جو کچھ تملیکاً دیا،اُس سے رجوع نہیں کرسکتا اور قبل نکاح جو کچھ دیا اُسے بیوی کی مرضی کے بغیر واپس لینا گناہ ہے اور خود چھین لینے کا ہرگز اختیار نہیں،بلکہ عورت نہ دے تو نالش کرکے قاضی کے حکم سے لے سکتا ہے اور گنہگار اس میں بھی ہوگا کہ صحیح حدیث میں فرمایا:

اَلْعَائِدُ فِيْ هِبَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهٖ لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ۔

ترجمہ:''ھبہ کرکے اُس سے رجوع کرنے والا اُس کتے کی مانند ہے،جو قے کرکے اُسے چاٹ لیتا ہے،بری مثال ہمارے لئے اختیار کرنا اچھا نہیں ہے''۔

درمختار میں دربارۂ موانع رجوع ہے:اَلزَّوْجِيَّةُ وَقْتَ الْهِبَةِ،فَلَوْ وَهَبَ لِامْرَأَةٍ ثُمَّ نَكَحَهَا رَجَعَ وَلَوْ وَهَبَ لِامْرَأَتِهٖ لَا.

ترجمہ:''ہبہ کے وقت منکوحہ بیوی ہونا،لہٰذا اگر کسی عورت کو ہبہ کیا،پھر بعد میں اس سے نکاح کیا تو ایسے ہبہ میں رجوع کرسکے گا،اور اگر اپنی (منکوحہ) بیوی کو ہبہ کیا،تو رجوع نہ کرسکے گا''۔اسی میں ہے:لَا يَصِحُّ الرُّجُوْعُ اِلَّا بِتَرَاضِيْهِمَا اَوْ بِحُكْمِ الْحَاكِمِ۔

ترجمہ:''باہمی رضامندی سے یا حاکم کے حکم سے ہی رجوع صحیح ہوگا۔

(فتاویٰ رضویہ،جلد 19،ص:388،رضافاؤنڈیشن،لاہور)

ہبہ (گفٹ) کرکے اس سے رجوع کرنے کو حدیث پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے،رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:اَلْعَائِدُ فِيْ هِبَتِهٖ كَالْعَائِدِ فِيْ قَيْئِهٖ۔

ترجمہ:"ہبہ کر کے اس سے رجوع کرنے والا اُس شخص کی طرح ہے جو قے کر کے دوبارہ اسے چاٹ لے"، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4171)۔

مَثَلُ الَّذِیْ یَرْجِعُ فِیْ صَدَقَتِهٖ كَمَثَلِ الْكَلْبِ یَقِیْئُ ثُمَّ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِهٖ فَیَأْكُلُهٗ۔

ترجمہ:"جو شخص صدقہ کر کے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اُس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4167)"۔

لیکن اگر قبضہ نہیں دیا تھا تو ہبہ مکمل نہ ہوا اور شوہر بدستور اپنی جائیداد کا مالک ہے، ہاں! رجسٹر کرانے میں بیوی کی جو رقم صرف ہوئی، وہ اُسے واپس کرنا ہوگی۔

قرابت داروں کو ہبہ کر کے رجوع نہیں کیا جاسکتا

سوال: 150

ایک شخص کا انتقال ہوا، اس کا ترکہ ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوگیا اور محکمۂ مال کی جانب سے قبضہ دے دیا گیا۔ جب ہر وارث اپنے متعین حصے کا قابض و مالک ہوگیا، تو بیٹیوں نے اپنا حصہ والدہ کو تملیک کر دیا، قانوناً وشرعاً قبضہ بھی دے دیا۔ والدہ نے وہ تملیک شدہ حصہ بیٹے کو تملیک کر کے شرعاً وقانوناً قبضہ دے دیا۔ کچھ عرصے بعد تنازعہ کے سبب بیٹیوں نے بھائی سے حصے کی واپسی کا مطالبہ کیا، ماں نے یہ کہہ کر جھگڑا ختم کیا کہ تم نے مجھے تملیک کیا تھا، مجھ سے مطالبہ کرو، اُس سے آج کے بعد مطالبہ نہیں کروگی۔ والدہ کو تملیک کرتے وقت بہنوں نے بھائی سے قسم لی تھی کہ جو حصہ ہم والدہ کو دیں اور والدہ تم کو تملیک کردے تو مستقبل میں ہمارے مطالبے پر واپس کروگے، بھائی نے بہنوں کے کہنے پر قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم دے دی، قسم کے بعد بہنوں نے کہا کہ ہم نے یہ قسم محض آپ کا ذہن دیکھنے کے لئے لی تھی نہ کہ حقیقتاً ہم اپنا حصہ واپس لینا چاہتے ہیں۔ صورتِ مسئولہ میں کیا تملیک مکمل ہوئی، واپس ہوسکتی ہے اور بھائی واپس کرنے کا پابند ہے یا نہیں؟۔ جو قسم لی گئی اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، (محمد نوید انجم، ضلع وہاڑی، پنجاب)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بیٹیوں نے اپنا حصہ اپنی والدہ کو ہبہ کیا اور پھر قبضہ بھی دے دیا، جس کے بعد ہبہ مکمل ہو گیا اور بیٹیوں کو اُس سے رجوع کرنے کا اختیار حاصل نہ رہا۔ سات مواقع ایسے ہیں جہاں ہبہ کر کے رجوع نہیں کیا جا سکتا، جن میں سے ایک قرابت ہے یعنی قرابت مانع رجوع ہے اور قرابت سے مراد ذی رحم محرم ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: وَلَا يَرْجِعُ فِي الْهِبَةِ مِنَ الْمَحَارِمِ بِالْقَرَابَةِ كَالْآبَاءِ وَالْأُمَّهَاتِ وَإِنْ عَلَوْا، وَالْأَوْلَادِ وَإِنْ سَفَلُوْا، وَأَوْلَادِ الْبَنِيْنَ وَالْبَنَاتِ فِي ذَالِكَ سَوَاءٌ وَكَذَالِكَ الْإِخْوَةُ وَالْأَخَوَاتُ وَالْأَعْمَامُ وَالْعَمَّاتُ۔

ترجمہ: ''اور قرابت کے سبب محارم سے ھبہ میں رجوع جائز نہیں ہے۔ جیسے باپ، دادا، ماں، دادی اگر چہ کئی پشت اوپر کے ہوں، اور اولاد (یعنی بیٹا اور بیٹی) اگر چہ کئی پشت نیچے تک ہوں اور بیٹوں اور بیٹیوں کی اولاد (یعنی پوتا، پوتی، نواسا ا. رنواسی سب اس میں برابر ہیں اور اِسی طرح بھائی، بہن چچا اور پھوپھیاں (کہ یہ سب ذی رحم محرم ہیں)''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص: 387، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

ہبہ (گفٹ) کر کے اس سے رجوع کرنے کو حدیثِ پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْعَائِدُ فِيْ هِبَتِهٖ كَالْعَائِدِ فِيْ قَيْئِهٖ۔

ترجمہ: ''ہبہ کر کے اس سے رجوع کرنے والا اُس شخص کی طرح ہے جو قے کر کے دوبارہ اسے چاٹ لے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4171)۔

مَثَلُ الَّذِيْ يَرْجِعُ فِيْ صَدَقَتِهٖ كَمَثَلِ الْكَلْبِ يَقِيْئُ ثُمَّ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهٖ فَيَأْكُلُهٗ۔

ترجمہ: ''جو شخص صدقہ کر کے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اُس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھا لیتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4167)''۔

مذکورہ صورت میں چونکہ بیٹیوں نے والدہ کو ہبہ کیا اگر براہِ راست بھائی کو بھی ہبہ کیا ہوتا تو

اُس سے رجوع ممکن نہیں۔لیکن بہنوں نے بھائی کو جو قسم دی تھی وہ منعقد ہوگئی اور اُس پر لازم ہے کہ اپنی قسم پوری کرے اور والدہ سے ملنے والا بہنوں کا حصہ بہنوں کو واپس (ہبہ) کردے، یہ جدید ھبہ ہوگا، اِس سے بھائی قسم سے بری ہو جائے گا اور اگر قسم پوری نہ کی تو قسم توڑنے کے سبب کفارہ لازم ہوگا، جو قرآن مجید کی سورۃ المائدہ کی آیت:89 میں بیان کیا گیا ہے، یعنی اپنے اوسط معیار کے مطابق دس مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس فراہم کرنا، اور جو یہ نہ کر سکے تو وہ تین دن کے روزے رکھے۔

والدہ کے ورثاء میں کون شامل ہیں؟

سوال:151

میرے والد صاحب کا انتقال 2004ء میں ہوا، ورثاء میں بیوہ اور چار بیٹیاں موجود تھیں، بیٹا کوئی نہیں۔میرے والد صاحب کے ایک ہی بھائی تھے، جن کا انتقال 2002ء میں ہوگیا تھا اور اُن کی اولاد میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔میرے دادا دادی کے انتقال کو عرصہ دراز ہو چکا ہے۔ہم نے چند علماء اور وکلاء کی مدد سے والد صاحب کا ترکہ تقسیم کردیا اور والدہ کو آٹھواں حصہ دے کر بقیہ چاروں بہنوں کے درمیان مساوی تقسیم کرلیا، بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ اس ترکے میں تایا کی اولاد کو بھی حصہ ملے گا، تو ہم تمام بہنیں کسی بھی حقدار کا حق غصب کرنا نہیں چاہتیں، لہٰذا ازسرِ نو ترکے کی تقسیم جاننا چاہتی ہیں۔مزید یہ کہ ہماری والدہ کا انتقال ایک سال قبل 2009ء میں ہوا، ہم چار بیٹیوں کے علاوہ والدہ کی دو بہنیں تھیں، بھائی کوئی نہیں۔ایک بہن کا انتقال 2004ء میں ہوگیا ہے، مرحومہ خالہ کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔معلوم یہ کرنا ہے کہ:

(1) والد صاحب مرحوم کے ورثاء کون کون ہوں گے اور ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟۔

(2) والدہ کی جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی؟۔

(3) میری والدہ کی جائیداد میں میری خالہ جو حیات ہیں، اُن کا اور مرحومہ خالہ کی اولاد کا بھی اُس ترکے میں حصہ ہوگا؟۔

(4) میری ایک خالہ جو حیات ہیں، اُن کی ایک بیٹی نے ایک عیسائی سے شادی کرلی ہے، جس سے اُس کی اولاد بھی ہے اور خالہ خالو نے اپنی اُس بیٹی سے تعلق قائم رکھا ہوا ہے، کیا اس بنا پر میری والدہ کے ترکے میں اُن کا حصہ ختم تو نہیں ہو جاتا؟۔

مسز قدسیہ مبشر خان، اسلام آباد

جواب:

وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں، اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ آپ کے متوفی والد کا ترکہ 48 حصوں میں منقسم ہوگا، اُن میں سے متوفی کی بیوہ (یعنی آپ کی والدہ) کو 6 حصے، چار بیٹیوں کو 32 حصے (ہر ایک کو 8 حصے) اور دونوں بھتیجوں کو 10 حصے (فی کس 5 حصے) ملیں گے اور تینوں بھتیجیاں محروم رہیں گی۔

آپ کی والدہ مرحومہ کا ترکہ 6 حصوں میں منقسم ہوگا، چاروں بیٹیوں کو 4 حصے (فی کس ایک، ایک حصہ) اور ایک بہن کو 2 حصے ملیں گے، اُن کی دوسری فوت شدہ بہن کے بیٹے اور بیٹی (یعنی مرحومہ کے بھانجے اور بھانجیاں) محروم رہیں گے۔

آپ کی خالہ کی بیٹی نے عیسائی شخص سے نکاح کرکے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے، اگر وہ علیحدگی اختیار کرلے تو درست ورنہ اُن کا سماجی مقاطعہ (Socail Boycott) کیا جائے، لیکن بیٹی کے ناجائز کام کرنے کے سبب ماں کے حصۂ وراثت پر اثر نہیں پڑے گا۔

تقسیم کا ایک پیچیدہ مسئلہ

سوال: 152

ہم صرف دو بہن بھائی (سیدہ نیر جہاں اور سید ارشد علی کاظمی) ہیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد ہمارے والد سید شوکت علی کاظمی نے ولایت آباد کا مکان جنوری 1992ء مبلغ دو لاکھ بیس ہزار روپے میں فروخت کردیا، نارتھ کراچی میں تین لاکھ اسی ہزار روپے میں دوسرا مکان خریدا، جس میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے میں نے لگائے۔ مکان فروخت

کرنے والے نے مختار نامہ عام (General Power of Attorney) والد صاحب کے نام لکھ دیا کہ وہ ضروری قانونی کاروائی کے بعد مکان اپنے نام منتقل کروالیں۔ جولائی 2003ء میں والد صاحب کا انتقال ہوگیا اور وہ مکان اپنے نام منتقل نہ کرواسکے، ان کے انتقال کے بعد مختار نامے کی قانونی حیثیت ختم ہوگئی، میں نے اصل مالک مکان سے رجوع کیا اور مکان میرے نام منتقل ہوگیا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد میں نے ایک لاکھ بانوے ہزار چار سو پچاس روپے قرض لیا اور کچھ رقم اپنے پاس سے ملا کر دو لاکھ پچاس ہزار روپے مکان کی اوپری منزل پر لگایا، جو ابھی تک نامکمل اور ناقابلِ رہائش ہے۔ غرض مکان میں اب تک جو رقم لگی ہے اس میں 35% رقم والد صاحب مرحوم کی اور 65% رقم میری جو میں نے مختلف ذرائع سے حاصل کر کے لگائی۔ میری ہمیشہ یہ نیت رہی کہ جیسے ہی میں اس قابل ہوا، اپنی بہن کا شرعی حصہ ضرور ادا کروں گا۔ اب میری ہمشیرہ اپنا حصہ مانگ رہی ہیں اور ان کا اصرار ہے کہ مکان کی موجودہ قیمت (تقریباً بائیس لاکھ روپے) کی بنیاد پر ہونا چاہئے اور اُن کا کہنا ہے کہ میں آپ سے مکان کا کرایہ بھی وصول کرسکتی ہوں۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ ترکے کی تقسیم کس بنیاد پر ہوگی؟ سید ارشد علی کاظمی، نارتھ کراچی

جواب:

مذکورہ صورت مسئلہ میں تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔ (۱) آپ نے مذکورہ رقم بطور تبرُّع اور فضل واحسان کے دی ہو، (۲) بطور قرض دی ہو، (۳) شراکت داری کے تحت دی ہو۔

تینوں صورتوں میں احکام جدا جدا ہوں گے، اول الذکر (یعنی وہ رقم اپنے والد کو بطور تبرُّع دینے کی) صورت میں شرعاً آپ اُس رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتے اور مذکورہ مکان آپ کے والد کا ترکہ شمار ہوگا اور تقسیم کامل مکان کی موجودہ قیمت پر جاری ہوگا (۲) اگر آپ نے وہ رقم بطور قرض دی تھی اور یہ طے کرلیا تھا کہ بعد میں اپنی رقم وصول کرلیں گے، تو آپ کو صرف وہی رقم یعنی ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے لینے کا حق حاصل ہے، اُس سے زائد

نہیں لے سکتے ،اگراس رقم پر بڑھا کر وصول کریں گے ،تو یہ سود ہوگا ،رسول اللہ ﷺ کا
فرمان ہے: كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبٰو۔
ترجمہ:'' ہر وہ قرض جو(اصل رقم پر زائد) کسی منفعت کا باعث ہو ،تو ایسی منفعت سود ہے،(کنزالعمال ،رقم الحدیث:15516)''۔یہی حکم مکان کے تعمیری مصارف میں صرف ہونے والی رقم کا ہے۔
(۳)اگر آپ نے وہ رقم بطور شراکت مکان میں لگائی تھی ،تو آپ اپنی لگائی ہوئی رقم کے تناسب سے رقم منہا کرلیں گےاور بقیہ 35% پر موجودہ قیمت کے حساب سے تقسیم کا عمل جاری ہوگا۔
بعد فراغت امور متقدمہ علی الارث بقیہ ترکہ تین حصوں میں تقسیم ہوگا،'' لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ'' (ایک لڑکے کے لئے دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے،النساء:11)کے تحت ایک بیٹے کو 2 حصے اور ایک بیٹی کو ایک حصہ ملے گا۔

جائیداد کے مختلف حصوں میں ترکے کا تعین

سوال: 153

میری بیٹی کا شوہر شوکت علی خان کا فروری 2010ء میں انتقال ہوگیا ہے،ورثاء میں ایک بیوہ ،والدہ ،ایک بھائی اور ایک بہن حیات ہیں ، اولاد کوئی نہیں ۔ (U.D.C+ کیمرہ مین پاکستان ملٹری اکیڈمی میں) سرکاری ملازم تھا ،اپنی زندگی میں واجبات کے حصول کے لئے اپنی زوجہ سمیرا کو نامزد کیا تھا ،جس میں پینشن ،فیملی پینشن ، GP فنڈ ،ڈیتھ پیکیج ،ہاؤس رینٹ اور گروپ انشورنس وغیرہ شامل ہیں۔ان تمام واجبات پر کس کا حق ہے؟۔
اس کے علاوہ شوکت کا مکان ،ایک دوکان (جو اس نے سرکاری ملازم ہونے کے سبب اپنی چھوٹے بھائی کے نام کی تھی)شوکت علی کے پیسے سے بنی تھی ،اُس دوکان کا کیا حکم ہے؟۔
نوے ہزار روپے کی ایک کمیٹی شوکت نے اپنی زندگی میں ڈالی تھی ،انتقال کے ایک ہفتہ بعد

اس کی والدہ نے وصول کرلی، اس کمیٹی کی تقریباً 12 اقساط باقی ہیں۔ شادی کے موقع پر دلہن کو سونے کے زیورات دیئے گئے تھے، ہار سیٹ، دو انگوٹھیاں، چار چوڑیاں۔ انتقال سے 8 ماہ قبل چار چوڑیاں واپس لے کر فروخت کردیں اور حاصل شدہ رقم سے فوٹو گرافر کی دوکان بنائی، مزید پچاس ہزار روپے بینک سے قرض لے کر دوکان پر خرچ کئے۔ زیورات پر کس کا حق ہوگا؟۔ مہر کی رقم ایک لاکھ روپے (عندالطلب) رکھی گئی تھی، اُس کی ادائیگی کا حکم کیا ہے؟ لڑکی کو ہم نے تقریباً دولاکھ روپے مالیت کا جو جہیز دیا تھا، اُس کا مالک کون ہوگا؟۔ اس کے علاوہ مرحوم دولاکھ روپے کا مقروض ہے، جس کے متعلق کوئی معقول ثبوت نہیں کہ شادی سے پہلے شوکت علی کے والد نے لیا اور زیورات پر خرچ ہوا، یا دوکان (جو چھوٹے بھائی کے پاس ہے) کے لئے شوکت علی نے قرض لیا۔

عبدالرشید، عابد آباد، کراچی

جواب:

وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں، اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ متوفی شوکت علی کا ترکہ 36 حصوں میں منقسم ہوگا، بیوہ (سمیرا) کو 9 حصے، والدہ کو 6 حصے، ایک بھائی کو 14 حصے اور بہن کو 7 حصے ملیں گے۔

پنشن حکومت کی طرف سے تبرّع (گفٹ) ہے، یہ ترکہ نہیں ہے اور حکومت اپنے قوانین کے مطابق وفات یافتہ سرکاری ملازم کی بیوہ کو دیتی ہے، لہٰذا اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔ ملازم کی تنخواہ سے جی پی فنڈ کی مد میں ماہانہ رقم کاٹی جاتی ہے اور اُتنی رقم ہی ماہانہ اپنی طرف سے اس فنڈ میں جمع کرتی ہے، اسے متوفی کے ترکے میں شمار کیا جائے گا۔ دوکان اگر متوفی شوکت علی نے اپنے بھائی کو ہبہ (گفٹ) کردی تھی، تو اب یہ ترکہ شمار نہیں ہوگی اور اگر مرحوم نے اپنی ملکیت میں رکھتے ہوئے بھائی کو صرف تصرُّف کا حق دیا تھا تو اب یہ متوفی کا ترکہ شمار ہوگی اور تمام ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگی۔ کمیٹی کی جتنی رقم متوفی نے ادا کی تھی وہ اُس کا ترکہ شمار ہوگی اور ورثاء کے درمیان تقسیم کی جائے گی اور جتنی اقساط باقی ہیں، وہ اُس

کے ذمے ہیں جس نے اُس رقم کو لیا، اگر تمام ورثاء کے درمیان پورے نوے ہزار تقسیم کیے گئے تو بقیہ بارہ اقساط اُن سب کے ذمے ہوں گی، اپنے حصے کے بقدر ادا کریں گے۔ زیورات اگر بیوی کی مِلک کردیے تھے، تو اُس کی مالک بیوی ہے اور اُسے ترکے میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ مہر کی ادائیگی شوہر پر لازم ہے اور تقسیم سے پہلے اُس کے ترکے سے ادا کیا جائے گا۔ اسی طرح بینک سے لیا گیا پچاس ہزار قرض بھی شوکت علی کے ترکے سے ادا کیا جائے گا۔ جہیز کے سامان کی مالک آپ کی بیٹی یعنی مرحوم کی بیوہ ہے۔ مذکورہ دولاکھ روپے اگر متوفی شوکت علی نے قرض لئے تھے، تو یہ رقم شوکت علی کے ترکے سے ہی ادا کی جائے گی۔

ہبہ محض زبانی کہہ دینے سے مکمل نہیں ہوتا

سوال: 154

ہمارے والد کا انتقال 1996ء میں اور والدہ کا انتقال 2008ء میں ہوا، ورثاء میں 3 بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ والدہ نے انتقال سے چند دن پہلے اپنے بیٹے سے زیورات کے لئے کہا کہ ان کو بچیوں (پوتیوں، نواسیوں) میں تقسیم کردو، بھائی نے کہا کہ بچوں کی ماؤں کو دیدیں، بچیوں کو خود بخود پہنچ جائے گا۔ والدہ خاموش ہوگئیں یہ گفتگو سب وارثوں کے درمیان نہیں ہوئی، زبانی ہوئی اور والدہ کے انتقال کے بعد سامنے آئی۔ اس گفتگو کی شرعی حیثیت کیا ہے اور ان زیورات کی تقسیم کس طرح ممکن ہوگی؟۔

خلیل احمد، بلاک 16 الیف۔ بی ایریا، کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں آپ کے بقول آپ کی والدہ نے زیورات اپنی پوتیوں اور نواسیوں کو دینے کی خواہش کا اظہار کیا، جس پر آپ کے بھائی نے اُنہیں اپنی رائے دی، اُس رائے کے بعد آپ کی والدہ نے نہ رضامندی ظاہر کی اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی وصیت کی، اِس صورت میں زیورات اُن کا ترکہ شمار ہوں گے اور تمام ورثاء کے درمیان "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ" (ایک لڑکے کے لئے دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11)

کے تحت تقسیم ہوگا۔اگر آپ اپنی والدہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان کے وکیل کے طور پر ان زیورات کو بچیوں میں تقسیم کردیتے اور سونا ان کے قبضے اور مِلک میں چلا جاتا،تو ہبہ مکمل ہوجاتا اور وہ سب اپنے اپنے حصے کے مطابق اس کے مالک بن جاتے اور یہ مال آپ کی والدہ کی مِلک سے نکل جاتا اور ترکہ نہ رہتا۔

بیوی کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا

سوال:155

میری شادی 2003ء میں ہوئی اور 2005ء کے زلزلے میں میری بیوی انتقال کرگئی ،اُس کا زیور جو بوقت حادثہ میری بیوی کے والدین کے گھر تھا ،اب وہ زیور میرے حوالے نہیں کررہے بلکہ مختلف بہانے کررہے ہیں مثلاً : میری ساس کا خیال ہے کہ زیور پر میری مرحوم بیوی کی بہنوں کا حق ہے،یعنی میری سالیوں کا۔دوسرا جواز یہ بتاتی ہیں کہ یہ زیور میں کسی دوسری عورت کے گلے میں برداشت نہیں کرسکوں گی کیونکہ آپ نے ابھی شادی کرنا ہے۔تیسرا جواز یہ کہ یہ زیور مجھے بہت پیارا اور عزیز ہے،میری بیٹی کی نشانی ہے،اس کو میں کسی کے حوالے نہیں کرسکتی۔چوتھا جواز یہ کہ یہ مرحومہ کی یادگار ہے،اس کو کوئی غیر اس عزت اور حرمت اور شان سے زیب تن نہیں کرے گا،جس طرح مرحومہ کی بہنیں اس کی تکریم کریں گی۔یہ زیور میری ساس کے پاس بطور امانت تھا۔شریعت کے مطابق میرا اپنے زیور کے لئے تقاضا کرنا اور اس میں میری حدود و قیود کا شرعاً تعین کردیں کہ میں واپس لینے کا اختیار رکھتا ہوں اور کتنا ؟۔نیز یہ کہ میری غیر موجودگی میں میری مرضی اور منشا کے خلاف میرا کوئی بھائی یا رشتہ دار میری کسی چیز کو کسی کے حوالے کرنے کا اختیار رکھتا ہے؟۔

حافظ محمد جاوید،اسلام آباد

جواب:

صورتِ مسئولہ میں سب سے پہلے آپ اس بات کا تعین کریں کہ وہ زیور کس کی ملکیت تھا؟،اگر آپ کا تھا اور آپ نے بطور عاریت استعمال کرنے کے لئے اپنی بیوی کو دیا

تھا، تو زیور آپ کی ملکیت ہے اور کسی دوسرے شخص کو آپ کی اجازت کے بغیر مالکانہ تصرُّف کا حق اور اختیار حاصل نہیں ہے یا آپ نے اپنی بیوی کو زیور کا مالک بنادیا تھا، اگر آپ نے اپنی بیوی کو مالک بنادیا تھا یا یہ زیور اس کو جہیز میں ملا تھا تو اب وہ زیور مرحومہ کا ترکہ شمار ہوگا اور حسبِ تناسب اُس کے ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگا۔ اگر مرحومہ کی اولاد ہے، تو آپ کو اپنی بیوی کے ترکے سے چوتھائی حصہ اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں کل ترکے کا نصف حصہ ملے گا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ترجمہ: ''اور تمہارے لئے آدھا مال ہے اس کا جو چھوڑ جائیں تمہاری بیویاں اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو، (سورۃ النسا: 12)''۔

اولاد ہونے کی صورت میں شوہر کو بیوی کے ترکے سے چوتھائی حصہ ملے گا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ، ترجمہ: ''اور اگر ان کی اولاد ہو تو تمہارے لئے ان کے ترکے کا چوتھائی حصہ ہے، (سورۃ النسا: 12)''۔

بقیہ ترکے میں سے اس وقت جو شرعی وارث موجود ہوں گے، اسلامی احکامِ وراثت کے مطابق اپنا حصہ پانے کے حق دار ہوں گے۔ آپ کی ساس صاحبہ صرف زیور کی امین تھیں اور اُن پر لازم ہے کہ اپنی بیٹی کی رکھوائی ہوئی امانت میں کسی بھی حیلے بہانے سے خیانت نہ کریں اور شرعی احکام کے مطابق اُس زیور کو وارثین تک پہنچادیں۔

ذوی الارحام کس صورت میں وارث بنتے ہیں

سوال: 156

ہمارے والد صاحب کا انتقال 1977ء میں اور والدہ کا اُن سے پہلے ہوگیا تھا۔ ہم چار سگی بہنیں اس وقت موجود ہیں، چار میں ایک شادی شدہ بہن ہے، جس کی شادی بھائی نے کی ہے اور ایک بہن (غیر شادی شدہ) کا 1985ء میں انتقال ہوگیا۔ والدہ صاحبہ کا اُن کے پہلے شوہر سے ایک بیٹا ہے۔ ایک مکان جس میں آدھا حصہ ہمارے والد صاحب اور آدھا حصہ سوتیلے بھائی کا تھا، سوتیلے بھائی سے ہم تینوں بہنوں نے مکان کا آدھا حصہ

خریدلیا، جس بہن کا انتقال 1985ء میں ہوا، اس مکان میں اُس کے بیس ہزار روپے شامل ہیں۔ اب اس مکان کا شرعی طور پر جس میں ہم تینوں (غیر شادی شدہ) بہنوں نے رقم ادا کر کے بھائی کا حصہ ادا کر دیا ہے اور باقی والد کے مکان کے حصے کی رقم ہے۔ شرعی طور پر ہم چار بہنوں کے حصے کے بارے میں بتادیجئے؟ شادی شدہ بہن کی تین اولاد (دو بیٹے اور ایک بیٹی) ہیں۔

نجم النساء، R-527، سیکٹر 7-D/3 نارتھ کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیان سائلہ اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو بعد از فراغت امورِ متقدمہ علی الارث بقیہ ترکہ ورثاء کے درمیان حسبِ تناسب تقسیم ہوگا۔ مکان کا آدھا حصہ چونکہ تینوں بہنوں نے خریدا تھا، لہٰذا مکان کے اس آدھے حصے کی مالک وہ تینوں بہنیں ہیں جنہوں نے اسے خریدا۔ آپ نے لکھا ہے کہ اس مکان میں بیس ہزار روپے مرحومہ بہن کے شامل ہیں، لہٰذا وہ بیس ہزار روپے مرحومہ کا ترکہ شمار ہوگا اور چاروں بہنوں کے درمیان تقسیم ہوگا۔ بقیہ آدھا مکان آپ کے والد کا ترکہ ہے، دو سے زائد بیٹیاں ہوں تو ذوی الفروض ہونے کی حیثیت سے دو تہائی ملے گا اور چونکہ بیٹیوں پر رَد کیا جا سکتا ہے، جو چاروں بہنوں کے درمیان مساوی (برابر) تقسیم ہوگا۔ شادی شدہ بہن کی اولاد ذوی الارحام کہلاتے ہیں اور ذوی الارحام اُسی وقت وارث ہوں گے جب اصحابِ فرائض میں سے وہ لوگ موجود نہ ہوں، جن پر مال دوبارہ رَد کیا جا سکتا ہو اور عصبہ بھی نہ ہو، لہٰذا شادی شدہ بہن کی اولاد محروم رہے گی۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَاِنَّما یرث ذوو الأرحام اذا لم یکن أحدٌ مَن أصحابِ الفَرائِضِ مِمَّنْ یُرَدُّ علیه ولم یکن عصبةٌ،

ترجمہ: ’’ذوی الارحام اُسی وقت وارث ہوں گے جب اصحابِ فرائض میں سے وہ لوگ موجود نہ ہوں، جن پر مال دوبارہ رَد کیا جا سکتا ہو اور عصبہ بھی نہ ہو‘‘۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 459)

ملازمت کے سرکاری قوانین اور ترکے کا تعین

سوال: 157

زید پاکستان آرمی میں بحیثیت فوجی ملازم تھا، اچانک موت واقع ہوگئی، زید شادی شدہ تھا، لیکن اولاد کوئی نہیں، ورثاء میں ایک بیوہ، والدہ، چار بھائی اور دو بہنیں حیات ہیں۔ پاکستان آرمی کا قانون ہے کہ متوفی شخص کے جو بھی مالی حقوق ہوتے ہیں، بیوہ اُس کی وارث ہوتی ہے۔ کیا کسی فرد یا ادارے کو یہ حق حاصل ہے کہ ایک وارث کے علاوہ باقی ورثاء کو محروم کردے؟۔ مزید یہ بھی وضاحت فرمادیں کہ ہر وارث کو کتنا حصہ ملے گا؟۔

عبدالرزاق عباسی، کراچی

جواب:

ہماری رائے میں ادارے کی جانب سے ملنے والے واجبات حکومت کی طرف سے مرحوم کی بیوہ کے لئے تبرُّع اور فضل واحسان (Donatoin or Gift) ہیں، یہ مرحوم کا ترکہ نہیں کہ اسے شرعی ورثاء میں اصولِ شرع کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ مثلاً پنشن حکومت کی طرف سے تبرُّع (گفٹ) ہے، یہ ترکہ نہیں ہے اور حکومت اپنے قوانین کے مطابق وفات یافتہ سرکاری ملازم کی بیوہ کو دیتی ہے، لہٰذا اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔ حکومت یا محکمے کی طرف سے جو مالیاتی رعایت حکومت کی طرف سے تبرُّع (Donation) ہیں، اُن میں ان کے قوانین جاری ہوں گے۔ اگر آپ کی ان قوانین (Service Rules) میں تبدیلی کی خواہش ہے تو اس کا فورم وفاقی شرعی عدالت ہے۔

البتہ اگر زید کا جی پی فنڈ حکومت کے پاس تھا، جو اس کی زندگی میں اس کی تنخواہ سے رضا کارانہ یا لازمی طور پر وضع کیا جاتا تھا، تو یہ اُس کا ترکہ شمار ہوگا اور والدہ سمیت تمام ورثاء کے درمیان شریعت کے قانون کے مطابق تقسیم ہوگا۔ اسی طرح مرحوم کی اپنی جمع کی ہوئی رقم اور دوسرا ترکہ بھی، اگر کچھ ہے، تو تمام ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں متوفی کا ترکہ 120 حصوں میں تقسیم ہوگا، بیوہ کو 30 حصے، والدہ

کو 20 حصے، چاروں بھائیوں کو 56 حصے (فی کس 14 حصے) اور دونوں بہنوں کو 14 حصے (فی کس 7 حصے) ملیں گے۔

بیٹے کے گھر میں باپ کی رہائش کا حق

سوال: 158

میری عمر 70 سال ہے۔ کمزور، ناتواں اور بے روزگار ہوں۔ اپنے بیٹے کے پاس رہنے کا ارادہ کیا تو بیٹے نے کہا: ''میرے گھر میں آپ کا رہنا غیر شرعی ہے''۔ کیا والدین کا اپنے بیٹے کے پاس رہنا غیر شرعی ہے؟، (ابوکامل، کراچی)۔

جواب:

باپ کو اپنے گھر میں رہنے سے روکنا اور اپنے گھر میں اس کے قیام کو غیر شرعی قرار دینا، بیٹے کی بدنصیبی اور شرعاً مکروہ تحریمی ہے، اس پر وہ گناہ گار ہے۔ اس کے لئے سکراتِ موت کی شدت اور آخرت میں عذاب کا خوف ہے، اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نصیب فرمائے۔

رسول اللہ ﷺ نے اولاد پر ماں باپ کی اطاعت کو لازم قرار دیا ہے اور ماں باپ کی ناراضگی کو اللہ کی ناراضگی کا سبب قرار دیا ہے۔ رسول پاک نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ''رب کی رضا باپ کی رضا میں ہے، اور رب کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے''۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ أَنَّ رَجُلاً قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ! اِنَّ لِيْ مَالاً وَّوَلَداً، وَاِنَّ أَبِيْ يُرِيْدُأَنْ يَّجْتَاحَ مَالِيْ، فَقَالَ: أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيْكَ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ ! میرے پاس کچھ مال ہے اور میں صاحب اولاد بھی ہوں اور میرے والد چاہتے ہیں کہ وہ میرا مال لے لیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اور تمہارا مال (دونوں) تمہارے والد کے ہیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ مزید ارشاد فرمایا: اِنَّ أَوْلَادَكُمْ مِنْ أَطْيَبِ كَسْبِكُمْ فَكُلُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۔

ترجمہ:" بے شک تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ کمائی ہے، پس اپنی اولاد کی کمائی سے کھاؤ (اُسے اپنے لئے جس طرح چاہو، استعمال کرو)۔(سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2291، 2292)"۔

سُنن ابوداؤد میں ہے: أَنْتَ وَمَالُكَ لِوَالِدِكَ ، اِنَّ أَوْلَادَكُمْ مِنْ أَطْيَبِ كَسْبِكُمْ ۔فَكُلُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۔

صاحبِ عون المعبود لکھتے ہیں:

اَنْتَ وَمَالُكَ لِوَالِدِكَ عَلٰى مَعْنٰى أَنَّهُ اِذَا احْتَاجَ اِلٰى مَالِكَ أَخَذَ مِنْكَ قَدْرَ الْحَاجَةِ كَمَا يَأْخُذُ مِنْ مَالِ نَفْسِهِ ۔

ترجمہ:"اس کا مطلب یہ ہے کہ جب باپ تمہارے مال کا محتاج ہو تو وہ تم سے بقدرِ ضرورت لے جیسے اپنے مال سے لیتا ہے۔(عون المعبود، جلد 3، ص: 312)"۔

صاحب بذل المجہود نے اس کی شرح میں لکھا ہے:

وَقَيَّدَهُ الْفُقَهَاءُ بِالْحَاجَةِ، أَيْ اِذَا احْتَاجَ اِلَيْهِ وأَمَّا اِذَا لَمْ يَحْتَجَّ فَلَا يَجُوْزُ لَهُ الْأَكْلُ اِلَّا بِاِذْنِهِ۔

ترجمہ:" (بعض) فقہاء نے حاجت کی قید لگائی ہے یعنی (بیٹے کے مال میں بلا اجازت) باپ کو تصرُّف کی اجازت صرف اس صورت میں ہے جب وہ اس کا محتاج ہو، اگر باپ محتاج نہیں تو بیٹے کی اجازت کے بغیر اس کا لینا جائز نہیں ہے۔(بذل المجہود، جلد خامس، ص: 295)"۔

عَنْ عَائِشَةَ ، قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ أَطْيَبَ مَا أَكَلْتُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ ، وَاِنَّ أَوْلَادَكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ ۔

ترجمہ:" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے پاکیزہ مال جو تم کھاتے ہو، وہ تمہاری اپنی کمائی ہے اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے۔(سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2290، سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 1358)"۔

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی لکھتے ہیں:

وَالْعَمَلُ عَلَى هٰذَا عِنْدَ بَعْضِ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ وَغَيْرِهِمْ، قَالُوْا: إِنَّ يَدَ الْوَالِدِ مَبْسُوْطَةٌ فِيْ مَالِ وَلَدِهِ يَأْخُذُ مَاشَاءَ ـ وَقَالَ بَعْضُهُمْ: لَا يَأْخُذُ مِنْ مَالِهِ إِلَّا عِنْدَ الْحَاجَةِ إِلَيْهِ۔

ترجمہ: ''نبی کریم ﷺ کے اصحاب اور بعض اہلِ علم کا اُس پر عمل رہا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ باپ کو اپنی اولاد کے مال میں کھلا اختیار حاصل ہے، جس قدر چاہے وہ اُس میں سے لے سکتا ہے اور بعض نے کہا کہ یہ اختیارِ تصرُّف ضرورت کی حد تک ہے''۔

(سُنن ترمذی، المجلد الثانی، ص: 347، مطبوعہ: دار الکتب علمیہ، بیروت)

اگر آپ کے بیٹے کی بیوی بد اخلاق اور نافرمان ہے اور اپنے گھر میں آپ کے قیام میں رکاوٹ ہے تو آپ کے بیٹے پر لازم ہے کہ آپ کے لئے متبادل انتظام کرے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ آپ کا کوئی اور بیٹا یا بیٹی آپ کی خدمت اور کفالت کے لئے موجود نہ ہو۔

أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيْكَ کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ بیٹا اپنے مال کا بالکل مالک نہیں رہتا۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''ثالثاً: ایسا ہو تو خود قبضۂ شوہر بھی منتفی ہو جائے گا اور کلام اپنے مقصود پر نقص کرتا پلٹ آئے گا کہ قبضۂ شوہر بواسطہ قبضۂ زن مانا تھا بقیاس مساوات کہ قَابِضُ القابض قابض جب سرے سے قبضۂ زن منفی ہو جائیگا، قبضۂ شوہر کہ اس واسطے سے تھا کہاں سے آئے گا، هٰذا الّا جهل مبين (کیا یہ واضح جہالت نہیں ہے؟۔ت) تو خود یہی روایات کہ ڈگری داروں نے پیش کیں اُن کا صریح رد ہیں''۔

رابعاً: ''کلام علماء باب حدیث ''أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيْكَ'' سے ہے، جیسے بیٹے کے لئے ارشاد ہوا کہ وہ اُس کا مال سب اس کے باپ کا ہے، کوئی عاقل اس سے یہ وہم نہیں کر سکتا کہ بیٹے کی ملک کی نفی فرمائی ہے، ایسا ہو تو باپ بیٹے کا وارث نہ ہو سکے، اور آیہ کریمہ لِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ

مِنۡهُمَا السُّدُسُ (اورمیت کے ماں باپ میں سے ہرایک کواُس کے ترکہ سے چھٹا حصہ ملے گا۔ت) کا معاذ اللہ صاف انکار لازم آئے کہ اِرث ترکۂ مُورِث میں جاری ہوگی اور ترکہ مُثبتِ مِلک جب، منفی، تو اِرث کہاں؟''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد:18، ص:284، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری قُدِّس سرُّہٗ العزیز کی اِس عبارت کا ماحصل یہی ہے کہ ''اَنۡتَ وَمَالُكَ لِأَبِيْكَ'' کا ہرگز یہ معنیٰ نہیں ہے کہ بیٹا مع اپنے مال کے باپ کا مملوک ہوا اور اُس کا کچھ نہ رہا، تو پھر یقیناً اس حدیث کا معنیٰ یہی ہے کہ باپ اپنی ضرورت کی حد تک بیٹے کی ملکیت میں اُس کی اجازت کے بغیر بھی تصرُّف کرسکتا ہے۔ اگر حدیث کو ظاہری معنیٰ پر محمول کیا جائے تو بیٹا اپنے مال کا مالک نہ رہے اور اگر قضاءِ الٰہی سے باپ کی حیات میں بیٹے کا انتقال ہوجائے تو اُس ترکے میں والدین کے حصے کا کیا معنیٰ رہے گا، جب باپ ویسے ہی بیٹے کے تمام مال کا مالک ہے۔

حلال وحرام کے مسائل

برقی مچھر مارآلے کا استعمال

سوال: 159

کیا برقی مچھر مارآلہ (Electric Mosquito Killer) استعمال کرنا جائز ہے؟۔روزنامہ اُمّت بروزاتوار 30 مئی 2010ء کی اشاعت میں دارالعلوم دیوبند کے مفتی صاحب سے یہ سوال کیا گیا تو اُنہوں نے جواب میں لکھا کہ:''خدا کی مخلوق کوتعذیب بِالنّار دینا یعنی اُنہیں آگ میں جلادینا ہمارے لئے جائز نہیں ہے،مچھروں کو مارنے اور بھگانے کے دوسرے بہت سے طریقے ہیں،اُنہیں استعمال کرنا چاہئے ،اگر کوئی دوسری صورت نہ ہوتو پھر گنجائش ہے۔(واللہ اعلم) (یاسر رحمٰن،نکیال آزادکشمیر)

جواب:

مذکورہ مفتی صاحب کا جواب اوراستدلال درست نہیں ہے،کیونکہ برقی مچھر مار آلے (Electric Mosquito Killer) کا استعمال روایتی آگ میں جلانے کا عمل نہیں ہے، اِس لئے اس کے استعمال پر''تعذیب بالنّار (آگ کے عذاب)'' کا اطلاق درست نہیں ہے۔

ذیل میں وہ احادیث مبارکہ درج کی جاتی ہیں،جن میں تعذیب بالنّار (آگ کا عذاب دیئے جانے) کی ممانعت ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِیْ بَعْثٍ فَقَالَ: اِنْ وَجَدْتُمْ فُلَانًا وَّفُلَانًا فَأَحْرِقُوْهُمَا بِالنَّارِ،ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حِیْنَ أَرَدْنَا الْخُرُوْجَ: اِنِّیْ أَمَرْتُکُمْ أَنْ تُحْرِقُوْا فُلَانًا وَّفُلَانًا ،وَاِنَّ النَّارَ لَا یُعَذِّبُ بِهَا اِلَّا اللّٰهُ، فَاِنْ وَجَدْتُمُوْهُمَا فَاقْتُلُوْهُمَا۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک مقام پر روانہ فرمایا اور فرمایا کہ فلاں فلاں کو پاؤ تو اُن دونوں کو (آگ میں) جلادینا،پس جب ہم نے نکلنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے پھر فرمایا: میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ فلاں

فلاں کو جلا دینا لیکن آگ کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ ہی عذاب دیتا ہے، پس تم اُن دونوں کو پاؤ تو قتل کر دینا''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 3016، سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 1571)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نَـزَلَ نَبِـيٌّ مِنَ الْاَنْبِيَـآءِ تَحْتَ شَـجَرَةٍ فَـلَـدَغَـتْـهُ نَـمْـلَـةٌ فَـأَمَرَ بِجَهَازِهِ فَأُخْرِجَ مِنْ تَحْتِهَا وَأَمَرَ بِهَا فَأُحْرِقَتْ فِي النَّارِ، قَالَ: فَأَوْحَى اللّٰهُ اِلَيْهِ فَهَلَّا نَمْلَةً وَّاحِدَةً۔

ترجمہ: ''انبیاء (سابقین) میں سے ایک نبی، ایک درخت کے نیچے ٹھہرے، اُنہیں ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، اُنہوں نے درخت کے نیچے سے چیونٹیوں کے چھتے کو نکالنے کا حکم دیا، پھر ان کے حکم سے اس کو آگ میں جلا دیا گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی کی کہ آپ نے ایک چیونٹی کے مارنے پر اکتفا کیوں نہ کی، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 5845)''۔

موذی جانوروں کو شریعت میں مارنے کی اجازت ہے۔ ماہرینِ طب نے بعض خاص قسم کے Virus اور Bacteria دریافت کئے ہیں، جو اگر انسان کو لاحق ہو جائیں، تو بعض اوقات انسان کی موت کا سبب بھی بن جاتے ہیں، جیسے ڈینگی وائرس وغیرہ۔ اور مقاصدِ شریعت میں سے ایک سدِّ ذرائع ہے، اسی طرح ترجیحات کے اعتبار سے دفعِ مَضَرّت (یعنی ممکنہ نقصان کا ازالہ) جلبِ مَنفَعَت (یعنی فائدے کے حصول) پر مُقدّم ہے۔ بعض اوقات کمرے میں اگر چند مچھر بھی آ جائیں تو ساری رات کی نیند کو غارت کر دیتے ہیں۔ پس انسان کو اپنے آرام کے حصول کے لئے حفاظتی اقدامات اختیار کرنا شرعاً جائز ہیں۔ مچھروں سے بچاؤ کے لئے دھوئیں والا گلوب، پیپر میٹ اور الیکٹرک میٹ استعمال کئے جاتے رہے ہیں، لیکن ان ذرائع سے بھی مچھروں کے ضَرر سے یقینی تحفظ نہیں مل پاتا۔ آج کل برقی مچھر مار آلہ (Electric Mosquito Killer) استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ باقاعدہ روایتی آگ جلا کر مچھروں کو مارنے کا آلہ نہیں ہے اور نہ ہی مچھروں کو پکڑ کر آگ میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے فقط اتنا عمل ہوتا ہے کہ جو مچھر

اِس سے آ کر ٹکرا جائیں، وہ الیکٹرک شاک سے مر جاتا ہے۔ میرے نزدیک اس کا استعمال جائز ہے۔ اس کی مثل یہ فقہی جزئیہ ہے:

اَلْفَیْلَقُ الَّذِیْ یُقَالُ لَهٗ بِالْفَارِسِیَّةِ (پِیْلَه) یُلْقٰی فِی الشَّمْسِ لِیَمُوْتَ الدِّیْدَانُ وَلَا یَکُوْنُ بِهٖ بَأْسًا لِاَنَّ فِیْ ذَالِكَ مَنْفَعَةَ النَّاسِ، اَلَا یُرٰی اَنَّ السَّمَکَةَ تُلْقٰی فِی الشَّمْسِ فَتَمُوْتُ وَلَا یُکْرَهُ کَذَا فِیْ خِزَانَةِ الْمُفْتِیْنَ

ترجمہ: ''فیلق'' جسے فارسی میں ''پیلہ'' کہتے ہیں، اُسے دھوپ میں ڈالا جاتا ہے تاکہ (دھوپ کی تمازت سے) کیڑے مر جائیں، اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس میں انسانوں کا فائدہ ہے، ذرا سوچیں کہ مچھلی کو دھوپ میں ڈالا جاتا ہے تاکہ وہ مر جائے اور یہ مکروہ نہیں ہے، ''خزانۃ المفتین'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 361، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

اسی طرح دیہات میں لوگ کھٹملوں کو مارنے کے لئے چارپائیاں سخت دھوپ میں ڈال دیتے ہیں یا چارپائی کی چولھوں پر کھولتا ہوا پانی ڈالتے ہیں، اِن سب صورتوں میں جاندار کو براہِ راست آگ میں نہیں جلایا جاتا، لیکن حرارت وتمازت سے موت واقع ہوجاتی ہے۔ یہی صورت برقی مچھر مار آلے (Electric Mosquito Killer) کی ہے، لہٰذا اُس پر آگ کے عذاب کا اطلاق درست نہیں ہے اور یہ بلا کراہت جائز ہے، اور موذی جانوروں کا اُن کے ضَرر سے بچنے کے لئے جلانا زیادہ سے زیادہ مکروہ ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَاِحْرَاقُ الْقَمْلِ وَالْعَقْرَبِ بِالنَّارِ مَکْرُوْهٌ۔ ترجمہ: ''جوؤں اور بچھوؤں کا آگ میں جلانا مکروہ ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 361)''۔

قانون کو ہاتھ میں لینا

سوال: 160

میرے تایا نے 30 سال پہلے اڑھائی ایکڑ زمین بہت کم قیمت پر چالیس ہزار روپے

میں فروخت کردی اور بعد میں اُس پر مقدمہ کردیا، جس کی وجہ سے دشمنی بڑھ گئی، تایا کے بیٹے فریقِ مخالف کو دھمکی دیتے تھے کہ زمین ہمیں واپس کردو۔ فریقِ مخالف نے وہ زمین کسی اور شخص کو فروخت کردی، اب یہی دشمنی اِن کے درمیان بڑھ گئی۔ اُس آدمی نے پولیس کو بھاری رقم دے کر میرے دو تایازاد بھائیوں کو قتل کروادیا، میرے تایازاد بھائی گھر میں آرام کررہے تھے کہ پولیس نے آکر فائرنگ شروع کردی اور گھر کی چھت کو آگ لگادی اور دونوں کزن کو قتل کردیا۔ تایا نے اُس آدمی اور پولیس پر کیس کردیا، اُس آدمی نے ایک غنڈے کے ذریعے تایا اور اُن کے بیٹے کو اٹھالیا اور یہ مطالبہ رکھا کہ اپنی زمین اور چار لاکھ روپے لے کر کیس ختم کردو، ورنہ تمہیں بھی قتل کردیں گے، تایا نے کیس ختم کردیا لیکن میں (مقتول کا چچازاد بھائی) اُس قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ یہ بدلہ لینے میں ہم شرعاً گنہگار تو نہیں ہوں گے؟۔ (محمد اسلم عطاری، ضلع نارووال، تحصیل شکرگڑھ)۔

جواب:

اس مسئلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کو قصاص کے مطالبے کا حق حاصل نہیں، بلکہ شرعاً قصاص لینے یا قاتل کو معاف کرنے کا حق مقتول کے قریبی اولیاء کو حاصل ہے۔ اولیاء کے اقرب اور ابعد ہونے میں یہاں بھی وہی ترتیب معتبر ہے، جو وراثت میں معتبر ہے یعنی سب سے مقدم بیٹا، پھر پوتا، پھر پڑپوتا اگرچہ کئی پشت کا فاصلہ ہو، یہ نہ ہوں تو پھر باپ، دادا وغیرہم اگرچہ کئی پشت اوپر کا ہو، پھر حقیقی بھائی۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: فَأَقْرَبُ الْعَصَبَاتِ الِابْنُ، ثُمَّ ابْنُ الِابْنِ، وَإِنْ سَفَلَ، ثُمَّ الْأَبُ، ثُمَّ الْجَدُّ أَبُ الْأَبِ، وَإِنْ عَلَا، ثُمَّ الْأَخُ لِأَبٍ وَأُمٍّ، ثُمَّ الْأَخُ لِأَبٍ، ثُمَّ ابْنُ الْأَخِ لِأَبٍ وَأُمٍّ۔

ترجمہ: ''عصبات میں قریب ترین (ورثاء کی ترتیب یہ ہے) سب سے مقدم بیٹا، پھر پوتا، اگرچہ کئی پشت کا فاصلہ ہو، (یہ نہ ہوں تو) پھر باپ، دادا وغیرہم اگرچہ کئی پشت اوپر کا ہو، پھر حقیقی بھائی، پھر باپ شریک بھائی، پھر حقیقی بھائی کا بیٹا''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 451، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

مذکورہ صورت میں یہ حق اگر مقتول کا بیٹا ہو تو اُسے حاصل ہے ورنہ مقتول کے والد اور اُن کے بعد مقتول کے بھائی کو حاصل ہے، لیکن قصاص لینے کے لئے وہ از خود کوئی انتقامی کاروائی نہیں کر سکتے بلکہ اُن کی جانب سے حکومت قصاص لے گی، حکومت کی طرف سے قائم کی گئی مُجاز عدالتوں کا کام ہے کہ وہ اعترافِ جرم کی صورت میں یا گواہوں کے ذریعے جرم ثابت ہونے کی صورت میں ملکی قانون کی رُو سے قصاص لیں، انفرادی طور پر کسی شخص، برادری یا قبیلے کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ بدلے کے طور پر سزائیں دیتا پھرے۔

علامہ غلام رسول سعیدی علامہ عبدالقادر عودہ مصری کے حوالے سے لکھتے ہیں :

''اس زمانے میں بربناء ضرورت طریقہ قدیمہ کے مطابق قصاص لینے کا کام ولی کے سپرد نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ولی کی طرف سے قصاص لے اور مقتول کے اولیاء اور ورثاء کو یہ چاہئے کہ اگر وہ قصاص لینا چاہتے ہیں تو حکومت کو قصاص لینے کی اجازت دیں اور اگر وہ مقتول کا خون معاف کرنا چاہتے ہیں تو حکومت کو قصاص لینے سے منع کردیں، (شرح صحیح مسلم، جلد 4، ص:686)''۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر آپ عہدِ جاہلیت کی رسم کے مطابق از خود انتقام لیں گے، تو یقیناً گنہگار ہوں گے اور قانون کی نظر میں مجرم ہوں گے، لہٰذا اس طرح کا کوئی بھی اقدام نہ کریں، قانون کو ہاتھ میں لینا اور خود ہی مدعی و منصف بن جانا شرعاً و قانوناً درست نہیں ہے۔

موٹر سائیکل سوار کا اپنی غلطی سے موت سے دوچار ہونا

سوال: 161

میں ایک ڈرائیور ہوں اور کوسٹر چلاتا ہوں۔ میں ایئر پورٹ سے ایک پارٹی کو بکنگ پر لے گیا اور واپسی پر جب میں ٹریفک سگنل پر پہنچا تو میری سائیڈ کا سگنل کھلا ہوا تھا اور ہم ایئر پورٹ سے شارع فیصل جا رہے تھے، اچانک ٹرمینل 3 کی طرف سے ماڈل کالونی کی طرف جانے کے لئے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل سگنل توڑتے ہوئے ہماری طرف

آئی ،موٹر سائیکل پر دونو جوان سوار تھے ،ہماری گاڑی (کوسٹر) کو بیچ میں دیکھ کر گھبرا گئے اور جولڑکا پیچھے بیٹھا تھا ،اُس نے موٹر سائیکل چلانے والے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر جمپ لگائی ،جس کی وجہ سے موٹر سائیکل کا توازن بگڑ گیا اور موٹر سائیکل سِلپ ہوکر کوسٹر کے پچھلے وہیل سے ٹکرائی ،میں نے گاڑی روک دی۔موٹر سائیکل چلانے والے کے سر پر چوٹ لگنے کے سبب موت واقع ہوگئی تھی ۔جولڑکا موٹر سائیکل سے جمپ کرکے اتر گیا تھا اُس نے فون کر کے مزید لڑکوں کو بلالیا اور مجھے اتنا مارا کہ میرے کان کا پردہ پھاڑ دیا ،کچھ دیر میں پولیس آئی اور تھانے لے گئی ۔اس تمام صورتِ حال میں ،میں قصوروار ہوں یا نہیں اور آیا مجھ پر قصاص یا جرمانہ واجب ہے ،اگر ہے تو کیا ہے؟۔موٹر سائیکل چلانے والا لڑکا بغیر ہیلمٹ بغیر لائسنس اور کسی دوسرے لڑکے کی موٹر سائیکل چلارہا تھا۔اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے ،(طارق محمود ،محمود آباد ،کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر واقعی آپ کا بیان درست اور حقیقت پر مبنی ہے تو مذکورہ صورت قتل کی پانچ اقسام میں سے کسی قسم کے تحت داخل نہیں ہوتی بلکہ اِس میں موٹر سائیکل سوار کا اپنا قصور ہے کہ اُس نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی ،سگنل توڑا اور اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالا ،لہٰذا شرعاً آپ پر اُس کی جان کے بدلے قصاص یا دیت واجب نہیں ہوتی ۔علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَكَذَالِكَ لَوْ تَعَمَّدَ الْمُرُوْرَ عَلَى الْحَجَرِ وَالْخَشَبِ فَعَثَرَ بِهِ لَايَضْمَنُ الْوَاضِعُ وَقَالَ بَعْضُ مَشَايِخِنَا هٰذَا اِذَا رَشَّ بَعْضَ الطَّرِيْقِ أَوْ وَضَعَ الْحَجَرَ وَالْخَشَبَ فِيْ بَعْضِهٖ فَأَمَّا اِذَا رَشَّ كُلَّ الطَّرِيْقِ أَوْ أَحْدَثَ الْخَشَبَ فِيْ كُلِّهٖ فَمَرَّ عَلَيْهِ وَعَثَرَ بِهٖ ضَمِنَ الرَّاشُّ وَالْوَاضِعُ۔

ترجمہ:"اگر کوئی شخص راستے میں رکھی ہوئی لکڑی یا پتھر کے اوپر سے جان بوجھ کر گزرا اور پھسل گیا ،تو (لکڑی یا پتھر رکھنے والا) اس (کی جان یا عضو کے تلف ہونے کے نقصان)

کا ضامن نہیں ہوگا، ہمارے بعض مشائخ کا قول ہے کہ یہ مسئلہ (اس صورت پر مبنی ہے) کہ راستے کے کچھ حصے میں پانی (کی وجہ سے کیچڑ) ہے یا بعض جگہ پتھر یا لکڑی رکھی ہوئی ہے، لیکن اگر کسی نے سارے راستے پر پانی ڈال دیا ہو یا سارے راستے میں لکڑی رکھ دی ہو اور راہ چلنے والا اُس پر سے گزرا اور پھسل گیا، تو پانی ڈالنے والا اور لکڑی رکھنے والا نقصان کا ضامن ہوگا، (عالمگیری، جلد:6، ص:41)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں: رَجُلٌ حَفَرَ بِئْرًا فِی الطَّرِیْقِ فَجَاءَ اِنْسَانٌ وَاَلْقٰی فِیْهَا نَفْسَهٗ مُتَعَمِّدًا لَا یَضْمَنُ الْحَافِرُ کَذَافِی "فَتَاوٰی قَاضِیْ خَانْ"۔

ترجمہ: ''کسی شخص نے راستے میں کنواں کھودا اور کوئی شخص آیا اور جان بوجھ کر اُس میں اپنے آپ کو گرا دیا، تو کنواں کھودنے والا ضامن نہیں ہوگا، جیسا کہ ''فتاویٰ قاضی خان'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 6 ص:45، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

ہاں! اس دوران جن لڑکوں نے آپ کو مارا اور آپ کے کان کا پردہ پھاڑ دیا، اگر اس سے آپ کی سماعت متأثر ہوئی ہو، تو مارنے والوں پر دیت لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ط

ترجمہ: '' جان کا بدلہ جان اور آنکھ کا بدلہ آنکھ اور ناک کا بدلہ ناک اور کان کا بدلہ کان اور دانت کا بدلہ دانت ہے اور زخموں میں بدلہ قصاص ہے، (سورۃ المائدہ:45)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَاِذَا ضَرَبَ اُذُنَ اِنْسَانٍ حَتّٰی ذَهَبَ سَمْعُهٗ تَجِبُ الدِّیَةُ وَطَرِیْقُ مَعْرِفَةِ ذَهَابِ سَمْعِهٖ اَنْ یُّطْلَبَ غَفْلَةً فَیُنَادِیْ فَاِنْ اَجَابَ عُلِمَ اَنَّ سَمْعَهٗ لَمْ یَذْهَبْ کَذَافِی الظَّهِیْرِیَّةِ۔

ترجمہ: ''اور جب کسی شخص کے کان پر ایسی ضرب لگائی ہو کہ اُس کی سماعت جاتی رہی، تو (مارنے والے پر پوری) دیت واجب ہوگی۔ اور اُس کی سماعت جانے کی معرفت کا طریقہ یہ ہے کہ اُسے ایسے وقت بلائے کہ وہ (بلانے والے کی طرف متوجہ نہ ہو اور) غفلت کے

عالم میں ہو، پس اگر وہ اُس کا جواب دے دے، تو معلوم ہو جائے گا کہ اُس کی سماعت زائل نہیں ہوئی، جیسا کہ ''فتاویٰ ظہیریہ'' میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص:25، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

اگر آپ کی سماعت متاثر ہوئی ہے تو آپ دیت کا مطالبہ کر سکتے ہیں، تاہم معاف کر دینا افضل ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ۔

ترجمہ: '' سو جس نے معاف کر دیا اور اصلاح کی اس کا اجر اللہ کے ذمہ (کرم) پر ہے، (الشوریٰ:40)''۔

لائسنس اور ہیلمٹ کے بغیر موٹر سائیکل چلانے کا تعلق مروّجہ قانون سے ہے اور شریعت مباح امور میں حکومت وقت کو قانون بنانے کا اختیار دیتی ہے اور ہر وہ قانون جو شریعت کے خلاف نہ ہو، اس کا احترام اور پابندی کرنی چاہیے۔ ٹریفک قوانین بھی گاڑی چلانے والے کی اپنی اور دوسروں کی جانوں کو خطرات سے امکانی حد تک محفوظ رکھنے کے لئے بنائے جاتے ہیں، لہٰذا سب کو ان کی پابندی کرنی چاہیے۔ جو لوگ اپنی غلطیوں کی بنا پر حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں، اگر حکومت قومی خزانے سے ان کو فضل و احسان کے طور پر زرِ تلافی دینا چاہے، تو یہ حکومت کا اچھا اقدام ہوگا، کیونکہ بعض حادثات کے نتیجے میں خاندان اپنے کفیل سے محروم ہو جاتے ہیں۔

گواہی کا معیار

سوال: 162

اسلام میں ایک عورت کی گواہی ہو سکتی ہے یا نہیں؟۔

جواب:

حدود اور قصاص کے معاملات میں عورت کی گواہی معتبر نہیں، نکاح اور طلاق، وصیت وغیرہ کے لئے گواہی کا شرعی معیار یہ ہے کہ دو مرد عادل یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَ) نِصَابُهَا (لِغَيْرِهَا مِنَ الْحُقُوْقِ سَوَاءٌ كَانَ) الْحَقُّ

(مَالًا أَوْ غَيْرَهٗ كَنِكَاحٍ وَّطَلَاقٍ وَّوَكَالَةٍ وَّوَصِيَّةٍ وَّاسْتِهْلَالِ صَبِيٍّ)وَلَوْ لِلْاِرْثِ (رَجُلَانِ أَوْرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ)۔

ترجمہ:''اور(گواہی کا)نصاب (حدوداور قصاص) کے سوادیگر حقوق سے جن کا تعلق مال سے ہو یا اُن کے علاوہ مثلاً نکاح ،طلاق ،وکالت ،وصیت اور بچے کی ولادت کی گواہی ،خواہ یہ گواہی وراثت کے لئے ہو،(ان تمام صورتوں میں گواہی کا نصاب یہ ہے کہ) دومرد ہوں یا ایک مرداوردوعورتیں''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 11،ص:86-85 کتاب الشہادات)

وَتُقْبَلُ فِي الْوِلَادَةِ وَالْبَكَارَةِ وَالْعُيُوْبِ بِالنِّسَآءِ فِيْ مَوْضِعٍ لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ الرِّجَالُ شَهَادَةُ امْرَأَةٍ وَّاحِدَةٍ، لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ: شَهَادَةُ النِّسَآءِ جَائِزَةٌ فِيْمَا لَا يَسْتَطِيْعُ الرِّجَالُ النَّظَرَ اِلَيْهِ۔

ترجمہ:''ولادت ،بکارت(Virginity)کسی ایسے عضو کے بارے میں عورتوں کے عیوب جس پر مرد مطلع نہیں ہوسکتے (یعنی ان کا اُن اعضاء پر نظر ڈالنا حرام ہے)،(ان تمام امور میں)ایک عورت کی گواہی بھی قبول کی جائے گی ،کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: جن چیزوں پر مردوں کا نظر ڈالنا جائز نہیں ہے،ان کے بارے میں عورتوں کی گواہی جائز ہے،(ہدایہ مع شرح ہدایۃ المبتدی،جلد:05،ص:403،مکتبۃ البشریٰ)۔

راستے کی تکلیف دہ چیز ہٹانا

سوال:163

ہم نے سنا ہے کہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹادینا بھی کارثواب ہے۔آج کل لوگ اپنے گھر کا کچرااور پھلوں سبزیوں کے چھلکے ادھر ادھر پھینک دیتے ہیں ۔گندگی بھی خوب کرتے ہیں ۔صاف ستھری دیواروں کوداغ دار کرتے ہیں ۔اسلام اس بارے میں کیا حکم دیتا ہے،(محمد شفاعت ،اندروٹھ ،آزاد کشمیر)۔

جواب :

پاکیزگی وطہارت ایمان کالازمی جزو ہے ۔شریعت مطہرہ جہاں انفرادی صحت وصفائی

کے اصول بیان کرتی ہے وہیں صالح معاشرے کی تشکیل و تکمیل کے لیے اجتماعی کاوشوں کی طرف بھی راہ نمائی کرتی ہے۔اس ضمن میں ذیل میں چند قرآنی آیات پیش کی جارہی ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ،

ترجمہ:''بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور خوب پاکی حاصل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے،(البقرہ:222)''۔

لَا يَمَسُّهٗ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ،

ترجمہ:''اس قرآن کریم کو نہیں چھوتے مگر پاکیزہ لوگ،(الواقعہ:79)''۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُؤُوْسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا،

ترجمہ:''اے ایمان والو! جب نماز کے لیے کھڑے ہوتو اپنے چہرے دھولو اور اپنے ہاتھ کہنیوں سمیت اور اپنے سروں کا مسح کرو اور ٹخنوں سمیت اپنے پاؤں (دھولو) اور اگر جنابت کی حالت میں ہو تو اچھی طرح پاکی حاصل کرلو،(المائدہ:6)''۔

اور اب چند احادیث ملاحظہ فرمایئے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ،قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْإِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ،أَوْ بِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ شُعْبَةً، فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَأَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْإِيْمَانِ۔

ترجمہ:''رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایمان کی ستر یا ساٹھ سے زیادہ شاخیں ہیں جن میں سب سے افضل شاخ کلمہ طیبہ کا اعتقاد ہے اور سب سے ادنیٰ شاخ راستے میں سے تکلیف دہ چیز کو دور کر دینا ہے اور حیاء بھی ایمان کی شاخ ہے،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:153)''۔

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ ن الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوْسَ بِالطُّرُقَاتِ۔ قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، مَا لَنَا بُدٌّ مِّنْ مَّجَالِسِنَا نَتَحَدَّثُ فِيْهَا۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِذَا أَبَيْتُمْ إِلَّا الْمَجْلِسَ، فَأَعْطُوا الطَّرِيْقَ حَقَّهٗ، قَالُوْا: وَمَا حَقُّهٗ؟قَالَ: غَضُّ الْبَصَرِ، وَكَفُّ

الْأَذٰی، وَرَدُّالسَّلَامِ، وَالْأَمْرُبِالْمَعْرُوْفِ، وَالنَّهْیُ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: راستوں میں بیٹھنے سے بچا کرو، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس کے علاوہ تو ہمارے لیے چارۂ کار ہی نہیں ہے۔ یہ ہماری مجالس ہیں جہاں ہم بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: تو راستے کو اس کا حق دیا کرو، صحابہ نے عرض کیا راستے کا حق کیا ہے؟۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: (نامحرم خواتین سامنے آئیں تو) نظر نیچی رکھنا، لوگوں کو تکلیف دینے سے اجتناب کرنا، کوئی سلام کرے تو اُس کا جواب دینا، اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 5541)“۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِمَاطَةُ الْأَذٰی عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ،

ترجمہ: ”نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص راستے سے تکلیف دینے والی چیز کو ہٹاتا ہے تو یہ صدقہ ہے، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 5243)“۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بَيْنَمَا رَجُلٌ يَّمْشِيْ فِيْ طَرِيْقٍ اِذْ وَجَدَ غُصْنَ شَوْكٍ فَاَخَّرَهٗ فَشَكَرَاللّٰهُ لَهٗ فَغَفَرَلَهٗ،

ترجمہ: ”رسول اللہ نے ارشاد فرمایا: ایک شخص کسی راستے پر جارہا تھا کہ اس نے ایک کانٹے دار شاخ دیکھی تو اسے راستے سے ہٹادیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ ادا قبول فرمائی اور اسے بخش دیا، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1958)“۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهٗ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ،

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے، اور جو اللہ

اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے"۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:6018)

عَنْ أَبِیْ شُرَیْحٍ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: وَاللّٰہِ لَایُؤْمِنُ بِاللّٰہِ، و اللّٰہِ لا یؤمن باللّٰہ، و اللّٰہِ لا یؤمن باللّٰہ، قیل: من یا رسول اللّٰہ؟ قال: الذی لا یأمن جارُہٗ بَوَائِقَہٗ۔

ترجمہ: "نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی قسم! وہ مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ مؤمن نہیں، لوگوں نے عرض کیا: ایسا شخص کون ہے؟، نبی پاک ﷺ نے فرمایا: جس کی آفتوں سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوں، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:6016)"۔

گذشتہ صفحات میں سوال نمبر:161 کے جواب میں "فتاویٰ عالمگیری، جلد:06، ص:41" کے حوالے سے فقہی عبارت موجود ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ اس موقع پر اس مقام کا مطالعہ فرمالیں۔

اس مقام پر ہمارے ایک قابلِ قدر مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی زید مجدہ نے متوجہ کیا کہ دینی مدارس اور دینی اجتماعات کے اشتہارات بھی بعض اوقات لوگوں کی دیواروں پر چسپاں کر دیئے جاتے ہیں یا من پسند سلوگن اور نعرے لکھ دیئے جاتے ہیں، تو اُن کے لئے بھی مسئلہ یہی رہے گا، البتہ پبلک عمارات کی دیواروں یا پلوں وغیرہ کے اطراف کی دیواروں پر جو اشتہار لکھے جاتے ہیں یا چسپاں کئے جاتے ہیں، تو اُن کی کسی حد تک گنجائش ہے، کیونکہ اُن پر ہم نے کمرشل اشتہارات بھی لکھے ہوئے دیکھے ہیں۔ اور میری رائے میں بہتر صورت یہ ہے کہ مقامی حکومتیں خود ان کے لئے جگہیں متعین کردیں۔

مصنوعی بال لگوانا اور بال اُگانا

سوال: 164

کیا مصنوعی بال لگوانا جائز ہے؟۔ (قاری بہادر خان، چترال)۔

جواب: مصنوعی بالوں کے لگوانے سے متعلق حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ قَالَتْ: جَاءَتِ امْرَأَةٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ: يَارَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ لِي ابْنَةً عُرَيِّساً أَصَابَتْهَا حَصْبَةٌ فَتَمَرَّقَ شَعْرُهَا، أَفَأَصِلُهُ؟ فَقَالَ: لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ۔

ترجمہ: ''حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک عورت نے حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول کریم ﷺ! میری لڑکی دلہن بنی ہے اور اسے چیچک نکل آئی ہے، جس کی وجہ سے اُس کے بال جھڑ گئے ہیں۔ کیا میں اُس کے بالوں کے ساتھ بال ملا کر پیوند کر دوں؟۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بال جوڑنے اور بال جڑوانے والی پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 5458)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَوَصْلُ الشَّعْرِ بِشَعْرِ الْآدَمِيِّ حَرَامٌ سَوَاءٌ كَانَ شَعْرُهَا أَوْ شَعْرُ غَيْرِهَا، لِقَوْلِهِ ﷺ: لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ وَالْوَاشِمَةَ وَالْمُسْتَوْشِمَةَ وَالْوَاشِرَةَ وَالْمُسْتَوْشِرَةَ وَالنَّامِصَةَ وَالْمُتَنَمِّصَةَ،

ترجمہ: ''ایک آدمی کا اپنے بالوں کے ساتھ دوسرے آدمی کے بالوں کو ملانا (پیوند کرنا) حرام ہے خواہ وہ اسی عورت کے بال ہوں یا کسی اور کے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: اللہ تعالیٰ نے بال ملانے والی، ملوانے والی، گودنے والی، گدوانے والی، دانتوں کو مصنوعی طریقے سے تیز کرنے والی اور کروانے والی اور بال نوچنے والی اور نچوانے والی پر لعنت فرمائی ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، ص: 454)''۔

اس مسئلے کی تفصیل علامہ غلام رسول سعیدی نے اپنی تصنیف شرح صحیح مسلم، جلد 6، صفحہ: 481 تا 487 بیان کی ہے۔

لیکن آج کل چونکہ شعبہ طب نے کافی ترقی کر لی ہے اور آدمی کے اپنے بالوں کو طبی عمل سے سر پر اُگایا جاتا ہے، جسے ہیئر پلانٹیشن (Hair Plantation) کہتے ہیں، لہٰذا میرے

نزدیک یہ عمل جائز ہے، کیونکہ ہمارے فقہاء نے عورت کے لئے اپنے گیسوؤں میں حلال جانوروں کے بال جوڑنے کی اجازت دی ہے اور اُنہوں نے حدیث پاک میں بال جوڑنے کی ممانعت کو اس پر محمول کیا ہے کہ دوسرے انسان کے بالوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَلَابَأْسَ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَجْعَلَ فِيْ قُرُوْنِهَا وَذَوَائِبِهَا شَيْئًا مِنَ الْوَبَرِ۔

ترجمہ: ''اس میں کوئی حرج نہیں کہ عورت اپنے گیسوؤں کے ساتھ (حلال) جانور کے بال یا رُواں جوڑے''۔

جب حلال جانور کے بال یا رُواں جوڑا جا سکتا ہے تو پاک چیز سے بنے ہوئے مصنوعی بال بھی جوڑے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وَلَعَلَّهُ مَحْمُوْلٌ عَلٰى مَا إِذَا فَعَلَتْهُ لِتَتَزَيَّنَ لِلْأَجَانِبِ، وَإِلَّا فَلَوْ كَانَ فِيْ وَجْهِهَا شَعْرٌ يَنْفِرُ زَوْجُهَا عَنْهَا بِسَبَبِهِ فَفِيْ تَحْرِيْمِ إِزَالَتِهِ بُعْدٌ لِأَنَّ الزِّيْنَةَ لِلنِّسَاءِ مَطْلُوْبَةٌ لِلتَّحْسِيْنِ۔

ترجمہ: ''حدیث پاک میں بال نوچنے کی ممانعت شاید اس بات پر محمول ہے کہ کوئی عورت اجنبی مردوں کے سامنے اپنے آپ کو دلکش بنا کر آئے، لیکن اگر عورت کے چہرے پر اس طرح کے بال ہیں کہ جس سے اس کے شوہر کو نفرت پیدا ہوتی ہے، تو اس صورت میں بال نوچنے (یا کسی پاک کیمیکل یا پاؤڈر یا کریم سے صاف کرنے) کو حرام قرار دینا (حکمتِ دین اور فطرت سے) بعید بات ہے، کیونکہ خواتین کو تزئین کی ضرورت ہوتی ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص: 455)

زنا کا الزام

سوال: 165

مسماۃ حور زعفران نے مسماۃ تاج النساء پر زنا کا الزام لگایا، مسماۃ حور زعفران نے کہا کہ مجھے عائشہ رحمٰن نے بتایا تھا۔ رات 11 بجے مسمّٰی عاشق حسین، انور اور عمران حور

زعفران کے ہمراہ میرے گھر آئے اور جرگہ شروع ہوا،میری بیوی عائشہ رحمٰن سے پوچھا گیااور اِس بات کا ثبوت طلب کیا تو اُس نے انکار کردیااور کہا کہ میں نے یہ بات نہ سنی ہےاور نہ ہی مجھے اِس کا پتا ہےاور قرآن اٹھانے پر تیار ہوگئی،لیکن اُس کی بات نہیں مانی گئی۔عاشق حسین نے کہا کہ مسماۃ حورزعفران کی بات قرآن کے موافق ہے،لہٰذا آپ پچاس ہزار روپے جرمانہ ادا کریں،مجھے ڈرایا،دھمکایا گیااور زبردستی جرمانے کی ادائیگی کی تحریر لے لی۔معلوم یہ کرنا ہے کہ الزام لگانے سے انکار کرنے والی عورت عائشہ رحمٰن یا حور زعفران،دونوں میں سے کس سے قسم لی جائے گی؟۔(ولی الرحمٰن،آزاد کشمیر)۔

جواب:

شریعتِ مطہرہ میں زنا کا الزام لگانے والے پر لازم ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے چار ثقہ مرد گواہ عدالت کے سامنے لائے،اگر وہ گواہ نہ پیش کرسکے تو اُسے 80 کوڑوں کی سزا دی جائے گی،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا۔

ترجمہ:''اور جولوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں پھر (اس کے ثبوت میں) چار گواہ نہ پیش کرسکیں تو تم ان کو 80 کوڑے مارواوران کی شہادت کو کبھی بھی قبول نہ کرو،(النور:4)''۔زنا کے ثبوت کے لئے چار مسلمان آزاد مردوں کی گواہی ضروری ہے عورتوں کی گواہی سے زنا ثابت نہیں ہوتا،جس پر قرآن مجید،احادیث،اجماع فقہاء سے بکثرت دلائل موجود ہیں۔

صورتِ مسئولہ میں دو دعوے ہیں:(۱)ایک مسماۃ حورزعفران کی جانب سے مسماۃ تاج النساء پر زنا کا دعویٰ (۲) یہ کہ دعویٰ اُس نے عائشہ رحمٰن کے کہنے پر لگایا ہے۔زنا کا الزام شرعاً ''قذف'' کہلاتا ہے،جس میں اگر مُجاز شرعی عدالت کے سامنے چار ثقہ مرد گواہوں کے ذریعے الزام ثابت ہوجائے تو مُدّعیٰ علیہ یا مُدّعیٰ علیہا (یعنی جس پر زنا کا الزام ہے) پر

حدِ زنا جاری کی جاتی ہے، جو غیر شادی شدہ کے لئے 100 کوڑے اور شادی شدہ کے لئے رجم (سنگسار) کرنا ہے۔ اور الزام ثابت نہ ہو سکے تو مُدَّعی یا مُدَّعیہ کو "حدِ قذف" لگائی جاتی ہے، جو 80 کوڑے ہے۔ لیکن یہ اسلامی حکومت کی جانب قائم کی گئی مُجاز شرعی عدالت کا کام ہے، پرائیویٹ عدالت یا برادری کا جرگہ اس کا مُجاز نہیں ہے، جرمانے کی سزا بھی غیر شرعی ہے۔ البتہ برادری میں قسم کھا کر کوئی جھوٹے الزام یا دعویٰ سے اپنی براءت ثابت کرے تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اس سے خاندان کے افراد کے درمیان نفرت وعداوت کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور ناجائز کردار کشی کا کسی حد تک ازالہ ہو سکتا ہے، مذکورہ بالا صورت میں قسم تاج النساء اور عائشہ رحمٰن کو دی جا سکتی ہے اور الزام غلط ثابت ہونے پر حور زعفران تاج النساء اور عائشہ رحمٰن سے معافی مانگے اور برادری میں اپنے جرم کا اعتراف کرے اور جن کی دل آزاری کی، ان سے معافی مانگے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے۔

ذخیرہ اندوز کا شرعی حکم

سوال: 166

ذخیرہ اندوزی کے بارے میں شرعی احکام بیان فرمائیں؟۔

جواب:

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روح یہ ہے کہ کاروبار فطری انداز سے جاری وساری رہے۔ طلب (Demand) اور رَسَد (Supply) میں توازن رہے۔ لہٰذا اگر مارکیٹ میں غلہ وافر مقدار میں موجود ہے تو خرید کر اسٹاک کرنا منع نہیں ہے، کیونکہ تجارتی منصوبہ بندی اسی طریقے سے ہوتی ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ اشیائے صرف (Consumer Items) میں سے کسی چیز کی پیداوار معاشرے کی ضرورت سے کم ہو یا قومی اور بین الاقوامی طور پر طلب کے مقابلے میں رَسَد کم ہوگئی ہے، تو ایسے حالات میں کوئی سرمایہ دار یا کاروباری شخص مارکیٹ سے اُس مال کو خرید کر ذخیرہ (Stock) کر لیتا ہے یا یہ مال پہلے سے اُس کے گوداموں (Stocks) میں موجود

ہے، لیکن شدید طلب کے باوجود وہ اِسے روکے رکھتا ہے اور مارکیٹ میں سپلائی نہیں کرتا کہ طلب بڑھے اور لوگ مجبوراً بنیادی ضرورت کی اشیاء کاروبار کے فطری اصول کے خلاف انتہائی مہنگے داموں خرید نے پر مجبور ہو جائیں، تو یہ "احتکار" ہے، ذخیرہ اندوزی (Hoarding) ہے۔ اور یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں، جو شقی القلب ہوں، سنگ دل ہوں اور لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی تجوریاں بھر رہے ہوں، اسے آج کل Expliotation کہتے ہیں، تو یہ عمل اور یہ طرزِ فکر غیر اسلامی ہے اور غیر انسانی بھی ہے۔ اس لئے ذخیرہ اندوز کو حدیث پاک میں خطا کار اور ملعون فرمایا گیا ہے اور اس کے لئے بڑی وعید آئی ہے:

(1) عَنْ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قال: لایَحْتَکِرُ اِلَّا خَاطِیٌٔ ۔

ترجمہ: "حضرت معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ذخیرہ اندوزی صرف گنہگار شخص کرتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4120)"۔

(2) سُنن ترمذی میں ہے: والعملُ علی ھذا عندأھلِ العلم: کرِھُوا احتکار الطَّعام ورخَّص بَعضُھُم فی الْاِحتِکار فی غیرِ الطَّعام ۔ وقال ابنُ المُبارك: لابأس بالْاِحتِکارِ فی الْقُطنِ والسَّختیان ونحو ذالك ۔

ترجمہ: "اہلِ علم کے نزدیک عمل اس پر ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں ذخیرہ اندوزی مکروہ ہے اور بعض علماء نے غیر طعام میں ذخیرہ اندوزی کی رخصت دی ہے اور عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں: کپاس اور بکری کی کھال اور اس کی مثل دوسری چیزوں کی ذخیرہ اندوزی میں حرج نہیں ہے، (سُنن ترمذی، جلد: 2، ص: 294، دارالکتب العلمیہ، بیروت)"۔

(3) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّاب قال: قال رسُولُ اللّٰہ ﷺ: اَلْجَالِبُ مَرْزُوْقٌ وَالْمُحْتَکِرُ مَلْعُوْنٌ ۔

ترجمہ: "حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تاجر خوش بخت ہے اور ذخیرہ اندوز ملعون ہے"۔

(سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2153)

(4) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنِ احْتَكَرَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ طَعَامًا ضَرَبَهُ اللّٰهُ بِالْجُذَامِ وَ الْإِفْلَاسِ۔

ترجمہ: ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرماتے ہیں: جس شخص نے مسلمانوں پر ذخیرہ اندوزی کی، اللہ تعالیٰ اُس پر جذام (کوڑھ) اور افلاس کو مسلّط کردے گا، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2155)''۔

ہر انسان فطری طور پر دولت سے محبت کرتا ہے۔ مستقبل کے لئے کچھ پس انداز کر رکھنا شرعاً درست ہے، زکوٰۃ و فطرہ کے علاوہ اپنے مال سے انفاق فی سبیل اللہ کا بڑا اجر و ثواب ہے اور جو دولت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کی جائے، اللہ تعالیٰ اُس کا اجر کئی سوگنا بڑھا کر عطا فرماتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت 261 تا 266 میں صدقہ و خیرات کی ترغیب دلائی گئی ہے، ایک جگہ ارشاد فرمایا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ O

ترجمہ: ''جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانے کی طرح ہے، جس نے سات ایسے خوشے اُگائے کہ ہر خوشے میں سو دانے ہیں اور اللہ جس کے لئے چاہے ان کو دگنا کر دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا بہت علم والا ہے، (البقرہ: 261)''۔

صحابۂ کرام جو صدق و وفا کا پیکر تھے اور راہِ خدا میں اپنا مال بے دریغ لٹاتے رہے، ان آیاتِ قرآنیہ کی عملی تفسیر ہیں۔ مدینہ منورہ میں جب قحط پڑا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنا تمام مال صدقہ کر دیا:

عن ابن عبَّاس قال: قحط النَّاسُ فِيْ زمان أَبِيْ بكرٍ فقالَ أَبُوْ بكرٍ لاتُمْسُوْنَ حتّٰى يُفرِّجَ اللّٰهُ عنكُمْ فلمَّا كان من الغد جاءَ الْبَشِيْرُ إِلَيْهِ قال: قدمتْ لِعُثْمَانَ أَلْفُ راحلة بُرًّا وَّطعامًا قال: فغدا التُّجَّارُ على عُثْمَانَ فقرعُوْا إِلَيْهِ الْبَابَ فخرجَ إِلَيْهِمْ وعليهِ مُلاءَةٌ وقد خالف بين طرفيها على عاتقيه فقالَ لَهُمْ ماتُرِيْدُوْنَ، قالُوْا: بلغنا

اَنَّـهٗ قَـدِمَ لَکَ اَلْفُ رَاحِـلَةٍ بُـرًّا وَّطَعَامًا بِعْنَا حتّٰی نُوَسِّعَ بِهٖ عَلٰی فُقَرَاءِ الْمَدِیْنَة فقَال لَهُـمْ عُثْمَانُ ادْخُلُوْا،فَدَخَلُوْا فَاِذَا اَلْفُ وِقْرٍ قَدْ صُبَّ فِیْ دَارِ عُثْمَانَ فَقَال لَهُمْ کَمْ تُـرْبِحُوْنِیْ عَلٰی شِرَائِیْ مِنَ الشَّامِ فقَالُوْا: اَلْعَشْرَةُ اِثْنَیْ عَشَرَ قَال :قَدْ زَادُوْنِیْ ،قَالُوْا: اَلْعَشْرَةُ اَرْبَعَةَ عَشَرَ،قَالَ: قَدْزَادُوْنِیْ قَالُوْا: اَلْعَشْرَةُ خَمْسَةَ عَشَرَ،قَالَ:زَادُوْنِیْ ،قَالُوْا: وَمَـنْ زَادَکَ وَنَـحْنُ تُجَّارُ الْمَدِیْنَةِ،قَالَ: زَادُوْنِیْ بِکُلِّ دِرْهَمٍ عَشْرَةً عِـنْدَکُمْ زِیَادَةٌ، قَالُوْا:لا ،قَالَ:فَاُشْهِدُکُمْ مَعْشَرَالتُّجَّارِ اِنَّهَا صَدَقَةٌ عَلٰی فُقَرَاءِ الْمَدِیْنَةِ ،قَالَ عَبْدُاللّٰه : فَبِـتُّ لَیْـلَتِیْ فَـاِذَا اَنَا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَنَامِیْ وَهُوَ عَلٰی بِرْذَوْنٍ اَشْهَبَ یَسْتَعْجِلُ وَعَلَیْهِ حُلَّةٌ مِّنْ نُوْرٍ وَّبِیَدِهٖ قَضِیْبٌ مِّنْ نُوْرٍ وَعَلَیْهِ نَعْلَانِ شِرَاکُهُمَا مِنْ نُوْرٍ فَقُلْتُ لَهٗ بِـاَبِیْ اَنْـتَ وَاُمِّـیْ یَـارَسُـوْلَ اللّٰهِ لَقَدْ طَالَ شَوْقِیْ اِلَیْکَ فقَالَ ﷺ اِنِّیْ مُبَادِرٌ لِاَنَّ عُثْمَانَ تَصَدَّقَ بِاَلْفِ رَاحِلَةٍ وَّاِنَّ اللّٰهَ قَدْقَبِلَهَامِنْهُ وَزَوَّجَهٗ بِهَا عُرُوْسًا فِی الْجَنَّةِ وَاَنَا ذَاهِبٌ اِلٰی عُرْسِ عُثْمَانَ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں (مدینہ میں) قحط پڑا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم صبح نہیں کرو گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تم پر (رزق) کشادہ فرمادے گا۔ اگلے دن صبح یہ خبر ملی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار اونٹ گندم اور اشیائے خوراک کے منگوائے ہیں، آپ نے فرمایا: مدینے کے تاجر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، آپ گھر سے باہر تشریف لائے، اس حال میں کہ چادر آپ کے کاندھوں پر تھی اور اُس کے دونوں سرے مخالف سمت میں کاندھے پر ڈالے ہوئے تھے۔ آپ نے مدینے کے تاجروں سے پوچھا کہ تم لوگ کس لئے آئے ہو؟، کہنے لگے: ہمیں خبر پہنچی ہے کہ آپ کے پاس ایک ہزار اونٹ غلے کے آئے ہیں، آپ انہیں ہمارے ہاتھ فروخت کر دیجئے تاکہ ہم مدینے کے فقراء پر آسانی کریں، آپ نے فرمایا: اندر آؤ، پس وہ اندر داخل ہوئے، تو ایک ہزار تھیلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں رکھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا: اگر میں تمہارے

ہاتھ فروخت کروں، تم مجھے کتنا منافع دو گے؟۔ اُنہوں نے کہا: دس پر بارہ، آپ نے فرمایا: مجھے اس سے زیادہ مل رہے ہیں، اُنہوں نے کہا دس پر چودہ، آپ نے فرمایا: مجھے اس سے زیادہ مل رہے ہیں، اُنہوں نے کہا: دس پر پندرہ، آپ نے فرمایا: مجھے اس سے زیادہ مل رہے ہیں، اُنہوں نے کہا: اس سے زیادہ کون دے گا، جبکہ ہم مدینے کے تاجر ہیں (یعنی مارکیٹ کا ہمیں پتا ہے)، آپ نے فرمایا: آپ لوگوں کے ہاں نرخ زیادہ ہیں۔ اُنہوں نے کہا: نہیں، پھر آپ نے فرمایا: اے گروہِ تُجّار! تم گواہ ہو جاؤ کہ (یہ تمام مال) میں نے مدینہ کے فقراء پر صدقہ کر دیا۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ رات کے وقت رسول اللہ ﷺ میرے خواب میں تشریف لائے، آپ ﷺ سیاہی مائل سفید سواری پر تشریف فرما تھے، آپ جلدی میں تھے اور آپ کے دست مبارک میں ایک قندیل تھی جس سے روشنی نور کی طرح پھوٹ رہی تھی، نعلین مبارک کے تسموں سے نور پھوٹ رہا تھا۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! مجھے آپ ﷺ کے دیدار کا طویل عرصے سے اشتیاق تھا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں جلدی میں ہوں کیونکہ عثمان نے ایک ہزار اونٹ اللہ کی راہ میں صدقہ کئے اور اللہ تعالیٰ نے اُسے قبول فرمایا اور اُن کا نکاح جنت کی ایک حور سے فرما دیا ہے اور میں عثمان کے (نکاح کی) خوشیوں میں شریک ہونے جا رہا ہوں، (ازالۃ الخفا، جلد 2، ص: 224)''۔

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

اَلْحکرُ اِدِّخارُ الطَّعامِ لِلتَّرَبُّص ۔ ترجمہ: ''حکر'' کا معنی ہے: کھانے پینے کی چیزوں کو (مہنگائی کے) انتظار میں ذخیرہ کرنا۔

ابن سیدہ نے کہا: اَلاِحتکارُ جَمعُ الطَّعامِ وَنَحوِہ مِمَّا یُوکَلُ وَاحتِبَاسُہُ اِنتِظَارَ وَقتِ الغَلاءِ بِہ ۔ ترجمہ: ''کھانے پینے کی چیزوں کو مہنگائی کے وقت کے لئے جمع کرنا''۔

(لسان العرب، جلد 4، ص: 208)

احتکار کی فقہی تعریفات اور احکام درج ذیل ہیں:

علامہ محی الدین شرف النووی لکھتے ہیں:

قَالَ الْعُلَمَاءُ: وَالْحِكْمَةُ فِي تَحْرِيمِ الْاِحْتِكَارِ دفْعُ الضَّرر عن عامَّة النَّاس كَمَا أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلَى أَنَّهُ لَوْ كَانَ عِنْدَ إِنْسَانٍ طعامٌ، واضطرَّ النَّاسُ اِلَيْه ولَم يَجِدُوا غَيْرَهُ أُجْبِرَ عَلَى بَيْعِهِ دفْعًا لِلضَّرَرِ عَنِ النَّاسِ۔

ترجمہ: ''علماء نے کہا ہے کہ احتکار کی حکمت یہ ہے کہ عام لوگوں سے ضرر کو دور کیا جائے۔ اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس اشیائے خوراک ہوں اور لوگوں کو اس طعام کی سخت ضرورت ہو اور اس کے علاوہ کہیں سے نہ ملے، تو لوگوں کو ضرر سے بچانے کے لئے اس شخص کو طعام فروخت کرنے پر مجبور کیا جائے گا''۔

(شرح صحیح مسلم للنووی، جلد 5، ص: 144)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

اَلْاِحْتِكَارُ مَكْرُوْهٌ وَذَالِكَ أَنْ يَّشْتَرِيَ طَعَامًا فِيْ مِصْرٍ وَيَمْتَنِعَ مِنْ بَيْعِهِ وَذَالِكَ يَضُرُّ بِالنَّاسِ كَذَا فِي الْحَاوِيْ ۔وَاِنِ اشْتَرَى فِيْ ذَالِكَ الْمِصْرِ وَحَبَسَهٗ وَلَا يَضُرُّ بِأَهْلِ الْمِصْرِ لَابَأْسَ بِهٖ كَذَافِي "التَّاتَارْخَانِيَةِ" نَاقِلًا عَنِ التَّجْنِيْسِ ۔وَاِذَااشْتَرَى مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ مِّنَ الْمِصْرِ فَحَمَلَ طَعَامًا اِلَى الْمِصْرِ وَحَبَسَهٗ وَذَالِكَ يَضُرُّ بِأَهْلِهٖ فَهُوَ مَكْرُوْهٌ هٰذَاقَوْلُ مُحَمَّدٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى وَهُوَ اِحْدَى الرِّوَايَتَيْنِ عَنْ أَبِيْ يُوْسُفَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى، وَهُوَ الْمُخْتَارُ، هٰكَذَا فِي "الْغِيَاثِيَّةِ" وَهُوَ الصَّحِيْحُ هٰكَذَا فِيْ "جَوَاهِرِ الْأَخْلَاطِيِّ" وَفِيْ جَامِعِ الْجَوَامِعِ فَاِنْ جَلَبَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ وَاحْتَكَرَ لَمْ يُمْنَعْ كَذَا فِي "التَّاتَارْخَانِيَّةِ"، وَاِنِ اشْتَرَى طَعَاماً فِيْ مِصْرٍ وَّجَلَبَهٗ اِلٰى مِصْرٍ آخَرَ وَاحْتَكَرَ فِيْهِ فَاِنَّهٗ لَايُكْرَهُ، هٰكَذَافِي "الْمُحِيْطِ"۔

ترجمہ: ''ذخیرہ اندوزی مکروہ ہے اور یہ اس صورت میں کہ (کوئی شخص) غلّہ (کھانے پینے کی اشیاء) شہر میں خریدے اور اُن کو فروخت سے روک رکھے اور اُس سے لوگوں پر تنگی

ہو جائے، جیسا کہ ''الحاوی'' میں ہے۔ اور اگر (صورتِ حال ایسی ہو کہ) شہر میں خرید کر روک لیا اور اس سے لوگوں پر تنگی نہیں ہوتی تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ ''فتاویٰ تاتارخانیہ'' نے تجنیس سے نقل کیا ہے۔ اور جب شہر کے قریب ہی کسی مقام سے خریدا اور اٹھا کر شہر تک لایا اور (فروخت سے) روکے رکھا، اگر اہلِ شہر کے لئے اس سے تنگی ہوتی ہو، تو یہ مکروہ ہے، یہ قول امام محمد رحمہ اللہ علیہ کا ہے، اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ سے دو روایتوں میں سے ایک روایت میں یہی منقول ہے ، اور یہی مختار قول ہے ، اسی طرح ''غیاثیہ'' میں ہے، یہی صحیح ہے، اسی طرح ''جواہر الاخلاطی'' میں بھی ہے۔ اور جامع الجوامع میں ہے، پس اگر کسی دور کے مقام سے اناج خرید کر لایا اور (شہر میں)ذخیرہ کیا تو یہ منع نہیں ہے، جیسا کہ ''تتارخانیہ'' میں ہے اور اگر کھانے پینے کی چیزیں شہر میں خریدیں اور اُنہیں دوسرے شہر لے گیا اور وہاں ذخیرہ کیا تو اس میں کراہت نہیں ہے، جیسا کہ ''محیط'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 3، ص: 213، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (و) کُرِہَ (اِحتِکَارُ قُوتِ الْبَشَرِ) کَتِبْنٍ وَّعِنَبٍ وَّلَوْزٍ (وَالْبَهَائِمِ) کَتِبْنٍ وَّقَتٍّ (فِیْ بَلَدٍ یَضُرُّ بِأَهْلِهٖ) لِحَدِیْثِ :اَلْجَالِبُ مَرْزُوْقٌ وَّالْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ، فَإِنْ لَّمْ یَضُرَّ لَمْ یُکْرَہْ، وَمِثْلُهٗ تَلَقِّی الْجَلَبِ (وَ)یَجِبُ أَنْ (یَّأْمُرَهُ الْقَاضِیْ بِبَیْعِ مَافَضَلَ عَنْ قُوْتِهٖ وقُوْتِ أَهْلِهٖ ،فَإِنْ لَّمْ یَبِعْ)بَلْ خَالَفَ أَمْرَ الْقَاضِیْ (عَزَّرَهٗ) بِمَایَرَاهُ رَادِعًا لَّهٗ(وَبَاعَ) الْقَاضِیْ(عَلَیْهِ) طَعَامَهٗ (وِفَاقًا) عَلَی الصَّحِیْحِ۔

ترجمہ: ''انسان کی خوراک (انجیر، انگور اور بادام)اور چوپایوں کی خوراک (بھوسہ اور چارہ خشک وتر)، مہنگی فروخت کرنے کے لئے ایسے شہر میں روک رکھنا مکروہ ہے، جہاں اُس کے روکنے سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو اور اگر ضرر نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے ۔(احتکار کے مکروہ ہونے کی دلیل)یہ حدیث ہے کہ : تاجر خوش بخت ہیں اور ذخیرہ اندوزی کرنے والے ملعون ہیں ۔پس اگر یہ ذخیرہ اندوزی لوگوں کے لئے مُضر نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے، جیسے کہ

”تَلَقِّی الحَلَب “(شہر سے باہر نکل کر دیہات سے مارکیٹ میں لانے والے کو خریدنا) اور قاضی پر واجب ہے کہ ذخیرہ اندوز کے پاس اُس کی اور اُس کے گھر والوں کی قوت (ضرورت کی خوراک) سے جس قدر زائد غلہ ہو، اُس کے فروخت کرنے کا حکم دے، پھر اگر وہ نہ بیچے اور قاضی کی مخالفت کرے تو قاضی اُس کو تعزیر کرے جس طرح مناسب ہو زجر و توبیخ کرے اور قاضی اُس کے غلے کو (زبردستی) فروخت کردے، صحیح قول کے مطابق اس پر ائمہ کا اتفاق ہے“۔ علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

وَشَرْعًا اِشْتِرَاءُ طَعَامٍ وَّنَحْوِهٖ وَحَبْسُهٗ اِلَی الْغَلَاءِ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا ،لِقَوْلِهٖ عَلَیْهِ الصَّلَاةُ وَ السَّلَامُ :مَنِ احْتَکَرَ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا ضَرَبَهُ اللّٰهُ بِالْجُذَامِ وَالْاِفْلَاسِ وَفِیْ رِوَایَةٍ : فَقَدْ بَرِئَ مِنَ اللّٰهِ وَبَرِئَ اللّٰهُ مِنْهُ،قَالَ فِی الْکِفَایَةِ : اَیْ خَذَلَهٗ وَالْخِذْلَانُ تَرْکُ النُّصْرَةِ عِنْدَ الْحَاجَةِ،وَفِیْ اُخْرٰی :فَعَلَیْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ،لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا، اَلصَّرْفُ:النَّفْلُ ، وَالْعَدْلُ:اَلْفَرْضُ، "شَرْنُبْلَالِیَّة "عَنِ "الْکَافِیْ"وَغَیْرِهٖ ـ وَقِیْلَ شَهْرًا وَقِیْلَ اَکْثَر،وهٰذَا التَّقْدِیْرُ لِلْمُعَاقَبَةِ فِی الدُّنْیَا بِنَحْوِ الْبَیْعِ وَالتَّعْزِیْرُ لَا لِلْاِثْمِ لِحُصُوْلِهٖ وَاِنْ قَلَّتِ الْمُدَّةُ وَتَفَاوُتُهٗ بَیْنَ تَرَبُّصِهٖ لِعِزَّتِهٖ اَوْ لِلْقَحْطِ وَالْعِیَاذُ بِاللّٰهِ تَعَالٰی۔"دُرّ الْمُنْتَقٰی" مَزِیْدًا،وَالتَّقْیِیْدُ بِقُوْتِ الْبَشَرِ قَوْلُ اَبِیْ حَنِیْفَةَ وَمُحَمَّدٍ وَّعَلَیْهِ الْفَتْوٰی ، کَذَا فِی "الْکَافِی" ۔وَعَنْ اَبِیْ یُوْسُفَ : کُلُّ مَا اَضَرَّ بِالْعَامَّةِ حَبْسُهٗ فَهُوَ اِحْتِکَارٌ ۔وَعَنْ مُحَمَّدٍ : اَلْاِحْتِکَارُ فِی الثِّیَابِ ۔

ترجمہ:”کھانے پینے کی چیزوں کو مہنگائی کے انتظار میں چالیس دن تک ذخیرہ کرنا (شرعاً) احتکار ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:”جس شخص نے مسلمانوں پر چالیس دن ذخیرہ اندوزی کی، اللہ تعالیٰ اُس پر جذام (کوڑھ) اور افلاس کو مسلّط کردے گا“۔ اور ایک روایت میں ہے:”وہ اللہ تعالیٰ سے بری ہوگیا اور اللہ تعالیٰ اُس سے ناراض ہوگیا“، اور ”کفایہ“ میں ہے: یعنی رسوائی اُس پر مسلط کردی جائے گی اور ضرورت کے وقت اُس کی مدد

نہیں کی جائے گی۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے: اُس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ اُس کا فرض قبول کرے گا نہ نفل، صرف سے مراد نفل اور عدل سے مراد فرض ہے، یہ ''شرنبلالیہ'' میں ''کافی'' وغیرہ سے ہے۔ بعض نے ایک ماہ اور بعض نے اس سے زیادہ کا قول کیا ہے۔ چالیس دن کی مدت اس پر دنیوی سزا مثلاً تعزیر جاری کرنے کے لئے ہے، گناہ کے لئے یہ قید نہیں ہے، اگر چند دن بھی مہنگائی کے انتظار میں یا قحط کے لئے ذخیرہ اندوزی کی تو گنہگار ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنی پناہ عطا فرمائے، ''درالمنتقی'' میں اس پر مزید اضافہ کیا: احتکار کی تعریف میں کھانے پینے کی چیزوں کی قید امام ابو حنیفہ اور امام محمد نے لگائی ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، جیسا کہ ''کافی'' میں ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک ہر وہ چیز جس کی ذخیرہ اندوزی سے مسلمانوں کو ضرر ہو، وہ احتکار ہے۔ اور امام محمد رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک احتکار کپڑوں میں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص: 487-486، داراحیاءالتراث العربی، بیروت)

جی۔ پی فنڈ میں اضافہ

سوال: 167

ہم ڈیفنس میں سرکاری ملازمین ہیں، ہماری ماہانہ تنخواہ سے حکومت جی۔ پی فنڈ کے طور پر کچھ رقم ہر ماہ کاٹتی ہے۔ ریٹائرمنٹ پر وہ رقم ہمیں مل جائے گی۔ یہ کمیوٹ اور پینشن کے علاوہ ہوتی ہے۔ اس رقم پر گورنمنٹ اپنی مرضی سے ایک شرح مقرر کر کے ہر سال اس میں اضافہ کرتی رہتی ہے، جس سے یہ رقم بڑھتی رہتی ہے۔ یہ فرمایئے کہ جو شرح گورنمنٹ اس رقم پر پر امداداً لگاتی ہے، وہ کیسی ہے، کیوں کہ ریٹائرمنٹ کے وقت وہ رقم اصل رقم سے زیادہ ہوگی؟۔ (سرکاری ملازمین، کیماڑی)۔

جواب:

حکومت ہر ملازم کی تنخواہ سے جی۔ پی فنڈ کے نام سے جو لازمی ماہانہ کٹوتی کرتی ہے، وہ رقم چوں کہ ملازم کی مِلک میں نہیں آتی، بلکہ حکومت کے پاس ہی جمع

رہتی ہے اور ملازم اس میں اپنی مرضی سے تصرف بھی نہیں کرسکتا، لہٰذا اس میں حکومت اپنی طرف سے جو اضافہ کرتی ہے، وہ اس کی طرف سے تبرُّع یعنی مہربانی اور احسان ہے۔اس بناء پر بعض علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے، البتہ جو ملازمین زیادہ کے شوق میں اپنی رضامندی سے اپنی تنخواہ سے اضافی کٹوتی کراتے ہیں، اس پر فیصد لینا میرے نزدیک جائز نہیں ہے۔اپنی اصل جمع شدہ رقم ہی لیں تو بہتر ہے اور جو تقویٰ پر عمل کرنا چاہیں تو وہ قناعت کریں اور اصل رقم ہی لیں اور اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھیں۔

فرائض و مستحبات سے روکنا

سوال: 168

کیا کوئی برادری، تنظیم، کمیٹی یا پنچایت کسی فرد پر کسی کی موت یا میت میں جانے، نمازِ جنازہ پڑھنے، سوئم یا قرآن خوانی میں شریک ہونے پر پابندی لگاسکتی ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

(حاجی امام الدین، گوہرآباد، دستگیر)

جواب:

اگر کوئی تنظیم، برادری، کمیونٹی یا پنچایت اپنے منشور میں یہ مقاصد شامل کرے کہ ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کریں گے، یعنی اپنی برادری میں نیکیوں کو فروغ دیں گے اور برائیوں کو مٹائیں گے تو یہ درست ہے، لیکن انہیں خلافِ شرع امور کو فروغ دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: لَاطَاعَةَ فِی مَعْصِیَةِ اللّٰهِ ،اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْف،

ترجمہ: ''یعنی کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے (خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی بڑا ہو) جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو، اطاعت تو فقط نیک کاموں میں لازم ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:1840)''۔

نمازِ جنازہ پڑھنا فرضِ کفایہ ہے، اس میں شرکت پر پابندی لگانا حرام ہے اور حرام کے مرتکبین فاسق قرار پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ۝ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ۝ ترجمہ: ''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو (اللہ کے) بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے، (العلق:10-9)''۔

ایصالِ ثواب کی مجالس، جن میں مجالسِ وعظ اور قرآن خوانی وغیرہ شامل ہیں، مستحب امور ہیں، ان سے روکنا مکروہِ تحریمی ہے اور اس پر یہ لوگ گناہ گار ہوں گے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک دشمن رسول کے رذیل اوصاف کے ضمن میں اُس کی ایک خصلت مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ، (یعنی خیر سے بہت زیادہ روکنے والا)، (القلم:12)''، بیان فرمائی ہے۔ مستحب پر عمل نہ کرنا خلافِ اولیٰ ہے۔

متفرق مسائل

مساجد، دینی و تعلیمی اور صنعتی و کاروباری اداروں میں مسلح حفاظتی انتظامات

سوال: 169

آج کل دہشت گردی کے پیشِ نظر مساجد کے اندر و باہر اور مدارس میں، کلاسز میں تعلیمی عمل پر نظر رکھنے کے لئے یا چوری کے واقعات کی روک تھام کے لئے جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے، کلوز سرکٹ کیمرے لگانا شرعاً جائز ہے؟۔ اسی طرح مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کا اپنی جان کی حفاظت کے پیشِ نظر حفاظتی اقدامات کرنا، سیکورٹی گارڈ متعین کرنا اور اسلحہ رکھنا جائز ہے؟۔ (قاضی غلام مصطفیٰ، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی)۔

جواب:

عام حالات میں ایک اسلامی ریاست و حکومت اور اسلامی معاشرے کے لئے یہ بات باعثِ افتخار نہیں ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کے لئے خطرہ بن جائیں یا ایک دوسرے سے خطرہ محسوس کریں، بلکہ اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ نے تو ایک کامل مسلمان کی تعریف ہی یہ فرمائی ہے کہ: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔

ترجمہ: ''صحیح مسلمان وہی ہے، جس کی زبان اور ہاتھ (کی اذیّت و آزار) سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 10)۔''

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ، وَالْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صحیح مسلمان وہی ہے، جس کی زبان اور ہاتھ (کی اذیّت و آزار) سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، صحیح مومن وہی ہے (جس کے شر) سے لوگوں کی جان و مال محفوظ رہیں''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2627)

لیکن بدقسمتی سے گذشتہ کچھ عشروں سے ہمارا ملک قتل و غارت گری، فساد اور دہشت گردی کی

زد میں ہے،اس کی وجوہ داخلی بھی ہیں اور بین الاقوامی بھی۔مساجد ومدارس،تعلیمی مراکز،
پبلک مقامات یہاں تک کہ وہ ادارے بھی،جن پر قومی سلامتی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے،
محفوظ نہیں ہیں۔حکومت عوام کو تحفظ دینے میں ناکام ہوچکی ہے۔عوام حکومت کو ٹیکس بھی
دیتے ہیں اور پھر جو لوگ مالی استطاعت رکھتے ہیں،انہیں اپنے مکانات ،دکانوں،
کارخانوں حتیٰ کہ اپنے ساتھ بھی پرائیویٹ گارڈ رکھنے پڑتے ہیں۔تحفظِ جان،تحفظِ مال،
تحفظ دین اور تحفظِ آبرو مقاصدِ شرعیہ میں سے ہے اور یہ ایک مسلمہ انسانی قدر اور ضرورت بھی
ہے۔لہٰذا جو ادارے اپنی حدود میں جس قدر حفاظتی اقدامات وانتظامات کرسکتے ہیں،شرعاً
اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عہدِ رسالت مآب اور خود رسول اللہ ﷺ سے بھی حفاظتی انتظامات کا ثبوت ملتا ہے،چند
احادیثِ مبارکہ پیشِ خدمت ہیں:

أَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ سَهِرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَقْدَمَهُ الْمَدِيْنَةَ لَيْلَةً، قَالَ:لَيْتَ رَجُلًا صَالِحًا
يَحْرُسُنِي اللَّيْلَةَ، قَالَتْ: فَبَيْنَمَا نَحْنُ كَذَالِكَ إِذْ سَمِعْنَا خَشْخَشَةَ السِّلَاحِ، فَقَالَ:
مَنْ هٰذَا؟،فَقَالَ:سَعْدُ بْنُ أَبِيْ وَقَّاصٍ، فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: "مَا جَاءَ
بِكَ؟"،فَقَالَ سَعْدٌ: وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ خَوْفٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَجِئْتُ أَحْرُسُهُ
فَدَعَا لَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثُمَّ نَامَ۔

ترجمہ:''ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ
کی (ہجرت کرکے) مدینہ آمد ہوئی،تو ایک رات آپ ﷺ کی آنکھ نہ لگی،تو آپ ﷺ
نے فرمایا: کاش!کوئی نیک مرد ہوتا جو آج رات میرے لئے حفاظتی پہرہ دیتا،حضرت عائشہ
رضی اللہ عنھا بیان کرتی ہیں کہ: ہم اسی خیال میں تھے کہ ہم نے ہتھیاروں کی جھنکار سنی،تو
رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ کون ہے؟،تو انہوں نے عرض کی: سعد بن ابی وقاص،
آپ ﷺ نے اُن سے فرمایا: کیسے آنا ہوا؟،سعد بن ابی وقاص نے عرض کی: میرے دل

میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اندیشہ ہوا (کہ کوئی آپ کو ضرر نہ پہنچا دے)، اس لئے میں آپ پر پہرہ دینے کے لئے حاضر ہوا ہوں، تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی اور پھر آپ (اطمینان سے) سو گئے"۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث:3756)

حضرت علی مسجدِ نبوی میں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے پہرہ دیا کرتے تھے اور اس مقصد کے لئے (حجرۂ اقدس کے باہر) ایک چوکی بنائی گئی تھی، جسے "اُسطوانِ علی بن ابی طالب" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، حضرت موسیٰ بن سلمہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جعفر بن عبداللہ بن حسین سے "اُسطوانِ علی بن طالب" کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے فرمایا:

ترجمہ: "یہ وہ چوکی ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے حجرۂ اقدس کے دروازے کے قریب ہے، جہاں بیٹھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے پہرہ دیا کرتے تھے، (سمہودی، وفاء الوفا، جلد 2، ص:448)"۔

اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے موقع پر حفاظتی اقدامات کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے اور اسباب کو اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے بلکہ اسباب اختیار کر کے ذاتِ مُسبِّبُ الاسباب پر بھروسا کرنا عینِ توکل ہے۔ یہ مدنی زندگی کے ابتدائی دور کی بات ہے، پھر جب اللہ جلّ شانہٗ نے آپ ﷺ کی حفاظت اپنے ذِمّۂ کرم پر لے لی، تو پھر آپ اپنی حفاظت کے لئے اسباب سے بے نیاز ہو گئے، چنانچہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحْرَسُ حَتّٰى نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" فَأَخْرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَأْسَهٗ مِنَ الْقُبَّةِ فَقَالَ لَهُمْ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ انْصَرِفُوْا فَقَدْ عَصَمَنِيَ اللّٰهُ۔

ترجمہ: "عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ: نبی ﷺ کی حفاظت کا اہتمام کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی: "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" ۔ (اور اللہ

لوگوں کے شر سے آپ کی حفاظت فرمائے گا)، تو رسول اللہ ﷺ نے خیمہ مبارکہ سے اپنا سرِ مبارک باہر نکالا اور اُن (پہرہ دینے والے صحابہ کرام) سے فرمایا: اے لوگو! چلے جاؤ، اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت کا ذمہ خود لے لیا ہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 3046)''۔

کُتا رکھنا اسلام میں انتہائی ناپسندیدہ بات ہے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے یہ وعید فرمائی ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ أَمْسَكَ كَلْبًا، فَإِنَّهُ يَنْقُصُ كُلَّ يَوْمٍ مِّنْ عَمَلِهِ قِيْرَاطٌ، إِلَّا كَلْبَ حَرْثٍ أَوْ مَاشِيَةٍ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کتا پالا، اس کے اجر سے ہر روز ایک قیراط (سونے) کے برابر اجر کم ہوتا رہے گا، ۔۔۔۔۔۔۔۔مگر پھر رسول اللہ ﷺ نے ضرورت کی بنا پر چوکیداری کیلئے کتا رکھنے کو اس وعید سے مستثنیٰ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قَالَ ابْنُ سِيْرِيْنَ وَأَبُوْ صَالِحٍ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: إِلَّا كَلْبَ غَنَمٍ أَوْ حَرْثٍ أَوْ صَيْدٍ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا: سوائے اس کتے کے جو بکریوں اور کھیت کی حفاظت یا شکار کے لئے پالا گیا ہو، (صحیح بخاری: 2322)''۔ ایک اور روایت میں ہے:

عَنِ ابْنِ الْمُغَفَّلِ قَالَ: أَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِقَتْلِ الْكِلَابِ ثُمَّ قَالَ: "مَا بَالُهُمْ وَبَالُ الْكِلَابِ" ثُمَّ رَخَّصَ فِيْ كَلْبِ الصَّيْدِ وَكَلْبِ الْغَنَمِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مغفل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے صحابہ کو کتوں کے قتل کرنے کا حکم دیا، پھر فرمایا: انہیں کتوں کے قتل کرنے سے کیا ملے گا؟ پھر آپ ﷺ نے شکار اور بکریوں کی حفاظت کے لئے کتے رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی، (صحیح مسلم: 4018)''۔

یہ عالمِ اسباب ہے اور اسباب کو اختیار کرنا مقاصدِ شریعت میں سے ہے اور رسول اللہ ﷺ کی سنتِ جلیلہ ہے۔ لہٰذا تدبیر اور توکل دونوں کو اختیار کرنا چاہئے۔ اسباب کے مؤثر ہونے

اور تدبیر کے کارگر ہونے کے لئے ایمان ویقین اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہئے، اس کا کرم شاملِ حال ہو، تب ہی اسباب مؤثر ہوتے ہیں اور تدبیر نتیجہ خیز ہوتی ہے، ورنہ لوگوں نے ماضی قریب میں ایسے کئی واقعات مشاہدہ کیے، جہاں تمام تر تدابیر واسباب کے باوجود المناک حادثات رونما ہوئے۔ عالم ہو یا غیر عالم، کوئی مذہبی رہنما ہو یا عام سیاسی رہنما یا کوئی عام شہری، اگر اسے خطرات درپیش ہیں اور وہ اپنی حفاظت کے وسائل رکھتا ہے، تو مُسلّح گارڈ بھی رکھ سکتا ہے، دیگر جو حفاظتی اِقداماتِ درکار ہوں، وہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ ہم جیسے عام شہری جو اتنے مالی وسائل نہیں رکھتے کہ مُسلّح گارڈ رکھ سکیں، انہیں اللہ تعالیٰ کی نصرت وحفاظت کے سہارے پر بھروسا کرنا ہوگا اور شریعت، آئین اور قانون کی رُو سے اُن کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت کی ذمے داری ریاست وحکومت پر ہے۔ آج کل جو جدید حفاظتی وسائل دستیاب ہیں، مثلاً اداروں کے داخلی دروازے (Entrance) پر اسکینر (Scanning Machine) یا (Metal Detecter) لگانا یا ادارے کی حدود میں کلوز سرکٹ (Close Circuit) کیمرے نصب کر کے اسکرین پر تمام سرگرمیوں کی نگرانی کا عمل ضرورت کی بنا پر جائز ہے، اس سے حفاظتی عمل کے ساتھ ساتھ چوری چکاری سے بھی تحفظ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کے گودے (Pulp) کے دوبارہ استعمال (Recycling) میں لانے کا جواز

سوال:170

آج کل قرآن مجید کے ناقابل استعمال بوسیدہ اوراق انتہائی پرانے نسخوں اور مختلف اخبارات، رسائل، جرائد اور کتب میں درج قرآنی آیات کی حرمت کو قائم رکھنا ایک گھمبیر مسئلہ بن چکا ہے، جبکہ یہ ہماری دینی ضرورت ہے اور عقیدت کا مسئلہ بھی ہے۔ اگر کیمیائی طریقے سے ان بوسیدہ اوراق اور نسخوں سے تحریر کو مٹایا جا سکتا ہو تو کیا Recycling کر کے اس کا گودا (Pulp) دوبارہ کاغذ سازی یا گتہ سازی میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟، اس

کیمیائی عمل سے آیات کی تحریر کی مطبوعہ روشنائی کاغذ سے جدا اور تحلیل ہو کر مائع (Liquid) کی شکل اختیار کرلے گی تو اگر وہ سیال جو ایک زہریلا (Poisoned) کیمیکل ہوگا، کیا فیکٹری کے سیورج میں مل جائے تو شرعاً کوئی حرج تو نہیں ہے یا اس کے لئے کوئی انتظام لازمی ہے۔ (محمد صدیق شیخ، پروگریسو ٹریڈرز شریف پیلس حقانی چوک، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اس کی تکریم ہر مومن پر لازم ہے بلکہ اس کے ایک ایک حرف کی تعظیم لازمی ہے اور کسی بھی قسم کی دانستہ بے حرمتی ایمان سے محروم ہونے کا سبب ہے۔ بلکہ مُصحف کے علاوہ کہیں بھی اور کسی بھی چیز پر قرآنی آیات تحریر ہو تو اس کا بھی ادب اور تعظیم لازمی ہے اور بے وضو انکو ہاتھ لگانا ناجائز ہے۔ اس لئے ہمارے فقہاء نے تعظیماً بوسیدہ اور ناقابل انتفاع اوراقِ مُصحف کو جلانے اور ایسی جگہ رکھنے سے منع فرمایا ہے کہ جہاں گندگی اور غبار وغیرہ کا خدشہ ہو۔ البتہ انہوں نے ان بوسیدہ اوراق کو زمین میں دفن کرنے یا بہتے ہوئے پانی یا سمندر میں ڈال دینے یا پانی سے ان کی روشنائی اور تحریر مٹانے کے بعد بقیہ اوراق کو جلا دینے کی صورتوں کو جائز قرار دیا ہے۔ زمین میں دفن کرنے کی صورت میں لحد بنائی جائے یا گڑھے میں ڈال کر اس کے اوپر چھت ڈال دی جائے، انبیاءِ کرام علیھم السلام جیسی مقدس ہستیاں بھی زمین میں دفن ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَفِي الذَّخِيرَةِ الْمُصْحَفُ اذا صار خَلَقًا و تعذّر القراءَةُ مِنْهُ لا يُحرقُ بالنّارِ، اليه اشار مُحَمَّدٌ وَبِهِ نَأخُذُ، وَلَا يكرهُ دفنُهُ، وينبغي أنْ يُلفَّ بخرقة طاهرة، ويُلحدُ لهُ، لأنّهُ لَوْ شقّ وَدفن يحتاجُ إلى اهالَةِ التُّرابِ عليه وفي ذالكَ نوعُ تحقيرٍ، إلَّا اذا جعل فَوْقَهُ سَقْفٌ، وَانْ شَاءَ غسلَهُ بالْماءِ أوْ وضعَهُ فِيْ مَوْضعٍ طاهرٍ لا تصِلُ اليه يدُ مُحدِثٍ وَّلَا غُبارٌ وَّلا قذرٌ تعظِيمًا لِكلامِ اللّٰه عزّوجلّ۔

ترجمہ: "اور ذخیرہ میں ہے کہ مُصحف جب بوسیدہ ہو جائے اور اسے پڑھا نہ جاسکتا ہو تو اس

کو آگ میں نہیں جلایا جائے گا، امام محمد رحمہ اللہ علیہ نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہم
نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور اس کو دفنانا مکروہ نہیں ہے۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ مصحف کو ایک
پاک کپڑے میں لپیٹ کر اور لحد (بغلی قبر کی طرح جگہ) بنا کر دفن کر دیا جائے، اگر صرف
گڑھا کھودا گیا (لحد نہ بنائی) تو اس میں دفنانے کے بعد اس پر مٹی ڈالنے کی ضرورت ہوگی
اور اس میں مصحف کی ایک قسم کی بے ادبی ہے۔ ہاں اگر گڑھے کے اوپر چھت بنائی جائے
(پھر جائز ہے)۔ اور اگر چاہے تو اس کو پانی کے ساتھ دھولے یا کسی پاک جگہ رکھ دے کہ
جہاں بے وضو کا ہاتھ نہ لگے اور غبار اور گندگی وغیرہ نہ لگے، کلام اللہ کی تعظیم کی وجہ
سے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:9، ص:518)''۔ فتاویٰ عالمگیری، جلد:5، ص:323 پر
اسی طرح مذکور ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْکُتُبُ الَّتِیْ لَا یُنْتَفَعُ بِھَا یُمْحٰی عَنْھَا اسْمُ اللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ وَیُحْرَقُ الْبَاقِیْ۔

ترجمہ: ''ایسی کتابیں جو قابل انتفاع نہ رہی ہوں ان سے اسماءِ الٰہیہ، اسماءِ ملائکہ اور اسماءِ
رُسُل علیھم السلام مٹا دیئے جائیں اور بقیہ اوراق جلا دیئے جائیں''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد:9، ص:518)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: حاصل البتہ قواعد بغدادی و ابجد اور سب کتب
غیر منتفع بھا (یعنی جن سے فائدہ نہ اٹھایا جا سکتا ہو) ماورائے مصحف کریم کو جلا دینا
بعد محو اسماء باری تعالیٰ اور اسمائے رُسل و ملائکہ علیھم السلام اجمعین کے جائز ہے۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:23، ص:339)

نیز ہمارے فقہاء نے جاری پانی میں ڈالنے کا حکم غالباً اسی لئے دیا ہے کہ اس کی تحریر مٹ
جائے، باقی اوراق اگر کہیں گر جائیں تو بے ادبی نہ ہو، اس لئے کہ تحریر مٹنے سے اس میں تغیر
آ گیا اور تغیر آنے سے ''شے'' کا حکم بدل جاتا ہے اور فتویٰ اسی قول پر ہے۔

آج کل کے مطبوعہ حروف و نقوش کو عام پانی سے مٹانا ممکن نہیں۔ لہٰذا سوال میں جو صورت

بیان کی گئی ہے ،وہ یہ ہے کہ کیمیکل کے ذریعے مطبوعہ حروف کو مٹادیا (Wash Out) جائے اور اس کیمیکل سیّال مادّے (Liquid) کو پاک جگہ بہادیا جائے ۔ اس طرح جو کچھ باقی بچے گا، وہ کاغذ نہیں رہے گا بلکہ گودے (Pulp) کی شکل میں ہوگا اور اس کی ماہیت بدل جائے گی، اس کے بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ ماہیّت کے بدل جانے کے بعد چیز کا حکم بھی بدل جاتا ہے، لہٰذا اب وہ اوراق قرآن نہیں ہیں اور اگر ان کی تشکیل نو (Recycling) ہوسکتی ہو، تو اس کا متبادل استعمال بھی جائز ہے۔ ہمارے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اور مجتبیٰ کی عبارت ہے کہ ناپاک تیل اگر صابون میں ڈالا گیا تو اس کی طہارت کا حکم دیا جائے گا، کیونکہ اس کی ماہیّت بدل گئی اور امام محمد کے نزدیک ماہیّت بدل جانے سے چیز پاک ہوجاتی ہے اور عموم بلوٰی (عام لوگوں کے اس میں مبتلا ہونے) کی وجہ سے اسی پر فتویٰ دیا جائے گا۔ اور اسی سے یہ مسئلہ بھی نکالا جائے گا کہ اگر انسان یا کتا صابون بنانے والے برتن میں گر جائیں (اور تحلیل ہوجائیں) تو وہ صابون بن جائیں گے، تو حقیقت بدلنے کی وجہ سے وہ پاک ہوجائیں گے۔ پھر جان لے کہ امام محمد کے نزدیک (حکم کے بدلنے) کی علّت تغیُّر اور انقلابِ حقیقت ہے اور عموم بلوٰی کی وجہ سے اسی پر فتویٰ دیا جائے گا، جیسا کہ پہلے معلوم ہوچکا۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ حکم صرف صابون کے ساتھ خاص نہ ہو، بلکہ اس میں ہر وہ چیز داخل ہوجائے گی جسمیں تغیر اور حقیقت کا بدلنا پایا جائے اور اس میں عموم بلوٰی بھی ہو۔ علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

(لَا) یَکُوْنُ نَجِسًا (رَمَادُقَذَرٍ) وَاِلَّا لَزِمَ نَجَاسَةُ الْخُبْزِ فِی سَائِرِ الْاَمْصَارِ (وَ) لَا (مِلْحٌ کَانَ حِمَارًا) أَوْخِنزِیْرًا وَلَا قَذَرٌ وَقَعَ فِی بِئْرٍ فَصَارَحَمْأَةً لِاِنْقِلَابِ الْعَیْنِ،بِهٖ یُفْتٰی۔

ترجمہ: ''کوڑا جل کر راکھ بن جائے تو ناپاک نہیں رہتا ورنہ وہ تمام علاقے جہاں ایسی آگ پر روٹی پکائی جاتی ہے، لازماً ناپاک قرار پاتی۔ اور نہ وہ نمک ناپاک ہے جو اوّل گدھا تھا

یا خنزیر (یعنی نمک کی کان میں گرنے سے گدھا یا خنزیر کی پوری ماہیت تبدیل ہوگئی، جس کی وجہ سے اب وہ گدھے یا خنزیر کے حکم میں نہ رہے) اور نہ وہ گندگی ناپاک ہے جو کنوئیں میں گری، پھر کالی مٹی ہو کر کیچڑ ہو گئی، اس چیز کے بدلنے کی وجہ سے اسی پر فتویٰ ہے۔۔۔۔۔۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

(قَوْلُهُ لِانْقِلابِ الْعَيْنِ) عِلَّةٌ لِلْكُلِّ وَهٰذَا قَوْلُ مُحَمَّدٍ وَّذَكَرَمَعَهُ فِي "الذَّخِيرَةِ" وَ"الْمُحِيطِ" "أَبَا حَنِيفَةَ" "حِلْيَةَ" قَالَ فِي "الْفَتْحِ": وَكَثِيرٌ مِّنَ الْمَشَايِخِ اِخْتَارُوهُ، وَهُوَ الْمُخْتَارُ لِأَنَّ الشَّرْعَ رَتَّبَ وَصْفَ النَّجَاسَةِ عَلَى تِلْكَ الْحَقِيقَةِ وَتَنْتَفِي الْحَقِيقَةُ بِانْتِفَاءِ بَعْضِ أَجْزَاءِ مَفْهُومِهَا فَكَيْفَ بِالْكُلِّ؟ فَإِنَّ الْمِلْحَ غَيْرُ الْعَظْمِ وَاللَّحْمِ، فَإِذَا صَارَ مِلْحًا تَرَتَّبَ حُكْمُ الْمِلْحِ۔ وَنَظِيرُهُ فِي الشَّرْعِ النُّطْفَةُ نَجِسَةٌ وَّتَصِيرُ عَلَقَةً وَّهِيَ نَجِسَةٌ وَتَصِيرُ مُضْغَةً فَتَطْهُرُ، وَالْعَصِيرُ طَاهِرٌ فَيَصِيرُ خَمْرًا فَيَنْجَسُ وَيَصِيرُ خَلًّا فَيَطْهُرُ، فَعَرَفْنَا أَنَّ اِسْتِحَالَةَ الْعَيْنِ تَسْتَتْبِعُ زَوَالَ الْوَصْفِ الْمُرَتَّبِ عَلَيْهَا۔

ترجمہ: ''اس چیز کی ماہیت وحقیقت کے بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے، یہ علت (Cause) سب چیزوں کے لئے ہے اور یہ امام محمد کا قول ہے اور اس کے ساتھ'' حلیہ'' میں'' ذخیرہ اور محیط'' کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کا بھی قول ہے۔ علامہ ابن ھمام نے'' فتح القدیر'' میں لکھا ہے کہ اکثر مشائخ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور یہی قول مختار ہے، کیونکہ شریعت نے اسی حقیقت پر وصفِ نجاست کو مرتب کیا ہے اور اپنے مفہوم کے بعض اجزاء کے نہ ہونے سے حقیقت کی بھی نفی ہو جاتی ہے، تو جب کسی چیز کے تمام اجزاء (اپنی سابقہ وضع وہیئت کے ساتھ) معدوم ہو جائیں، تو اس کی حقیقت معدوم کیوں نہیں ہوگی؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔اور شرع میں اس کی نظیر یہ ہے کہ نطفہ (منی) نجس ہے اور وہ (ماں کے رحم میں) جب منجمد خون کی شکل اختیار کرتا ہے، تب بھی وہ نجس ہوتا ہے اور پھر جب وہ گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے تو

پاک ہو جاتا ہے۔اور پھل وغیرہ سے کشید کیا ہوا رس پاک ہوتا ہے، پھر جب پھلوں کا رس سڑ جانے سے خمر (شراب) بن جاتا ہے تو نجس ہو جاتا ہے (کیونکہ اب اس کی حقیقت بدل گئی ہے)، پھر یہی شراب جو حرام اور نجس ہے جب (نمک اور لیموں ڈالنے سے) سرکہ بن جاتا ہے، تو (اپنی حقیقت کے بدل جانے سے) پاک ہو جاتا ہے"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 1 ص: 463، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

اس استدلال پر یہ اعتراض درست نہیں ہوگا کہ صابن، کریم اور ٹوتھ پیسٹ وغیرہ میں اگر خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہو، تو علماء اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کے استعمال کے عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، حالانکہ ان چیزوں میں بھی اختلاط کی وجہ سے چربی کی ماہیت بدل جاتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ان چیزوں میں شریعت کے مقصد کو باطل کرنے کے لئے ارادتاً اس نجس اور حرام چیز کی ملاوٹ کی جاتی ہے، لہٰذا اس کی حرمت کا فتویٰ درست ہے۔اس کے برعکس ہم نے فقہاءِ کرام کے حوالے سے صابن بنانے والے بوائلر (Boiler) یا نمک کی کان میں گر کر تحلیل ہو جانے والی حرام چیز کی طہارت کا فتویٰ ضرورت کی بنا پر دیا ہے، کیونکہ یہاں ارادتاً ایسا نہیں کیا جاتا۔اسی طرح قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کے حوالے سے ان کے حروف کی روشنائی محو ہونے کے بعد گودے کے استعمال کے جواز کا فتویٰ مقصدِ شریعت کو باطل کرنے کے لئے نہیں بلکہ حرمتِ قرآن کو قائم رکھتے ہوئے ضرورت کی بنا پر دے رہے ہیں، کیونکہ آج کے دور میں یہ ناقابلِ استعمال مواد اتنا ہے کہ اس کے ادب واحترام کو قائم رکھتے ہوئے اس کو محفوظ رکھنا ایک مسئلہ بن گیا ہے۔اب مندرجہ بالا دلائل کی روشنی میں ہم آپ کے سوالات کے براہِ راست جوابات درج کرتے ہیں:

(1) اگرچہ کیمیکل کے ذریعے مقدّس اوراق کی تحریر مٹانے کا عمل آج کل جدید مشینوں سے ہوتا ہے، مگر اس عمل میں شریک کارکنوں کے لئے باوضو رہنا ضروری ہے، کیونکہ انہیں تمام بوسیدہ نسخے اور اوراق اٹھا کر مشین میں ڈالنے ہوں گے، اسی طرح قرآن مجید کی طباعت سے لے کر جلد بندی اور نقل وحمل تک کے تمام مراحل میں شریک کارکنان کو بھی باوضو رہنے

کا اہتمام کرنا چاہئے، کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: لَایَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْن.
ترجمہ: ''قرآن کو صرف باوضو لوگ چھوئیں، (واقعہ:79)''۔ نیز جو حکم ہم نے قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کا بتایا ہے، اس کا اطلاق قرآن مجید کے ان اوراق پر بھی ہوتا ہے، جو طباعت کے دوران ناقص رہ جاتے ہیں، جزوی طور پر طباعت ناقص (Mis Print) رہ جاتی ہے، بعض اوقات کاغذ کی شیٹس (Sheets) مڑ جانے کی وجہ سے بعض صفحات نیم طبع ہو جاتے ہیں، بعض اوقات کاغذ کے صحیح ڈائرکشن یا صحیح زاویے میں نہ ہونے کی وجہ سے مطبوعہ صفحات ٹیڑھے ہو جاتے ہیں اور یہ سب ضائع کرنے پڑتے ہیں، کیونکہ یہ کسی اور استعمال میں نہیں آسکتے نہ ہی ردّی میں بیچے جاسکتے ہیں، لہٰذا ان سب صورتوں میں وہی عمل کرنا چاہئے، جو بوسیدہ اوراق کے لئے ہے۔

(2) اس سیال مادّہ (Liquid Chemical) کو، اگر چہ وہ زہریلا کیمیکل ہو، فیکٹری کے سیوریج میں ملانے سے اجتناب کرنا لازمی ہے، کیونکہ اس زہریلے کیمیکل سے قرآن مجید کے کلماتِ مبارکہ اور اسماءِ مقدّسہ کو مٹایا گیا (Wash Out) ہے اور یہ کلماتِ قرآن کا دھوون ہے، لہٰذا اس کا ادب واحترام واجب ہے۔ لہٰذا اس کیمیکل کو کسی محفوظ گڑھے میں ڈالنے کا انتظام ہونا چاہئے یا اگر اسے حرارت دے کر گیس کی شکل میں تبدیل کیا جاسکتا ہو، تو ایسا کرلیا جائے، بشرطیکہ یہ گیس انسانی اور حیوانی حیات کے لئے نقصان دہ نہ ہو۔

(3) جس کیمیکل سے آیاتِ قرآنیہ اور اسماءِ مقدّسہ کو محو (Wash Out) کیا جائے گا، اس کا نجس اشیاء سے پاک ہونا بھی ضروری ہے، کیونکہ نجس اشیاء سے قرآنی آیات کا دھونا ناجائز اور بے ادبی ہے۔

(4) قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق یا قرآن مجید کی پرنٹنگ پریس کے ایسے اوراق جو ناقص طباعت کی وجہ سے ضائع کرنے پڑتے ہیں، جب کیمیکل سے ان کی تحریر کو مٹادیا جائے، تو وہ گودا (Pulp) بن جائے گا اور اب اس کی ماہیت تبدیل ہو جائے گی۔ اور تبدیلیِ ماہیت سے حکم بدل جاتا ہے، لہٰذا اب وہ قرآن کے حکم میں نہیں ہے اور اس گودے کو دوبارہ

کاغذ سازی یا گتہ سازی میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(5) اس امر پر بھی غور کر لیا جائے کہ وہ لانچیں جو مچھلیوں کے شکار کے لئے نسبتاً گہرے سمندر میں جاتی ہیں، اگر ان کے ساتھ کوئی قابلِ عمل عقد (Contract) طے پا سکتا ہو، تو پھر ان مقدّس نسخوں اور اوراق کو سمندر بُرد بھی کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ یہ آبی حیات کے لئے نقصان دہ نہ ہو اور اس سے سمندر میں آلودگی کا مسئلہ نہ پیدا ہو۔ یہ ہم نے اس لیے کہا کہ ہمیں ایک اخباری سروے کرنے والے نے بتایا کہ نیٹی جیٹی کے پل سے قرآنِ مجید کے بوسیدہ اوراق سمندر میں عرصے سے گرائے جا رہے تھے، اس کے ساتھ کچھ توہم پرست لوگ مخصوص ایام میں کھیر یا میٹھی چیزیں بنا کر سمندر میں ڈالتے تھے، اس کے نتیجے میں سمندر کے اس حصے کا پانی گدلا ہو گیا، اس میں آلودگی شامل ہو گئی اور اب وہ جگہ آبی حیات کیلئے سازگار نہیں ہے۔

عدالت میں قرآن ہاتھ میں اٹھا کر جھوٹی گواہی دینا

سوال: 171

اگر کوئی شخص عدالت میں قرآن شریف ہاتھ میں لے کر جھوٹی گواہی دے تو قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی کیا سزا ہے؟۔

محمد رفیق، زیب النساء اسٹریٹ، صدر، کراچی

جواب:

معاملات کا تعلق خواہ بندوں سے ہو (مثلاً نکاح، طلاق ودیگر معاملات کی گواہی) یا احکامِ شرع (مثلاً ہلالِ رمضان وعید کی رویت کی گواہی وغیرہ) سے ہو، ہر صورت سچائی پر عمل پیرا رہنے کا حکم اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ترجمہ: "اور جھوٹی بات سے پرہیز کرو، (الحج:30)"۔

جھوٹی قسم کھانے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌO

ترجمہ: ”بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی قیمت خریدتے ہیں، اُن لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ آخرت میں اللہ ان سے کوئی کلام فرمائے گا اور نہ ہی قیامت کے دن ان کی طرف نظر کرم فرمائے گا اور نہ اُن کو (روحانی آلائشوں سے) پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، (سورۂ آل عمران: 77)“۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے حاکم کے فیصلہ سے حلف اٹھایا تا کہ اس قسم کے ذریعے کسی مسلمان شخص کا مال کھالے، وہ جس وقت اللہ سے ملاقات کرے گا، وہ اس پر غضب ناک ہوگا، اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل کی:

إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (سورۂ آل عمران: 77)۔ پھر حضرت اشعث بن قیس آئے اور پوچھا: حضرت ابو عبدالرحمن نے تم سے کیا حدیث بیان کی ہے؟ انہوں نے بتایا: اس اس طرح حدیث بیان کی ہے، انہوں نے کہا: یہ آیت میرے متعلق نازل ہوئی تھی، میرے عم زاد کی زمین میں میرا کنواں تھا، میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش کیا، آپ نے فرمایا: تم اس کے ثبوت میں گواہ لاؤ، ورنہ پھر اس کی قسم پر فیصلہ ہوگا، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! وہ تو اس پر قسم کھالے گا! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے حاکم کے فیصلہ سے جھوٹی قسم کھائی تا کہ اس قسم کے ذریعہ وہ مسلمان کا مال کھالے وہ جب قیامت کے دن اللہ سے ملاقات کرے گا تو اللہ اس پر غضب ناک ہوگا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 2670،2515)“۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِاَكْبَرِ الْكَبَائِرِ اَلَا وَ قَوْلُ الزُّوْرِ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ

ترجمہ: ”کیا میں تمہیں نہ بتادوں کہ کبیرہ گناہ کون سا ہے؟ جھوٹی بات یا یہ ارشاد فرمایا: جھوٹی گواہی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5976)“۔

عَنِ ابْنِ عُمر قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:لَنْ تَزُوْلَ قدما شَاهِدِالزُّوْرِ حَتّٰی یُوْجِبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ۔

ترجمہ:''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جھوٹی گواہی دینے والا اپنا قدم ہٹانے نہیں پاتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے جہنم واجب کردیتا ہے۔(سُنن ابنِ ماجہ، رقم الحدیث: 2373)''۔

عَنْ خُرَیْمِ بْنِ فَاتِكٍ قَالَ:صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الصُّبْحِ، فَلَمَّا انْصَرَفَ قَامَ قَائِمًا فَقَالَ: عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ بِالْاِشْرَاكِ بِاللّٰهِ،ثَلَاثَ مَرَّاتٍ،ثُمَّ قَرَأَ:فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ O حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَیْرَ مُشْرِكِیْنَ بِهٖ۔

ترجمہ:''حضرت خریم بن فاتک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی اور پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: جھوٹی گواہی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے برابر ہے۔آپ نے تین مرتبہ یہی ارشاد فرمایا، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: (ترجمہ: پس بتوں کی نجاستوں سے بچو اور پرہیز کرو جھوٹی بات سے، ہر باطل سے الگ، صرف اللہ کے ہو کر (کسی کو) اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراتے ہوئے''۔

(سُنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 3594)

اور اُس کی جھوٹی گواہی سے کسی کا حق سلب ہوتا ہو تو وہ جھوٹی گواہی دینے والا اُس کا بھی مجرم ہے اور اُس کی جھوٹی گواہی سے جس کا حق سلب ہوا، جب تک وہ معاف نہ کرے، اللہ عزّ وجلّ اسے معاف نہیں فرمائے گا۔ اِلّا یہ کہ وہ خصوصی کرم فرمادے، حدیث پاک میں ہے: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: اَلْقَتْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُكَفِّرُ كُلَّ شَیْءٍ، اِلَّا الدَّیْنَ،

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت ہر چیز کا کفارہ بن جاتی ہے، سوائے قرض کے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4880)''۔

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ جھوٹی گواہی گناہِ کبیرہ ہے، حرام ہے، گواہی قسم کے ساتھ ہوتی

ہے۔خواہ قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا جائے یا ویسے ہی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی قسم کھائی جائے ، ہمارے ہاں چونکہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانا زیادہ بھاری محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر قسم توڑی تو بڑا وبال آئے گا تو کسی حد تک قسم کی پاس داری کرتے ہیں ورنہ تمام قسموں کو ہلکا محسوس کرتے ہوئے انہیں توڑ دیتے ہیں اور ان کی پاس داری نہیں کرتے یا جھوٹی قسم کو معمولی چیز سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانا

سوال: 172

زید کی ملکیت پر بکر نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے، زید کے پاس ملکیت کے تمام تحریری شواہد بھی موجود ہیں، زید کا کہنا ہے کہ اُس نے اپنی شے بکر کو عاریتاً استعمال کے لئے دی تھی اور اب بکر اُس پر قابض ہو گیا ہے جبکہ بکر یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ شے اس (بکر) کی ملکیت ہے اور زید سے کہتا ہے کہ تم قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ، ان حالات میں شریعت کا کیا حکم ہے؟۔(ملک محمود عباسی ،گلستانِ جوہر، کراچی)۔

جواب:

شریعت کا اصول ہے کہ جب کوئی بندہ کسی دوسرے شخص پر کسی چیز کا دعویٰ کرے تو بارِ ثبوت مدعی کے ذمے ہے ،وہ گواہ پیش کرے ،اگر اس کا دعویٰ گواہوں سے ثابت ہو جائے تو اس کا حق دلایا جائے گا ،اگر مُدعی کے پاس گواہ نہ ہوں تو مُدّعیٰ علیہ سے پوچھا جائے گا ،اگر وہ دعوے کا اقرار واعتراف کرتا ہے ہے تب بھی اس پر لازم ہے کہ مدعی کا حق اسے واپس کرے۔ اور اگر وہ مُدّعی کے دعوے کو درست تسلیم نہیں کرتا بلکہ باطل قرار دیتا ہے تو عدالت اسے قسم دے گی ،اگر وہ قسم کھا کر کہہ دیتا ہے کہ مُدّعی کا دعویٰ باطل ہے، تو وہ بری ہو جائے گا۔عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي خُطْبَتِهِ : "اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ"۔

ترجمہ:'' عمرو ابن شعیب اپنے والد سے،وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم

ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1341)''۔

پس صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے کہ زید کے پاس اپنے حقِ ملکیت کے ثبوت میں تمام ''تحریری شواہد'' موجود ہیں تو وہ انہیں عدالت میں پیش کرے، اگر ان شواہد سے عدالت مطمئن ہو جاتی ہے تو اس کے حق میں فیصلہ دے دے گی ورنہ بکر کو انکارِ دعویٰ کی صورت میں قسم دی جائے گی ۔شرعاً اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی قسم معتبر ہوتی ہے لیکن چونکہ ہمارے معاشرے میں بدقسمتی سے لوگ عام قسم کو خفیف اور معمولی سمجھتے ہیں اور قرآن پر قسم کھانے کو بھاری سمجھتے ہیں کہ اس کا وبال برداشت ہوگا، تو ایسی قسم کھا سکتا ہے یا عدالت ضروری سمجھے تو ایسی قسم دے سکتی ہے۔

بالغ نومسلم کا ختنہ

سوال: 173

بالغ شخص مسلمان ہوجائے تو ختنہ کا کیا حکم ہے اور اس کی کیا صورت ہوگی؟، (قاری محمد شوکت، گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ)۔

جواب:

یہاں بظاہر دو احکامِ شرعی کا ٹکراؤ ہے، ایک یہ کہ سترِ عورت واجب ہے اور دوسرا یہ کہ ختنہ نہ صرف یہ کہ سنتِ انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم ہے بلکہ شعائرِ اسلام میں سے ہے، اسی لئے بعض اوقات کسی گمنام مردانہ میت کو ختنہ سے شناخت کر کے مسلمان قرار دیا جاتا ہے اور اس کا جنازہ پڑھنے کا حکم ہے۔لہٰذا اگر کوئی شخص صاحبِ عزیمت ہے اور خود اپنا ختنہ کی ہمت رکھتا ہے اور اسے اس کا طریقہ بھی آتا ہے، اس طرح کہ اس کی جان کو خطرہ لاحق نہ ہو تو پھر اپنا ختنہ خود کرلے یہ صورت سب سے بہتر ہے۔اگر اتفاق سے کسی نومسلم کی بیوی نرس یا ڈاکٹر ہو اور وہ ختنہ کرنا جانتی ہو تو اپنے شوہر کا ختنہ کر سکتی ہے۔چونکہ ختنہ شعائر

اسلام میں سے ہے، جس طرح کسی مرض کے علاج کے لئے ڈاکٹر کو بقدرِ ضرورت مریض یا مریضہ کے ان جسمانی اعضاء یا حصوں کو دیکھنے کی اجازت ہے، جن کا ستر لازم ہے، اسی طرح نومسلم بالغ مسلم ڈاکٹر سے ختنہ کرا سکتا ہے اور بقدرِ ضرورت شرم گاہ کو عریاں کر سکتا ہے۔ البتہ اگر نومسلم شخص معمّر اور ضعیف ہے اور ڈاکٹر کہے کہ اس کے لئے ختنہ کسی بڑے نقصان کا باعث ہو سکتا ہے تو وہ چھوڑ دے اور ختنہ نہ کرائے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ "جو شخص قریب تیس برس کی عمر میں اسلام قبول کرے اس کی سنّت (ختنہ) کرانا جائز ہے یا ناجائز ہے؟"، آپ نے جواب میں لکھا: "اگر ختنہ کی طاقت رکھتا ہو تو ضرور کیا جائے، حدیث میں ہے کہ ایک صاحب خدمتِ اقدس حضور سید عالم ﷺ میں حاضر ہو کر مشرف با اسلام ہوئے، حضور پُر نور ﷺ نے فرمایا: اَلْقِ عَنْكَ شَعْرَ الْكُفْرِ ثُمَّ اخْتَتِنْ رَوَاهُ الْإِمَامُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوٗدَ عَنْ عُثَيْمِ بْنِ كُلَيْبٍ اَلْحَضْرَمِيِّ الْجُهْنِيِّ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ۔

ترجمہ: "اپنے زمانۂ کفر کے بالوں کو دور کرو پھر اپنا ختنہ کرو (یہ حدیث امام احمد اور امام ابوداؤد نے عثیم بن کلیب حضرمی جُہنی سے، اس نے اپنے باپ سے اور اس نے اپنے دادا سے روایت کی ہے)۔ ہاں! اگر خود کر سکتا ہو تو آپ اپنے ہاتھ سے کر لے یا کوئی عورت جو اس کام کو کر سکتی ہو ممکن ہو تو اس سے نکاح کرا دیا جائے وہ ختنہ کر دے، اس کے بعد چاہے اُسے چھوڑ دے اور اگر یہ صورتیں نہ ہو سکیں تو حجام ختنہ کر دے کہ ایسی ضرورت کے لئے ستر دیکھنا منع نہیں، درمختار میں ہے: يَنْظُرُ الطَّبِيْبُ اِلٰى مَوْضِعِ مَرَضِهَا بِقَدْرِ الضَّرُوْرَةِ اِذِ الضَّرُوْرَاتُ تَتَقَدَّرُ بِقَدْرِهَا وَكَذَا نَظَرُ قَابِلَةٍ وَّخَتَّانٍ۔

ترجمہ: "بقدرِ ضرورت طبیب جائے مرض (خواہ وہ جائے پردہ ہو) کو دیکھ سکتا ہے، اور ضروراتِ (شرعیہ) اپنی حد تک محدود رہتی ہیں (یعنی اس میں شرم وحیا ملحوظ رہے، حدِ ضرورت سے تجاوز نہ ہو اور حظِّ بصر اور لذّتِ نظر مقصود نہ ہو)، اسی طرح دایہ اور ختنہ کرنے والے کا معاملہ ہے"۔ آگے چل کر درمختار کے حوالے سے لکھتے ہیں: اَلظَّاهِرُ فِي

الْکَبِیْرِ اَنَّہٗ یُخْتَنُ۔ ترجمہ:"اور ظاہر یہ ہے کہ بالغ آدمی کا بھی ختنہ کیا جائے۔
ردالمحتار میں ہے:اَلْخِتَانُ مُطْلَقٌ یَشْمَلُ خِتَانَ الْکَبِیْرِ وَالصَّغِیْرِ وَھٰکَذَا اَطْلَقَہٗ فِی النِّھَایَۃِ کَمَا قَدَّمْنَاہُ وَاَقَرَّہُ الشُّرَّاحُ وَالظَّاھِرُ تَرْجِیْحُہٗ وَلِذَا عَبَّرَ ھُنَا عَنِ التَّفْصِیْلِ بِقِیْلَ۔
ترجمہ:"ختنہ کرنے کا حکم مُطلَق (بلا قید ذکر کیا) ہے، لٰہذا یہ حکم بڑے اور چھوٹے دونوں کو شامل ہے اور اسی طرح "نھایہ" میں اسے مطلق رکھا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور شارحین نے اس کو برقرار رکھا ہے، بظاہر یہی راجح ہے اس لئے یہاں لفظ قیل سے تفصیل کی تعبیر فرمائی گئی۔
ہندیہ میں ہے: ذَکَرَ الْکَرْخِیُّ فِی الْجَامِعِ الصَّغِیْرِ وَیَخْتِنُہُ الْحَمَّامِیُّ کَذَا فِی الْفَتَاوٰی الْعَتَّابِیَّۃِ۔
ترجمہ:"امام کرخی نے جامع صغیر میں فرمایا کہ بالغ آدمی کا ختنہ حمام والا (یعنی حجام) کرے یونہی فتاویٰ عتابیہ میں مذکور ہے،(آج کل ڈاکٹر کی خدمت حاصل کرسکتا ہے)۔خلاصہ میں ہے:اَلشَّیْخُ الضَّعِیْفُ اِذَا اَسْلَمَ وَلَا یُطِیْقُ الْخِتَانَ اِنْ قَالَ اَھْلُ الْبَصَرِ لَایُطِیْقُ یُتْرَکُ۔
ترجمہ:"بہت بوڑھا شخص اگر اسلام قبول کرے اور بوجہ ضعف وکمزوری ختنہ نہ کرسکے یا نہ کراسکے تو اگر ماہرین طب یہ کہیں کہ (واقعی یہ شخص) ختنہ کے قابل نہیں، تو اسے بلا ختنہ ہی رہنے دیا جائے اور اس کا ختنہ نہ کیا جائے"۔
(فتاویٰ رضویہ جلد 22،ص:593 تا 595، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن،لاہور)

کیا استخارے سے چوری کا جرم ثابت ہوسکتا ہے؟

سوال: 174

زید کا موبائل چوری ہوگیا، جس کے لئے عمرو نے استخارہ کرکے بتایا کہ بکر نے موبائل چوری کیا ہے، مگر بکر انکار کرتا ہے۔تینوں نے حلف اٹھانے کا فیصلہ کیا، عمرو اپنے ساتھ قرآن لایا اور کہا کہ: میں اس پر ہاتھ رکھوں گا اور رکھواؤں گا۔لوگوں نے کہا کہ یہاں دیگر قرآن

پاک بھی تو ہیں، ان پر ہاتھ کیوں نہیں رکھواتے؟، اس پر عمرو نے کہا کہ یہ میرا خاص قرآن ہے، سوال یہ ہے: (۱)۔ اس ضمن میں استخارے کی کیا حیثیت ہے، کیا استخارے سے چوری کا پتہ چل جاتا ہے؟۔ (۲)۔ کیا اتنی چھوٹی سی بات پر قرآن اٹھانا جائز ہے؟۔

(محمد آصف ہزاروی، سرجانی ٹاؤن، کراچی)

جواب:

استخارہ کے لفظی معنٰی ہیں: خیر طلب کرنا اور اس کے جامع معنٰی ہیں: ایسا مباح معاملہ جس کے نفع بخش یا نقصان دہ ہونے کا انسان اپنی عقل کی روشنی میں فیصلہ نہ کر سکے اور تردُّد میں مبتلا ہو جائے کہ اسے کروں یا نہ کروں، تو اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرے، اس کا تعلق ماضی کے معاملات سے نہیں ہے، مستقبل میں درپیش ایسے معاملات سے ہے، جن کو کرنا ہے۔

''استخارہ'' کی روح یہ ہے کہ جس بندے کو کوئی مسئلہ درپیش ہے، وہ خود استخارہ کرے، کیونکہ جتنا درد، شکستگیِ دل، حضوریِ قلب، تضرُّع و عاجزی کسی شخص کو اپنے معاملے میں ہو سکتی ہے، دوسرے شخص کو نہیں ہو سکتی۔ حدیث میں ہے: رب ذوالجلال فرماتا ہے: ترجمہ: میں ان کے پاس ہوتا ہوں، جو میری (خشیت و محبت اور انکسار کی) وجہ سے شکستہ دل رہتے ہیں، (الاسرار المرفوعہ، رقم الحدیث: 249، کشف الخفاء ج 1 ص: 232، الشفاء قاضی عیاض مالکی ج 1 ص: 78)''۔

وہ لوگ جو استخارے کے نام پر ماضی کے احوال بتاتے ہیں، مثال کے طور پر کسی پر کالا جادو ہو گیا ہے، سفلی عمل کر دیا گیا ہے، چند سیکنڈ میں یہ تمام غیبی امور ان پر منکشف ہو جاتے ہیں اور ایک ہی لمحے میں ان کا حل بھی نکل آتا ہے، اس کا ہمیں علم نہیں ہے، اس سے لوگ توہُّم پرستی اور تشکیک میں مبتلا ہوتے ہیں، تقدیرِ الٰہی پر رضا جو مومن کا شعار ہونا چاہیے، اُس میں کمزوری واقع ہوتی ہے۔ پھر لوگ کسی مشکل صورتِ حال میں، جب انہیں کوئی فیصلہ کن راہ بجھائی نہ دے، اللہ تعالیٰ کی ذات سے براہِ راست رجوع کرنے اور اس کے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے توسُّل کے بجائے،

اِس روش کو ترک کر کے، اِس طرح کے عاملوں سے رجوع کرتے ہیں۔ استخارہ تو مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرنے کا نام ہے۔
استخارے کا مفہوم ہرگز یہ نہیں کہ کسی چور کا پتا چل جائے یا ماضی میں ہونے والے کسی واقعے کی تصدیق یا تکذیب کی جا سکے یا حقائق معلوم کئے جا سکیں، اگر ایسا ہوتا تو آج دنیا بھر میں ہونے والے جرائم قتل و غارت گری کے ملزمان کا انہی عاملوں کے ذریعے پتا چلا لیا جاتا، لہٰذا مذکورہ شخص عمرو کی بات درست معلوم نہیں ہوتی۔
امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''کیا کسی سچی بات کے لئے قرآن کی قسم کھانا یا اس کا اٹھا لینا گناہ ہے؟، آپ نے جواب میں لکھا: جھوٹی بات پر قرآن مجید کی قسم کھانا یا اٹھانا سخت گناہِ کبیرہ ہے اور سچی بات پر قرآن عظیم کی قسم کھانے میں کوئی حرج نہیں، ضرورت ہو تو اُٹھا بھی سکتا ہے، مگر اس قسم کو بلا ضرورت بہت سخت نہیں کرنا چاہئے''۔

مُخنّث (ہیجڑوں) سے متعلق ضروری مسائل

سوال: 175

اگر مُخنّث کا انتقال ہو جائے تو کیا اس کی میت کو غسل دینا واجب ہے؟، اسے کون غسل دے گا؟، کیا اس کی نمازِ جنازہ بھی فرضِ کفایہ ہے؟، اگر ہے تو کون سی دعا پڑھی جائے گی؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہیجڑے کی نمازِ جنازہ نہیں ہوتی اور اسے رات کی تاریکی میں دفن کیا جاتا ہے، کیا یہ درست ہے؟، کیا یہ لوگ احکامِ شرعیہ کے مُکلّف ہوتے ہیں؟، کیا مُخنّث کو خیرات دینا جائز ہے؟، (مولانا محمد طاہر سرفراز، آزاد کشمیر)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ تخلیق سے انسان کو پیدا کیا اور اس کی دو اصناف (Gender) بنائیں، ایک مذکر (Male) اور دوسری مؤنث (Female)۔ ان دونوں کے ذریعے انسانی نسل کی افزائش اور توالد و تناسل کا نظام قائم فرمایا۔ دونوں کی جسمانی ساخت اور ہیئت ایک دوسرے سے ممتاز رکھی۔ ازدواجی زندگی میں دونوں کا وظیفۂ

عمل بھی اپنا اپنا رکھا اور دونوں کی جسمانی علامات بھی ایک دوسرے سے ممتاز رکھیں۔ بعض عوارض میں بھی دونوں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ان دونوں کے درمیان ایک تیسری صنف بھی پیدا فرمائی جسے ''مُخنث'' کہتے ہیں۔انگریزی میں انہیں isexual، Intersexual اور Hermaphrodite کہتے ہیں، آج کل انہیں میڈیا میں She Male کہا جاتا ہے، جیسے گونگے بہرے یا انتہائی معذور بچوں کو Special Children کہتے ہیں۔

Eunuchs یا مخنث کا لفظ بالعموم ان مردوں کے لئے مستعمل ہے جو باطنی وظاہری مردانہ خصوصیات سے محروم ہوں، چاہے کسی پیدائشی نقص کے نتیجے میں یا بعد میں جان بوجھ کر کردیئے گئے ہوں یا حادثاتی طور ہو گئے ہوں۔کسی بھی انسان کی جنسی خصوصیات کا متعین ہونا ایک پیچیدہ عمل ہے جس میں متعدد عوامل کارفرما ہوتے ہیں تاہم آسان طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ جنس کا تعین تین سطحوں پر ہوسکتا ہے۔

(1) Sex Chromosomal یعنی وہ جنس جو ''حیاتی گچھا'' کی ساخت کے نتیجے میں متعین ہوتی ہے ایک تندرست فرد کے اندر (46) کروموسوم یہ خلیے کے مرکز میں موجود ہوتے ہیں، اس میں سے (2) جنسی معاملات سے متعلق ہوتے ہیں، ایک تندرست عورت کے اندر دونوں کروموسوم x x (الگ کا لفظ x) ہوتے ہیں۔ اور تندرست مرد کے اندر XY (2) Gonadal یعنی جس کا وہ تعین جو زنانہ یا مردانہ فوطوں کی موجودگی پر منحصر ہے مردوں میں Testis یا خصیے اور عورتوں میں Ovary یا بیضہ دانی

(3) Genital Sex یعنی ظاہری آلۂ تناسل کی شکل وصورت کے باعث متعین ہونے والی صنفیں، مردوں میں یہ آلۂ تناسل Penis ہے اور عورتوں میں Vagina یعنی فرج۔ اس کے بعد جسم میں مختلف غدود ہیں جو مختلف Hormones پیدا کرتے ہیں۔ہارمونز ایسی رطوبتیں ہیں جو خون میں شامل ہو کر مختلف اعضاء کی نشوونما اور ان کی مسلسل ومناسب کارکردگی کا باعث بنتی ہیں۔ان کی کمی یا بیشی کی وجہ سے انسانی جسم کے بہت سے اعضاء وافعال میں نقص آسکتا ہے جس میں Gonads اور Genitalia بھی شامل ہیں۔

کسی شخص کی غیر متعین جنس کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں:

1۔ ظاہراً مرد غالب زنانہ خصوصیات کے ساتھ

2۔ ظاہراً عورت مردانہ خصوصیات کے ساتھ

3۔ ایک ہی فرد میں دونوں فوطوں کی موجودگی یعنی Hermaphrodites

4۔ Interest یا بالکل غیر متعین جنس

فقہی اعتبار سے مُخنث وہ ہے جس میں مرد اور عورت دونوں کی علامتیں پائی جائیں اور کسی ایک جانب کو ترجیح نہ دی جاسکتی ہو۔ اگر بلوغت سے پہلے یا بعد میں کوئی ایسی علامت پائی جائے جو کسی ایک صِنف کے زیادہ قریب ہو تو اُس پر اُسی کا حکم عائد ہوگا، اگر مذکر کی علامت غالب ہو تو اسے مردوں کے زمرے میں شامل سمجھا جائے گا۔ اور اگر مؤنث کی علامت غالب ہو تو اسے عورتوں کے زمرے میں شامل سمجھا جائے گا۔

امام اعظم ابوحنیفہ نے ایک اور علامت بھی بتائی ہے، وہ یہ کہ اگر وہ "مُخنث" پیشاب کی ابتدا علامتِ ذکور (Male) سے کرتا ہے، تو اسے مردوں کے زمرے میں شامل کردیں گے اور اگر علامتِ اناث (Female) سے کرتا ہے، تو اسے عورتوں کے زمرے میں شامل کردیں گے، اگر ایسا امتیاز بھی ممکن نہ ہو اور کسی ایک جانب کی علامت غالب نہ ہو تو وہ "خُنثیٰ مُشکِل" ہے۔ اگر وہ چھوٹی عمر کا ہو اور حدِ شہوت کو نہ پہنچا ہو اور اس کا انتقال ہو جائے تو مرد اور عورت دونوں ہی اسے غسل دے سکتے ہیں۔ اگر بلوغت کے قریب عمر کو پہنچ کر وفات پائے یا بلوغت کو پہنچ کر وفات پائے، تو اسے غسل نہیں دیا جائے گا بلکہ تیمم کرائیں گے، اگر تیمم کرانے والا محرم ہے تو اپنے ہاتھ سے براہِ راست تیمم کرا سکتا ہے، ورنہ ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر تیمم کرائے۔ اگر وہ بچپن میں وفات پائے تو نمازِ جنازہ میں تیسری تکبیر کے بعد بچے والی دعا پڑھی جائے گی۔ اگر بلوغت کے قریب عمر کو پہنچ کر یا بالغ ہو کر وفات پائے، تو بالغ والی دعا پڑھی جائے گی، بہر کیف اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ اس کی قبر عام مسلمانوں کی قبر کی طرح بنائی جائے گی۔ اسے قبر میں عام مسلمانوں کی طرح قبلہ رُو

رکھا جائے گا، بہتر یہ ہے کہ اسے خواتین کی میت کی طرح اس کے محرم ہی (اگر موجود ہیں تو) باپردہ قبر میں اتاریں، اسے کفن بھی حسبِ معمول پہنایا جائے گا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مُخنّث کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جاتی اور اسے رات میں عام لوگوں سے خفیہ طور پر جنازے کے بغیر ہی دفن کیا جاتا ہے، یہ شرعاً غلط ہے۔ اگر کچھ لوگوں نے اپنی جہالت کی بنا پر اسے جنازے کے بغیر دفن کر دیا اور اگر اس کی میت تازہ ہو تو قبر پر نمازِ جنازہ پڑھ لی جائے۔ اگر وہ مستحق ہے تو اسے زکوٰۃ و خیرات دی جاسکتی ہے اور دینی چاہئے۔ وہ ایمان لانے اور احکامِ شرعیہ کا مُکلّف ہے، اگر نماز با جماعت میں شریک ہے، تو بچوں کے بعد والی صف میں کھڑا ہو، اسی طرح اس پر روزہ بھی فرض ہے۔ اگر استطاعت ہے اور محرم کی رفاقتِ سفر بھی دستیاب ہے تو حج بھی فرض ہے۔ اگر بچپن میں ختنہ نہ کیا ہو تو بلوغت کے قریب پہنچنے یا بالغ ہونے کے بعد اس کا ختنہ نہ کیا جائے۔ ہمارے فقہاء نے اس کی بعض صورتیں بیان فرمائی ہیں، جن کا تذکرہ یہاں مناسب نہیں ہے۔ فقہاء نے ان کے وراثتی احکام بھی بیان فرمائے ہیں، جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ان کے اس جسمانی نقص یا کمزوری کی وجہ سے ان سے نفرت نہ کی جائے۔ یہ عام انسانوں کی طرح اللہ کی مخلوق ہیں اور ان کی یہ ہیئتِ تخلیق اللہ تعالیٰ کی حکمت اور تکوینی امر کے تحت ہے۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ ان سے ہمدردی کی جائے، اگر یہ لوگ اپنے خاندانوں سے بچھڑے ہوئے ہیں تو حکومت یا دین دار اہلِ خیر ان کے لئے دارالکفالت بنائیں، یہ بہت بڑی انسانی خدمت ہوگی۔

رخصتی سے قبل شوہر کے انتقال پر عدت، مہر، تقسیمِ ترکہ وغیرہ سے متعلق 12 سوالات پر مشتمل تفصیلی فتویٰ

مؤدبانہ عرض یہ ہے کہ میری بیٹی سحرش خان بنت عقیل احمد خان کا نکاح ستمبر 2003ء میں محمد راشد الحق ولد رضاء الحق سے ہوا، ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی، لڑکا بیرونِ ملک ملازمت کرتا تھا، رخصتی 2005ء میں ہونی تھی۔ اسی اثناء میں لڑکے کا بیرونِ ملک 10 مارچ 2005ء کے دن ایکسیڈنٹ میں فوری طور پر انتقال ہوگیا، اس کا جسدِ خاکی

17 مارچ 2005ء کے دن پاکستان میں سپردِخاک کیا گیا۔
اب مجھے مندرجہ ذیل باتوں کے لئے قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی درکار ہے، میرے بارہ سوالات درج ذیل ہیں، (رضوان احمد خان، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

نوٹ: چونکہ ایک ہی استفتاء میں بارہ سوالات دریافت کیے گئے ہیں، اس لئے ہم ترتیب وار ہر سوال درج کر کے اس کے آگے اس کا جواب درج کر رہے ہیں۔

سوال(1):176

دورانِ عدت لڑکی اپنی نوکری پر صبح جا کر دوپہر ایک بجے تک واپس آسکتی ہے یا نہیں؟۔

(نوٹ: محترمہ گورنمنٹ اسکول میں سروس کرتی ہیں)

جواب:

قرآن مجید میں عدت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔

ترجمہ: ''اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں چار مہینے دس دن اپنے آپ کو (اپنے آپ کو نکاح کرنے سے) روکے رکھیں، پھر جب وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو کوئی حرج نہیں تم پر اس بات میں جو دستور (شرع) کے موافق وہ اپنے حق میں فیصلہ کریں، (البقرہ:234)''۔

عورت کو زمانہ عدت میں گھر سے نکلنا حرام ہے، ہاں! اگر عدت موت کی ہو اور اس کے پاس کھانے کو نہ ہو، بغیر گھر سے نکلے کام نہ چل سکے گا، تو روزگار کے لئے ضرورت کے تحت گھر سے باہر جاسکتی ہے اور رات اسی گھر میں گزارے۔ اور بغیر ضرورت شرعیہ نکلنا حرام ہے۔ چونکہ محترمہ سرکاری ملازمہ ہیں، اور حکومت پاکستان کے احکام کے تحت بیوہ کو عدت وفات کی باقاعدہ باتنخواہ رخصت ملتی ہے، اس لئے اسے گھر سے نکلنے کیلئے کوئی شرعی جواز

نہیں ہے۔تنویرالابصاروالدرالمختار میں ہے:

(وَ)الْعِدَّۃُ(لِلْمَوْتِ أَرْبَعَۃُ أَشْھُرٍ وَّعَشْرَۃٌ مُطْلَقًا)وُطِئَتْ أَوْ لَا وَلَوْ صَغِیْرَۃً،

ترجمہ:اور موت کی عدت مطلقاً چار ماہ دس دن ہے بیوی مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ،اگرچہ نابالغہ ہو،(درمختار جلد 5ص:150 داراحیاءالتراث العربی،بیروت)۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:وفات کی عدت عورتِ غیر حامل پر مطلقاً چار ماہ دس دن ہے خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ،مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ۔

(فتاویٰ رضویہ جلد 13ص:293 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن،لاہور)۔

ایامِ عدت میں جن وجوہات کی بناء پر عورت گھر سے باہر نکل سکتی ہے فقہائے کرام اس کی وضاحت فرماتے ہیں،تنویرالابصاروالدرالمختار میں ہے:

(وَمُعْتَدَّۃُمَوْتٍ تَخْرُجُ فِی الْجَدِیْدَیْنِ،وَتَبِیْتُ)اَکْثَرَ اللَّیْلِ(فِیْ مَنْزِلِھَا)لِاَنَّ نَفَقَتَھَا عَلَیْھَا،فَتَحْتَاجُ لِلْخُرُوْجِ،

ترجمہ:"اور جو عورت عدت وفات گزار رہی ہو،وہ بوقت ضرورت دن یا رات میں نکل سکتی ہے،لیکن رات کا اکثر حصہ گھر میں گزارے،اس لئے کہ وہ اپنے اخراجات کی ذمہ دار خود ہے،پس وہ اس کے لئے باہر نکلنے کی محتاج ہے"۔نوٹ:"جدیدین"سے دن اور رات مراد ہیں،کیونکہ گردش لیل ونہار کی وجہ سے ہر روز نیا دن اور نئی رات طلوع ہوتی ہے۔

(درمختار جلد 5صفحہ 180،مطبوعہ داراحیاءالتراث العربی،بیروت)

علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود لکھتے ہیں:

وَاَمَّاالْمُتَوَفّٰی عَنْھَا زَوْجُھَا فَلَا تَخْرُجُ لَیْلًا،وَلَا بَاْسَ بِاَنْ تَخْرُجَ نَھَارًافِی حَوَائِجِھَا لِاَنَّھَاتَحْتَاجُ اِلَی الْخُرُوْجِ بِالنَّھَارِ لِاِکْتِسَابِ مَاتُنْفِقُہٗ،لِاَنَّہٗ لَا نَفَقَۃَ لَھَا مِنَ الزَّوْجِ الْمُتَوَفّٰی بَلْ نَفَقَتُھَاعَلَیْھَا،فَتَحْتَاجُ اِلَی الْخُرُوْجِ لِتَحْصِیْلِ النَّفَقَۃِ،

ترجمہ:"اور جس عورت کا شوہر وفات پا گیا ہو وہ رات میں گھر سے نہ نکلے،اور اپنی ضروریات کیلئے دن کے وقت نکلنے میں حرج نہیں اس لئے کہ دن کے وقت روزگار کیلئے نکلنا

اس کی ضرورت ہے، کیونکہ اس کا نفقہ اسکے وفات یافتہ شوہر پر نہیں بلکہ وہ خود اس کی ذمہ دار ہے، پس اپنے مصارف کے لئے باہر نکلنا اس کی ضرورت ہے''۔

(بدائع الصنائع جلد 3 صفحہ 299 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات، ھند)

صورتِ مذکورہ میں چونکہ لڑکی اپنے والد کی کفالت میں ہے اور اسے کوئی معاشی ضرورت یا مجبوری بھی درپیش نہیں ہے، لہٰذا عدت کے ایام میں گھر سے نہ نکلے۔

سوال(2):177

مرنے والے کے ترکے میں بیوی کا کتنا حصہ بنتا ہے؟ جبکہ میت کے ورثاء میں والد، چار بھائی اور تین بہنیں ہیں۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں تقسیمِ وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی ہو، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر کوئی متوفٰی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 4 حصوں میں منقسم ہوگا، مرحوم کے والد کو 3 حصے، زوجہ کو 1 حصہ ملے گا، باپ کی موجودگی میں متوفٰی کے بھائی اور بہنیں محروم ہوں گے۔

سوال(3):178

نکاح کے وقت جو زیورات اور کپڑے دیئے گئے وہ واپس ہونگے یا نہیں؟۔

جواب:

شادی کے موقعے پر دلہن کو شوہر یا سسرال والوں کی جانب سے جو زیورات، لباس، سامان اور تحائف وغیرہ ملتے ہیں، اسے عرف عام میں ''بری'' کہا جاتا ہے۔ بری کے سامان کی ملکیت واستحقاق کا مسئلہ ہمارے معاشرے میں نارمل حالات میں اٹھتا ہی نہیں ہے، اگر عائلی وازدواجی زندگی خوشگوار ہے، باہم محبت ہے، سب معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں، تو اس طرح کے سوالات خواب وخیال میں بھی نہیں آتے چہ جائے کہ عملی زندگی

میں ان کو چھیڑا جائے۔ تاہم ان کی ممکنہ صورتیں اور ان کے احکام درج ذیل ہیں:

(الف) یہ کہ کسی علاقے، کمیونٹی یا برادری میں یہ معروف اور طے شدہ اصول ہو کہ بری کا سامان شوہر یا اس کے خاندان کی ملکیت ہوتا ہے، تو عرف بھی نصِ شرع کی طرح ہوتا ہے اور اسی پر معاملات کا فیصلہ ہوگا اور عورت کے لئے محض تصرف واستعمال کی اجازت ہی سمجھی جائے گی۔ اور طلاق کی صورت میں وہ سامان شوہر کا ہوگا اور اس کی وفات کی صورت میں وہ اس کے ترکے میں شمار ہوگا۔

(ب) شادی کے موقع پر اگر باقاعدہ تحریری طور پر یا زبانی طے کرلیا گیا ہو کہ بری کا سامان کس کی ملکیت ہوگا؟، تو بعد میں اسی کے مطابق عمل ہوگا اور بہتر یہی ہے کہ شادی کے موقع پر نکاح نامے میں یہ درج کرادیا جائے کہ بری کے زیورات اور سامان کس کی ملکیت ہوں گے تاکہ بعد میں خدانخواستہ طلاق یا شوہر کی وفات کی صورت میں تنازع نہ پیدا ہو۔

(ج) شادی کے موقع پر یہ سامان دلہن کو ہبہ (GIFT) کردیا گیا ہو، لیکن بعد میں زوجین میں اختلافات رونما ہونے کی بناء پر نیت میں فتور آجائے تو ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے کو حدیثِ پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) اَلْعَائِدُ فِیْ هِبَتِهٖ کَالْعَائِدِ فِیْ قَیْئِهٖ۔

ترجمہ: ''ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کرکے دوبارہ اسے چاٹ لے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4171)''۔

(۲) مَثَلُ الَّذِیْ یَرْجِعُ فِیْ صَدَقَتِهٖ کَمَثَلِ الْکَلْبِ یَقِیْٔ ثُمَّ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِهٖ فَیَأْکُلُهٗ۔

ترجمہ: ''جو شخص صدقہ کرکے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4167)''۔

فقہ حنفی کی رو سے بیوی کو ہبہ کرنے کے بعد اُس سے رجوع نہیں ہوسکتا۔

امام احمد رضا قادری فرماتے ہیں: ''دلہن کا گہنا جوڑا جو بری میں جاتا ہے، اگر نصاً یا عرفاً اس

میں بھی تملیک ہوتی ہو، جیسے شکر، میوہ، عطر پھلیل وغیرہ میں مطلقاً ہوتی ہے، تو وہ بھی قبضۂ منکوحہ، ملکِ منکوحہ ہوگا، ہمارے یہاں شرفاء کا عرفِ ظاہر یہی ہے، ولہٰذا بعد رخصت اس کے واپسی لینے کو سخت معیوب و موجبِ مطعونی جانتے ہیں، اور اگر لے لیں تو طعنہ زن یہی کہتے ہیں کہ دے کر پھیر لیا یا صرف دکھانے کو دیا تھا، جب دلہن آئی چھین لیا، یعنی یہ ان کی رسمِ معہود (UNDERSTOOD MARITAL CUSTOM) کے خلاف ہے، اس صورت میں تو اس کے لئے بعینہٖ وہی احکام ہوں گے جو دولہا کے جوڑے میں گزرے کہ بعد ہلاک دلہن سے تاوان لینے کا اصلاً اختیار نہیں، جیسے شکر، میوہ کا تاوان بننے کے بعد نہیں مل سکتا، اگرچہ ہنوز کھانے میں نہ آیا ہو......

آگے چل کر لکھتے ہیں...... ہاں جہاں عرف تملیک نہ ہو بلکہ صرف پہنانے کے لئے بھیجا جاتا اور بنانے والوں ہی کی ملک سمجھا جاتا ہو، وہاں دلہن کی ملک نہیں، ایک عاریت ہے کہ بحالتِ بقا جس سے رجوع ہر وقت جائز و حلال''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج ۱۲، ص ۲۰۸، رضا فاؤنڈیشن۔لاہور)

میری دانست میں ہمارے یہاں بھی معزز خاندانوں اور شرفا کا معمول اور عرف یہی ہے کہ بری کا سامان و زیورات وغیرہ دلہن کو بطورِ ملک دیئے جاتے ہیں اور وہ ان پر مالکانہ تصرف کرتی رہتی ہے، تاہم جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، اگر کسی خاندان، برادری، کمیونٹی یا علاقے کا رواج اور عرف یہی ہے کہ بری کے زیورات اور سامان دلہن کو عاریتاً محض استعمال کے لئے دیئے جاتے ہیں نہ کہ ملکیت کے طور پر، تو وہ اپنے عرف پر ان کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔

سوال(4):179

مہر ادا ہوگا یا نہیں؟

جواب:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَيَتَأَكَّدُ (عِنْدَ وَطْءٍ اَوْ خَلْوَةٍ صَحَّتْ) مِنَ

الزَّوْجِ(اَوْ مَوْتِ اَحَدِھِمَا)

ترجمہ: ''اور منکوحہ سے وطی یا خلوتِ صحیحہ کی صورت میں یا زوجین میں سے کسی ایک کی موت واقع ہونے پر بیوی کا حق مہر مؤکد ہو جائیگا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4 ص:170، داراحیاء التراث العربی)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَالْمَهْرُ يَتَأَكَّدُ بِأَحَدِ مَعَانٍ ثَلَاثَةٍ اَلدُّخُولُ وَالْخَلْوَةُ الصَّحِيحَةُ وَمَوْتُ اَحَدِ الزَّوْجَيْنِ

ترجمہ: ''اور مہر تین باتوں میں سے کسی ایک کے پائے جانے پر مؤکد ہو جائے گا یعنی مباشرت یا خلوتِ صحیحہ یا زوجین میں سے کسی ایک کی موت واقع ہونے پر''۔

(فتاویٰ عالمگیری ج ا ص ۳۰۳، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

اعلیٰحضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز اسی سے ملتے جلتے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: '' جب شوہر مر جائے پورا مہر واجب ہوتا ہے اگرچہ ایک نے دوسرے کی صورت نہ دیکھی ہو اور چار مہینے دس دن کی عدت فرض ہے، اس سے پہلے نکاح حرام ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 12 ص:176 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔''

مندرجہ بالا حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ اُس فوت شدہ شخص کی بیوہ کو پورا مہر دیا جائے گا، اور اس کی ادائیگی تقسیم ترکہ سے پہلے ہوگی، جیسے قرض کی ہوتی ہے۔

سوال(5):180

مرنے والے نے اپنی زندگی میں اگر اپنی بیوی کے نام رقم یا اپنا انشورنس کیا ہو تو وہ بیوی کی ملکیت ہے یا ترکے میں شامل کیا جائے گا؟۔

جواب:

اگر وفات شدہ شوہر نے اپنی زندگی میں کوئی رقم، جائیداد یا چیز اپنی بیوی کے نام پر کردی ہو اور بیوی کا اس پر قبضہ مکمل ہو چکا ہو تو یہ ہبہ کہلاتا ہے اور اب وہ چیز بیوی کی ملکیت متصور ہوگی۔ ہاں اگر شوہر نے کسی بینک اکاؤنٹ یا انشورنس پالیسی میں بیوی کو نامزد

(Nominate) کیا ہو تو اس کی حیثیت وصیت کی ہے اور وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ فَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ"۔

ترجمہ: "بیشک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے"۔

(سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862)

اگر گروپ انشورنس میں نامزدگی کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ Employer ادارہ اپنی طے شدہ پالیسی کے تحت بیوہ ہی کو دیتا ہے، تو پھر وہ از قسمِ تبرُّع ہے، اس کا وراثت یا ترکے سے کوئی تعلق نہیں ہے، ادارہ اپنے قانون یا طے شدہ پالیسی کے تحت جس کے نام ڈرافٹ جاری کرتا ہے، وہی اس کا حق دار ہوگا۔

سوال (6): 181

مرنے والے کی فرم کے بقایا جات اگر بیوی کے نام ہوں تب وہ بیوی کی ملکیت ہے یا وہ رقم ترکے میں شامل کی جائے گی؟۔

جواب:

متوفّی کی فرم کے بقایا جات اگر بصورتِ حیات یا وفات اس کا استحقاق ہے، جسے عدم ادئیگی کی صورت میں عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہو، تو اس کی حیثیت ترکے کی ہے اور وہ شرعی اصولوں کے مطابق تمام جائز شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ اور اگر وہ اس کا استحقاق نہیں بلکہ کوئی فرم، ادارہ یا حکومت اپنی صوابدید سے تبرعاً اپنے فوت شدہ سابق ملازم کی بیوہ کو کچھ رقم ادا کرتی ہے، تو وہ اس کا حق ہے، جیسے حکومت وفات شدہ شوہر کی پینشن اس کی بیوہ کو دیتی ہے، اور اگر بیوہ نہیں ہے تو نابالغ بچوں کو دیتی ہے، تو یہ ترکہ نہیں ہے، حکومت یا متعلقہ ادارے کا صوابدیدی فیصلہ یا قانون ہے جو مؤثر ہے اور اس میں ترکہ جاری نہیں ہوگا۔

سوال(7):182

مرنے والے نے اگر رخصتی میں بیوی کو دینے کیلئے زیورات بنوائے تھے۔ وہ اب بیوی کی ملکیت ہیں یا ترکے میں دیئے جائیں گے؟

جواب:

وفات شدہ شوہر نے جو زیورات وغیرہ بیوی کو دینے کی نیت سے بنائے تھے، مگر دیئے نہیں، وہ ترکہ ہے اور مجموعی ترکے میں شامل ہو کر تمام ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہو گا۔

سوال(8):183

مرنے والے کی بڑا گھر لینے کی اور ماں، باپ کو حج کروانے کی خواہش تھی۔ اب یہ خواہشات ترکے سے پوری ہوں گی یا ختم ہو گئیں؟۔ (نوٹ: ماں کا انتقال 5 سال قبل ہو چکا تھا)

جواب:

اس کا ترکے سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہاں اگر اس نے باقاعدہ وصیت کی ہو کہ میری وفات شدہ ماں کا حج بدل میرے ترکے میں سے کرایا جائے، تو اس کی حیثیت وصیت کی ہو گی اور تہائی ترکے کی حد تک نافذ العمل ہو گی، محض خواہش کو وصیت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

سوال(9):184

مرنے والے نے اپنی بھانجیوں کی شادی کیلئے بھانجیوں کے نام سے جو رقم جمع کی اب وہ رقم بھانجیوں کو دی جائے گی یا ترکے میں شامل کی جائے گی؟۔

جواب:

بھانجے بھانجیوں کی شادی کیلئے متوفّٰی نے جو رقم جمع کر رکھی تھی یا مختص کر رکھی تھی، لیکن اپنی زندگی میں انہیں نہیں دی، تو یہ رقم بھی مجموعی ترکے میں شامل ہو کر شرعی وارثوں میں اسلام کے قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہو گی، اور صورتِ مسئولہ میں بھانجے بھانجیاں

اس کے ورثاء میں شامل نہیں ہیں، ہاں اگر یہ لوگ نادار ہیں تو تقسیم ترکہ کے وقت اگر سب ورثاء برضاورغبت انہیں تقسیم سے پہلے کچھ دیدیں تو قرآن کی رو سے یہ مستحسن امر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًاo وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًاO

ترجمہ:''اور جب (ترکے کی) تقسیم کے موقع پر (غیر وارث) رشتے دار اور یتیم اور محتاج آجائیں تو انہیں (بھی) اس میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہوo اور وہ لوگ (جو وراثت میں حصے دار ہیں یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ اپنے پیچھے کمزور (و بے سہارا) اولاد چھوڑ گئے ہوتے تو انہیں انکے بارے میں خدشات ہوتے، پس انہیں چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات کہیں، (النساء:9-8)''تقسیم ترکہ کے بعد ہر وارث کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔

سوال(10):185

مرنے والے کو نکاح کے وقت انگوٹھی، گھڑی اور کپڑے دیئے گئے تھے، وہ اب کس کی ملکیت ہیں؟۔

جواب:

وفات پانے والے شوہر کو شادی کے وقت جو تحائف دیئے گئے بظاہر یہ ھبہ کے حکم میں ہیں، اس لئے یہ اشیاء بھی مجموعی ترکے میں شامل ہونگی۔

سوال(11):186

مرنے والے کی ملکیت کا حساب مکمل طور پر کس طرح سے کیا جائے گا؟۔

جواب:

یہ لایعنی سوال ہے۔

سوال(12):187

ترکے کی تقسیم کون کرے گا؟،باپ،بیوی یا بھائی؟۔

جواب:

ترکے کی تقسیم وہ تمام ورثاءل کر کرتے ہیں،جن کا ترکے میں حصہ ہوتا ہے۔

روڈ انشورنس کی رقم پر کس کا استحقاق ہے؟

سوال :188

میرے شوہر راشدالحق کا بیرونِ ملک ملازمت کے دوران 2005ء میں روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوا۔ترکے،لائف انشورنس کی رقم اور فرم کے بقایا جات وغیرہ سے متعلق میں نے آپ سے فتویٰ 2005ء میں لیا تھا،جس کے مطابق عمل بھی کیا گیا۔ 2006ء میں ہم نے ٹیکسی ڈرائیور کے خلاف مقدمہ کیا تھا،جس کا فیصلہ اب 2008ء میں ہمارے حق میں ہوا ہے،ٹیکسی ڈرائیور کی غلطی سامنے آئی۔چونکہ ڈرائیور نے اپنا روڈ انشورنس کروایا ہوا تھا،بیرون ملک یہ قانون ہوتا ہے کہ اگر کوئی روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہوجائے تو اس کا ہرجانہ انشورنس کمپنی ادا کرے گی۔کمپنی نے مرحوم کی بیوہ (یعنی میرے نام)،والد،مرحوم کے چار بھائیوں اور تین بہنوں کے نام علیحدہ علیحدہ سب کے ناموں کے ساتھ چیک جاری کئے ہیں۔نام بنام یہ رقم ہم سب کی ملکیت ہے یا ترکے میں شمار ہوگی؟۔ 2008ء میں مرحوم راشدالحق کے والد اور ایک بہن (غیر شادی شدہ) کا انتقال ہوگیا ہے۔ اُن کا حصہ کسے ملے گا؟۔(سحرش خان،فیڈرل بی ایریا،کراچی)۔

جواب:

ٹیکسی ڈرائیور کی جانب سے کروائے جانے والے روڈ انشورنس کی مد میں ملنے والی یہ رقم از قسمِ تبرُّع ہے،اس کا وراثت یا ترکے سے کوئی تعلق نہیں ہے،کمپنی اپنے قانون یا طے شدہ پالیسی کے تحت جس کے نام ڈرافٹ جاری کرتی ہے،وہی اس کا حق دار ہوگا اور مذکورہ کمپنی کی جانب سے ہر ایک کے نام چیک جاری کئے گئے ہیں،تو وہی اُس رقم کے حق دار

ہیں، اِس کا شمار ترکے میں نہیں ہوگا۔ متوفی کے والد اور بہن کے نام جو رقم ملی ہے، اب ان کے انتقال کے بعد وہ ان کے شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگی، واللہ اعلم بالصواب

نام رکھنے سے متعلق ضروری مسائل

سوال: 189

کیا "راعنہ" یا راعنا یا رائحہ نام رکھنا درست ہے؟ اگر نام مناسب نہ ہو تو بدل سکتے ہیں؟۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کچھ نام بھاری ہوتے ہیں اور بچے بکثرت روتے رہتے ہیں، چڑچڑے ہوجاتے ہیں، غصیلے ہوجاتے ہیں، بیمار رہنے لگتے ہیں، لہٰذا ایسے نام بدل دینے چاہئیں، خواہ معنوی طور پر وہ نام اچھے ہی کیوں نہ ہوں، کیا شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے؟۔ (یاسر رحمان، ضلع کوٹلی تحصیل نکیال، آزاد کشمیر)۔

جواب:

جو بچہ زندہ پیدا ہوا ہو، خواہ پیدا ہونے کے بعد وفات پاگیا ہو، اس کا نام رکھنا سنت ہے۔ نام رکھنے اور ناموں کے ساتھ پکارنے کے بارے میں قرآن وحدیث میں تعلیمات موجود ہیں۔

برے نام سے پکارنے کی ممانعت: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ،

ترجمہ: "اور ایک دوسرے کو برے ناموں سے نہ پکارو، (حجرات: 11)"۔

اچھے نام رکھنے کا حکم: حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِنَّكُمْ تُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِأَسْمَائِكُمْ وَأَسْمَاءِ آبَائِكُمْ فَأَحْسِنُوا أَسْمَاءَكُمْ،

ترجمہ: "حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہیں قیامت کے دن تمہارے اپنے ناموں اور تمہارے باپوں کے ناموں کے ساتھ پکارا جائے گا، پس اپنے (اور اپنے بچوں کے) اچھے نام رکھا کرو"۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 4909)

نوٹ: قیامت کے دن باپ کے نام سے پکارے جانے کے عنوان پر ہم نے تفہیم المسائل، جلد دوم، ص: 55 تا 59 پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ماں کے نام سے پکارے جانے کی روایات اور توجیہات بیان کر دی ہیں، یہاں ہم چند ضروری مسائل بیان کر رہے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ نام: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَحَبُّ الْاَسْمَاءِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالیٰ عَبْدُاللّٰہِ وَعَبْدُالرَّحْمَان،

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کو یہ نام بہت پسند ہیں: عبداللہ اور عبدالرحمٰن''۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 4910)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت سچے نام یہ ہیں: حارث (اس کے معنی ہیں: کاشت کرنے والا، کھیت میں ہل چلانے والا یعنی محنت کرنے والا) اور ہُمام (اس کے معنی ہیں: بلند ہمت بادشاہ، بہادر، سخی سردار، شیر)، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: انبیاءِ کرام علیہم السلام کے ناموں پر نام رکھو۔

اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ نام: حرب (اس کے معنی ہیں: ''جنگ'') اور مُرّہ (اس کے معنی ہیں: ''کڑوی چیز'')۔

جنگ میں چونکہ قتل وقتال ہوتا ہے، اس لئے بدفالی سے بچنا چاہئے اور کڑوی چیز سے انسان کو طبعاً نفرت ہوتی ہے اور شیطان کی کنیت ''ابومُرّہ'' ہے۔

نام کی تاثیر: حدیث پاک میں ہے:

عَبْدُالْحَمِیْدِ بْنُ جُبَیْرِبْنِ شَیْبَۃَ قَالَ: جَلَسْتُ اِلیٰ سَعِیْدِبْنِ الْمُسَیَّبِ، فَحَدَّثَنِیْ: اَنَّ جَدَّہٗ حَزْناً قَدِمَ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ: مَااِسْمُکَ قَالَ: اِسْمِیْ حَزْنٌ، قَالَ: بَلْ اَنْتَ سَھْلٌ قَالَ: مَااَنَابِمُغَیِّرٍاِسْمًاسَمَّانِیْہِ اَبِیْ، قَالَ ابْنُ الْمُسَیَّبِ: فَمَازَالَتْ فِیْنَاالْحُزُوْنَۃُبَعْدُ۔

ترجمہ: ''عبدالحمید بن جبیر بن شیبہ بیان کرتے ہیں کہ میں سعید بن مسیب کے پاس بیٹھا، تو انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ان کے دادا، جن کا نام ''حَزن'' تھا، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارا نام کیا ہے؟، انہوں نے عرض کیا: میرا نام

''حزن'' ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: (نہیں) بلکہ تمہارا نام ''سہل'' ہے، انہوں نے عرض کیا: میں اپنے اُس نام کو جو میرے باپ نے رکھا، تبدیل نہیں کروں گا، تو سعید بن مسیّب نے کہا: تو (اسی لئے) ہمارے خاندان میں ''حزونۃ'' (سختی) ہے''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:6193)

مفتی محمد شریف الحق امجدی رحمہ اللہ تعالیٰ مندرجہ بالا حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''حضورِ اکرم ﷺ کا یہ نام بدلنا استحباباً (یعنی بطورِ مستحب کے) تھا اور تفاؤل (نیک فال) کے طور پر تھا، کسی کا نام رکھنے میں لغوی معنی کے ساتھ مناسبت کا لحاظ نہیں ہوتا اور اس واقعہ میں حضور اقدس ﷺ کی بات نہ ماننے کا اثر پڑا''۔

(نزھۃ القاری شرح صحیح البخاری، جلد:5، ص:593)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے خصائص میں سے ہے کہ آپ کو وحی کے ذریعے سے کسی خاص شخص پر نام کی معنوی تاثیر کا علم ہو جاتا تھا۔ اور سعید بن مسیّب کے خاندان میں سختی ان کے دادا کے رسول اللہ ﷺ کے مشورے کو نہ ماننے پر پیدا ہوئی اور ان کی نسل میں بھی یہ اثر قائم رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے بعض نام نیک فال اور استحباب کے طور پر تبدیل بھی فرمائے، کیونکہ یہ قاعدۂ کلیہ نہیں ہے کہ اگر کسی کے نام میں معنوی حسن نہیں ہے، تو اسے لازماً تبدیل کر دیا جائے، چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم میں سے بعض کے اسماءِ گرامی، جن میں معنوی حسن نہیں ہے، آپ ﷺ نے تبدیل نہیں فرمائے۔ بلکہ نسبت سے عقیدت کی وجہ سے امت میں یہ نام رکھنے کی روایت ہمیشہ موجود رہی ہے، کیونکہ اکابر کے نام پر نام رکھنے میں نسبت کی فضیلت کا حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، ان میں سے چند نام یہ ہیں: جیسے عباس، عثمان، مُصعَب، حُذَیفہ، سماک، اُویس، حنظلہ، عِکرمہ، وکیع، قُتیبہ، مِسوَر، عکاشہ، عَلقمہ، عوف، جندل وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ نے اچھے نام رکھنے کی تلقین فرمائی اور چند ناموں کو آپ ﷺ نے تبدیل بھی فرمایا جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ يُغَيِّرُ الْاِسْمَ الْقَبِيْحَ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ برے نام کو(اچھے نام سے) تبدیل کردیا کرتے تھے،(سنن ترمذی،رقم الحدیث:2839)''۔

(۲) عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدَبٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَاتُسَمِّ غُلَامَكَ رَبَاحًا، وَلَايَسَارًا وَلَا اَفْلَحَ وَلَانَافِعًا۔

ترجمہ:''حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے لڑکے کا نام رباح، یسار، افلح اور نافع نہ رکھو،(صحیح مسلم:5594)''۔

(۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ ابْنَةً لِعُمَرَ كَانَتْ يُقَالُ لَهَا عَاصِيَةُ فَسَمَّاهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ جَمِيْلَةَ۔

ترجمہ:''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک صاحبزادی کا نام عاصیہ تھا، رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام جمیلہ رکھ دیا،(صحیح مسلم:5599)''۔

رسول اللہ ﷺ نے جو نام تبدیل فرمائے، وہ دو طرح کے ہیں، ایک وہ جن کے معنیٰ بظاہر اچھے ہیں، جیسے آپ ﷺ نے یسار (آسانی)، رَباح (نفع)، نجیح (کامیاب)، اَفلح (بہت زیادہ کامیاب)، نافع، یعلیٰ (بلندی)، برَکہ اور اسلام وغیرہ نام رکھنے سے منع فرمایا، کیونکہ جب یہ نام لیکر پکارا جائے گا، مثلاً: کیا اسلام، برکت، نافع وغیرہ ہیں؟، اگر وہ موجود نہیں ہیں، تو کہا جائے گا اسلام یا برکت یا نافع نہیں ہے، اس طرح سے بدفالی کا تاثر ہوگا اور اسے آپ ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا، لیکن صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ بعد میں آپ ﷺ نے ان کی ممانعت فرمانا چھوڑ دیا۔ دوسرے ایسے نام ہیں جن کے معنیٰ اچھے نہیں ہیں، تو آپ ﷺ نے ان کو تبدیل فرمایا، جیسے مَلِكُ الْاَملاك (جسے فارسی میں شاہنشاہ یعنی بادشاہوں کا بادشاہ، جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ جلالت ہی پر صادق آتا ہے)، بَرّہ (اس کے معنیٰ ہیں نیک، اس میں خودستائی اور پارسائی کے معنیٰ پائے جاتے ہیں) اور آپ ﷺ نے اس نام کو بدل کر ''زینب'' رکھ دیا، عاص یا عاصیہ (اس کے معنیٰ ہیں نافرمان)، آپ ﷺ

نے اسے بدل کر جمیلہ رکھ دیا، اَصرم (اس کے معنی ہیں بہت زیادہ کاٹنے والا اور محتاج)، اس کو بدل کر آپ ﷺ نے زُرعہ رکھ دیا (جس کے معنی ہیں کاشت کرنا اور بیج)، عزیز (اس کے معنی ہیں غلبے والا، یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے)، عَتَلہ (اس کے معنی ہیں سختی، شدت)، شیطان (اس کے معنی ہیں رحمتِ الٰہی اور خیر سے دور)، حَکَم (اس کے معنی ہیں حاکم اور حاکم حقیقی اللہ تعالیٰ ہے)، غُراب (دوری)، حُباب (یہ شیطان کا نام ہے اور سانپ کو بھی کہتے ہیں)، شِہاب (آگ کا شعلہ) وغیرہ۔ فقہاءِ کرام نے ایسے نام رکھنے سے منع فرمایا، جن میں تعلّی (برتری) یا خودستائی اور پارسائی کے معنی پائے جاتے ہوں، جیسے محی الدین (دین کو زندہ کرنے والا)، تاج الدین، شمس الدین، بدرالدین، شمس الاسلام اور فخر الاسلام وغیرہ۔
غریب نواز، سلطان الہند، سلطان الاولیاء اور اعلیٰ حضرت، صدر الشریعہ، صدر الافاضل، وغیرہ، یہ بعض اولیاءِ کرام اور علماءِ کبار کے القاب ہیں، لیکن یہ انہوں نے خود نہیں رکھے، نہ ہی ان کے والدین نے رکھے ہیں، بلکہ ان کے معاصر یا ان کے بعد کے صلحاءِ امت نے حسنِ عقیدت کی بنیاد پر رکھے ہیں اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ اسی طرح علماء نے محمد نبی، احمد نبی، نبی احمد وغیرہ، نام رکھنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ ان کا اطلاق صرف رسول اللہ ﷺ پر ہوسکتا ہے، اسی طرح طٰہٰ اور یٰسین نام رکھنے سے منع فرمایا ہے کہ قطعی طور پر معلوم نہیں ہیں کہ یہ اللہ کے نام ہیں یا رسول اللہ ﷺ کے نام ہیں اور یہ کہ ان کا قطعی مصداق کیا ہے؟ لہٰذا محمد طٰہٰ اور محمد یٰسین نام رکھنے سے بھی احتراز کرنا چاہئے، کیونکہ اگر یہ رسول اللہ ﷺ کے نام ہیں تو اس کے معنی ہوجائیں گے: محمد رسول اللہ ﷺ اور اس کا مصداق بھی صرف آپ ﷺ ہی ہیں۔ البتہ غلام کی نسبت سے غلام محمد، غلام احمد، غلام مصطفیٰ، غلام رسول نام رکھنے جائز ہیں اور غلام حسین، غلام علی وغیرہ نام رکھنے بھی جائز ہیں، لیکن ان کے شروع میں محمد یا احمد نہ لگایا جائے۔
رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں آپ ﷺ کے اسمِ مبارک اور کنیت کو جمع کر کے "ابوالقاسم محمد" نام رکھنا منع تھا تاکہ اس شخص کو بلانے پر آپ ﷺ کا اشتباہ نہ ہو۔ علما نے

کہاہے کہ آپ ﷺ کے وصالِ مبارک کے بعد اس کی ممانعت نہیں ہے، تاہم امام شافعی اور بعض دیگر علماء کے نزدیک اس کی ممانعت اب بھی قائم ہے، لہٰذا احتیاط بہتر ہے۔ بعض اوقات کسی بچے کا نام انتہائی اچھا اور بامعنی ہوتا ہے، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ کسی نے کہا ہے کہ یہ نام بچے پر بھاری ہے، جلالی ہے، اسلئے بچہ اکثر روتا رہتا ہے یا چڑچڑا ہوگیا ہے اس لئے نام بدل دیا جائے، میرے علم میں اب تک کوئی ایسا فقہی حوالہ نہیں آیا، جو اس موقف کا مؤید ہو۔ امام احمد رضا قادری نے اسم کی مسمّٰی میں معنوی تاثیر کی جو بات کی ہے، اس کی رو سے تو اچھے معنی کے حامل اسم کی اچھی تاثیر ہونی چاہئے، اس سے اسم کی تاثیرِ بد یا بدفالی مراد لینا میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ سوال میں ''راعنہ'' نام کی بابت دریافت کیا گیا ہے، بظاہر اس اسم کے مادّہ کے معنی ہیں: بیوقوف ہونا، ڈھیلا ہونا، بے احتیاط ہونا، کلام میں بیوقوف اور طیش والا ہونا، لہٰذا معنیٰ کے اعتبار سے یہ اسم درست نہیں ہے۔ ''رائحہ'' کے معنی ہیں: بُو، شام کے وقت کی بارش یا بادل، اس سے نیک فال کے طور پر خوشبو مراد لے سکتے ہیں، اسی مادّہ سے ''ریحان'' ہے، جس کے معنی خوشبو کے ہیں۔

تاریخی نام: (یعنی یہ کہ نام کے حروفِ تہجی کے اَعداد ابجد کے حساب سے مسمّٰی کے سنِ پیدائش کے موافق ہوں) رکھنے کی بھی بطورِ سنت یا بطورِ استحباب کوئی اصل نہیں ہے، تاہم بعض اکابر علماء کے ہاں یہ شعار رہا ہے اور شریعت میں اس کی کوئی ممانعت بھی نہیں ہے، امام احمد رضا قادری قُدِّس سرُّہ العزیز نے اپنے نام کا مادّۂ تاریخ بھی نکالا ہے اور اپنی کتابوں کے تاریخی نام بھی رکھا کرتے تھے، جیسے فتاویٰ رضویہ کا تاریخی نام انہوں نے ''العطایا النبویہ'' رکھا تھا اور اس فن میں ان کو بڑا ملکہ اور مَہارتِ تامّہ حاصل تھی اور اس سے نیک فال لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جن حضرات کے نام اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ کی طرف مضاف کر کے عبدالرحیم، عبدالرحمٰن، عبدالستار اور عبدالجبار وغیرہ ہیں، ان کو جب بھی پکارا جائے، پورا نام لیا جائے، رحمٰن صاحب، رحیم صاحب، ستار صاحب اور جبار صاحب وغیرہ کہہ کر پکارنا ناجائز ہے، کیونکہ الرحمٰن، الرحیم، اَلسَّتَّار اور اَلْجَبَّار وغیرھا اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حُسنیٰ مقدّسہ مبارکہ

ہیں۔لہٰذا بندے کو جب بھی پکاریں ''عبد'' کی اضافت کے ساتھ پکاریں۔

تقریبات میں پابندیٔ وقت کا فقدان

سوال:190

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ لوگ کسی بھی تقریب کے موقع پر رات کو دس بجے تک کھانا کھلانے کی تحریری دعوت دیتے ہیں اور رات کو 2 بجے کھانا کھلایا جاتا ہے۔اس موقع پر اگر کوئی شخص وقت کی پابندی کا تقاضا کرے اور اس کے مضر پہلوؤں پر روشنی ڈالے، مثلاً: رات کی نیند خراب کر کے دل و دماغ اور اعصابی تھکاوٹ اور دیگر بیماریوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہو، اگلے روز کی ذمہ داریوں کو کما حقہ' ادا کرنے کا اہتمام رکھتا ہو، اور قرآن و احادیث کی روشنی میں رات گئے تک جاری رہنے والی ان محافل کی مذمت کرتا ہو، تو اسے لوگ پرانے خیال کا حامل، بیوقوف، احباب کا دل شکن، وقت کے ساتھ نہ چلنے والا کہہ کر خاموش کرا دیتے ہیں۔آیا اپنے اس موقف میں وہ لوگ درست ہیں یا یہ اصلاح کی نیت رکھنے والا درست ہے؟۔

مہربانی فرما کر اس نوزائیدہ غیر معقول کلچر کے مذہبی معاشرتی اور طبی نقصانات بیان کرتے ہوئے مضمون نما مفصل جواب عنایت فرمائیں، (محمد ذکی، نارتھ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

ہمارے معاشرے میں یہ رجحان اس قدر تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ تقریبات خواہ کسی نوعیت کی ہوں، نہ تو وقت پر شروع ہوتی ہیں اور نہ ہی وقت پر اختتام پذیر ہوتی ہیں، نتیجۃً نہ صرف اگلے روز کی مصروفیات متاثر ہوتی ہیں بلکہ ذہنی اور اعصابی تھکاوٹ کے سبب صحت بھی روبہ زوال رہتی ہے۔

ذرا غور کریں تو اس قسم کی تقاریب میں جب بھی مدعو کیا جاتا ہے، تو گویا داعی کی جانب سے مدعوئین سے تحریری صورت میں یہ وعدہ ہوتا ہے کہ آپ اس وقت تشریف لائیں، ہم آپ کو اس وقت تک فارغ کر دیں گے اور طعام کا یہ وقت ہوگا، تو یہ محض ایک تحریر نہیں ہوتی بلکہ

ایک وعدہ ہوتا ہے جو ہم ایک ہی وقت میں کئی سو یا ہزار افراد سے کر رہے ہوتے ہیں اور تاخیر کی صورت میں یہ ایک وعدہ خلافی نہیں بلکہ مدعوئین کی تعداد کے مطابق ہزار ہا وعدوں کی صورت میں شمار کی جائے گی اور اُسی قدر اس کا خلاف بھی پایا جائے گا۔ حالانکہ اسلام میں ایفائے عہد کی بہت تاکید کی گئی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُوْلًا۔

ترجمہ: ''اور وعدہ پورا کرو، بیشک وعدے کی بابت (آخرت میں ہر ایک سے) پوچھا جائے گا، (بنی اسرائیل:34)''۔

اور فلاح یافتہ اہلِ ایمان کی صفاتِ حمیدہ بیان کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ

ترجمہ: ''اور وہ جو اپنی امانتوں اور عہد کی (مکمل) پاسداری کرتے ہیں، (المؤمنون:8)''۔

اسی طرح نیکی کے مرتبۂ کمال پر فائز اہلِ ایمان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا ، ترجمہ: ''اور (وہ) جب وعدہ کرلیں تو (پھر) اپنے عہد کی (مکمل) پاس داری کرتے ہیں، (البقرۃ:177)''۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ○

ترجمہ: ''اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو وہ بات جو کرتے نہیں، (الصف:2)''۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے منافق کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا:

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِىِّ ﷺ قَالَ: اٰيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ، وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے، تو خیانت کرے''۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث:33)

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو: أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: أَرْبَعٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ کَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِّنْھُنَّ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰی یَدَعَھَا: اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ، وَاِذَا عَاھَدَ غَدَرَ، وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔

ترجمہ: ’’حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: چار باتیں جس میں ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے، یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے، (اور وہ چار خصلتیں یہ ہیں) جب اسے امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب جھگڑے تو بیہودہ بکواس کرے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 34)‘‘۔

ایسی صورت میں کہ جب داعی یہ جانتا ہے کہ لوگوں کو دیا جانے والا نظام الاوقات قابلِ عمل نہیں ہے اور تمام امور وقت پر انجام نہیں پاسکتے بلکہ لازماً تاخیر ہو جائے گی، تو یہ جانتے ہوئے اس کا لوگوں سے تحریری وعدہ کر لینا، انہیں دھوکہ دینے اور ضرر پہنچانے کے مترادف ہے، ارشادِ رسول ﷺ ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَاضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ۔

ترجمہ: ’’(مومن وہ ہے جو) نہ خود نقصان اٹھائے اور نہ دوسرے کو نقصان پہنچائے‘‘۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2340,2341)

پھر یہ بھی ملاحظہ رہے کہ ایسی صورت حال میں رات دیر تک یا صبح تک جاری رہنے والی تقریبات کے نتیجے میں جو مصائب اور تکالیف خود صاحبِ خانہ یا احباب اور مدعوئین کو درپیش ہوتی ہیں (مثلاً دور دراز کے علاقوں سے آنے والوں کے لئے واپسی کے مسائل، فیملی بالخصوص بچوں کے ساتھ مزید دشواری کا سامنا) بعض مہمانوں پر ان کی وسعت سے زیادہ ٹیکسی وغیرہ کے کرائے کا بوجھ پڑتا ہے، جس کی بسا اوقات وہ طاقت بھی نہیں رکھتا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے: عَنْ حُذَیْفَۃَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:

لَایَنۡبَغِیۡ لِلۡمُؤۡمِنِ أَنۡ یُّذِلَّ نَفۡسَہٗ قَالُوۡا: وَکَیۡفَ یُذِلُّ نَفۡسَہٗ؟قَالَ: یَتَعَرَّضُ مِنَ الۡبَلَاءِ لِمَالَایُطِیۡقُ۔

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلت سے دوچار کرے، صحابہ نے عرض کی (یارسول اللہ ﷺ)! وہ اپنے آپ کو ذلت سے کیسے دوچار کرے گا؟، آپ ﷺ نے فرمایا: (وہ اس طرح کہ) وہ اپنے آپ کو ایسی مصیبت سے دوچار کرے، جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2254)

بعض اوقات خدانخواستہ ڈاکے پڑ جاتے ہیں، لہٰذا ہم دعا ہی کرسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایفاءِ عہد، قول وفعل میں مطابقت اور دوسروں کو راحت پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔
آج غیر مسلم اقوام وممالک میں بعض اقدار کی پاس داری ہے، لیکن مسلمانوں میں بدقسمتی سے نہیں ہے، وقت کی تو ہمارے ہاں کوئی قدر وقیمت ہی نہیں ہے۔

دیوار پر قرآنی آیات لکھنا

سوال: 191

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مکان کی پیشانی پر قرآن کی آیات لکھنا کیسا ہے؟، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیے۔

(محمد احسان، لیاقت آباد نمبر 6، کراچی)

جواب:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا مقدس کلام ہے، اس کا احترام واجب ہے، باعث برکت ودفعِ بلا ہے، ظاہری وباطنی عوارض کے لئے شفا ہے، حصول برکت کے لئے آیاتِ مبارکہ کو دیوار پر لکھنا جائز ہے بشرطیکہ جس رنگ یا چونے یا مواد کے ساتھ آیاتِ مقدسہ لکھی جائیں، وہ پاک ہو۔ اگر دوبارہ اس جگہ پر رنگ کرنے کے لئے کھرچنا پڑے، تو ان ذرّات کو کسی پاک جگہ دفن کردیا جائے، وہ جگہ بلندی پر اور قابلِ احترام ہو، اس پر کوئی ناپاک چیز لگنے کا

خدشہ نہ ہو۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَلَوْ كَتَبَ الْقُرْآنَ عَلَى الْحِيطَانِ وَالْجُدْرَانِ بَعْضُهُمْ قَالُوا: يُرْجَى أَنْ يَجُوْزَ وَبَعْضُهُمْ كَرِهُوْا ذَالِكَ مَخَافَةَ السُّقُوْطِ تَحْتَ أَقْدَامِ النَّاسِ، كَذَا فِي "فتاوىٰ قاضيخان"۔

ترجمہ: ''اگر قرآنِ مجید کی آیات دیواروں پر لکھی جائیں تو بعض فقہاء نے اس کے جواز کا قول کیا ہے اور بعض فقہاء نے اس اندیشے کی بنا پر مکروہ قرار دیا ہے کہ اس کے ذرات (یعنی چونے یا رنگ کے ذرات) لوگوں کے پاؤں میں گریں گے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد: 5، ص: 323، مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

پس اگر اس امر کا اہتمام کرلیا جائے کہ اس کے ذرات نیچے نہ گریں تو کراہت اٹھ جائے گی، نیز اگر کبھی دوبارہ رنگ کرنا ہو، تو اس کو کھرچ کر کسی محفوظ جگہ دفنانے کا انتظام بھی ہو، دفن کردیا جائے اور جہاں آیتیں لکھی ہوں وہاں بے وضو ہاتھ نہ لگائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اس کو نہ چھوئیں کریں مگر پاک لوگ، (الواقعہ: آیت 79)''۔

بعض مکانوں کا رخ گندی گلی کی طرف ہوتا ہے، لہٰذا اس طرف آیات کا لکھنا بھی خلافِ ادب ہوگا کہ وہ مقام محترم نہیں سمجھا جاتا۔ اسی طرح مساجد کے استنجا خانوں کی طرف بھی نہ لکھی جائیں، اگر وضو خانہ استنجا خانے سے الگ ہو تو اس کی دیواروں پر مسنون دعائیں لکھی جاسکتی ہیں تاکہ لوگ متوجہ ہوں اور پڑھ کر اجر پائیں۔ یاد رہے کہ حصولِ برکت کے لئے آیات کا لکھنا اگرچہ جائز ہے، لیکن شریعت کا اصل مقصود و مطلوب قرآن مجید کی تلاوت کرنا ہے اور تلاوت ہی کو شعار بنانا چاہئے کہ یہ افضل عبادت ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات احکامِ قرآن پر عمل کرنا ہے۔

سرکاری محکمے عاقلہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں

سوال: 192

مورخہ: 5، ستمبر 2006ء بوقت: 7:35 منٹ این۔ایل۔سی کا حاضر سروس

ڈرائیور نمبر:3260528 سپاہی طارق محمود ولد محمد ابراہیم این ایل سی ٹریلر لے کر کراچی آرہا تھا کہ خیر پور میرس بحریہ کالج کے مقابل جی ٹی روڈ ایک رکشہ روڈ کے بائیں طرف کچی جگہ پر کھڑا تھا، جس کو ڈرائیور طارق محمود کراس کرتے وقت ٹریلر کے بائیں طرف رکشے کے ساتھ لگا، جس کے نتیجے میں ایک عورت جمیلہ بی بی زخمی ہوگئی اور خیر پور ہسپتال میں فوت ہوگئی۔فوت شدہ جمیلہ بی بی کے خاوند نے نہ تو ایف آئی آر کٹوائی اور نہ ہی قصاص ودیت کا مطالبہ کیا، بلکہ جمیلہ مرحومہ کے خاوند غلام اکبر ولد محمد بخش نے خون معاف کر دیا اور اسٹامپ پیپر پر بیانِ حلفی بھی لکھ دیا، جس کی نقل منسلک ہے۔فوت شدہ خاتون کے پانچ نابالغ بچے ہیں۔معافی کے باوجود ڈائریکٹر جنرل این ایل سی نے محکمانہ کاروائی کرتے ہوئے، سمری فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کا حکم دیا اور ایک انکوائری کمیٹی تشکیل دی، جس نے انکوائری مکمل کرنے کے بعد ڈرائیور طارق محمود کو تین ماہ قید فوجی جیل بغیر تنخواہ اور چھ لاکھ تینتالیس ہزار سات سو ساٹھ روپے دیت ادا کرنے کا حکم سنایا۔ڈرائیور طارق محمود کے والدین فوت ہو چکے ہیں، دو چھوٹے بھائی اور چھ چھوٹی بہنیں ہیں، مزید ڈرائیور کا بڑا بھائی بھی فوت ہو چکا ہے، جس کی بیوہ اور بچی بھی طارق محمود کی کفالت میں ہیں، علاوہ ازیں ڈرائیور کے اپنے بچے بھی ہیں جو کل چودہ افراد بنتے ہیں، جن کا یہ واحد کفیل ہے، ڈرائیور کے وسائل نہیں ہیں جس کی بنیاد پر وہ دیت کی رقم ادا نہیں کر سکتا، معلوم یہ کرنا ہے کہ:

1۔ کیا فوت شدہ خاتون کے خاوند کی طرف سے معافی نامے کے بعد ڈرائیور پر دیت کی رقم دینا لازم ہے؟۔

2۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دیت کی رقم کتنی بنتی ہے؟، دیت کی رقم کس طرح حاصل کی جائے؟، ہمارے ادارے میں ہر ڈرائیور سے ماہانہ سو روپے ایکسیڈنٹ فنڈ بھی جمع ہوتا ہے۔(میجر محمد اظہر، مینیجر ٹرانسپورٹ گروپ نمبر:2 این ایل سی، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں یہ "قتل بالسبب" کی صورت ہے اور "قتل بالسبب" میں

قاتل کے عصبہ (وُرثاء) پر دِیت لازم ہے اور قاتل پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَأَمَّا الْقَتْلُ بِسَبَبٍ فَمِثْلُ حَفْرِ الْبِئْرِ وَوَضْعِ الْحَجَرِ فِيْ غَيْرِ مِلْكِهٖ كَذَا فِي الْكَافِيْ وَلَوْ وَطِئَتْ دَابَّتُهٗ إِنْسَانًا فَقَتَلَتْهُ وَهُوَ سَائِقُهَا أَوْ قَائِدُهَا فَهُوَ قَتْلٌ بِسَبَبٍ، كَذَا فِي الْمُضْمَرَاتِ وَمُوْجِبُهٗ إِذَا تَلَفَ بِهٖ آدَمِيٌّ الدِّيَةُ عَلَى الْعَاقِلَةِ وَلَا يَتَعَلَّقُ بِهِ الْكَفَّارَةُ وَلَا حِرْمَانُ الْمِيْرَاثِ عِنْدَنَا، كَذَا فِي الْكَافِيْ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ۔

ترجمہ: ""قتل بِالسّبب" یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص راستہ میں کنواں کھودے یا راستہ میں پتھر وغیرہ رکھ دے اور کوئی شخص کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو جائے یا پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرے اور مر جائے؛ "کافی" میں بھی اسی طرح ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سواری پر سے گرا اور ہلاک ہو گیا اور یہ (یعنی جس پر قتل کا الزام ہے) اُس سواری کو چلا رہا تھا، پس یہ بھی قتل بِالسّبب میں شامل ہے، "مضمرات" میں اسی طرح سے ہے۔ پس ہم (احناف) اس کے عصبات پر دیت واجب کرتے ہیں تاکہ انسانی جان رائیگاں جانے سے بچ جائے اور اس شخص پر کفارہ واجب نہیں ہوگا اور اگر (قتل کے سبب سے متعلق شخص مقتول کا وارث ہے) تو وہ مقتول کی وراثت سے محروم نہیں ہوگا، "کافی" میں بھی اسی طرح ہے"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص:3 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ غلام رسول سعیدی شرح صحیح مسلم جلد چہارم، صفحات 676، 677 پر المبسوط سرخسی، جلد 26، صفحہ 68 کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قتل بِالسّبب: علامہ سرخسی لکھتے ہیں کہ: "جو قتل عمد ہے نہ خطا نہ قائم مقام خطا (یعنی قتل بِالسّبب)، وہ یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص راستہ میں کنواں کھودے یا راستہ میں پتھر وغیرہ رکھ دے اور کوئی شخص کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو جائے یا پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرے اور مر جائے، یہ شخص قتل

کرنے کا مرتکب نہیں ہے کیونکہ اس نے مقتول پر کوئی فعل واقع نہیں کیا، اس کا فعل تو زمین کے ساتھ متصل تھا۔ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ عمد، شبہ عمد، خطایا قائم مقام خطاء قتل کی کسی قسم کا مرتکب نہیں ہے، بلکہ اس کے ایک سبب سے قتل ہوا ہے جو سبب متعدی ہے، پس ہم اس کے عصبات پر دیت واجب کرتے ہیں تا کہ انسانی جان رائیگاں جانے سے بچ جائے اور اس شخص پر نہ کفارہ واجب ہوگا اور نہ وہ مقتول کی وراثت سے محروم ہوگا۔

حسب ذیل صورتیں بھی قتل بِالسَّبَب میں داخل ہیں:

۱۔ کوئی شخص کسی جانور کو ہانک کر لے جا رہا ہو اور وہ جانور کسی شخص کو ہلاک کر دے۔

۲۔ کوئی شخص تیز رفتار گاڑی چلائے اور اس کی جھپٹ میں آ کر کوئی شخص ہلاک ہو جائے۔

۳۔ کوئی اناڑی شخص گاڑی چلائے اور اس کی گاڑی کے نیچے کوئی آ کر ہلاک ہو جائے۔

۴۔ کوئی شخص نشہ میں آ کر گاڑی چلائے اور اس کی گاڑی کے نیچے آ کر کوئی شخص مر جائے''۔

شرعاً قاتل کو معاف کرنے کا حق اولیاءِ مقتول کا ہے، آپ کے پیش کردہ حقائق کی روشنی میں مقتولہ کے ورثاء نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے قاتل کو معاف کر دیا ہے، لہٰذا اسے مزید سزا دینے کا کوئی جواز نہیں ہے، اسے آزاد کر کے ملازمت پر بحال کیا جائے اور قاتل پر کوئی کفارہ بھی واجب نہیں ہے۔

اسلام نے قتل بِالسَّبَب کی دِیَت قاتل کی عاقلہ پر عائد کی ہے، یعنی قاتل کے والد کی طرف کے قریبی رشتے دار۔ لیکن حکومت کے مختلف محکموں کے وہ ملازمین جو ماہانہ یا سالانہ تنخواہ حکومت سے پاتے ہیں، اگر اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے ڈیوٹی کے دوران اُن سے ''قتل بِالسَّبَب'' کا ارتکاب ہو جائے، تو ان کے لئے عاقلہ ان کا متعلقہ ادارہ ہوتا ہے۔ اور چونکہ این۔ایل۔سی (N.L.C) ایک باقاعدہ منظم ادارہ ہے، لہٰذا اسے ''عاقلہ'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَالعاقِلَةُ اَهلُ الدِّيْوَانِ) وَهُمُ العَسْكَرُ،

ترجمہ:"محلے کے لوگ بھی عاقلہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس سے لشکری یا فوجی مراد ہیں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:10 ص:265 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

عَاقِلَةُ الرَّجُلِ أَهْلُ دِيْوَانِهِ عِنْدَنَا كَذَا فِي " الْمُحِيطِ" وَأَهْلُ الدِّيْوَانِ أَهْلُ الرَّايَاتِ وَهُمُ الْجَيْشُ الَّذِيْنَ كُتِبَتْ أَسَامِيْهُمْ فِي الدِّيْوَانِ كَذَافِي "الْهِدَايَةِ"۔

ترجمہ:"ہمارے (احناف) کے نزدیک کسی شخص کی عاقلہ اس کے دفتر (محکمے) کے لوگ ہو سکتے ہیں، جیسا کہ "محیط" میں ہے۔ محکمے کے لوگ پرچم بردار ہیں، یہ وہ فوجی ہیں، جن کے ناموں کا رجسٹر میں اندراج کیا گیا ہے، اسی طرح ہدایہ میں ہے"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص:83، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

نوٹ: دیوان سے دفتری یا محکمانہ نظام مراد ہے اور یہ محکمانہ نظام سب سے پہلے حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قائم ہوا، ہر دیوان یا محکمے سے متعلق لوگوں کے ناموں کے اندراج کے لئے ایک رجسٹر ہوتا تھا، اسی طرح مجاہدین یا فوجیوں کا باقاعدہ ریکارڈ مرتب ہوتا تھا۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

قَالَ الْحَنَفِيَّةُ: اَلْعَاقِلَةُ هُمْ أَهْلُ الدِّيْوَانِ، اِنْ كَانَ الْقَاتِلُ مِنْ أَهْلِ الدِّيْوَانِ، وَهُمُ الْجَيْشُ أَوِالْعَسْكَرُالَّذِيْنَ كُتِبَتْ أَسَامِيْهُمْ فِى الدِّيْوَانِ: وَهُوَ جَرِيْدَةُ الْحِسَابِ۔ اَوْهُمُ الْمُقَاتِلَةُ مِنَ الرِّجَالِ الْاَحْرَارِ الْبَالِغِيْنَ الْعَاقِلِيْنَ ،أَىْ اَهْلُ الرَّايَاتِ وَالْاَلْوِيَةِ، تُؤْخَذُمِنْ عَطَايَاهُمْ أَوْمِنْ أَرْزَاقِهِمْ لَا مِنْ أُصُوْلِ اَمْوَالِهِمْ بِدَلِيْلِ فِعْلِ عُمَرَرَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، فَاِنَّ الدِّيَةَ كَانَتْ عَلٰى أَهْلِ النُّصْرَةِ، وَكَانَتْ بِأَنْوَاعٍ:بِالْقَرَابَةِ، وَالْحِلْفِ، وَالْوَلَاءِ، وَالْعَقْدِ، فَلَمَّادَوَّنَ عُمَرُالدَّوَاوِيْنَ جَعَلَ الْعَقْلَ(اَلدِّيَةَ)عَلٰى اَهْلِ الدِّيْوَانِ بِمَحْضَرٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔

ترجمہ:"احناف نے کہا ہے کہ: عاقلہ محکمے کے لوگ ہی ہیں، اگر قاتل محکمے کے لوگوں میں

سے ہو اور وہ لشکری یا فوجی ہیں، جن کے ناموں کا رجسٹر میں اندراج ہے اور یہ حساب کتاب (دفتری ریکارڈ) کا رجسٹر ہے یا اس سے مراد آزاد عاقل، بالغ لوگوں کا گروہ ہے (جو مشترکہ مقاصد کے لئے) جنگ کرتے ہیں، یعنی پرچم بردار جو لوگ بطور فضل و احسان کے دِیَت ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کریں، اُن پر (واجب الادا دِیَت) ان کو ملنے والے (سرکاری) عطایا اور وظائف (تنخواہوں) سے لی جائے گی، نہ کہ اُن کے اصل مال سے۔ اس کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فعل ہے کیونکہ دِیَت اہلِ نصرت پر ہوگی اور اس کی چند اقسام ہیں، دِیَت بالقرابت، دِیَت بالحلف (یعنی جو باقاعدہ حلف اٹھا کر باہمی معاہدے کے تحت ایک دوسرے کی دِیَت کی ذمہ داری قبول کریں)، دِیَت بِالوَلاء (یعنی مالک کا آزاد کردہ غلام جب فوت ہو جائے اور اس کے نسبی وارث نہ ہوں، تو اس کا ترکہ آزاد کرنے والے کو دیا جاتا ہے اور اس کو ''عصبہ سَببی'' کہتے ہیں) یا غلام کو آزاد کرنے والا سابق مالک، کہ اگر وہ وفات پا جائے اور اس کے نسبی وارث نہ ہوں، تو اس کا آزاد کردہ غلام اس کا وارث بن جائے گا)، دِیَت بِالعَقد (اس سے مراد ایسے فریقین ہیں جو باہم یہ عقد کریں کہ ہم ایک دوسرے کی دِیَت ادا کریں گے)، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ محکمانہ نظام قائم کیا، تو اُنہوں نے دِیَت کو اہلِ دیوان (ایک دفتر یا محکمے کے لوگوں) پر صحابہ کرام کی موجودگی میں عائد کیا تھا''۔

(الفقہ الاسلامی وادلّتہٗ، جلد 7، ص: 28-5727، دار الفکر بیروت)

ہمارے فقہاء کرام نے ایک دفتر یا ادارے میں کام کرنے والوں کو بھی عاقلہ قرار دیا ہے، میری رائے میں این۔ایل۔سی (N.L.C) کے ادارے کی حیثیت بھی ''عاقلہ'' ہی کی ہے۔ یہ ادارہ چونکہ بڑے بڑے ٹریلر چلاتا ہے، جن سے وقتاً فوقتاً حادثات کا واقع ہونا خارج از امکان نہیں ہے، بعض اوقات ڈرائیور کی غلطی یا غفلت باعث بنتی ہے اور بعض اوقات اتفاقیہ طور پر حادثہ پیش آجاتا ہے، لہٰذا این۔ایل۔سی (N.L.C) کو ان حادثات کے حوالے سے ''قتل بالسَّبَب'' کی دِیَت کے لئے ایک کفالتی فنڈ (Compensatory

(Fund) قائم کرنا چاہئے۔اس میں ایک حصہ این۔ایل۔سی (N.L.C) بھی ڈالے اور کچھ ماہانہ رقم ڈرائیوروں کی تنخواہوں سے بھی وضع کی جائے (جیسا کہ آپ نے سوال میں لکھا کہ ''ہمارے ادارے میں ہر ڈرائیور سے ماہانہ سو روپے ایکسیڈنٹ فنڈ بھی جمع ہوتا ہے'') اور حادثے کی صورت میں مقتول کے ورثاء کو اُس فنڈ سے دیت ادا کی جائے تاکہ جو خاندان اپنے کفیل سے محروم ہوگیا ہے، اس کی کسی حد تک کفالت ہو سکے، ڈرائیوروں سے بھی کچھ نہ کچھ رقم وضع کرنا اس لئے ضروری ہے تاکہ وہ ذمہ داری کا مظاہرہ کریں۔آپ نے ڈرائیوروں کی تنخواہوں سے ماہانہ ''ایکسیڈنٹ فنڈ'' کا ذکر تو کیا ہے، لیکن اس کا مصرف بیان نہیں کیا کہ کیا ہے اور اس کے تقسیم کرنے کا طریقۂ کار کیا ہے۔

علامہ ابوالحسن مرغینانی لکھتے ہیں:

وَقَتْلُ الْخَطَأُ تَجِبُ بِهِ الدِّيَةُ عَلَى الْعَاقِلَةِ، وَالْكَفَّارَةُ عَلَى الْقَاتِلِ، لِمَا بَيَّنَّامِنْ قَبْلُ، قَالَ: وَالدِّيَةُ فِي الْخَطَأْمِائَةٌ مِّنَ الْإِبِلِ أَخْمَاسًا: عِشْرُوْنَ بِنْتَ مَخَاضٍ، وَّعِشْرُوْنَ بِنْتَ لَبُوْنٍ، وَّعِشْرُوْنَ ابْنَ مَخَاضٍ، وَّعِشْرُوْنَ حِقَّةً، وَّعِشْرُوْنَ جَذْعَةً،قَالَ وَمِنَ الْعَيْنِ اَلْفُ دِيْنَارٍ وَمِنَ الْوَرِقِ عَشْرَةَ الَافِ دِرْهَمٍ۔

ترجمہ:''امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک قتلِ خطا میں پانچ قسم کی سو اونٹنیاں ہیں: بیس دوسرے سال کی اونٹنیاں، بیس تیسرے سال کی اونٹنیاں، بیس دوسرے سال کے اونٹ، بیس چوتھے سال کی اونٹنیاں، اور بیس پانچویں سال کی اونٹنیاں یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہوں، (الھدایۃ، جلد:8،ص:72)''۔

ایک ہزار دینار چار اعشاریہ تین سات چار (۴٫۳۷۴) کلوگرام سونے کے برابر ہیں اور دس ہزار درہم چاندی تیس اعشاریہ چھ ایک آٹھ (۳۰٫۶۱۸) کلوگرام چاندی کے برابر ہیں یا اس کی موجودہ بازاری قیمت (Market Value) کے مطابق رقم ہے۔

نوٹ: انشورنس کے متبادل اسلامی تصورِ کفالت پر مبنی تکافل کمپنیاں وجود میں آچکی ہیں، آپ اِن میں سے کسی ادارے کے ساتھ اپنے نظام کو مربوط ومنسلک کر سکتے ہیں۔قومی

اداروں کی صاحب بصیرت (Visionary) قیادت کو چاہئے کہ case to case معاملات کو دیکھنے اور ہر بار ایک نئی صورتِ حال کا حل ڈھونڈنے کے بجائے باقاعدہ ایک نظام وضع کرے تاکہ ایک قابلِ عمل خودکار طریقے سے معاملات چلتے رہیں۔

بچوں کو حسنِ سلوک کی تلقین کریں

سوال: 193

میری شادی تقریباً 19 سال پہلے ہوئی تھی۔میرے چار بچے ہیں۔بڑا بیٹا 17 سال کا،بیٹی 16 سال کی،دوسرا بیٹا 15 سال کا اور چھوٹی بیٹی 5 سال کی ہے۔میرے شوہر نے بہ ہوش وحواس تقریباً سولہ سال قبل مجھے دو طلاقیں دیں،لیکن اس کے بعد بھی ہم میاں بیوی کے طور پر ازدواجی زندگی گزارتے رہے۔اور اس کے بعد بھی اکثر وبیشتر طلاقیں دیتا رہا،چونکہ مجھے اُس وقت علم نہیں تھا اور بعد تک بھی شریعت سے زیادہ معلومات نہ ہونے کے سبب گنہگار ہوتی رہی۔اس کے علاوہ بھی میرے ساتھ بہت زیادتی کرتا رہا ہے،جو نا قابلِ بیان ہے۔آپ سے اس مسئلے میں رہنمائی درکار ہے۔

لبنیٰ جہانگیر،کراچی

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے کہ شوہر نے سب سے پہلے آپ کو دو طلاقیں دیں اور پھر رجوع کرلیا اور آپ دونوں میاں بیوی کے طور پر رہے،تو شرعاً دو طلاق کے بعد رجوع کی گنجائش ہے۔اس کے بعد آپ کے شوہر نے جب تیسری طلاق دی،تو پہلی دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہوکر کل تین طلاقیں ہوگئیں اور آپ ان پر حرام ہوگئیں،اس میں رجوع کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔تین طلاقیں مکمل ہونے کے بعد آپ دونوں نے عدت کے اندر اور عدت کے بعد جو ازدواجی زندگی گزاری،وہ شرعاً حرام گزاری ہے،آپ دونوں فوری طور پر علیحدگی اختیار کرلیں اور اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ توبہ کرتے رہیں۔چھوٹی بچی کی نگہداشت آپ کا حق ہے اور جب تک آپ دوسری شادی نہ کریں بچی اور آپ کا نان نفقہ بچی کے والد کو دینا

چاہیے۔باقی بچوں کے ساتھ بھی والد کو حسنِ سلوک کرنا چاہیے اور آپ کو بھی چاہیے کہ بچوں کو ان کے والد کے ملنے سے نہ روکیں اور نہ ہی انہیں والد سے نفرت دلائیں بلکہ جب والد کو ان کی مدد کی ضرورت ہو اور یہ اس قابل ہوں تو ان کی ہر ممکن مدد کریں۔

دس محرم اور نیاز کی تقسیم

سوال:194

محرم الحرام کی دس تاریخ کو نیاز میں حلیم، بریانی اور شربت وغیرہ لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کیا یہ جائز ہے؟ شریعت کی روشنی میں مدلّل جواب عنایت فرمائیں، (محمد مسکین، کراچی کینٹ)۔

جواب:

مذکورہ بالا سوال کا جواب دینے سے قبل یہ واضح ہو کہ عاشورے کے موقع پر مذکورہ امور کی انجام دہی کا مقصود ایصالِ ثواب ہے تو پہلے ہم ایصالِ ثواب کا مفہوم واضح کرتے ہیں:

ایصالِ ثواب کے معنی کسی شخص کا اپنے کسی عملِ خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچانا ہے، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو، یہ شرعاً جائز ہے، بلکہ مستحسن امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ O

ترجمہ: ”حضرت موسیٰ نے التجا کی: اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی (ہارون) کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے، (الاعراف:151)“۔

(2) رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ O

ترجمہ: ”(حضرت ابراہیم نے دعا کی) اے ہمارے رب! حساب (یعنی قیامت) کے دن

میری، میرے والدین اور تمام اہل ایمان کی بخشش فرمانا، (ابراہیم:41)''۔

(3) رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ O

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی (بھی مغفرت) فرما جو ہم سے پہلے وفات پا چکے، (الحشر:10)''۔

(4) رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ

ترجمہ: ''(حضرت نوح نے دعا کی) اے میرے رب! میری اور میرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور (جملہ) ایمان والے مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما، (نوح:28)''۔

عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ، أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ: إِنَّ أُمَّ سَعْدٍ مَاتَتْ، فَأَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟، قَالَ: اَلْمَاءُ، قَالَ: فَحَفَرَ بِئْرًا وَّقَالَ: هٰذِهٖ لِأُمِّ سَعْدٍ۔

ترجمہ: ''حضرت سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ! امّ سعد (یعنی میری والدہ) وفات پا گئی ہیں تو (ان کے ایصالِ ثواب کے لئے) کون سا صدقہ افضل ہے؟، آپ نے ارشاد فرمایا: ''پانی''، چنانچہ انہوں نے کنواں کھدوا کر (وقف کر دیا) اور کہا، یہ امّ سعد کا کنواں ہے''۔

(سنن ابی داود، رقم الحدیث:1678)

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا: أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: إِنَّ أُمِّي افْتُلِتَتْ نَفْسُهَا، وَأَظُنُّهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ، فَهَلْ لَهَا أَجْرٌ إِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟، قَالَ: نَعَمْ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ: ''ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: میری والدہ کا اچانک انتقال ہو گیا ہے، میں گمان کرتا ہوں کہ اگر وہ کچھ وصیت کرتیں تو صدقہ کرنے کا حکم کرتیں۔ اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو اس کا انہیں اجر ملے گا؟ نبی رحمت نے فرمایا: ہاں! (اس کا اجر اسے

ملے گا،(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1388، الفاظ کے کچھ تغیر کے ساتھ:2760)''۔

پانی پلانا اور کھانا کھلانا فی نفسہٖ ایسا ثوابِ جاریہ ہے جسے شریعتِ مطہرہ میں باعثِ اجر بیان فرمایا گیا ہے۔

حضرت ابو سعید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَیُّمَا مُسْلِمٍ أَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلٰی جُوْعٍ أَطْعَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ، وَاَیُّمَا مُسْلِمٍ سَقٰی مُسْلِمًا عَلٰی ظِمَأٍ سَقَاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مِنَ الرَّحِیْقِ الْمَخْتُوْمِ۔

ترجمہ: ''جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کو بھوک کے وقت کھانا کھلائے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے پھلوں (نعمتوں) سے کھلائے گا، اور جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کو سخت پیاس کے وقت پانی پلائے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کی مہر بند شراب طہور پلائے گا، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:1679)''۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''پانی یا شربت کی سبیل لگانا، جب کہ بہ نیت محمود اور خالصاً لوجہ اللہ ثواب رسانی ارواحِ طیبہ ائمۂ اَطہار مقصود ہو، تو بلاشبہ بہتر و مستحب وکارِ ثواب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان عالی شان ہے:

اِذَا کَثُرَتْ ذُنُوْبُكَ فَاسْقِ الْمَآءَ عَلَی الْمَآءِ تَتَنَاثَرُ کَمَا یَتَنَاثَرُ الْوَرَقُ مِنَ الشَّجَرِ فِی الرِّیْحِ الْعَاصِفِ۔ رَوَاهُ الْخَطِیْبُ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ۔

ترجمہ: ''جب تیرے گناہ زیادہ ہو جائیں تو (پیاسوں کو) بہ کثرت پانی پلا، اس طرح تیرے گناہ جھڑ جائیں گے جیسے سخت آندھی میں درخت کے پتے جھڑتے ہیں''، (رواہ الخطیب عن انس بن مالک)۔ اسی طرح کھانا کھلانا، لنگر بانٹنا بھی باعثِ اجر ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ یُبَاهِیْ مَلٰٓئِکَتَهٗ بِالَّذِیْنَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ مِنْ عَبِیْدِهٖ، رَوَاهُ اَبُو الشَّیْخِ فِی الثَّوَابِ عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا۔

ترجمہ: ''بے شک، اللہ تعالیٰ ان (فیاض بندوں) پر فرشتوں کے سامنے فخر و مسرت کا

اظہار فرماتا ہے، جو اس کے (محتاج) بندوں کو (بھوک کی حالت میں) کھانا کھلاتے ہیں، (رواہ ابو الشیخ فی الثواب عن الحسن مرسلا)۔ مگر لنگر لٹانا جس میں لوگ چھتوں پر بیٹھ کر روٹی وغیرہ پھینکتے ہیں، کچھ ہاتھوں میں جاتی ہیں، کچھ زمین پر گرتی ہیں اور کچھ پاؤں کے نیچے آتی ہیں، یہ منع ہے کہ اس میں رزقِ الٰہی کی بے تعظیمی ہے"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 24، ص: 520، 521، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

عاشورے کے موقع پر حلیم، بریانی اور شربت وغیرہ کی تقسیم اسی ایصالِ ثواب کے عمل کا حصہ ہے، لیکن اس تقسیم میں اس امر کو ملحوظ رکھنا لازم ہے کہ رزق کی بے حرمتی اور ضیاع نہ ہو۔

غیر مسلم کے سلام کا جواب

سوال: 195

اگر کوئی غیر مسلم ہم سے ہاتھ ملائے تو اس کے جواب میں خاموش رہیں یا وعلیکم السلام کہیں؟ شریعتِ محمدیہ کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

نعیم انجم، اسلم کالونی

جواب:

کسی غیر مسلم کو سلام میں پہل کرنا حرام ہے اور اس کے سلام کے جواب میں صرف "وعلیکم" کہنا واجب ہے۔

حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِذَا سَلَّمَ عَلَیْکُمْ اَھْلُ الْکِتَابِ فَقُوْلُوْا: وَعَلَیْکُمْ۔

ترجمہ: "جب اہلِ کتاب تمہیں سلام کریں تو ان کے جواب میں (صرف) "وعلیکم" کہو، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 5646)"۔

علامہ یحیٰ بن شرف الدین نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

وَاخْتَلَفَ الْعُلَمَآءُ فِیْ رَدِّ السَّلَامِ عَلَی الْکُفَّارِ وَابْتِدَائِھِمْ بِہٖ فَمَذْھَبُنَا تَحْرِیْمُ

اِبتِدائِهِم بِهٖ وَوُجُوبُ رَدِّهٖ عَلَيهِم بِاَنْ يَقُولَ وَعَلَيكُم اَوْ عَلَيكُم فَقَط، وَدَلِيلُنَا فِی الاِبتِدَاءِ قَولُهٗ ﷺ لَاتَبدَوُوا اليَهُودَ وَلَاالنَّصارٰی بِالسَّلامِ وَفِی الرَّدِ قَولُهٗ ﷺ فَقُولُوا "وَعَلَيكُم" وَبِهٰذا الَّذِی ذَكَرنَاهُ عَن مَذهَبِنا، قَالَ اَكثَرُ العُلَماءِ وَعَامَّةُ السَّلَفِ وَذَهَبَت طَائِفَةٌ اِلٰی جَوَازِ ابتِدَائِنَا لَهُم بِالسَّلامِ۔

ترجمہ: ''کفار کو سلام میں پہل کرنے اور ان کے سلام کا جواب دینے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارا مذہب یہ ہے کہ انہیں سلام میں پہل کرنا حرام ہے اور صرف ''وعلیکم'' یا ''علیکم'' کہہ کر ان کے سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ کفار کو سلام میں پہل کرنے کی حرمت کے بارے میں ہماری دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''یہود و نصاریٰ کو سلام میں پہل نہ کرو''۔ اور کفار کے سلام کا جواب دینے کے بارے میں یہ ارشاد رسول ہے: ''جب کفار سلام کریں تو جواب میں ''وَعَلَیْکُم'' کہو۔ اور اسی لئے ہم نے اسے ''مذہبِ شوافع'' کے طور پر ذکر کیا ہے۔ اکثر علماء اور عام متقدمین کا یہی مذہب ہے اور علماء کی ایک جماعت نے غیر مسلم کو سلام میں پہل کرنے کو بھی جائز قرار دیا ہے''۔

(شرح مسلم للنووی، جلد:6،ص:293،مکتبۃ البشریٰ، دمشق)

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''الاشباہ والنظائر وتنویر الابصار'' و ''درمختار'' وغیرہ میں ہے کہ اگر کسی نے ذمی کافر کی تعظیم کرتے ہوئے سلام کیا، تو کافر ہو گیا، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 21، ص: 247، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔ یعنی اس کے کفر کی بنا پر تعظیم کرے گا تو کفر لازم آئے گا، ورنہ بعض اوقات غیر مسلم کے کسی دنیاوی منصب کی وجہ سے بر بناء منصب مدارات کے طور پر اکرام کرنا پڑتا ہے، اس سے کفر لازم نہیں آتا، کیوں کہ کفر سے نفرت تو مسلمان کے دل میں تب بھی موجود ہوتی ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَاَمَّا التَّسلِيمُ عَلٰی اَهلِ الذِّمَّةِ فَقَدِ اختَلَفُوا فِيهِ قَالَ بَعضُهُم لَابَاْسَ بِاَنْ يُسَلِّمَ عَلَيهِم وَقَالَ بَعضُهُم لَايُسَلِّمُ عَلَيهِم وَهٰذَا اِذَا لَم يَكُن لِلمُسلِمِ حَاجَةٌ اِلَی الذِّمِّیِّ، وَاِذَا

كَـانَ لَـهُ حَاجَةٌ فَلَا بَأْسَ بِالتَّسْلِيمِ عَلَيْهِ وَلَا بَأْسَ بِرَدِّ السَّلَامِ عَلٰى أَهْلِ الذِّمَّةِ وَلٰكِنْ لَّا يُزَادُ عَلٰى قَوْلِهٖ "وَعَلَيْكُمْ" قَالَ الْفَقِيْهُ أَبُو اللَّيْثِ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى، اِنْ مَرَرْتَ بِقَوْمٍ وَّفِيْهِمْ كُفَّارٌ فَأَنْتَ بِالْخِيَارِ اِنْ شِئْتَ قُلْتَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَتُرِيْدُ بِهِ الْمُسْلِمِيْنَ وَاِنْ شِئْتَ قُلْتَ "اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى" كَذَا فِي "الذَّخِيْرَةِ"۔

ترجمہ: ''اور رہا ذِمّیوں کو سلام کرنے کا مسئلہ تو ذِمّیوں کو سلام کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، بعض علماء کہتے ہیں کہ انہیں سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں اور بعض منع کرتے ہیں۔ اور یہ (اختلاف) اس صورت میں ہے کہ اس ذمی سے (کلام کرنے کے سلسلے میں) مسلمان کو کوئی حاجت درپیش نہ ہو، اور اگر اس سے مسلمان کی کوئی (جائز) غرض وابستہ ہو، تو اسے سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ذمی کے سلام کا جواب دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن جواب میں اضافہ نہ کرے (صرف) ''وعلیکم'' کہے۔ فقیہ ابو اللیث فرماتے ہیں کہ: اگر کسی ایسے مجمعے کے پاس سے گزر ہوا، جس میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی ہیں تو تمہیں اختیار ہے کہ چاہو تو مسلمانوں کی نیت کرکے ''السلام علیکم'' کہو اور چاہو تو ''اَلسَّـلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى'' (یعنی جو ہدایت پر ہے اسے سلام) ''ذخیرہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 5، ص: 325، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

میری رائے میں ہمارے فقہاءِ کرام کی آراء ان کے اپنے دور کے تناظر میں تھیں، جب مسلمان غالب پوزیشن میں تھے اور شاید اس دور میں غیر مسلم، مسلمانوں کو سلام کرنے یا مسلمانوں کو اُن کے سلام کا جواب دینے کو اپنے لئے اعزاز وافتخار سمجھتے ہوں۔

موجودہ دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا باہمی تعامل بہت زیادہ ہوگیا ہے، مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے اداروں اور ملکوں میں ملازمتیں بھی کرتے ہیں، حکومتوں اور صنعتی وکاروباری اداروں اور سول سوسائٹی کی سطح پر روابط بھی قائم ہوتے ہیں، بین المذاہب مکالمہ بھی ہوتا ہے، اس لئے سلام میں پہل بھی کرنی پڑتی ہے، سلام کا جواب بھی دینا پڑتا ہے اور بعض اوقات مصافحہ اور معانقہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ بعض صورتوں میں مسلم ممالک میں

ایک ساتھ دفاتر میں کام بھی کرتے ہیں اور افسر و ماتحت بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک میز یا دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا بھی پڑتا ہے، لہٰذا سلام و جوابِ سلام کا یہ باہمی برتاؤ ناگزیر ہے۔ یہ باہمی سلام کلام بالعموم مدارات کے طور پر ہوتا ہے، جس کی اسلام میں گنجائش ہے، کیوں کہ اسلام انسانیت سے نفرت نہیں سکھاتا، انسانیت کی بنیاد پر ہمدردی اور حسنِ سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ مسلمان کے حسنِ سلوک اور معاملات میں عدالت، دیانت، امانت اور صداقت سے متاثر ہو کر کوئی غیر مسلم اسلام بھی قبول کر سکتا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔ اگر غیر مسلم کا سامنا ہو اور ہم منہ موڑ لیں تو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں منفی تأثر پیدا ہوگا کہ یہ انسانوں اور دیگر اہلِ مذاہب سے نفرت کرتے ہیں۔ اس سے ان کے دل میں بھی ہمارے لئے نفرت پیدا ہوگی تو یہ حکمتِ دین کے منافی ہے۔ حدیث و فقہ میں اس پر بحث کی حکمت ہمیں یہ معلوم ہوتی ہے کہ ''السّلام علیکم'' مسلمانوں کے باہمی میل جول کا شِعار ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی سُنّتِ طیبہ ہے۔ اِخلاص پر مبنی کلمۂ دعا ہے اور اپنی طرف سے مسلمان بھائیوں کے لئے پیامِ امن و سلامتی بھی ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک بہتر یہی ہے کہ غیر مسلموں سے میل ملاقات کے وقت وہ کلمات استعمال کئے جائیں جو ان کا شِعار اور روزمرہ ہیں اور وہ ان کی کوئی امتیازی مذہبی علامت بھی نہیں ہے، جیسے ''صبح بخیر'' یا ''گڈ مارننگ''، ''شب بخیر'' یا ''گڈ نائٹ''۔ اہلِ عرب کے ہاں ''صَبَاحَ الْخَیْر''، ''مَرْحَبًا''، ''اَھْلًا وَّسَھْلًا''، یعنی ''خوش آمدید'' اسی طرح ان کلمات کے انگریزی مترادف ہیلو، ویلکم ہیں یا ''حَیَّاكَ اللّٰهُ'' (جیتے رہو) یا ''هَدَانَا وَهَدَاكَ اللّٰهُ'' (اللہ ہم سب کو ہدایت دے) کہہ کر اخلاص کے ساتھ ان کے لئے توفیقِ ہدایت کی دل سے دعا کریں۔ اسی طرح ہمارے علاقائی زبانوں میں کلمات ہیں، مثلاً پشتو میں ''ہر کلہ راشہ'' اور ہندکو زبان میں ''ہر کدے آؤ'' سندھی زبان میں ''بھلے آیو، چنگی آیو''، پنجابی زبان میں ''صدقے آیانوں'' وغیرہ ہیں۔ ان تمام کے مشترک معنی خوش آمدید ہیں یا آپ کے آنے پر خوشی ہوئی، ایسے ہی آتے رہو۔ فارسی زبان میں کہتے ہیں: ''اے کہ آمدنت تو باعث آبادی

ما'' اور کبھی اگر وہ ہمیں ''السلام علیکم'' کہہ کر پہل کریں، تو ہم بھی وعلیکم کہہ سکتے ہیں۔ شرعاً جو امر ممنوع ہے، وہ ''مُداہنَت'' ہے، یعنی کسی ذاتی غرض، طمع، ریا یا خوف کے تحت تملُّق، خوشامد اور چاپلوسی کے طور پر غیر مسلم کی تعظیم و تکریم کرنا، بے جا تعریف کرنا اور اپنے آپ کو بے توقیر کرنا وغیرہ شرعاً حرام ہیں۔ اس سے اسلام پر مسلمان کی بے توقیری ہوتی ہے۔ اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔ قرآن نے بھی اس سے منع فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ O

ترجمہ: ''وہ کافر چاہتے ہیں کہ آپ (دین کے معاملے میں بے جا رعایت دے کر) مداہنت کریں اور وہ بھی جواباً آپ کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کریں، (القلم: 9)''۔

ضروری یادداشت